غلام نبی خیالؔ نمبر

شیرازہ



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

غلام نبی خیال نمبر

شیرازہ



جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد : ۵۷ | غلام نبی خیال نمبر | شمارہ : ۴۔۶

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد اقبال بابا

سرورق : امتیاز شرقی

ISSN نمبر : 2277-9833

سالِ اشاعت : (اپریل۔جون) 2019ء

قیمت : ۱۰۰ روپے

’’شیرازہ میں جو مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کُلاًیا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔‘‘ (ادارہ)

● ...... خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ’’شیرازہ‘‘ اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

ای میل : salimsalik2012@gmail.com

فون نمبرات : 9419711330,9419072288

فہرست

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد اقبال بابا

سرورق : امتیاز شرقی

ISSN نمبر : 2277-9833

سالِ اشاعت : (اپریل۔جون) 2019ء

قیمت : ۱۰۰ روپے

''شیرازہ میں جو مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کُلّاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔'' (ادارہ)

● ...... خط وکتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

ای میل : salimsalik2012@gmail.com

فون نمبرات : 9419711330,9419072288

فہرست

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئیجز

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد اقبال بابا

سرورق : امتیاز شرقی

ISSN نمبر : 2277-9833

سالِ اشاعت : (اپریل۔جون)2019ء

قیمت : ۱۰۰ روپے

''شیرازہ میں جو مضامین اور شعری تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کُلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔'' (ادارہ)

● ...... خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئیجز

سرینگر / جموں

ای میل : salimsalik2012@gmail.com

فون نمبرات : 9419711330,9419072288

فہرست

غلام نبی خیالؔ......تخلیقی و تحقیقی جہتیں

غلام نبی خیالؔ......تخلیقی و تحقیقی جہتیں

غلام نبی خیالؔ کی اُردو منظومات

غلام نبی خیالؔ کے منتخب مضامین

............●●●............

حرفِ آغاز

گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے سے جو اَدبی شخصیات ریاست کے ثقافتی منظرنامے پر قوسِ قزح بکھیر رہی ہیں اُن میں غلام نبی خیالؔ صاحب کی شخصیت کئی خصوصیات کی حامل ہے اور ساتھ ہی خیالؔ صاحب ہمارے ادبی کاروانِ رنگ و بُو کے اوّلین شاہسواروں میں دُور سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔آپ ایک بلند قامت ادیب، قلم کار، شاعر، مترجم، صحافی، براڈ کاسٹر، محقق اور نامہ نِگار کی حیثیت سے گزشتہ ساٹھ برس سے بیک وقت کئی زبانوں میں کامیابی کے ساتھ اپنے قلم کی جولانیاں دکھارہے ہیں۔عالمی ادب، خصوصاً فارسی، انگریزی اور عربی پر آپ کی گہری نظر ہے۔آپ کی جو خصوصیت سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک پُر جوش اور فعال تمدنی شخصیت ہیں۔ ریاست اور بیرون ریاست میں متعدد اَدبی اور ثقافتی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔دُنیا کے مختلف ممالک کے نامور قلمکاروں کے ساتھ آپ کے ذاتی روابط ہیں اور اُن سے خاطر خواہ استفادہ بھی کرتے ہیں۔ خیالؔ صاحب سیاسیات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور کئی برس قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں لیکن اِس عرصے کو بھی آپ نے اَپنی تخلیقی سرگرمیوں میں نِکھار لانے کے لئے استعمال کیا۔نوجوانی کے ایام ہی سے آپ متعدد ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے روحِ رواں رہے اور اِن کوششوں کی بدولت ہمارے تمدّنی منظرنامے کے کئی ابواب رقم ہوئے ہیں۔اِس وقت بھی آپ کئی ادبی تنظیموں کے سرپرست ہیں یا یوں کہیئے اِن تنظیموں کے روحِ رواں ہیں۔خیالؔ صاحب کی شخصیت کا یہ بھی خاصا ہے کہ آپ مختلف معاملات پر مصلحت کوشی کے بجائے کھل کر دانشورانہ اختلاف کرتے ہیں۔ادبی اور ثقافتی معاملات میں ہم نے آپ کو ہمیشہ ثابت قدم اور مستقل مزاج پایا ہے۔ہم نے آپ کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا ہے۔بہر حال، قصہ طویل ہے اور صفحات کی قید......!

خیالؔ صاحب خوش اطوار، خوش لباس، نفاست پسند اور بلند قامت شخصیّت ہیں اور یہ

اوصاف آپ کی تحریروں میں بھی جھلکتے ہیں۔ بنیادی طور اگر چہ کشمیری زبان کے ادیب ہیں لیکن اُردو اور انگریزی میں آپ کے ادبی کنٹری بیوشن کو کسی طور کم نہیں کہا جا سکتا ہے۔

شیرازہ اُردو ہمیشہ ہی سے ریاست کی نامور ادبی اور ثقافتی شخصیات پر خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کرتا آرہا ہے اور آج خیالؔ صاحب پر یہ اشاعت خصوصی قارئین کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے۔ خیالؔ صاحب کے ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت بھی لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ ایسے میں ہم بھی حق ادائی کے جذبے کے تحت یہ سوغات لے کر حاضر ہوئے ہیں اور اُمید ہے کہ اِسے قارئین میں شرفِ قبولیت حاصل ہوگا۔

اِدارہ اِس اشاعت خصوصی کے لئے اپنا قلمی تعاون پیش کرنے والوں کا اِنتہائی ممنون ہے۔ خیالؔ صاحب نے ذاتی کلیکشن سے بعض تصاویر اور تخلیقی نوادرات عنایت کئے ہیں جس کے لئے ادارہ اُن کا شکر گزار ہے۔ محمد سلیم سالکؔ، سلیم ساغرؔ اور محمد اقبال لون نے زیر نظر اشاعت کے مختلف مراحل خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں جس محنتِ شاقہ سے کام لیا ہے، اُس کے لئے وہ شاباشی کے مستحق ہیں۔

زیر نظر اشاعتِ خصوصی کے لئے آپ کی آرأ کا اِنتظار رہے گا۔

سری نگر: یکم جون ۲۰۱۹ء ● ...... محمد اشرف ٹاک

......●●......

● ...... محمد اقبال لون

سوانحی خاکہ

نام ...... میر غلام نبی

قلمی نام ...... غلام نبی خیآل

والدین ...... مرحوم میر جلال الدین، مرحومہ تاجہ بیگم

پیدائش ...... سنیچروار، 4/مارچ 1939ء، حول سری نگر

ابتدائی تعلیم ......اسلامیہ ہائی سکول راجوری کدل، سری نگر

میٹرک 1952ء

گریجویشن 1961ء

پوسٹ گریجویشن ایم اے اردو...... 1970ء

نکاح 30/اگست 1970

نصف بہتر...... رفیقہ جبین

اولادیں...... کامران خیال (فرزند)، ڈاکٹر صبا خیال (دختر)، عرفان خیال (فرزند)

پہلی شعری تخلیق...... رسالہ ''گلریز' جولائی 1954 (خیال فاروقی کے نام سے)

اساتذہ...... مولانا غلام نبی مبارکی، مولانا محمد سعید مسعودی، حسام الدین بانڈے

تصانیف

اردو

1997......اقبالؔ اور تحریکِ آزادئ کشمیر (چار ایڈیشن)

1998......خیابانِ کشمیر

1998......کاروانِ خیال

1999......فغانِ کشمیر

2003......اظہارِ خیال

2004......خیالات

2007......فکر خیالؔ

2010......چنار رنگ

2014......خیالؔ قلم

2014......کشمیر کی وادی (والٹر لارنس کی کتاب کا ترجمہ، ناشر: اردو کونسل۔نئی دہلی)

2015 ...... کشمیر، دھوپ اور چھاؤں میں (ٹنڈیل بسکو کی کتاب کا ترجمہ، ناشر: اردو کونسل۔نئی دہلی)

2016......شبنم کا آتش کدہ

2016...... جہانِ خیالؔ

2016......غلام نبی خیالؔ ایک مطالعہ۔از ڈاکٹر رفیق احمد بانڈے

کشمیری

1959......لُولک پرتَو (پرتوِ عشق)

1961......ترجمہ رباعیاتِ عمر خیام۔(تین ایڈیشن)

1962......پراگاش (نورِ سحر)

1962......بوطیقا (ارسطو کی کتاب کا ترجمہ)

1962......ویُور (سمتر انندن پنت کی نظموں کا ترجمہ)

1962......سام نامہ

1963......زنجورہ ہند ساز (شعری مجموعہ زنداں نامہ)

1963......سون ادب

1963......محمود گامی

1967......کاشر نثر (کشمیری نثر کی تاریخ، اوتار کشن رہبر کے ساتھ)

1973......گاشرِ مُنار (ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 1975)

1974......اکہ نندن

1998......میڈیا (یوری پیڈیز کے ڈرامے کا کشمیری ترجمہ)

2003......قلم پارہ

2003......گلزارِ خیال

2004......الہام (شعری مجموعہ)

2012......مونوگراف اختر محی الدین

نگریزی

2009......لیوز آف چنار (ریاستی کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ۔2012)

2011......پروگریسو لٹریری موومنٹ اِن کشمیر

صحافت

1955......مدیر: کونگ پوش (کشمیری ادبی رسالہ)

1961......مدیر: رسالہ گل ریز

1965-68......بانی مدیر ہفت روزہ وطن (پہلا کشمیری اخبار)

2003......مدیر اعلیٰ: ووئس آف کشمیر (انگریزی ہفت روزہ)

جموں و کشمیر نمائندہ: انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی)، السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی)، ٹائم میگزین نیویارک، سنڈے میل (نئی دہلی)، گجرات سماچار (احمد آباد)، نوائے وقت اور نیشن (پاکستان)، ووئس آف امریکہ (نئی دہلی)، گارڈین (لندن)، سٹیٹس مین (نئی دہلی)

انعامات واعزازات

1968......انٹرنیشنل ایسے کمپٹشن ایوارڈ۔وارسا، پولینڈ

1972......العرب میگزین ایوارڈ بین الاقوامی شعری مقابلہ

1974......جموں وکشمیر کلچرل اکادمی انعام برائے گاشرِ مُنار

1975......ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

1976......اکھل بھارتیہ ناگری پرچارنی سبھا ایوارڈ۔ کلکتہ

1982......جرنلسٹس ویلفیئر فاؤنڈیشن ایوارڈ، نئی دہلی

1989......ملک راج صراف ٹرسٹ ایوارڈ برائے صحافت، جموں

2000......لل دید فاؤنڈیشن ایوارڈ، سری نگر

2006......شاندار کارکردگی ایوارڈ، از دُوردرشن کیندر، چندی گڑھ

2007......فاضل کشمیری میموریل ایوارڈ، سری نگر

2007......بخشی میموریل ایوارڈ، سری نگر

2009......ہرموکھ کشمیر کمیٹی انعام

2010......جموں و کشمیر اردو اکیڈیمی ایوارڈ

2012......کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ برائے بہترین کتاب (Leaves of Chinar)

2013......خلعتِ فاخرہ۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

2013......دستارِ فضیلت، ریڈیو کشمیر سری نگر، کشتواڑ صوبۂ جموں

2013......اعزاز من جانب کشمیر کلچرل سوسائٹی، سری نگر

2014......این، جی، او ''آواز'' کی طرف سے راج بیگم یادگاری ایوارڈ

2014......بہار اردو اکیڈیمی ایوارڈ برائے بہترین کتاب۔ پٹنہ

2014......ریاست جموں و کشمیر کا سرکاری انعام۔ سری نگر

2015......حلقۂ اربابِ ذوق، سوپور کشمیر کا اعزاز

2017......شفیع شیدا میموریل ایوارڈ

2017......ٹائم لائف ایوارڈ۔ بخشی میموریل کمیٹی سری نگر

2018......نگینہ انٹرنیشنل ایوارڈ۔ سری نگر

پتہ............ Ghulam Nabi Khayal
15-Rawalpora Housing Colony,
Srinagar-190005 (J&K)

موبائل نمبر ...... 9419005909, ای میل ...... gulkhayal@gmail.com

● ...... رفیق احمد بانڈے

غلام نبی خیاؔل: حیات کے نشیب و فراز

غلام نبی خیاؔل ایک دبستان ہیں جنہوں نے اُردو ادب میں تحقیق و تنقید میں کارہائے نمایاں
نجام دیئے اور آج بھی مسلسل دیتے رہتے ہیں۔ ان کی آج تک شائع ہونے والی کتابوں کی
عداد بتیس (۳۲) ہے۔ کشمیری زبان میں شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کرنے والے غلام نبی خیاؔل
بلندیوں کی اس حد کو چھوئیں گے، یہ کسی کے گماں میں بھی نہ تھا۔ آگے چل کر اُنہوں نے اُردو، کشمیری اور
نگریزی میں دو درجن سے زیادہ کتابیں تحریر کیں۔

سلاف

غلام نبی خیاؔل کا خاندان سری نگر کے ایک تاریخی علاقے حول میں رہتا تھا۔ ان کے دادا کا
م غلام محمد میر تھا جو پشمینہ سازی کا کاروبار کرتے تھے۔ کشمیر میں ان دنوں دست کاری اپنے عروج پر
ھی، جو کہ اصل میں کشمیر میں میر سید علی ہمدانیؒ (1313-1384) کے دَور کی دَین ہے۔ غلام محمد
یر مرحوم کو یہ کام وراثت میں ملا تھا اس وجہ سے انہوں نے اس کو کافی بڑھاوا دے کر اپنے گھر میں اس
کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا۔ روایتی طرز پر ان کا کنبہ مشترکہ تھا جس میں قریب چالیس افراد اکٹھے
ہتے تھے۔

الدین

غلام نبی خیاؔل کے والد کا نام جلال الدین میر تھا۔ خیاؔل صاحب، مرحوم جلال الدین میر کے

اکلوتے فرزند تھے۔ جلال الدین میر زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن اس کے باوجود اپنے پیشے میں بڑی
مہارت رکھتے تھے۔ وہ پیشے سے قالین بافی کے نقاش تھے اور آخری دم تک وہ اسی کام میں لگے رہے
غلام نبی خیالؔ کی والدہ کا نام تاجہ بیگم تھا۔ وہ ایک سلیقہ مند خاتون تھیں اور زیادہ تر گھریلو کام میں
مصروف رہتی تھیں۔ خیالؔ صاحب کی پرورش میں تاجہ بیگم کی تربیت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ سلیقہ مندی، نرم
مزاجی، ملنساری اور حقیقت پسندی کے اوصاف غلام نبی خیالؔ کی ماں کی پرورش کی ہی دین ہیں۔

پیدائش

جلال الدین میر کے گھر 4/ مارچ 1939ء کو جس لڑکے نے آنکھیں کھولیں اس کا نا
غلام نبی میر رکھا گیا۔ بعد میں یہی لڑکا اپنی لیاقت اور قابلیت سے صحافت میں ایک مقام حاصل کر
میں کامیاب ہوا۔ جب اُنہوں نے اپنی توجہ شاعری کی طرف مبذول کی تو اپنا تخلص خیالؔ رکھا۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

غلام نبی خیالؔ کا بچپن فارغ البالی میں گزرا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کشمیر میں
مشترکہ خاندانوں کا رواج عام تھا۔ موصوف آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جس کا ثبوت ا
بات سے ملتا ہے کہ ان کے بچپن کے دور میں ایک دفعہ گھر کے کسی فرد نے کہا کہ بھئی ہمارے محلے
کسی کے پاس ریڈیو نہیں ہے لیکن ہمارا گھر بڑا ہے کم سے کم ہمارے گھر میں ایک ریڈیو
چاہیئے۔ پھر فرگوسن ریڈیو دوسو روپیہ میں خرید کر لایا گیا۔ ہندوستان میں ان دنوں ریڈیو نہیں
تھے۔ وہ لندن کا ریڈیو تھا۔ محلے کے سارے لوگ خیالؔ صاحب کے گھر میں دن بھر ریڈیو سننے
لئے آتے رہتے تھے۔

غلام نبی خیالؔ کی ابتدائی تعلیم محلے سے چند قدم کی دوری پر راجوری کدل کے اسلامیہ
اسکول میں ہوئی جو آج بھی اپنی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دنوں کشمیر میں اس کا شمار تین بڑ
اسکولوں میں ہوتا تھا۔ جن میں بسکو اسکول نیشنل پبلک اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول شامل تھے۔ نیشن
پبلک اسکول اور بسکو اسکول میں کشمیری پنڈت لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور اسی طرح اسلامیہ
اسکول میں مسلم طبقہ اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتا تھا۔ اسلامیہ ہائی اسکول سے انہوں

میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول میں مولانا نورالدین مرحوم نے انہیں اردو اور مولانا غلام نبی مبارکی مرحوم نے عربی پڑھائی۔ دوران تعلیم وہ اپنے اساتذہ سے کافی متاثر رہے اسکول کے زمانے سے ہی غلام نبی خیالؔ طبع آزمائی کرنے لگے تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ''گلریز'' رسالہ سے ہوا۔

تعلیم

غلام نبی خیالؔ 23رفروری 1958ء کو ریاست میں سیاسی تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے گرفتار کئے گئے اور ان کو سینٹرل جیل سری نگر منتقل کیا گیا۔ جہاں خیالؔ نے انتہائی آزمائشوں کے وجود اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا اور 1960ء میں بی۔ اے امتیازی حیثیت کے ساتھ مکمل کیا۔ جیل میں ہی اُنہوں نے مولانا مسعودی صاحب سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 1960ء میں رہائی کے بعد خیالؔ نے صحافت کے ساتھ وابستگی اختیار کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور کشمیری یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو بھی کیا۔

شادی

غلام نبی خیالؔ کی شادی 1970ء میں سری نگر کے فتح کدل علاقے کے ایک مشہور تاجر غلام حسن وانی کی بیٹی رفیقہ کے ساتھ ہوئی۔ خیالؔ صاحب کی زوجہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں جو پیشے سے استاد ہیں اور سبکدوشی کے بعد آج کل اپنے بیٹے کامران کے ساتھ دوبئی میں مقیم ہیں۔ وہ ایک ہنس مکھ اور نہایت ہی سلیقہ مند خاتون ہیں اور پوری زندگی ایک نیک سیرت اہلیہ کا کردار نباتی رہیں۔ اُنہوں نے بچوں کی بہتر پرورش اور خیالؔ کے ادبی سفر کے دوران نمایاں کردار ادا کیا۔

اولاد

خیالؔ صاحب اور رفیقہ صاحبہ کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے سرفراز کیا اور اُن کے یہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئیں۔ بڑے بیٹے کا نام کامران رکھا گیا جو پیشے سے کمپیوٹر انجینئر اور اس وقت دوبئی میں ایک نامور سافٹ ویئر کمپنی میں بڑے عہدے پر فائز ہے۔ بیٹی کا نام صباء ہے جو پیشے سے ڈاکٹر ہے اور اس وقت امریکہ میں اپنے شوہر کے ساتھ سکونت پذیر ہے۔ چھوٹے بیٹے کا نام عرفان ہے وہ

بھی کمپیوٹر انجینئر ہے اور اس وقت اپنے بڑے بھائی کے ساتھ دوبئی میں بحیثیت انجینئر کام کر رہا ہے
بچوں کی تعلیم اور تربیت پر غلام نبی خیالؔ نے خاص توجہ دی۔ انہی کاوشوں کے طفیل ان کی اولاد آ
بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہے۔

ملازمت

غلام نبی خیالؔ کو کم سنی سے ہی پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ چونکہ ان دنوں میٹرک پاس کر
کے بعد ہی سرکاری ملازمت ملتی تھی خیالؔ نے بخشی صاحب کے دورِ حکومت میں نوکری کے
درخواست دی تو ان کو پولیس میں نوکری کی پیش کش کی گئی۔ ان دنوں پولیس میں جانا معیوب سمجھا ج
تھا اسی لئے ان کے ماموں عبدالعزیز نے ان کو پولیس کی نوکری سے روکا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے
خیالؔ صاحب ریڈیو کشمیر سری نگر میں بحیثیت اناؤنسر تعینات ہوئے۔ ریڈیو کشمیر میں چار سال ت
نوکری کے بعد 1958ئمیں ریڈیو کشمیر سے نکلتے ہی گرفتار کئے گئے اور پھر 1960ئمیں قید
رہا ہوئے۔ 1961ئمیں انہیں کلچرل اکادمی میں پبلی کیشنز سیکشن کا انچارج مقرر کیا گیا۔ چو
خیالؔ آزاد طبیعت کے مالک تھے اسی لئے انہیں یہ نوکری بھی چھوڑنی پڑی۔ بعد میں انہوں نے
ناطہ دوبارہ صحافت سے جوڑا۔ دو سال تک کشمیر یونیورسٹی میں محکمۂ صحافت میں وزیٹنگ پروف
(Visiting Professor) بھی رہے۔

شخصیت

غلام نبی خیالؔ ایک بھرپور اور مثالی شخصیت کے حامل ہیں۔ بہ حیثیت ادیب، صحافی، ش
والد اور سماج کے ایک ذمہ دار فرد کے طور پر انہوں نے اپنی شخصیت کی گوناگوں خصوصیات سے س
متاثر کیا۔

ذیل میں غلام نبی خیالؔ کی شخصیت کے چند نمائندہ پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔

سراپا

غلام نبی خیالؔ مغلوں کے میر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں مغل خاندان
لوگوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں جیسے بلند قامت، چوڑا شانہ، بھاری بھرکم جسم، گورا رنگ، ست

ناک، سرمئی آنکھیں وغیرہ۔

لباس

غلام نبی خیالؔ لباس کے معاملے میں نفاست پسند ہیں۔ ہمیشہ صاف ستھرے اور دلکش کپڑے زیب تن کرتے ہیں۔ شادی بیاہ اور دیگر تقاریب میں کوٹ پینٹ اور ٹائی کا استعمال کرتے ہیں۔ گھر میں قمیض پائجامہ اور فرن پہنتے ہیں۔

غذا

غلام نبی خیالؔ کو سادہ اور مرغن سبھی قسم کی غذائیں پسند ہیں۔ خود بھی اچھا کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اکثر کھانے پر مدعو کرتے ہیں۔ انہیں غذا میں خاص طور سے گوشت بہت پسند ہے۔ گھر پر سبزی، دال، گوشت ہر قسم کا کھانا کھاتے ہیں۔

ادبی دلچسپیاں

غلام نبی خیالؔ کی ادبی دلچسپیوں کا آغاز دہلی کے ہفتہ وار فلمی رسالے ''چترا'' سے ہوا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خیالؔ اسلامیہ ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس فلمی رسالے نے خیالؔ کے دل میں ادبی ذوق قائم کیا۔ یہ رسالہ خیالؔ صاحب کی زندگی کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ اگر چہ راقم نے اس رسالے کو ڈھونڈنے کی کافی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ غلام نبی خیالؔ کا طالب علمی کا زمانہ تھا، اس کے بعد غلام نبی خیالؔ نے جب اپنے شعور کی آنکھیں کھولی تو ان کو ہر طرف ادبی ماحول ملا۔ یہ ادبی تحریکوں کا دور تھا جس نے خیالؔ کو بھی اپنے اَثر میں لیا۔ 1954ء میں خیالؔ نے ریاست جموں و کشمیر کی ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ پہلے وہ کشمیری زبان میں مشقِ سُخن کرنے لگے اور بعد میں اردو اور انگریزی ادب کی طرف بھی راغب ہوئے۔

صحافت

غلام نبی خیالؔ نے صحافتی زندگی کی ابتدا ''کونگ پوش'' رسالہ سے کی ہے۔ اس رسالے کو 1949ء کے آس پاس یہاں کے ترقی پسند مصنفین نے جاری کیا تھا۔ خیالؔ ''کونگ پوش'' رسالہ کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس کے ادارتی مجلس میں خیالؔ کے علاوہ عبدالعزیز ہارون اور نور محمد روشن بھی شامل

تھے۔اس کے بعد 1964ء میں خیاؔل کی ادارت میں اردو ہفت روزہ ''محاذ'' شائع ہوا۔ ''محاذ'' عوامی ترجمان تھا۔ 1964ء کے اخیر میں ''محاذ'' پر پابندی عائد کی گئی۔ان دنوں خیاؔل کو سیاسی مخالف قرار دیا گیا۔ بعد میں اُنہوں نے اپریل 1965ء میں اپنا ہفتہ وار کشمیری اخبار ''وطن'' جاری کیا۔ چونکہ ان دنوں کشمیر میں سیاسی وسماجی بے چینی تھی اور تعلیم بھی کچھ زیادہ عام نہ تھی اس وجہ سے یہاں پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ اسی لئے یہ اخبار وطن 1968ء میں بند ہوگیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے 1968ء میں اردو ہفت روزہ 'اقبال' جاری کیا جو بعد میں روز نامہ بن گیا۔لیکن کچھ مدت کے بعد انہیں کئی مجبوریوں کے باعث یہ اخبار بھی بند کرنا پڑا۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنی محنت ولگن کے ساتھ صحافتی پیشے اور اپنے فرائض کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ پھر وہ انگریزی صحافت کی طرف مائل ہوئے۔اس طرح وہ بڑی حوصلہ مندی اور خداداد قابلیت کے ساتھ ''انڈیا ٹوڈے میگزین'' کے کشمیر کے پہلے نامہ نگار بن گئے اور دس سال تک اس سے وابستہ رہے۔اس کے بعد 1977ء میں انہوں نے ''اسٹیٹس مین'' (دہلی) کی نامہ نگاری بھی کی۔وہ کشمیر یونیورسٹی میں دو سال تک شعبۂ صحافت کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ پاکستان کے ایک اخبار ''نوائے وقت'' کے نامہ نگار بھی تھے۔غلام نبی خیاؔل نے زیادہ تر کام غیر ملکی پریس کے لئے کیا۔ خاص کر کشمیر میں 1990ء کے پُرآشوب دور میں ''گارڈین'' اخبار لندن کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔انہوں نے امریکہ کے ایک مشہور میگزین ''ٹائم'' کے لئے بھی کام کیا ہے۔نامساعد حالات کی وجہ سے کشمیر عالمی میڈیا کا موضوع بحث رہا تو ان حالات میں خیاؔل نے عالمی سطح پر کشمیر کی ترجمانی کی۔ پھر 2003ء میں انہوں نے اپنا ایک ہفت روزہ انگریزی اخبار "Voice of Kashmir" جاری کیا جو آج بھی پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔انگریزی میں اس اخبار کے نکالنے کا یہ بنیادی مقصد ہے کہ کشمیر کا ادب، ثقافت اور تاریخ غیر کشمیری لوگوں تک پہنچ سکے تاکہ وہ کشمیر کے بارے میں واقفیت حاصل کرسکیں۔

غیر ممالک کے اسفار:

عراق میں صدر صدام حسین کے دور میں ہر سال یوم انقلاب جولائی کے مہینے میں منایا جاتا تھا۔اس موقع پر وہ دنیا کے تمام اخبار نویسوں کو بلاتے تھے۔ 1979ء میں ہندوستان سے بھی اخبار

نویسوں کا ایک وفد روانہ ہوا۔ انہیں اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا اور صحافیوں کے علاوہ ان کے ساتھ دہلی کے اردو رسالے ''روبی'' کے ایڈیٹر مرحوم رحمان نیرؔ، ''ہندوستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر راجندر راو ستھی اور ایک بنگالی صحافی بھی شامل تھے۔

انہوں نے دوسری مرتبہ 1986ء میں عراق کا سفر کیا۔ وہاں دیگر ممالک کے صحافیوں سے ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ متحدہ عرب امارات کا سفر کیا۔ کئی مرتبہ پاکستان کے سفر پر بھی روانہ ہوئے ہیں۔ پہلی مرتبہ 1986ء میں وہ پاکستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں صدر ضیاالحق کا انٹرویو لیا۔ دوسری مرتبہ 1990ء میں انہوں نے پاکستان کا سفر کیا۔ وہاں نواز شریف کا انٹرویو لیا اور آخری مرتبہ انہوں نے 2007ء میں پاکستان کا سفر کیا۔ وہاں جنرل پرویز مشرف کا انٹرویو لیا۔ اور 2007ء میں ہی انہوں نے قطر کا سفر کیا اور وہاں بھی بیشتر غیر مُلکی صحافیوں سے ملاقاتیں کیں۔

............●●● ....

● ......غلام نبی خیالؔ

آپ بیتی

میں کب اور کہاں پیدا ہوا، یہ تو مجھے بتایا گیا ہے لیکن کیوں پیدا ہوا اُس کی مجھے کوئی علمیت
نہیں۔4/مارچ 1939ء کو میں دنیا کی خوبصورت ترین جگہ جنت ارضی کی راجدھانی سری نگر شہر کے
''حول'' علاقے میں پیدا ہوا۔ اُن دنوں شہر میں تین درس گاہیں تعلیم و تدریس کے لیے مشہور تھیں۔
امیراکدل کے بسکو سکول میں زیادہ تر متمول گھرانوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کرن نگر
نیشنل سکول کشمیری پنڈتوں کے لیے مخصوص تھا اور راجوری کدل کا اسلامیہ ہائی سکول متوسط طبقے کے
مسلمان طلباء کا تدریسی مرکز تھا۔ اسی اسلامیہ سکول میں میرے دادا غلام محمد میر نے میرا داخلہ کروایا۔
سکول ہمارے گھر سے مختصر فاصلے پر واقع تھا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں مجھے میر واعظ مولانا غلام نبی
مبارکی، مولانا نورالدین اور محمد حسین آزاد پنجابی جیسے علمائے دہر کی رہنمائی حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔
ہمارا کنبہ محلے کا سب سے بڑا گھرانہ تھا جس کے مکینوں کی تعداد کوئی چالیس افراد پر مشتمل تھی۔

اسلامیہ ہائی سکول میں، میں نے ایک معمول کے طالبِ علم کی حیثیت سے ابتدائی تعلیم
حاصل کی جس کے ساتھ کوئی یادگار واقعہ وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ موسیقی کے ایک ہفت روزہ سلسلے کی
حسین یادیں اب بھی فکر و ذہن میں برجستہ گلابوں کی مہک بن کر ابھرتی ہیں۔

اُن دنوں حول کا سارا علاقہ بادام اور انار کے باغات سے بھرا پڑا تھا جس میں کہیں کہیں
اُکا دکا رہائشی مکان نظر آتے تھے۔ بہار کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے گھر سے ملحق در باغ میں ہر اتوار

صوفیانہ موسیقی کی محفل آراستہ ہوا کرتی۔ سبز مخملی زمین پر نقرئی چاندنی بچھائی جاتی جس پر براجماں ہوکر محمد عبداللہ تبت بقال اوران کے ہم نوا سنگیت کا ایسا جادو جگاتے تھے کہ ہم سبھی کم عمر بچے سارا دن اس محفل سے محظوظ ہوتے ہوئے کھانا پینا تک بھول جاتے تھے۔ سنگیت کی اس محفل کے دوران جہاں ہم اور ہمارے ساتھ چھوٹی لڑکیاں سوئی دھاگہ لے کر زمین پر گرے ہوئے بادام کے شگوفوں سے مالائیں بنا بنا کر پہنتیں اور خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ وہاں ہمارے یا کسی اور صاحب ثروت ہمسایہ گھرانے سے بڑے بڑے سماواروں میں زعفرانی قہوہ لایا جاتا جس کے ساتھ گھی میں بنائی ہوئی باقر خانیوں سے بھری ٹوکریاں بھی ہوتیں۔ یہ قہوہ مہمانوں کے ساتھ بچوں کو بھی ضرور پلایا جاتا۔

تبت بقال کا یہ معمول تھا کہ وہ دن کے ڈیڑھ بجے محفل سمیٹ کر ہمارے گھر کی طرف رخ کرتے جہاں اس گھر کی بالائی منزل میں ظہر کی با جماعت نماز ادا کی جاتی۔ پھر یہ لاثانی گلوکار اپنے گھر کی راہ لیتا جو مشکل سے ایک یا دو میل کی دوری پر بدھ گیر میں واقع تھا۔

تقریباً ساٹھ ستر سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی تبت بقال کا بار بار گایا ہوا وہ دلنشین اور اُن کا اپنا پسندیدہ نغمہ میری یادوں کے شبستان میں جاگ اٹھتا ہے جسے وہ مقام راست کشمیری میں گاتے تھے:

لیس مارہ متس مائز چھ نمن سہ کمن ستیین گوم
کلہ والی بورنم شراب خمن داماہ چاوتھ گوم
سۂ چیتھ پھیورم رُمن رُمن کمن ستیین گوم

(میرے محبوب کے ناخن مہندی سے رنگے ہیں، وہ نہ جانے کن کے ساتھ چلا گیا۔ ساقی نے میرا جام شراب سے لبریز کیا اور چند قطرے پلا کر گیا۔ یہ شراب میری نس نس میں سرایت کر گئی۔ میرا محبوب کن کے ساتھ چلایا گیا؟)

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد گھر میں جو بات موضوع سخن بن گئی وہ یہ تھی کہ اب میرا اگلا قدم کیا ہوگا۔ میں تو دل و جان سے تعلیم آگے جاری رکھنے کا متمنی تھا لیکن میرے ماموں میر عبدالعزیز کے مشورے سے، جن کی بات گھر میں حرفِ آخر سمجھی جاتی تھی اور جن کے سامنے سبھی

افرادِ خانہ بھیگی بلی بن کر خاموش بیٹھے رہتے تھے، یہ طے پایا کہ مجھے اب نوکری کرنی چاہیئے۔ جب اس فیصلے پر دبے دبے لہجے میں کسی نے اختلاف کا اظہار کیا تو میر صاحب اپنی گھن گرج والی آواز میں بولے: ''بہت ہو چکا، غلام نبی اب نوکری کرے گا اور اس وقت دسویں جماعت پاس ہونا ایک بڑی بات ہے، اسے فوراً سرکاری ملازمت ملے گی۔''

میں نے سن رکھا تھا کہ ریاست کے وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد ہر جمعہ کو صبح سے لے کر نمازِ ظہر کے وقت تک اپنے پرائیویٹ دفتر میں لوگوں کے مسائل سن کر موقعے پر ہی ان کا فیصلہ سناتے تھے۔ میں نے اُن سے اپنے بارے میں کہا کہ میں نے میٹرک کیا ہے اور اب نوکری کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اُس وقت ان کے ساتھ سید نظیر احمد شاہ عرف شیام جی موجود تھے جو پولیس کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ بخشی صاحب نے شیام جی کی طرف رخ کر کے کہا: ''یہ چھ فٹ کا لمبا نوجوان پولیس کے لیے موزون ہے۔ اسے کل سے ہی پولیس میں بھرتی کریں اور ہاں، اسے سب انسپکٹر کا عہدہ دیں''۔ شیام جی نے کورنش بجالا کر حکم کی تعمیل کا اشارہ دیا۔

میں خوشی خوشی گھر پہنچا۔ والدین یہ مژدہ سن کر خوش ہوئے لیکن ماموں میر صاحب نے تیوریاں چڑھا کر حیرانی سے پوچھا: ''کیا؟ کیا ہمارے خاندان کا لڑکا پولیس کی نوکری کرے گا؟ ہر گز نہیں''۔

ماموں کی رائے پتھر کی لکیر ثابت ہوئی۔ پھر گھر میں کسی نے بھولے سے بھی پولیس کا کبھی نام نہیں لیا۔

اس کے بعد حال تک کی میری داستانِ حیات عجیب و غریب واقعات، مد و جزر، غیر متوقع حالات اور فلمی نوع کی دلچسپ اور غم ناک کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔

ریڈیو کشمیر سری نگر میں شعبۂ موسیقی میں چند گانے والوں کی ضرورت تھی۔ مجھے روزِ اوّل سے ہی گانے بجانے کا شوق تھا۔ میں بھی ریڈیو کے دفتر پر گیا اور وہاں یہ فلمی گانا گا کر بزعمِ خود تیر مارا کہ میں منتخب ہو کے ہی رہوں گا:

محبت کے دھوکے میں کوئی نہ آئے
جو اک دن ہنسائے تو سو دن رلائے

آڈیشن چل ہی رہا تھا کہ شعبے کے سربراہ بشیر بٹ سٹوڈیو میں آئے اور مجھ سے تلخ لہجے میں

کہا کہ میں فوراًباہر چلا جاؤں کیونکہ ایک تو میں نے فلمی گیت گایا اور دوسرا یہ کہ میں اس پٹے پٹائے گیت کو بھی صحیح سُر تال کے ساتھ گا نہیں سکا۔ میں بے نیل ومرام گھر لوٹ آیا۔ چند روز بعد اسی ریڈیو سٹیشن میں اردو اور کشمیری میں خبریں پڑھنے کے لئے ایک نیوز ریڈر کی جگہ خالی ہوئی۔ میں پھر اس امتحان کے لیے میدان میں کود پڑا۔ امیدواروں میں میرے دو ادیب دوست امیش کول اور مکھن لال بیکس بھی شامل تھے۔ پروفیسر جیا لال کول اور محمودہ احمد علی شاہ ممتحن تھے۔ میری موزون آواز اور صحیح تلفظ کی بدولت مجھے منتخب کیا گیا۔ اُس وقت میری ماہانہ تنخواہ سوا سو روپے مقرر ہوئی۔

ریڈیو کی ملازمت سے قبل میری ادبی زندگی کا آغاز دراصل 1951ء سے ہی شروع ہوا تھا جب میں شہر سری نگر کی اُس وقت کی مایہ ناز تعلیمی درس گاہ اسلامیہ ہائی سکول میں زیرِ تعلیم تھا۔ میرے اختیاری مضامین میں عربی شامل ہونے کے ناطے یہ زبان کشمیر کے ایک ممتاز عالم دین اور سکالر مرحوم مولانا غلام نبی مبارکی ہمیں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مبارکی صاحب ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میری دلچسپی شاعری کے اوزان اور ردیف وقافیہ کے ساتھ بڑھتی گئی۔ اس طرح سے میں نے 1952ء میں اردو میں پہلی غزل لکھی جو جالندھر پنجاب کے ایک رسالہ 'راہی' میں شائع ہوئی۔

ان ہی دنوں میرے ایک ہم جماعت نے دہلی کے مشہور فلمی رسالے ''چترا و'' کے مطالعہ کا شوق مجھ میں پیدا کیا اور میں ہر ہفتے یہ رسالہ امیرا کدل کے اومکار برادرس بک شاپ سے خرید کر گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھتا رہا کیونکہ ہمارے گھر میں فلمی باتیں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر مجھ میں اردو افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اُس دوران میں نے جو درجنوں افسانے لکھے وہ اسی ''چترا ویکلی'' میں جی۔ این۔ برسات، شہباز کشمیری اور صادق رضوانی کے قلمی ناموں سے شائع ہوئے۔

یہاں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ جب میں نے اپنا اوّلین اردو افسانہ لکھا تو ان دونوں مرحوم پیر عبدالاحد سری نگر میں اخبار ''الحق'' کے ایڈیٹر تھے۔ لال چوک میں مرحوم غلام محمد صادق اور مرحوم خواجہ غلام محی الدین قرہ کی بیٹھک میں اس اخبار کا بھی دفتر تھا۔ ایک روز میں سہما سہما پیر صاحب کے پاس گیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ میرا یہ افسانہ شائع کریں۔ اخبار کے اگلے شمارے میں افسانہ شائع تو ہوا لیکن کاتب نے اسے نامکمل ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح سے افسانے کا اختتام جسے ہم

ان دنوں فلمی اصطلاح میں the end کہا کرتے تھے، اشاعت سے رہ گیا تھا۔ میں پھر پیر صاحب کے پاس گیا اور اس طرف ان کی توجہ دلا کر ان سے التجا کی کہ افسانے کا اختتامی حصہ بھی چھاپ دیں تا کہ پوری تحریر پڑھنے والوں کے سامنے آسکے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے ضروری نہیں ہے کہ کسی افسانے کا اختتام بھی ہو۔ آپ کا افسانہ میں نے چھپنے کے بعد پڑھا ہے اور یہ مجھے the end کے بغیر زیادہ اچھا لگا ہے۔

میرا اردو افسانہ نگاری کا شوق پھر بھی قائم رہا البتہ میرے یہ فلمی ٹائپ کے افسانے سوائے ''چتراویکلی'' کے اور کوئی اخبار یا رسالہ شائع کرنے پر ہرگز راضی نہ ہوا۔ یہاں پر یہ بھی کہہ دوں کہ اس مقبولِ عام رسالے میں ہر ہفتے اس کے مستقل قارئین کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ اوّلین خط بغیر کسی ناغہ کے قلوپطرہ نامی کسی پُر اسرار نسوانی شخصیت کی طرف سے ہوتا جس کا اتا پتہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کشمیر کے چترا پریمیوں میں باقاعدہ مراسلہ نگاروں میں لیکھ راج چھاپڑہ، حسن شش و پنج، حسن ساہو اور ہمدم کشمیری شامل تھے۔

اُس زمانے میں وہ دن میری دلی مسرت اور ذہنی آسودگی کا ایک عظیم دن تھا جب اسلامیہ ہائی سکول کے وسیع و عریض ہال میں، میں نے ایک مشاعرے میں پہلی بار ایک کشمیری نظم پڑھی۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ انجام دے رہے تھے اور اس مشاعرے میں موجود میرے استاد مولانا مبارکی دل کھول کر مجھے داد دے رہے تھے۔ کشمیری، اردو اور فارسی زبانوں میں منعقدہ اس محفلِ سخن میں محمد امین داراؔب، میرزا کمال الدین شیدؔا، خوشباش کشمیری، مبارک شاہ فطرت گیلانی، پروفیسر نندلال طالبؔ، غلام نبی عارضؔ اور فاضلؔ کشمیری کے علاوہ مولانا مبارکی نے بھی شرکت کی جنھوں نے دلوں کو چھو لینے والی اور آنکھوں کو اشک بار کرنے والی ایک نعت شریف اردو میں سنائی۔

جہاں مولانا مبارکی نے ذہنی طور پر مجھے سخن گوئی کی طرف مائل کیا وہاں پہلے پہلے رحمن راہی میری کشمیری نظموں اور غزلوں کی اصلاح کرتے رہے اور اس مناسبت سے میں انھیں بھی اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔

اپریل 1954ء میں، میں ریڈیو کشمیر سری نگر میں اناونسر اور نیوز ریڈر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا جہاں مجھے ڈیڑھ سو روپے مشاہرہ کے عوض یہ ملازمت مل گئی۔ سری نگر کے ریڈیو سٹیشن میں اُن دنوں کئی ادیب، شاعر اور ڈرامانگار موجود تھے جن میں سہیل عظیم آبادی، پریم ناتھ پردیسی، غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، غلام حسن اعجاز، پران کشور، علی محمد لون، اکبر لداخی، پشکر بھان، قیصر قلندر، ایس۔ ایس۔ این کیمفر، کنول نین پرواز اور شفیع شفائی قابل ذکر ہیں۔ انہی میں سے چند ایک مقامی حضرات کی ترغیب اور وساطت سے میں نے ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کشمیر کلچرل کانفرنس کی ہفت روزہ ادبی نشستوں میں باقاعدہ شرکت کرنا شروع کیا۔

23/فروری 1958ء کو جب میں ریڈیو سے اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر سائیکل پر گھر لوٹ رہا تھا تو راستے میں شہر سرینگر کے وسطی علاقے خانیار میں پولیس سٹیشن کے باہر گرفتار کیا گیا اور اس طرح پہلی بار ایک طویل قید و بند کے ماہ و سال سے گزرنا پڑا۔

طرفہ یہ ہے کہ میں اُس وقت تک شیخ محمد عبداللہ سے کبھی ملا بھی نہیں تھا، صرف میں نے ان کا نام سنا تھا۔ ہاں یہ حق بات ہے کہ ان کی رہائی کے بعد مجھ میں انھیں دیکھنے اور سننے کا اشتیاق بڑھ گیا اور سر میں کن ٹوپ سے چہرے کو ڈھک کر ایک دو بار جامع مسجد اور حضرت بل میں ان کی تقریریں سننے کے لئے گیا۔ اگر چہ ایک سرکاری ملازم ہونے کے ناطے اور وہ بھی جب کہ میں مرکزی سرکار کے ایک ادارے میں کام کرتا تھا، میرے لئے ایک مخالفانہ عوامی اجتماع میں شریک ہونا ایک شجرِ ممنوعہ تھا۔

خانیار پولیس سٹیشن کے گندے، تاریک اور مہیب حوالات میں جو پندرہ دن میں نے گزارے وہ ہر شب دیر گئے جموں کے ایک ڈوگرہ تھانیدار مینگی کی گالیوں پر ختم ہوتے تھے۔ ان پندرہ طویل راتوں کی سحر اُس صبح کو سری نگر کے سینٹرل جیل میں طلوع ہوئی جب 9/مارچ 1958ء کو علی الصباح موسمِ بہار کے نغمہ سنج پرندوں نے جیل کی بارکوں میں میرا استقبال کیا۔ اُس وقت میری عمر انیس سال تھی۔

جیل خانے میں پورے دو سال تک کی نظر بندی کے دوران جن تجربات سے میں دوچار ہوا وہ بجائے خود ایک الگ افسانہ ہیں لیکن میں یہاں پر صرف اُن محرکات کا ذکر کروں گا جو میری ادبی زندگی کے کنواس کو وسیع کرنے کا باعث بن گئے۔

اس زندان خانے میں مجھے مولانا محمد سعید مسعودی جیسے سر برآوردہ مفکر اور عالم سے علمی ا
ادبی استفادہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا بحالتِ اسیری بھی دن رات محوِ مطالعہ رہتے تھے ا
اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں جو عام طور پر انھیں شیخ صاحب
ایک زبردست حامی مس مردولا سارابائی نئی دہلی سے باقاعدگی کے ساتھ بھیجا کرتی تھیں۔

جیل میں مجھے فارسی زبان سیکھنے کا شوق ہوا اور میری یہ خواہش مولانا اور محاذ رائے شماری کے
ایک اور رہنما حسام الدین بانڈے کی عنایات سے پوری ہوئی۔ مولانا کے پاس مولانا عبدالسلام ندو
کا مرتب کردہ عمر خیام کی رباعیات کا ایک نسخہ تھا جو انھوں نے مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ خیام کی
رباعیات نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے کشمیری زبان میں ان کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں ہمارے روزمرہ میں یہ مسلسل عمل شامل تھا کہ قیدی ہر روز ناشتے کے بعد جیل کے
وسیع صحن میں ایک مخصوص جگہ پر جمع ہو کر تبادلۂ خیال کرتے اور سری نگر ریڈیو کی خبروں کو حسبِ دستو
جھوٹ کا پلندہ قرار دے کر ایک ذہنی آسودگی حاصل کر لیتے۔ ان غیر رسمی محفلوں میں محاذ رائے شماری
کے جانے پہچانے اراکین صوفی محمد اکبر، مرزا غلام محمد بیگ ذیلدار، غلام محی الدین شاہ، حسام الدین
بانڈے، علی محمد نائیک، مرزا غلام قادر بیگ، مرزا محمد یعقوب بیگ، محمد خلیل جوہر، پیر مقبول شاہ ویلہ گامی
نوہٹہ کے پیر یوسف شاہ مانکی پیر، غلام قادر شیر گاندربلی اور کشمیر پولیٹیکل کانفرنس کے عبدالحمید قرہ، غلام
رسول قرہ، محمد امین نحوی، شیخ غلام محمد اور مولوی عبدالحمید وکیل شوپیانی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

تقریباً ایک سال کے عرصے میں، میں نے عمر خیام کی ڈیڑھ سو رباعیات کا منظوم کشمیری
ترجمہ مکمل کر لیا جو بعد میں 1961ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آ گیا۔ اس ترجمے کے آغاز میں میر
موزون کیا ہوا یہ طبع زاد فارسی قطعہ بھی شامل ہے:

نغمہ عشرت، فغان غم، حدیثِ سوز و ساز
اہل دل راتحفہ ارباب حال آوردہ ام
نوش کن تاراز ہائے بستہ گردند آشکار
بادۂ خیام در جام خیال آوردہ ام

ترجمہ رُباعیات عمر خیام میری آج تک کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب ہے۔

جیل میں مجھے سعدی، حافظ، جامی اور اقبال کا فارسی کلام پڑھنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔

1960ء پر نظر ڈالی جائے تو میں نے دیکھا کہ اس دوران میں نے کشمیری میں کئی غزلیں اور نظمیں تخلیق کیں۔ یہ کلام ایک مجموعہ کی صورت میں 1963ء میں ''زنجورہ ہند ساز'' (سازِ زنجیر) کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میری زنداں کی شاعری پر فیض احمد فیض، ناظم حکمت اور قاضی نذرالاسلام کا اثر رہا ہے۔ نظر بندی کے دنوں میں، میں نے غیر شعوری طور پر اُن مصنفوں اور ادیبوں کی تخلیقات کا بھی ذوق وشوق سے مطالعہ کیا جو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی جیل گئے تھے۔ ان میں جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، فیض احمد فیض، قاضی نذرالاسلام، جولیس فیوچک وغیرہ شامل ہیں۔ اس زندان نامے کا آغاز میں نے مجروح سلطانپوری کے اس شعر سے کیا تھا:

غیروں کی خلش، اپنوں کی لگن، سوزِ غمِ جاناں، دردِ وطن

کیا کہیئے کہ ہم ہیں کس کس کو سینے سے لگائے زنداں میں

1962ء میں ارسطو کی مشہور تنقیدی کتاب بوطیقا (Poetics) کا میرا کشمیری ترجمہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس کاوش کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ادبی تنقید کی اس قدیم ترین کتاب کو کشمیری میں منتقل کر کے اہلِ کشمیر کو اس کی اہمیت اور افادیت سے روشناس کراسکوں۔

اُس وقت کی کشمیر سرکار نے تقریباً دو سال تک قید وبند میں رکھ کر غالباً مجھ پر ایک احسان ہی کیا تھا کیونکہ اگر میری زندگی میں یہ واقعہ ڈرامائی طور پر ظہور پذیر نہ ہوا ہوتا تو شاید میں ادبی دنیا میں وہ نہ ہوتا جو کچھ میں آج ہوں۔

بخشی صاحب نے میری رہائی کے بعد ایک دن مجھے اپنے پاس بلا کر میری بلاوجہ نظر بندی کے ضمن میں یہ انکشاف کر کے بذات خود معافی مانگ لی کہ اس حرکت کے پس پردہ ان کے بھائی بخشی عبدالرشید کا ہاتھ تھا، جس نے ریڈیو میں کام کرنے والے دوسرکاری مخبروں اور میرے محلے کے دو پیس بریگیڈ والوں کے بہکاوے میں آکر میری گرفتاری کے احکامات دیئے تھے۔ بخشی صاحب نے کہا کہ جب انھیں اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے میری فوری رہائی کے لئے چند قانونی ماہروں سے مشورہ

کیا جنھوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کی مخالفت کی کہ ایک نظر بند کی اچانک رہائی سے حضرت بل کیس کی ساری بنیادیں ہل جائیں گی اور قانونی لحاظ سے یہ مقدمہ کمزور پڑ جائے گا لیکن بخشی غلام محمد کے طرز عمل کا ایک انداز تھا کہ جو غلط یا صحیح فیصلہ وہ کرتے اسے کسی صورت میں تبدیل نہیں کرتے۔

بخشی صاحب تک نہ جانے کن خاص ذرائع سے یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ میں نے نظر بندی کے دوران عمر خیام کی فارسی رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ ایک روز انھوں نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری آر۔سی۔ رینہ کے ہاتھ مجھے فوری طور پر ملنے کا پیغام بھیجا۔ اس ملاقات میں بخشی صاحب نے میری اس کاوش پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا کیونکہ امریکی صحافی روزن تھآل کے بقول جہاں شیخ عبداللہ اقبال کو چاہتے تھے وہاں بخشی غلام محمد کا پسندیدہ شاعر عمر خیآم تھا۔

بخشی صاحب نے پانچ سو روپے مجھے دیئے اور کہا کہ یہ ترجمہ فوراً کتابی صورت میں شائع ہونا چاہئے۔ جب اس کتاب کی پانچ سو کاپیاں شائع ہوئیں تو پانچ سو روپے میں سے ڈیڑھ سو روپے بچ گئے تھے۔ میں یہاں پر بخشی غلام محمد کی اس ادائے دلبری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا:

وہی قتل بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا

اس کے ساتھ ہی بخشی صاحب نے مجھے کلچرل اکادمی میں ملازمت بھی دلوائی جہاں اختر محی الدین اور امین کامل پہلے سے ہی ملازم تھے۔ میں چار سال تک مرزا کمال الدین شیدا، صاحبزادہ حسن شاہ، علی جواد زیدی اور پروفیسر جیالال کول کی ماتحتی میں اکیڈیمی کے شعبۂ مطبوعات کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور ان احباب کی شفقت اور دوستی سے قدم قدم پر فیض یاب ہوتا رہا۔ اکادمی میں، میں نے اپنا سارا وقت کشمیری زبان اور ادب کی تحقیق و تدوین میں صرف کیا جس کا ماحصل محمود گامی، لکشمن کول بلبل اور اکہ نندُن پر میری تحقیقی مطبوعات کی شکل میں نمودار ہوا۔ اکادمی کے لیے میں نے سمترانندن پنت کی ہندی نظموں کے ترجمہ کی بھی شیرازہ بندی اور ''سون ادب'' (کشمیری) کی ترتیب کے علاوہ اوتار کشن رہبر کی معیت میں کشمیری زبان کی تاریخ کو بھی مرتب کر کے شائع کروایا۔ اس دوران ''لولک پرتو'' کے بعد میری کشمیری غزلوں اور نظموں کا ایک اور مجموعہ ''پراگاش'' (نورِ سحر) کے نام سے منظر عام پر آ چکا تھا۔ یہاں میری ماہانہ تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی۔ اکادمی کی ملازمت بھی مجھے راس نہ آئی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ میرے قاری کی کیا

دلچسپی ہو سکتی ہے؟

لیکن میں اس لمبی داستان کو یہاں ایک مختصر واقعے کی شکل میں بیان کرتا ہوں تا کہ حقائق کی روشنی میں کل کوئی اس کا حلیہ بگاڑنے کی حرکت نہ کر سکے۔

اپریل 1964ء میں شیخ محمد عبداللہ کو پھر ایک بار قید سے رہا کیا گیا۔ سری نگر آنے کے بعد وہ دہلی چلے گئے تا کہ جواہر لال نہرو کے ساتھ مسلۂ کشمیر پر کوئی ٹھوس بات کی جاسکے۔ نہرو نے انھیں پاکستان جا کر وہاں صدر ایوب خان سے ملنے کو کہا تا کہ اس معاملے پر صدر پاکستان کی رائے سے بھی آگاہی ہو سکے۔ شیخ صاحب ایک وفد کی صورت میں اسلام آباد چلے گئے جس میں مولانا محمد سعید مسعودی، مرزا افضل بیگ، مبارک شاہ نقش بندی اور فاروق عبداللہ کو بھی شامل کیا گیا۔ پاکستان میں شیخ صاحب کا والہانہ استقبال ہوا اور صدر ایوب سے ان کی طویل ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد شیخ صاحب مظفر آباد گئے جہاں وہ ایک عوامی جلسے سے خطاب کر رہے تھے کہ انھیں دہلی سے نہرو کے انتقال کی خبر مل گئی۔ وہ ناکام و نامراد واپس دہلی لوٹ آئے۔

دہلی میں شیخ عبداللہ کے قیام کے دوران یہاں سرینگر میں چند ادیبوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی اس نازک مرحلے پر الجھے ہوئے مسلہ کشمیر کے ممکنہ حل کی خاطر ان دونوں رہنماؤں سے انسانی بنیادوں پر تحریری طور پر ایک اپیل کریں گے۔

سری نگر کے وسطی علاقے وازہ پورہ میں رحمٰن راہی کے گھر پر ایک خفیہ میٹنگ بلائی گئی جس میں راہیؔ کے علاوہ امین کاملؔ، اخترؔ محی الدین، غلام نبی فراقؔ اور میں نے شمولیت کی۔ میٹنگ میں اتفاق رائے سے طے پایا کہ ایک اپیل کشمیری زبان میں ہندوستان کے اہالیانِ علم و دانش کے نام لکھی جائے جس میں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے نہرو اور شیخ عبداللہ سے گزارش کی جائے کہ وہ مسئلہ کشمیر کی طرف بھر پور توجہ دے کر اس کے مستقل حل کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہوں۔ اپیل کشمیری زبان میں لکھی گئی۔ یہاں یہ مسئلہ در پیش آیا کہ اپیل کس کی طرف سے پیش کی جائے۔ راہیؔ، اخترؔ، کاملؔ اور فراقؔ نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ سبھی سرکاری ملازم ہیں لہٰذا ان کے نام ظاہر ہونے سے ان کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں ان سبھی میں کم عمر اور ایک پُر جوش جوان تھا۔ اگر چہ میں بھی اُس وقت کلچرل اکیڈیمی میں

ملازمت کرتا تھا لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے اس کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ اس اپیل کو ملک گیر سطح پر تشہیر دینے کی خاطر اسے انگریزی میں بھی منتقل کیا گیا۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر محمد سلطان وانٹ۔ نے کیا جو اُن دنوں کشمیر یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے سربراہ تھے۔

اس طرح ہم نے اس کے نیچے فرضی شناخت کی غرض سے ''غلام نبی خیال، جنرل سیکریٹری کشمیری رائٹرس آرگنائزیشن'' نام کی کاغذی تنظیم کا نام درج کیا۔

میں نے اگلے ہی دن اپیل کی ایک کاپی شیخ صاحب کے نام ڈاک سے روانہ کی جب وہ دہلی کے کوٹلہ لین کے ایک بنگلے میں ''نظر بند'' تھے۔ شامتِ اعمال سے انھوں نے اس مراسلے کا جواب مجھے کلچرل اکیڈیمی کے پتے پر بھیجا جہاں میں ان دنوں ملازم تھا۔ چند روز بعد اکاڈیمی کے سیکریٹری جیالال کول نے جب اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے اس خط کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تو مجھے پتہ چلا کہ یہ خط پہلے ہی سرکار کے ہاتھ لگا ہے۔ کول جاننا چاہتا تھا کہ اس حرکت میں اور کون میرے ساتھ تھا۔ میں نے صاف لفظوں میں کہا کہ یہ کام میں نے اکیلے کیا ہے۔ وہ مطمئن نہیں ہوا کیونکہ ان کے بقول وزیر داخلہ ڈی، پی، در نے اسے یہ تفتیش کرنے کو کہا تھا۔ اکیڈیمی میں میری ملازمت مستقل نہیں تھی لہٰذا کول نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے آسانی سے برخاست کر سکتا ہے۔ میں نے کہا آپ یہ تکلیف نہ کریں میں خود ہی مستعفی ہو جاوٗں گا اور اس طرح اکیڈیمی میں بھی میری نوکری تمت بالخیر ہوئی۔

1964ء میں محاذ رائے شماری کا ترجمان اردو ہفت روزہ ''محاذ'' جاری کیا گیا اور اس کی مجلس ادارت کے چار ارکان یعنی شیخ محمد عبداللہ، مرزا افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی اور غلام رسول کوچک میں سے مسعودی صاحب اور کوچک صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی ادارت سنبھالوں جسے میں نے سرکاری عتاب اور حکومتی سطح پر سیاسی انتقام گیری کے امکانات سے بے پروا ہو کر قبول کیا۔ کوچک صاحب نے خود ہی میرے لیے پونے چار سو روپے کی تنخواہ مقرر کر لی۔

محاذ بھی صرف ایک سال تک زندہ رہنے کے بعد دم توڑ بیٹھا کیونکہ حکومتِ وقت نے سری نگر سے شائع ہونے والے ایک درجن اخباروں کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت پر بھی پابندی عائد کر دی۔ اگرچہ مجھے اور میرے دیگر پانچ ساتھیوں کو محاذ کی ادارت اور ملازمت سے پہلے ہی الگ کر دیا گیا تھا

کیونکہ بقول مرزا افضل بیگ ''اس اخبار نے دس بارہ ہزار روپے کا خسارہ اٹھایا تھا اور وہ مالی لحاظ سے اس حالت میں نہیں تھے کہ اخبار میں کام کرنے والے درجن بھر اشخاص کو مستقل طور پر رکھ سکتے۔'' اس وقت شیخ عبداللہ اور محمد افضل بیگ کے ذہنوں میں ذرہ بھر کے لئے بھی یہ احساس نہیں جاگ سکا کہ میں انہی کے سیاسی رفیقوں کے کہنے پر اور ناموافق صورتِ حال میں اس اخبار کا ایڈیٹر بننے پر آمادہ ہوا تھا۔ اس طرح ریڈیو، اکیڈیمی اور محاذ کے بعد تین سلسلوں کو محیط میری لولی لنگڑی ملازمت کا تمت بالخیر ہوا اور میں نے اس کے بعد کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری نوکری سے دور رہنے کی قسم کھائی۔

1965ء میں، میں نے کشمیری زبان کا پہلا اخبار ہفت روزہ ''وطن'' کے نام سے شروع کیا جس کا ایک سو صفحات پر مشتمل ''امن نمبر'' آج بھی کشمیری صحافت میں ایک یادگار اور لاثانی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خاص نمبر ستمبر 1965ء کی ہندو پاک جنگ کے ساتھ ہی شائع کیا ہوا اور اس کے لیے عالمی شہرت یافتہ ممتاز فلسفہ دان برٹرینڈ رسل نے مجھے خصوصی طور پر اپنا وہ پیغام لندن سے ارسال کیا جس میں انھوں نے کشمیری عوام کی جدوجہد کی تائید کی تھی۔ اس سے قبل اگرچہ مہجور نے 1940ء میں ''گاش'' نامی ایک دوورقی کشمیری اخبار کا آغاز کیا تھا لیکن اس کے صرف تین شمارے ہی شائع ہو سکے لہٰذا اسے اس زبان کے باقاعدہ اخباروں میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ''وطن''، کشمیری ادیبوں اور قلم کاروں کی بے حسی اور نام نہاد محبتوں کی مہربانی سے 1968ء میں دم توڑ گیا۔

میرا اردو روزنامہ ''اقبال'' بھی 1968ء سے لے کر 1977ء تک سری نگر سے شائع ہوتا رہا لیکن اس دوران انگریزی صحافت کی طرف رجوع کرنے کی بنا پر یہ اخبار بھی بعد میں بند ہوا۔

دیگر صحافتی اداروں کے لیے کام جاری رکھنے کا سلسلہ ترک کئے جانے کے بعد میں نے مئی 2003ء میں انگریزی ہفت روزہ اخبار Voice of Kashmir جاری کیا جو اب تک ہر شکروار کو باقاعدگی سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

1972ء میں 512 صفحات پر مشتمل میری ضخیم کشمیری کتاب ''گاشری منار'' (روشنی کے مینار) منظر عام پر آگئی جسے 1974ء میں جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے بہترین کتاب کی حیثیت سے

پہلا انعام دیا اور 1975ء میں اس تصنیف کو ساہتیہ اکادمی نے گزشتہ تین سال کے دوران شائع شد
بہترین کشمیری کتاب قرار دے کر اعزاز سے نوازا۔ ''گاشری منار'' میری عرق ریزی اور تحقیق و تلاش
نتیجہ ہے جس میں دنیا بھر کے گیارہ منتخب شاعروں پر سوانحی اور تجزیاتی مقالات درج ہیں۔ ان عظیم سخ
وروں میں ہومرؔ (یونانی)، ورجلؔ (لاطینی)، کالی داسؔ (سنسکرت)، ڈانتےؔ (اطالوی)، امرا القیسؔ
(عربی)، حافظؔ شیرازی (فارسی)، گوئٹےؔ (جرمن)، پشکنؔ (روسی)، شیکسپیرؔ (انگریزی)، ٹیگورؔ (بنگالی
اور اقبالؔ (اردو) شامل ہیں۔ کتاب کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ کشمیری پڑھنے والوں کے ذہن و شعور
دنیائے ادب کے ان نورانی میناروں کی روشنی سے منور کیا جاسکے۔ عالمی شہرت یافتہ گیارہ شاعروں سے
متعلق یہ کتاب مکمل کرنے میں مجھے پورے گیارہ سال لگے۔

اس وقت تک میری کشمیری، اردو اور انگریزی تصانیف کی تعداد بتیس تک پہنچی ہے۔

میری نظروں میں انسانی زندگی صبحِ بہار کی ایک ایسی مشک بار سرخوشی ہے جو سدا لہراتی اور گرد
پیش کو اپنی ابدیت کے روح پرور اثر سے شاداں اور خنداں رکھتی ہے۔ زندگی جاودانی ہے، اس کے
برعکس موت ایک بن برسات کی بجلی ہے جو کڑکتی تو ہے لیکن برستی نہیں۔ اس کی آمد کا کوئی اشارہ نہیں ملتا
اگر آئے بھی تو اس کے بعد اس کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتیں۔ موت کا تصور محض ایک وہم کے سوا او
کچھ نہیں۔ اس کے برعکس زندگی امر ہے اور حیات لازوال ہے۔

اپنی عمر کے اس آخری پڑاؤ پر میں اپنے بارے میں یہی کچھ کہہ سکتا ہوں:

رومیں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

......●●......

غلام نبی خیالؔ

شخصیت کے بعض اہم پہلو

•......پران کشور

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا

غلام نبی خیالؔ کا خیال آتے ہی میری زندگی ایک دم آج سے کوئی ساٹھ سال پہلے کے کشمیر میں لوٹ جاتی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب یہاں کے ادیب اور فنون لطیفہ کے دیگر کلا کار ثقافتی احیائے نو میں لگے تھے اور ترقی پسند تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ اسی متحرک ماحول میں بیس اکیس سال کا نوجوان غلام نبی، جو خیالؔ تخلص کرتا تھا اپنی نظموں اور غزلوں کی ایک چھوٹی کتاب ''لولک پرتَو'' لے کر منظر عام پر وارد ہوا۔ خیالؔ ہم میں سے بیشتر ساتھیوں میں سب سے قد آور، گورا اور خوب رو تھا۔ یہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کی محفلوں میں بے جھجک شامل ہونے لگا۔ 60-1959 کا زمانہ تھا۔ شاعر بننے اور اپنا کلام شائع کرنے کے شوق نے غلام نبی خیالؔ کو دینا ناتھ نادمؔ، امین کاملؔ، مرزا عارفؔ بیگ، رحمان راہیؔ، غلام نبی فراقؔ جیسے کہنہ مشق شاعروں کی صف میں کھڑا ہونے کی ہمت دی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اس نوجوان میں ایک ایسی خود اعتمادی ہے جو اُس وقت کے نوجوانوں میں بہت کم ملتی تھی۔ عمر میں دہائیوں کا فرق ہونے کے باوجود خیالؔ بہت جلد ہم سب میں گھل مل گیا اور اُس کارواں میں شامل ہوا۔

اسی دوران ریڈیو کشمیر میں نئے نیوز ریڈر تلاش کرنے کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں اور خیالؔ نے بھی قسمت آزمائی کے لئے آڈیشن دیا اور کسی سفارش کے بغیر آڈیشن پاس کیا۔ آواز اور لفظوں کی صحیح ادائیگی اور اچھے تلفظ کی وجہ سے غلام نبی خیالؔ نے جلد ہی مقبولیت بھی حاصل کی۔ یہ اُسی خود

اعتمادی کا نمونہ تھا جس کی رمق ہم نے پہلے ہی دیکھی تھی۔ خبریں پڑھنے اور اُن کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ خیالؔ ریڈیو کے دوسرے پروگراموں میں حصہ لینے لگا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اُس نے اُن دنوں کچھ غنایئے بھی لکھے تھے جنہیں براڈ کاسٹ بھی کیا گیا تھا۔

خیالات کی ہم آہنگی کی وجہ سے علی محمد لون اور میرے ساتھ جلد ہی شیر وشکر ہو گئے۔ اُن دنوں کشمیر میں ایک سیاسی بحران آ گیا تھا۔ یہ بحران نیشنل کانفرنس کے لیڈروں میں مسائل کو سلجھنے کے طور طریقوں میں اختلافات کی وجہ سے رونما ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے نیشنل کانفرنس دو حصوں میں بٹ گئی تھی ۔ایک گروپ کے سربراہ بخشی غلام محمد تھے اور دوسرے گروپ کی قیادت خواجہ غلام محمد صادق کر رہے تھے جن کے ساتھ اُن کے ہم خیال سیّد میر قاسم، ڈی پی در، گردھاری لال ڈوگرہ، غلام رسول رینزو نیشنل کانفرنس تیاگ آئے اور اُنہوں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے نام سے ایک الگ سیاسی پارٹی قائم کی تھی۔ یہ گروپ ترقی پسند تحریک کا علمبردار تھا اس لئے اُن ادیبوں اور فنکاروں کا رجحان اس گروپ کی طرف ہو جانا ایک لازمی بات تھی جو ترقی پسند تحریک کے پیرو کار تھے۔ چنانچہ اس عتاب کے شکار سب سے پہلے علی محمد لون، غلام نبی خیال اور خاکسار ہوئے۔ علی محمد لون کو دلی ٹرانسفر کرایا گیا اور مجھے جالندھر، غلام نبی خیالؔ چونکہ ابھی غیر مستقل تھے اس لئے اُنہیں نوکری سے برطرف کرنا بہت ہی آسان تھا۔ غلام نبی خیالؔ کو نہ صرف ملازمت سے نکالا گیا بلکہ من گھڑت الزام لگا کر اُنہیں قید کر کے سینٹرل جیل بھیجا گیا۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ عتابوں کا سلسلہ صرف ہم پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ دوسری کھیپ میں بشیر بھٹ، میر غلام رسول نازکی، غلام رسول قادری کو بھی دیش بدر کیا گیا۔ لیکن اس طرح ایک دوسرے سے بچھڑ جانے اور بکھر جانے کے باوجود ہماری دوستی میں کسی طرح کا بال نہیں آیا۔ لون صاحب نہیں رہے، نہ ہی بشیر بھٹ، نازکی صاحب اور قادری صاحب بھی چلے گئے۔ حالات نے مجھے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ جو خواب ہم نے ایک وقت کشمیر کے مستقل کے بارے میں دیکھے تھے وہ بھی ٹوٹ گئے۔ اس کے باوجود زندگی ایک اُمید پر قائم رہی، چاہے جس حال میں ہو۔ یار زندہ صحبت باقی۔ کئی گلے شکوے ہونے کے باوجود ہمارا رشتہ قائم ودائم رہا۔ یہی دوستی میری جمع پونجی ہے۔ اسی کی

وجہ سے میں اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ اپنا رابطہ قائم رکھے ہوئے ہوں۔اسی وجہ سے جب بھ
خیالؔ صاحب سے ملنا ہوتا ہے، جہاں بھی ملنا ہوتا ہے چاہیئے سری نگر میں یا ساہتیہ اکادمی کی مہربانی ۓ
دلی میں، وہی محبت، وہی والہانہ پن اُبھر آتا ہے اور دل بھر آتا ہے۔

گو ملاقاتیں کافی طویل وقفے کے بعد ہوتی ہیں لیکن ہوتی تو ہیں۔ ایک رشتہ جو خیالؔ صاحب نے باقاعدگی کے ساتھ برقرار رکھا وہ یہ کہ وہ مجھے Voice of Kashmir کے پرچے بھیجتے رہتے ہیں۔اُن پر اپنی رائے ظاہر کرنے کا یہ موقع ہے اور نہ محل۔ خیالوں میں اختلاف کے باوجود میں کشمیر کے ثقافتی نشاۃِ ثانیہ میں اُن کے اہم مقام کو سلام کرتا ہوں۔ سیاست شعبدہ بازی ہے۔ شطرنج کا ایسا کھیل جسکی بساط پر مصلحتوں کی بناپر بدلتے رہتے ہیں لیکن ادیب اور ادب ہی ابدیت حاصل کرتے ہیں باقی بڑے بڑے شعبدہ باز آئے اور وقت کی گرد میں کھو گئے۔

خیالؔ صاحب کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ وہ شاعر ہیں، ادیب ہیں، محقق ہیں، نقاد ہیں، صحافی ہیں، تاریخ دان ہیں۔اُن کے کس کس معرکے کا ذکر کروں۔ اُن سب معرکوں کا مشترکہ احاطہ دولفظوں میں کرتا ہوں۔ خیال ایک اہم شاعر ہے اور کشمیر کے اہم شاعروں کی صفِ اوّل میں بہت پہلے ہی اپنا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری زبان اُن کی ہمیشہ ممنون رہے گی، ورلڈ کلاسیکس کے کشمیری ترجموں کی وجہ سے۔ ان ترجموں کو پڑھ کر اُن کے اصل ہونے کا احساس ہوتا ہے جو ترجموں کی سب سے بڑی صفت ہے۔ چاہے عمر خیامؔ کی رباعیات ہوں، چاہے دس عظیم مفکروں کے بارے میں ان کی کتاب ''کاشرِ منار'' ہو جس میں ہومر، کالیداس، امروٗالقیس، حافظ شیرازی، گوئیٹے، اقبال جیسی شخصیتوں سے متعارف کرایا ہے۔ جسے بجا طور پر اکادمی کی طرف سے Best Book ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی سے نوازا گیا۔ ٹینڈل بسکو کی کتاب Kashmir in Sunlight and Shade یا لارنس صاحب کی مشہور کتاب TheValley of Kashmir کا ترجمہ بھی ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔

2012ء کے موسمِ گرما کے اُس دن کا ذکر کرنا کہ ضروری سمجھتا ہوں جسے خیالؔ صاحب نے اپنے اخبار میں اس سرخی کے ساتھ شائع کر کے یادگار بنایا تھا۔ ''پران کشور نے اپنے دوستوں کو اپنے راج باغ کے گھر میں ''زگ بتہ تہ کاشر گاڈ'' کی دعوت دے کر پرانی روایتوں کو برقرار رکھا۔ یہ وہ سال تھا

جب میری شریک حیات شانتا جی زندہ تھی۔ یہ کشمیر آنے کا اُن کا آخری سال تھا۔ اُس یادگار لنچ میں خیاؔل صاحب کے علاوہ جناب محمد یوسف ٹینگ، امین کاملؔ، رفیق رازؔ بھی شامل ہوئے تھے۔ اُس یادگار دن کی تصویر بھی اُنہوں نے اپنے اخبار میں چھاپی تھی اور وہ اس کا تذکرہ بار بار کرتے رہتے ہیں۔ محفل ختم ہونے کے بعد سبھی اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے تو شانتا جی نے ایک ہوک بھر کے کہا کاش ایسے دن پھر واپس آئیں۔ لیکن یہی تمنا لے کر وہ اُسی سال ہاڑ مانس کی یہ کایا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں اور میرے جیسے غریب الوطن ابھی اسی اُمید پر زندگی کی ناؤ کھے رہے ہیں کاش یہ اندھیرا چھٹ جائے۔ آخر پر غلام نبی خیاؔل کی رفاقت کے نام یہ شعر۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا

بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

............●●● ....

جموں، کشمیر اور لداخ سے متعلق اہم معلومات کا نادر خزانہ

(11 جلدوں پر مشتمل)

شیرازہ اُردو

''جموں۔ کشمیر۔ لداخ نمبر''

''قدیم تذکروں اور سفرناموں کے آئینہ میں''

کتاب گھر، لال منڈی سرینگر پر دستیاب ہے۔

......●......

● ...... محمد یوسف ٹینگ

غلام نبی خیالؔ: مردِ ادب عیال

کشمیری ادیبوں کا کسی خاص صِنف کی دیوار بندی کے اندر محدود رہنا شاذ و نادر ہے۔ ایک ہی ادیب اچھا شاعر، نثر نگار، محقق، ناقد بلکہ افسانہ نگار بن کر سارے عرصۂ فن میں چھلانگیں مار سکتا ہے۔ لیکن ہمارے قد آور غلام نبی خیالؔ میں جتنی اصناف اور اوصاف کا سنگم ہو گیا ہے، وہ کشمیر میں بھی کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہے۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، ایک ڈرامہ نگار، ایک صحافی، ایک نامہ نگار اور ایک ترجمہ کار اور اِن کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اُن کا قلم جن زبانوں کے معدن سے کان کنی کرنے پر قادر اور ماہر ہے، اُن میں کشمیری، اُردو، انگریزی اور فارسی جیسے الگ الگ کنبوں کی زبانیں شامل ہیں۔ اُنھوں نے ادبی صحافت میں کشمیری کے پہلے ترقی پسند ادب کے اعلانچی رسالے ''کونگہ پوش'' سے وابستہ ہونے کا بھی شرف حاصل کیا ہے اور اس کے علاوہ اپنا کشمیری ہفتہ وار ''وطن'' جاری کرنے کا امتیاز بھی پایا ہے۔ اُردو میں وہ کافی دیر تک 'اِقبال' نامی اخبار نکالتے رہے اور وہ اِس وقت بھی اپنا انگریزی ہفت روزہ The Voice of Kashmir برسوں سے شائع کر رہے ہیں جو صِرف منتخب خبریں ہی شائع نہیں کرتا بلکہ جو اعلیٰ ادبی تحریروں کا بڑا خزانہ لے کر قاری کے پاس پہنچتا ہے۔ اس میں منتخبہ ادبی جواہر پاروں کا حصہ بھی ہوتا ہے۔ اِنٹرویو اور کالم بھی ہوتے ہیں۔ بڑی اچھی کتابوں پر تبصرے اور مختلف زبانوں کے شہ پاروں کے تراجم بھی چھپتے رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کے شاید سب سے اچھے اُردو اخبار

''نوائے وقت'' لاہور کے نامہ نگار بھی رہ چکے ہیں اور اس تعلق سے پاکستان کے کئی دورے کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے وہاں بسیار ادبی مشاہیر کے ساتھ روابط بھی قائم کیئے اور کئی ادبی محفلوں کے خاص مہمان بھی بنے۔ وہ دُنیا کی ایک بہت بڑی اور اہم نشر گاہ Voice of America کے بھی ترجمان رہ چکے ہیں۔ اُن کا ''رُباعیاتِ عُمر خیاؔم'' کا کشمیری ترجمہ شاید اس شاہکار کے سب سے عمدہ ترجموں میں شُمار کیا جا سکتا ہے۔ اِن رُباعیات کو اگرچہ کشمیری کے کچھ اور شاعروں نے بھی کشمیری پوشاک میں پیش کرنے کی سعی کی ہے لیکن خیال صاحب کے ترجمے کی چمک دمک اِس قدر تیز ہے کہ اُس کے سامنے یہ ترجمے اِتنے مدھم پڑ گئے ہیں کہ اب اُن کے مترجمین کا نام یاد کرنا بھی ایک کارے دارد جیسا معاملہ بن گیا ہے۔ خیاؔل صاحب کا جسمانی قد بہت اونچا ہے اور شاید اِس وقت کے کشمیری ادیبوں میں سب سے بڑا۔ لیکن اپنی زود نویسی اور کثرتِ تصانیف کے لحاظ سے بھی اُن کا قد بہت دراز ہے۔ وہ بلاشبہ اِس وقت کشمیر میں سب سے کثیر التصانیف صاحبِ قلم ہیں۔ اُن کو کشمیر، بیرون کشمیر اور بیرون ملک اِتنے اعزازات وانعامات سے نوازا گیا ہے کہ وہ کشمیر میں ادب اور صحافت میں اپنے جسمانی قد کی طرح سرفراز اور بلند قامت بنے رہیں گے۔

خیاؔل صاحب اور راقم آج سے کوئی چونسٹھ پینسٹھ سال پہلے ریڈیو کشمیر سری نگر میں شعبہ خبر میں ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ میں دور شوپیان کے دیہاتی علاقے سے آیا ہو نو وارِد تھا اور خیاؔل صاحب شہر خاص سے آئے ہوئے نکھرے اور منجھے ہوئے شہر باش تھے۔ اُس وقت شعبہ خبر کے سربراہ حبیب اللہ علاقہ بند صاحب تھے۔ موصوف فضلِ الٰہی سے اپنی عمر کا سینکڑہ پورا کرنے کے بعد گزار رہے ہیں۔ اللہ کرے قیدِ عمر اور زیادہ۔ خیاؔل صاحب اور میرا کام اُن دِنوں اردو بلیٹن کا کشمیری ترجمہ کرنے کا تھا اور کبھی کبھی پولو گراؤنڈ کے واحد سٹوڈیو سے اِن کو آواز بھی دینا ہوتا تھا۔ خیال صاحب بھی اِسی شعبے سے وابستہ تھے اور مجھ سے پہلے وہاں براجمان ہو چکے تھے۔ اُن کا اِس شعبے کے علاوہ سارے ریڈیو میں دبدبہ تھا۔ جبکہ مجھ غریب کو آئے دِن علاقہ بند صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سہنا پڑتی تھی۔ علاقہ بند صاحب کبھی مسکراتے نہیں تھے بلکہ اُن کی تیوری پر ہمیشہ تیوریاں در زندان کی سلاخوں کی طرح اپنا دم خم جمائے رہتی تھیں۔ اِس حد تک کہ اُن کے نائب جگن ناتھ ولی صاحب بھی اُن سے ملنے سے کتراتے تھے۔

یہ وہی ولی صاحب ہیں جنہوں نے حبہ خاتون کی زندگی پر ایک بڑا ناول لکھا ہے۔ جب میں علاقہ بند صاحب کے کمرے سے روہانسا ہو کے نِکلتا تھا تو یہی ولی صاحب مجھے دلاسا دیتے اور چمکارتے رہتے تھے۔ خیال صاحب کے ساتھ علاقہ بند صاحب بہت مہربان تو نہیں تھے لیکن اُن کے قد و قامت اور رفتار و گفتار سے متاثر ہو کر اُنہیں ڈانٹنے سے گریز کرتے تھے۔ اُن دِنوں ہمارے شعبے میں ایک نقل نویس مصطفیٰ صاحب ہوا کرتے تھے۔ مصطفیٰ صاحب خیال صاحب کے شیفتہ اور فریفتہ تھے۔ لیکن خود خیاؔل صاحب مجھ سے ناراض نہ سہی مگر نظر انداز کرنے پر مائل رہتے تھے۔ مصطفیٰ صاحب، خیاؔل صاحب کو ''خی یال''، یعنی Khiyal صاحب کہہ کر پُکارتے تھے لیکن خیاؔل نے کبھی اُن کے اِس تلفظ کا بُرا نہیں مانا۔ اوّل الذکر خیال صاحب کے اتنے وارفتہ تھے کہ جب خیاؔل اُن کے ساتھ کینٹین میں چائے پینے پر تیار ہوتے تو بچارے مصطفیٰ صاحب کی باچھیں کھلتی تھیں۔ وہ بچارے میری طرح ایک معمولی نقل نویس تھے اور ظاہر ہے کہ تنگدست بھی، لیکن خیال صاحب کو رجھانے میں اُس کی یہ کوتاہ دستی ہرگز آڑے نہ آتی۔ وہ کبھی کبھی اپنے گھر سے بھی خیاؔل صاحب کے لئے کوئی مزیدار لوزیات لانے میں بھی پیچھے نہیں رہتے۔ ایک بار میں اور خیاؔل ایک ہی کمرے میں میز کے دو اطراف بیٹھے ہوئے قلم کشی میں مصروف تھے۔ اُن دِنوں ریڈیو کشمیر سے ایک بڑی میٹھی دُھن کا نغمہ بجتا تھا:

کلہٕ وألکی مس بوٗر پیالن
گاہ پیو سنگر مالن

لگتا ہے کہ گیت مہجوؔر صاحب کے نغمے سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا جیسا کہ اِس کی لفظیات سے ہی ظاہر ہے۔

گٹہ ژٕج ،گاش آو ، گاوٕ تژ وو لالن
سنگر مالن پیو پراگاش

مجھ کو اِس کے لکھنے والے شاعر کا نام معلوم نہیں تھا۔ لیکن اِس کی مدُّھر تان کی وجہ سے یہ مجھے از بر ہو گیا تھا۔ اُس دِن ہمارے کوتوال نما نیوز ایڈیٹر کسی وجہ سے دفتر نہیں آئے تھے اور دفتر میں ایک ہلکے پھلکے احساس کے جھونکے چل رہے تھے۔ میں نے بچپن کے بھولے پن میں اس گیت کو ذرا اونچی لے

میں گنگنانا شروع کیا۔ کسی بات کے لئے مجھے خیالؔ صاحب سے پوچھنے کی ضرورت ہوئی تو مجھے نظر آیا کہ اُن کے لال زُلال چہرے پر مسکراہٹ کی چاندنی دمک رہی ہے۔ جب میں نے اپنے سوال کا اُن سے جواب جاننا چاہا تو خیالؔ صاحب نے خلافِ معمول نرمی اور نفاست سے جواب دیا۔ میں نے اِسے محض ایک اتفاق سمجھا مگر جب مجھے اصل بات معلوم ہوئی کہ یہ گیت اُنہی کا لکھا ہوا ہے تو مجھے اِس مسکراہٹ کی اصل وجہ سمجھ میں آئی۔ شاعر ہمیشہ اپنی تخلیق کی مقبولیت سے نہال ہوتا ہے اور اِسے اپنے بیان کا اصل معاوضہ اور مدعا سمجھتا ہے لیکن اُن کی مہربانی دوسرے روز تک سوکھ گئی تھی اور نرخِ شالی بہ اصل خویش پر تھم گیا تھا۔ اُدھر میری نوکری چھ مہینے کے کنٹریکٹ کی تھی۔ اِس کا پتہ میرے قصبے شوپیاں کے اس وقت کے ممبر اسمبلی کو لگ گیا تھا جو میرے والد مرحوم سے کسی بات پر ناراض تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے کنٹریکٹ کی توسیع کے لئے کوئی جتن کرتا۔ ممبر موصوف نے ریڈیو کے افسروں سے مل کر میرا پتہ کٹوا دیا۔ نہ رہا بانس نہ بجی بانسری۔

اُس کے بعد طویل عرصے تک میں خیال صاحب سے رو بہ رو نہیں ہو سکا کہ اُنہیں کبھی قید کیا گیا اور کبھی کسی دوسری سبیل سے عوام سے دور۔ اِدھر میں بھی کسی دفتر میں اپنے سینگ سمانے کی بھاگم دوڑ میں رہا۔ کبھی کسی اخبار کی عارضی نوکری کبھی کسی حاکم کا ہرکارہ۔ لیکن ہوتے ہوتے جب جنوری 1962ء میں مجھے کلچرل اکیڈیمی میں تعینات کیا گیا تو وہاں جا کر دیکھا کہ خیالؔ صاحب یہاں مجھ سے پہلے ہی تشریف فرما ہیں۔ وہاں بھی وہ مجھ سے کھچے کھچے رہے لیکن اُنہوں نے وہاں اپنی تصنیفات اور تالیفات کا سلسلہ جاری رکھا اور سام نامہ وغیرہ شائع کروائیے۔ اُن دِنوں کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ پاکستان چلے گئے روسأ اور اُمرأ کے گھروں سے، جن میں آخری ڈوگری مہاراجہ ہری سنگھ کے مصاحبِ خاص عبدالرحمان آفندی صاحب، جن کی گپکار روڑ پر واقع عالی شان کوٹھی، بعد میں پنڈت درگا پرشاد در صاحب جیسے ذی وقار وزیر کو الاٹ کی گئی۔ اُن کی کتابیں رسالے وغیرہ اکادمی کے پاس محفوظ رکھنے کے لئے لائی گئیں اور یہ بڑا کام کرنے میں خیالؔ صاحب جیسے محنتی اور جفاکش ادیب ہی فائز کئے گئے۔ یہ اب بھی اکادمی میں موجود ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اُنہیں پھر زندان کا بُلاوا آ گیا اور میں اُن کو رام کرنے کی آرزو لے کر سٹپٹاتا رہ گیا۔

خیالؔ صاحب کو میرے نام سے کس قدر چڑ ہے اُس کا کچھ اندازہ کروانے کے لئے میں ا
ایک چھوٹی سی مثال پیش کروں گا۔ اپنی ایک تازہ تصنیف ''جہانِ خیالؔ'' میں وہ اکادمی کی طرف
شائع شدہ میری تالیف ''کلیات مہجور'' کے حوالے سے وہ میرا ذکر یوں فرماتے ہیں۔

''کلیات مہجور'' کے مرتب کے بقول..........''

اور پھر حاشیے میں یوں رقم طراز ہیں ''کلچرل اکادمی۔ کلیاتِ مہجور ص۔266۔447
چونکہ یہ کلیات میرا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اس لئے میرا نام لینے سے اس قدر گریز ہے۔ حالان
باقی کتابوں کے ترتیب کاروں کا ذکر کرنے سے اُن کا قلم کسی پہاڑی نالے کی طرح رواں رہتا ہے۔
اُس بات کی یاد دلاتا ہے جس طرح ذرا پہلے زمانے میں کشمیر میں نوبیاہتا دُلہن اپنے دُلہا کا نام لینے میں تکلف
کرتی تھی''..........قربان جاؤں اِس دِلکش ادا کے (حوالے کے لئے ملاحظہ ہو۔ ''جہانِ خیالؔ'' صفحات
(82/73)۔

خیالؔ صاحب کے مطالعے اور اُن کی تحریر کی نوعیت مقامی بھی ہے اور آفاقی بھی اور وہ ہر صورت
نبھانے کی سکت اور سلیقہ رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے جہاں کشمیری شاعروں اور ادیبوں پر خوب لکھا ہے، وہاں
عالمی مرتبے اور شہرت کے ادیبوں اور دوسرے مشاہیر کو دل کھول کے دادِ سخن دی ہے اور میرے کوتاہ علم کے
مطابق ایسا کسی اور کشمیری سُخن ور نے کم ہی کیا ہے۔ صرف چند ایسے عظیم مشاہیر کے نام، ورجل، یوری پیڈیز
ہومر، دانتے، کلہن، بلہن، پُشکن، کالی داس، فردوسی، ٹالسٹائی، گوئٹے، شیکسپیئر، ابھنو گپت، سوم دیو
آنندوردھن، حافظ شیرازی، سعادت حسن منٹو، مرزا غالب، علامہ اقبال، مہجور، فاضل کشمیری، مولوی رومی
امین کامل، رحمٰن راہی، اختر محی الدین، غلام نبی فراق وغیرہ۔ خیالؔ صاحب کے کارناموں میں یہ بات بھی
شامل ہے کہ اُنہوں نے کشمیر شناس اور مسلم دوست انگریز محسن سر والٹر لارنس کی لمبی چوڑی کتاب دی ویلی
آف کشمیر، کا ایسا اُردو ترجمہ کیا ہے کہ اِسے ملک میں اُردو کے سب سے بڑے سرکاری ادارے NCPUL
نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کو کشمیر کی تاریخ سے زیادہ اس کی سماجی اور تہذیبی طرح داری
پیش کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس کو خیالؔ صاحب سے پہلے کچھ اور ترجمہ کاروں مثلاً جیوتشور پتھک جی
نے بھی ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ اسی لئے وہ گمنام ہوگئی ہے۔ خیالؔ

صاحب کی ترجمہ نگاری کا ایک اور اچھا نمونہ کشمیریوں کے ایک اور یورپی مربّی ٹینڈیل بسکو کے ذات نامے کا اُردو ترجمہ ہے اور اس کا بھی کوئی ثانی نہیں ہے۔

خیالؔ صاحب کے مداح ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور ''جہانِ خیالؔ'' میں درج یہ دعویٰ مشکل سے جھٹلایا جاسکتا ہے کہ خیال صاحب عالمی شہرت کے مالک ہیں (جہانِ جہانِ خیال۔Back Title)۔ وہ اب بھی اپنی دراز قامت کے ساتھ اپنے بلند ادبی قد پر برقرار ہیں۔

جریدہ ''شیرازہ'' دیر ہی سے سہی۔ خیال صاحب پر اپنا خاص شمارہ شائع کر رہا ہے اور یہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ اس سے اُن کے ادبی سفر کی ساری گُل گشت قارئین کے لئے نظر نوازی کے سامان کرے گی۔

............●●● ....

● ...... سیف الدین سوز

غلام نبی خیالؔ: ہر دلعزیز شخصیت

غلام نبی خیالؔ کے ساتھ تین دہائیوں سے زیادہ میری وابستگی رہی ہے اور خیالؔ صاحب کی جو صفتیں میں نے دیکھی ہیں، اُن کا احاطہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

غلام نبی خیالؔ کشمیر کے منفرد اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں جو بیک وقت تین زبانوں میں لکھتے رہے ہیں یعنی ،اردو کشمیری اور انگریزی ۔تینوں زبانوں میں انہوں نے اپنے خیالات کو دانشورانہ مہارت سے ادا کیا ہے جس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ خیالؔ صاحب پر کشمیر میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے کئی دانشوروں نے ان کی شخصیت پر توجہ مرکوز کر کے بہت کچھ لکھا ہے۔

خیالؔ صاحب کی سب سے بڑی صفت میں نے یہ دیکھی ہے کہ وہ بہت ہی مدبرانہ اور دانشورانہ طریقے سے گفتگو کرتے ہیں۔اسی لئے سماج میں اُن کی کافی قدر ومنزلت ہے۔

جہاں تک غلام نبی خیالؔ صاحب کی نگارشات کا تعلق ہے اُن کی بوقلمونیاں ریاست کے تمام ادیبوں کے سامنے ہیں اور اس ادبی رنگارنگی کا احاطہ کرنا کسی ادیب کیلئے بھی ناممکن ہے۔مگر جب مجھے اکادمی سے یہ فرمائش موصول ہوئی کہ میں بھی خیالؔ صاحب پر کچھ لکھوں، تو میں نے اپنی محبت میں قلم اٹھایا۔

جیسا میں نے پہلے ہی بیان کیا، ان کی ادبی نگارشات اتنی گوناں گوں ہیں کہ اختصار سے لکھنے میں بھی دشواری ہے وہ بیک وقت شاعر، ادیب، ترجمہ کار، دانشور اور مانے ہوئے سخن گو ہیں۔میرا ذاتی

خیال ہے کہ اگر خیالؔ صاحب نے دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہوتی تو آج ریاست کے منظرنامے پر ہمیں ایک بڑا انشائیہ نگار مل جاتا۔

خیالؔ صاحب بہترین ترجمہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے جو رباعیاتِ عمر خیامؔ کا فارسی سے کشمیری میں ترجمہ کیا ہے وہ کشمیری ادب میں ایک شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب یہ ترجمہ منظرِ عام پر آیا تھا تو اس وقت تہلکہ مچ گیا تھا۔ انہوں نے مسلسل کچھ ایسے تراجم بھی پیش کئے کہ وہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں بحثیت مترجم ہمیشہ یاد رکھیں جائیں گے۔ ان کے تراجم میں Poetics اور Madea قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے کچھ تراجم کشمیر یونیورسٹی نے بھی شائع کئے ہیں۔ جہاں تک اِن کی شاعری کا تعلق ہے تو میں ان کی نظموں کا بڑا امداح رہا ہوں، جو اپنے اندر بہت ہی فکرانگیز فلسفہ رکھتی ہیں۔

خیالؔ صاحب کی اعلیٰ نثری کاوشوں میں خیابانِ خیال، کاروان خیال، اِظہارِ خیال، فکرِ خیال اور چنار رنگ قابل قدر ہیں۔ ان نگارشات میں کشمیری قوم کے لئے کوٹ کوٹ کر دردمندی کا اظہار موجود ہے۔

میں غلام نبی خیالؔ صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کیوں کہ وہ ابھی بھی زبان وادب کی ترقی وترویج میں کوشاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ خیالؔ صاحب بڑی دیر تک ہمارے ساتھ رہیں اور خوش وخرم رہیں۔ (آمین)

............●●● ....

● ...... نور شاہ

چاند نگر کا مسافر

غلام نبی خیالؔ کی شناخت بطور قلم کار مستحکم ہے۔ وہ ایک معتبر شاعر ہیں، ایک کہنہ مشق صحافی
ہیں اور تحقیق و تنقید میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ کشمیر کے تاریخی پسِ منظر سے بخوبی واقف ہیں۔ کشمیر
کی موجودہ صورت حال پر اپنی ایک سنجیدہ رائے رکھتے ہیں۔ کشمیر کی ادبی محفلوں اور مجلسوں میں نمایاں
طور پر نظر آتے ہیں۔ ماضی میں بھی کشمیر کی ادبی تحریک کے ایک سرگرم کارکن رہے ہیں۔ سرکاری
ملازمت بھی کی ہے۔ مختصر سے عرصہ کے لئے اور پھر خود ہی سرکاری ملازمت سے دوری بھی اختیار کی
ہے، اِس سرکاری ملازمت کا تعلق ریاستی کلچرل اکیڈیمی اور ریڈیو کشمیر سے رہا ہے۔ کشمیر کی ایک ادبی
تنظیم کشمیر کلچرل کانفرنس اُن کی قیادت میں سرگرم عمل رہی ہے۔ مختلف موضوعات پر تیس سے زائد
کتابوں کے مصنف ہیں۔ خیالؔ صاحب کے تحریر کردہ الگ الگ نوعیت کے تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی
مضامین مختلف ادبی اور علمی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اِن تخلیقات میں اُن کے مطالعے اور
دروں بینی کی جھلک نظر آتی ہیں۔ کچھ عنوانات تو فوراً ہی ذہن میں اُتر جاتے ہیں۔ مثلاً خیال قلم، جہانِ
خیال، خیابانِ کشمیر، کاروانِ خیال، اظہار خیال، گلزارِ خیال اور فکر خیال وغیرہ۔ یہ عنوانات پڑھ کر
احساس ہوتا ہے کہ خیالؔ کے خیالات اُن کی گرفت میں ہیں۔ ریڈیو سے بھی اُن کی آواز اکثر سنائی دیتی
ہے اور اُن کی صورت آپ مختلف ٹی وی چینلز کی وساطت سے اپنے ٹی وی سکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔
شاید آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عمر میں بھی وہ نجی محفلوں اور
مجلسوں میں اپنی جوانی کے رومان بھرے کارنامے دہراتے خوب ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں۔

ذاتی طور پر خیالؔ صاحب کے ساتھ میرے مراسم قریباً چھ دہائیوں پر مشتمل ہیں۔ مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب شہر سری نگر پولو ویو مارکیٹ کے سامنے بنڈ کے کنارے لالہ شیخ ریسٹورنٹ میں قریب قریب ہر شام ادیبوں، شاعروں، قلم کاروں، فنکاروں اور صحافیوں کی ایک کہکشاں نظر آتی تھی۔ ریسٹورنٹ کے مالک کا بیٹا جو ہمارا ہم عمر تھا، بڑا ہی زندہ دل تھا۔ اکثر اُدھار میں ہی چائے پلاتا تھا۔ ویسے ہم لوگ اپنی رضامندی سے جیب سے کچھ نہ کچھ نکال کر ایک چھوٹی موٹی رقم جمع کر کے چائے پیسٹری اور کبھی کبھار کباب کا آڈر دیتے تھے۔ ایک دن میں ریسٹورنٹ میں اکیلا بیٹھا تھا کہ خیالؔ صاحب آ گئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا، کہنے لگے میرا پہلا شعری مجموعہ عنقریب ہی منظر عام پر آرہا ہے اور میں پریس سے ایک کاپی لے آیا ہوں۔ ابھی اس کا سرورق پوری طرح سے سوکھا نہیں ہے، جب میں نے دیکھنے کی خواہش کی تو انہوں نے انکار کیا لیکن پھر نہ جانے کیا سوچتے ہوئے پیکٹ کھولا اور کتاب میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا ''دیکھ لو جلدی جلدی میں اپنی پہلی شعری تخلیق پہلے خود پڑھنا چاہتا ہوں۔ شروع سے آخر تک ویسے اس کی پروف ریڈنگ میں نے خود کی ہے پھر بھی'' ابھی وہ اپنی بات پوری طرح سے کہہ بھی نہ پائے تھے کہ غلام رسول سنتوشؔ، علی محمد لون، بنسی پارمو، پشکر ناتھ اور نثار عزیز ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ اب خیالؔ صاحب کے لئے کتاب چھپانا ممکن نہ تھا۔

اور یہ کتاب تھی...... پراگاش!

سنتوشؔ اپنی فنکارانہ نظروں سے کتاب کا سروق دیکھنے لگے۔ بیک پیج پر نظر ڈالی تو حیران نگاہوں سے خیالؔ کو گھورنے لگے۔ اب کتاب لونؔ صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔ بیک پیج کو دیکھا تو ہنسنے لگے، خوب ہنسنے کے بعد کتاب پشکر ناتھ کی جانب بڑھا دی۔ لونؔ صاحب شاید اپنے تاثرات بھی پڑھ چکے تھے جو بیک پیج پر شائع ہوئے تھے۔ پشکر ناتھ کے ساتھ بھی وہی صورت حال رہی اور جب بنسی پارمو نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو سامنے کھڑے ویٹر سے کہا ''میرے لئے ایک بلیک کافی لاؤ...... ہاں دودھ اور شکر کے بغیر......''

بلیک کافی کیوں؟ پشکر ناتھ نے پوچھا۔

''وہ اس لئے کہ کتاب کے بیک پیج پر جو تصویر نظر آ رہی ہے وہ خیالؔ کی ہو ہی نہیں سکتی۔ بڑ
غلطی سے کسی اور کی تصویر چھپ گئی ہے۔''

اب کتاب دیکھنے کی باری نثار عزیز کی تھی۔ اُنہوں نے سرورق دیکھا، کتاب کے اوراق
الٹ پلٹ کر دیکھا اور بیک پیج دیکھ کر اُن کی نگاہیں جیسے منجمد ہو کر رہ گئیں۔ اُنہوں نے میری طرف
دیکھا اور کہا۔

''شاہ ذرا اپنا ہاتھ دکھاؤ۔''

میں نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ میری انگلیوں کو ایک ایک
کر کے دیکھا، میرا انگوٹھا دیکھ کر اُن کی نظر جیسے اٹک کر رہ گئی۔ میرے انگوٹھے پر کالا رنگ چڑھا ہوا تھ
میرے انگوٹھے نے خیالؔ صاحب کی تصویر کو بے رنگ بنا دیا تھا۔ اب وہاں کوئی تصویر نہ تھی بلکہ تصویر
جگہ ایک کالا دھبہ نظر آ رہا تھا...... خیالؔ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا ''میں نے کہا تھا نا کہ سرور
ابھی پوری طرح سے سوکھا نہیں ہے''......!!!

چھاپ خانہ، لالہ شیخ ریسٹورنٹ کے قریب ہی تھا۔ اُن دنوں یہ شہر سری نگر کا اہم چھاپ خا
تھا۔ اس کا مالک سارا سارا دن کافی ہاؤس میں نظر آتا تھا۔

پراگاش...... اس کتاب کی پہلی کاپی آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، خیالؔ صاحب کے
دستخط کے ساتھ۔ تاریخ بھی مکمل ہے 17/اپریل 1963ء اور یہ ہے خیالؔ صاحب کی تخلیق کے تعلق
سے ایک بھولی بسری یاد۔ پڑھنے والوں کے لئے یہ واقعہ غیر دلچسپ بھی ہوسکتا ہے لیکن اِس بات سے
انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ''پراگاش'' اُن کی ادبی زندگی کی پہچان بن گئی اور یہ پہچان اتنے سارے برس
بیتنے کے بعد بھی قائم ہے اور آج خیالؔ صاحب ہمارے ادبی کارواں کے اہم اور معتبر فرد ہیں اور آج
بھی وہ ادبی زندگی کے خاکے میں رنگ بھرتے نظر آ رہے ہیں۔ میرے لئے مسرت کی بات یہ ہے کہ
آج خیالؔ صاحب نہ صرف ذاتی طور پر بلکہ تصویروں میں بھی جوان نظر آتے ہیں۔

اُن کی جوانی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ویسے خیالؔ صاحب آج بھی ظاہری طور پر صحت مند
نظر آتے ہیں، اندر کا حال اللہ ہی جانے۔ ہم تو صرف کہہ سکتے ہیں۔ ''قدمن مدد تہ صحتِ بدن'' اگر

میری یادداشت میرا ساتھ دے رہی ہے تو یہ اس زمانے کی بات ہے جب خیالؔ صاحب اپنی جوانی کی نمائش کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ جی ہاں یہ 1970ء کی بات ہے۔ اب تو خیالؔ صاحب اپنی زندگی کے ۸۰ سے زائد گرما سرما دیکھ چکے ہیں۔ ہمارے ایک دوست موہن جی نے بابا بلڈنگ (متصل جموں کشمیر بنک بنڈ سری نگر) میں اپنے دو کمروں پر مشتمل دفتر میں ادبی محفلیں آراستہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ ادیب تو نہ تھے لیکن ادب نواز ضرور تھے۔ ادبی محفلوں میں شریک ہونے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ البتہ ہر شام پینے پلانے کی غرض سے وہ ایک نزدیکی بار میں جاتے تھے...... ایک شام جب ادبی محفل اپنے جوبن پر تھی تو وہ گھبرائے گھبرائے سے لوٹ آئے۔ حاضرین نے وجہ جاننا چاہی تو کہنے لگے۔ ''یار کئی دنوں سے ایک شخص جسے میں بالکل نہیں جانتا۔ دو ایک پیگ لینے کے بعد مجھ سے خواہ مخواہ اُلجھ جاتا ہے اور بے ہودہ حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ تنگ کرنا اور مجھ پر جملے کسنا اس کی عادت بنتی جا رہی ہے۔'' یہ بات خیالؔ بھی سن رہے تھے۔ کہنے لگے۔

''کل میں آپ کے ساتھ چلوں گا''

پھر فیصلہ یہ ہوا کہ موہن جی اکیلئے نہیں جائیں گے، دو چار لوگ اور بھی جائیں گے۔ اُن میں میں بھی شامل تھا۔ موہن جی نے ہمارے لئے چائے اور کانتی کا آڈر دیا۔ اسی دوران وہ صاحب بھی تشریف لے آئے اور جی کھول کر پینے لگے۔ جب بل دینے کا وقت آیا تو انہوں نے انکار کیا۔ سامنے پڑا خالی گلاس فرش پر گرا دیا۔ اس کے فوراً بعد موہن جی سے اُلجھ گئے۔ خیالؔ صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی، وہ اور زیادہ بک بک کرنے لگے۔ اُن کی غیر ذمہ دارانہ حرکات وسکنات میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ خیالؔ صاحب نے اُنہیں اپنے بازوؤں کی قوت سے اس قدر آشنا کیا کہ بقول موہن جی وہ پھر کبھی وہاں نظر نہیں آئے۔

دراصل یہ پرانا واقعہ دہرانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ نازک طبیعت کے ہمارے قلم کار دوست غلام نبی خیالؔ سخت طبیعت کا جامہ پہن لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ پہلے کی بات ہے اب جہلم میں کافی پانی بہہ چکا ہے۔ اب اُن کی طبیعت میں کافی بدلاؤ آچکا ہے۔ کسی بات پر غصہ آ بھی جائے تو پی جاتے ہیں۔ کسی کو محسوس ہونے نہیں دیتے۔ یہ میں نے خود بھی دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔

شاید آپ نے بھی دیکھا ہو یا محسوس کیا ہو۔ اب اُن کی عمر کی ساری قوت اُن کے قلم میں سمٹ کر آ گئی ہے..........!!

آخر پر ایک اور واقعہ پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

بہت پرانی بات ہے۔ جانے تب سے کتنے ماہ و سال گزر چکے ہیں۔ خیالؔ، مرحوم سنتوش اور میں جموں میں ہوٹل کاسمو میں چائے پی رہے تھے۔ سب اپنی اپنی سُنا رہے تھے کہ اچانک سنتوش نے خیالؔ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''آخر تم ہو کون!''

خیالؔ ذرا گھبرا سا گیا......اور گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا......''میں......میں ہوں۔''

''وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم......تم ہو......اِس کے بغیر بھی تم کچھ ہو۔ اس دنیا میں......اِس کائنات میں......!''

''ہاں ہوں! اب خیال سنبھل چکا تھا۔''

''کیا؟''

''مسافر''

''مسافر کہاں کا''، سنتوش نے سنجیدگی سے پوچھا۔

خیال نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا......''چاندنگر کا۔''

جانے یہ بات میرے ذہین میں کیسے اُبھری کہ میں نے خیالؔ کے تعلق سے اِس مختصر سے مضمون کا عنوان ''چاندنگر کا مسافر'' ہی مناسب سمجھا۔!!!

..........●●●..........

● ...... ناجیؔ منور
● ...... مترجم: مبشر رفاعی

خیالؔ، خیالی نہیں بلکہ عملی ہے

علامہ اقبال نے اپنی ایک تصویر کھنچوائی ہے جس میں وہ آنکھیں بند کئے اور زانو پر ہاتھ رکھے نظر آتے ہیں۔ یہ تصویر جب عام ہوئی تو ہمارے اکثر شعراء نے بھی اسی پوز میں تصویریں کھنچوانا شروع کیا۔ لیکن جب غلام نبی خیالؔ نے عمر خیامؔ کی رباعیات کا کشمیری ترجمہ شائع کیا اور اسی انداز میں اپنی تصویر بھی کتاب کے ساتھ منسلک کی۔

آج مجھے ایسا لگتا ہے کہ خیالؔ صاحب کا ترجمۂ خیام فٹز جیرالڈ کے ترجمے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر کشمیری زبان انگریزی کی طرح عوام میں مقبول اور پڑھنے لکھنے کی زبان ہوتی تو نہ معلوم کتنے عاشق یہی ترجمہ اپنے خون سے رقم کر کے اسے اپنے محبوب کو ایک تحفہ کی صورت میں بھیجتے یا اسی کو اپنا تکیہ بنا کر آرام کی نیند سوتے۔ حق تو یہ ہے کہ جب میں جوان تھا تو میں فارسی شاعری کا دلدادہ تھا اور اکثر و بیشتر خیالؔ صاحب کا یہی ترجمہ سرہانے رکھ کر مزے کی نیند میں ڈوب جاتا اور ان کی ہمت کی داد دیتا۔

دراصل جب 1958ء میں خیالؔ صاحب کو بھی کشمیر کے سیاست دانوں کے ساتھ جیل جانا پڑا، یہ واقعہ ان کے لئے ایک سعادت بن گیا۔ وہ پسِ زندان بھی ایک دانشور اور فن کار کی حیثیت میں محنت کرتے رہے اور انھیں مولانا محمد سعید مسعودی جیسا نابغۂ روزگار عالم و فاضل ہم اسیر ملا۔

اسیرِ زنداں بننے سے قبل غلام نبی خیالؔ ریڈیو کشمیر سری نگر میں ملازمت کرتے تھے جو اُس وقت تفریح اور عوام تک خبریں پہنچانے کا واحد مرکز تھا۔ ریڈیو سے ایک دن میں عبدالرشید کی آواز اردو

خبروں میں اور غلام نبی خیالؔ کی کشمیری خبروں میں گونجتی تھی۔ان دونوں آوازوں کے مشتاق سبھی
تھے۔میں بھی ان دنوں شعروشاعری کے شغف سے آشنا ہورہا تھا۔خیالؔ صاحب کے جیل جانے کی خبر
سن کر ہم سب پر ایک لرزہ سا طاری ہوا۔

47ء کے بعد کشمیر میں پڑھنے لکھنے کی سہولتیں عام ہوگئیں اور جوانوں میں یہ جذبہ بیدار ہوگیا
کہ وہ بھی کوئی ایسا کام کریں جس سے ان کا نام روشن ہوسکے۔اکثر خواندہ نوجوان اپنی کتابوں پر
اپنا Motto لکھتے تھے جس کے لئے ان کے اُستاد رہبری کرتے تھے۔میرے ایک دوست نے یہ موٹو
زندگی کے مدعا و مقصد کے لئے اپنایا تھا: aim at the sun although you may not reach
it یعنی کہہ دو کہ ہمیں سورج تک پہنچنا ہے اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے مگر کسی منزل کو
تو چھو سکتے ہیں۔

خیالؔ صاحب کے جو کارنامے ہم تک پہنچے ہیں وہ بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ خیالؔ محض
روزی کمانے کے لئے دوسرے قلم کاروں کی طرح تنگ نظریے کے مالک نہیں۔انھوں نے عالمی شہرت
یافتہ فلسفیوں، ڈراما نگاروں اور شاعروں کی تخلیقات کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کے کارناموں پر ایسے شاندار
مقالے تحریر کئے جن سے کشمیری زبان اور ادب کو وسعت نصیب ہوئی۔یہ مقالات ''گاشری مُنار'' نام
کی کتاب میں شایانِ شان طریقے سے یکجا کئے گئے ہیں۔انھوں نے قدیم یونانی ادب، یورپی اور روسی
ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کی بدولت کشمیری زبان کو ایک مدعا و مقصد حاصل ہوا۔

1960ء تک کشمیر میں صرف ایک رسالہ ''گلریز'' تھا(1)۔مرزا عارف مرحوم یہ رسالہ اردو
اور کشمیری میں شائع کرتے تھے۔انھوں نے جب خیالؔ صاحب کی صلاحیتیں دیکھیں تو اس کی ادارت
انہی کو سونپی اور خود اس کے نگراں بنے رہے۔

''گلریز'' کا دفتر کشمیر کی ثقافت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔وہاں شاعر اور ادیب بیٹھ کر شاعری
اور ادب کے نکتوں کی گرہ کشائی کرتے ان ہی دنوں کشمیری زبان افسر شاہی کی سازشوں کا شکار ہوئی
جسے شیرِ کشمیر نے بچوں کو تعلیم دینے کا ذریعہ بنایا تھا۔اسے سکولوں سے بے دخل کیا گیا۔کشمیری قلم کار بھی
عام لوگوں کی طرف افلاس زدہ تھے اور وہ نئے حکام کی قصیدہ خوانی کرنے لگے۔

خیاؔل صاحب کی ادارت میں رسالے کا جو پہلا شمارہ شائع ہوا اس میں انھوں نے میری یہ آزاد نظم ''شبِ شالیمار'' شائع کی:

شالمارُکھ شب چھُ از آلو دوان بیہ ہاوسن
ہاوسن یم اَسی مے وہراوی متی کرتام برونھ
از ہیرٕن تیزٕنی ہنا دبرائے بیہ سینن اندر
یام یِتہٕ مدرس شرین آسن زیون پیٹھ
لولہ ہتی کاشری غزل

......☆......

بوش کھسہِ یامتھ رسل میرس تہ مہجورس یہوے
تام میی ہیوہ بلبلاہ پرہ ژھیون تہ ہیکہ باوتھ کتھاہ
شالمارو چاننی پوشن ونی لوپچ کتھاہ

''گلریز'' نہایت ہی کامیابی کے ساتھ کئی مہینوں تک جاری رہا اور خیاؔل صاحب کو یہ نیا خیال آیا کہ جو کام مہجور پورا نہیں کر سکے وہ اب انہی کے ہاتھوں مکمل ہوگا یعنی کشمیری قوم کو روزنامہ ہفتہ وار اخبار دینا ہے۔ اس اقدام کی ہر طرف سے سراہنا کی گئی ہفت روزہ ''وطن'' زور وشور سے جاری رہا۔ ہر شخص نے اسے کشمیر کے لئے ایک فال نیک تصور کیا اور اُس وقت کے ادبی حلقوں نے خیاؔل صاحب کی ہمت کی داد دی جنھیں مادرِ کشمیر کے ساتھ ہمدردی تھی اور جو مادری زبان سمجھ سکتے تھے۔

''وطن'' اخبار کی کامیابی دیکھ کر خیال صاحب نے اس کا ایک خاص نمبر نکالنے کا ارادہ کیا۔ وہ بھی ایسا جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ اُس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ عالمی امن تھا۔ انسانی تاریخ نے تباہی کے بھیانک مناظر دیکھے تھے یعنی جاپان کے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایٹم بم سے تباہ کرنے کا مذموم عمل واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ واقعہ روئے زمین پر ہمیشہ ایک بدنما زخم کی طرح رہے گا۔ خیاؔل صاحب نے اخبار وطن کا ''امن نمبر'' نکال کر ایک جرأت مندانہ کارنامہ انجام دیا۔

نصف صدی گزرنے کے بعد آج بھی جب یہ خاص نمبر سامنے آجاتا ہے تو انسان حیرت زدہ

ہوجاتا ہے کہ غلام نبی خیاؔل کے قلم میں کوئی جادوئی طاقت پوشیدہ تھی کہ اس وقت کی عالمی شہرت کی شخصیات نے اس کے لئے اپنے خاص پیغامات ارسال کئے۔ ان مایہ ناز ہستیوں میں برٹرینڈ رسل یواین کے سیکریٹری جنرل اوتھانٹ، ہند میں امریکی سفیر چسٹر باولز، لیگ آف نیشنز کے اعلیٰ نمائندے کلاور مقصود اور وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی شامل ہیں۔ یہاں برٹرینڈ رسل کا پیغام بار دیگر نقل کیا جاتا ہے:

لندن، ایس، ڈبلیوا، انگلینڈ

3/جولائی 1966ء

پیارے خیاؔل صاحب!

آپ کے خط کے لئے شکر گزار ہوں۔ میں بہ خوشی اخبار وطن اور کشمیری عوام کو مبارک باد بھیجتا ہوں۔ میں آپ کو ایک مضمون ''امریکی لوگوں کے نام ایک اپیل'' بھی بھیج رہا ہوں جس کے ساتھ آپ کی دلچسپی ہے۔

آپ کا مخلص: برٹرینڈ رسل

ایسی ہی کوششوں سے امن عالم نے ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کی اور اسی بنا پر دنیا آج تک باقی ہے۔ مگر......

''امن نمبر'' شائع کر کے خیاؔل صاحب کا نہ صرف ایک مقصد پورا ہوا بلکہ کشمیری زبان جو کشمیری قوم کی مادری زبان ہے بار دگر یہاں کے سیاست دانوں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

خیاؔل صاحب نے ایک سال قبل ''شہید نمبر'' بھی نکالا تھا جو تیرہ جولائی کے شہدا کو خراج عقیدت تھا۔ اس کے لئے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اپنے قلم سے کشمیری میں ''شہیدن ہُند دوہ'' عنوان کے تحت مضمون بھی لکھا تھا۔ یہ بھی خیاؔل صاحب کی شخصیت ہی کا اثر تھا کہ کشمیر میں جانے پہچانے اردو لکھاری کشمیری میں لکھنے کا آغاز کرنے لگے۔

''امن نمبر'' کے لئے قیصر قلندر لکھتے ہیں:

''آل انڈیا ریڈیو، جالندھر

یکم اگست 1966

عزیز دوست السلام علیکم

مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ آپ کی کوشش رفتہ رفتہ رنگ لائے گی۔اب اردو کے ساتھ میں کشمیری نظم بھی لکھوں گا۔ چنانچہ میں نے بصد کوشش اس زبان میں تین نظمیں تحریری کی ہیں۔تیسری نظم حاضر ہے جس کا عنوان ''ایک انسانی فرض'' ہے اور اس کا موضوع بھی امن ہے۔

آپ کی نظم ''مناجات'' کا ترجمہ ''شب خون'' الہ آباد کے چھٹے شمارے میں شائع ہوگا۔

آپ کا دوست: قیصر قلندر

قیصر قلندر مرحوم کی ایک نظم اس سے پہلے ''وطن'' کے شہید نمبر 1965ء میں چھپ چکی تھی۔ اسی طرح اردو زبان کے ایک اور صحافی پریم ناتھ بزاز جس کے اخبار ''ہمدرد'' میں عبدالاحد آزاد صاحب کی شاعری اور کشمیری زبان کی تاریخ گاہے بگاہے شائع ہوا کرتی تھی۔ خیالؔ صاحب کی مساعی سے انھوں نے بھی امن عنوان کے تحت کشمیری میں ایک مضمون لکھا۔ بھلا ان تخلیقات کی تاریخی اہمیت سے کون منکر ہوسکتا ہے؟

بزاز صاحب، خیالؔ صاحب کے نام لکھتے ہیں: ''آپ کی فرمائش کے مطابق میں نے یہ مضمون ''امن نمبر'' کے لئے لکھا ہے۔ یہ میری کشمیری میں اولین کوشش ہے۔کوئی تعجب نہیں کہ اس میں درجنوں غلطیاں موجود ہوں۔۔۔''

''وطن'' تین سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اس کے بعد کئی چھوٹی موٹی کوششیں کی گئیں مگر وہ ساتھ ہی معدوم ہوئیں۔

...........●●●...........

(1) جی نہیں۔ اس سے پہلے کونگ پوش اور گلریز ہی کے نام سے کشمیری رسالے 1947ء اور 1960ء کے درمیان شائع ہورہے تھے۔

● ......حسن ساہؔو

غلام نبی خیالؔ: ماضی کے جھروکوں سے

اس کبرسنی میں جہاں تک احقر کی یاداشت کا تعلق ہے، غلام نبی خیالؔ (جی این برساتؔ) سے پہلی ملاقات غالباً 1953ء میں ہوئی تھی جب میں محکمہ واٹرورکس میں دفتری بابو تھا۔ ایک روز میں دفتری کام میں مصروف تھا ایک اکھڑی مگر سریلی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔

''کیا میں حسن شش و پنج سے مخاطب ہوں؟''

تیرہ یا چودہ برس کا چھریرے بدن والا شکیل لڑکا میز کے سامنے کھڑا تھا۔

''جی ہاں! میں ہی شش و پنج ہوں۔''

''مجھے جی این برساتؔ کہتے ہیں۔ یہ لیجئے راج چھاپڑہ کا خط''.......................

دراصل اُس زمانے میں دہلی سے فلمی اور ادبی مواد سے لبریز جریدہ ''چترا ویکلی'' کے عنوان سے دھرم ویر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس ہفت روزہ کے آٹھ دس صفحات ''لیٹر بکس'' کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے جن میں مختلف ریاستوں کے چترا پریمیوں کے خیالات و تاثرات تفصیل کے ساتھ دستیاب رہتے تھے۔ ملکی سطح پر درد شملوی، راج اوستھی، اوم پرکاش بجاج، ریشم سنگھ ریشم اور شرما کملیش وغیرہ کی تحریک پر آپسی تال میل بڑھانے کی نیت سے مختلف ریاستوں میں ''چترا کلب'' قائم کئے گئے۔ اُن دنوں سری نگر میں ایم نسیم، مستانہ کوہلی، جی این کٹاریہ، احقر اور لیکھ راج چھاپڑہ اس کلب سے وابستہ تھے۔ بعد میں جی این برساتؔ (غلام نبی خیالؔ) اور عبدالقیوم (ہمدمؔ کاشمیری) حرکت میں

گئے۔ راج چھاپڑہ کا خط جو خیالؔ صاحب کی وساطت سے مِلا۔ دراصل چترا کلب کے قیام کے سلسلے میں تھا۔ اُن دِنوں سکول باغ (جہاں آج ہائی کورٹ کی بلڈنگ واقع ہے) کے چار چناروں کے درمیان ہماری بیٹھک ہوا کرتی تھی۔

1955ء میں میرا تبادلہ سری نگر سے جموں ہوا اور پھر ملازمت کے سلسلے میں برسوں میرا قیام وہاں رہا۔ 1960ء میں ایک سے دو بن جانے پر نظیر حسین سمنانی، موہن یاور، وید بھسین، ایس اے ایس قادری اور حکیم منظور کے اِصرار پر حسن ساہو کے قلمی نام سے کاغذ داغدار کرنے لگا۔

اِس دوران جی این برساتؔ نے غلام نبی خیالؔ کے نام سے اپنا علمی، ثقافتی، ادبی و صحافتی سفر متوازن انداز میں شروع کیا۔ ایک بات مسلّم ٹھہری کی میری طرح غلام نبی خیالؔ نے بھی ادبی سفر کی شروعات ''ویکلی چترا'' کے لیٹر بکس سے ہی کی ہے۔

ریڈیو، ٹی وی، کلچرل اکیڈیمی غرض ذرائع ابلاغ کے وسیلوں کے ساتھ ساتھ معتبر بین الاقوامی خبر رساں اداروں سے وابستگی اختیار کر کے خیالؔ صاحب کی علمیت، واقفیت اور اُٹھان میں وقت گزرنے کے ساتھ خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جس کے باعث اُس کے ہم عصر ساتھی رشک کرنے لگے۔

اربابِ اختیار نے خیالؔ صاحب کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو اندازِ دِگر میں جانچنے کے بعد کچھ اقدام اُٹھائے جن کے باعث خیالؔ صاحب کو کچھ عرصہ جیل کی چار دیواری میں گزارنا پڑا۔ خوش بختی کی بات یہ ٹھہری کہ جیل میں دورانِ قیام ممتاز سیاسی و مذہبی راہنما مرحوم مولانا مسعودی کے ساتھ مختلف مسائل پر خیال کو تبادلہ خیالؔ کرنے کا زریں موقع ہاتھ لگا۔

الغرض لگاتار مشقت و تجربہ اور سالہا سال کی ریاضت کے بعد غلام نبی خیالؔ توانائی اور نِکھار کے ساتھ ادبی، ثقافتی و صحافتی دنیا کے خوشگوار و تابناک اِمکانات تلاش کرنے لگے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ دورِ حاضر میں خیالؔ صاحب نے تخلیقی سچائی سے اپنے آپ کو تپا کر اور انتھک کاوشوں سے یہ بھید دریافت کیا کہ جاندار و شستہ ادب پارہ کیسے معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔

غلام نبی خیالؔ کے اکثر مضامین خواہ انگریزی، اردو یا کشمیری زبان کے ہوں حیات بخش پیغام لئے ہوتے ہیں، جن کو پڑھتے ہوئے قارئین کرام یقیناً حرکت و حرارت محسوس کرتے ہیں۔ سچ تو

یہ ہے کہ خیالؔ کی ہر طرز کی تحریر قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایسا اِس لئے کہ خیالؔ کا قلم ہر رنگ میں ہر موقع پر سُوز وگداز میں ڈوبا رہتا ہے۔

خیالؔ صاحب کی رنگا رنگ شخصیت کا مطالعہ اگر اس کی زیست کے پس منظر میں کیا جائے تو حقیقت طشت ازبام ہو کر رہتی ہے کہ اس نے ادب و صحافت میں اعلیٰ مقام انتھک محنت، انہماک تجربات، خلوص اور مشاہدات کے بل پر حاصل کیا ہے۔ ایک قلم کار کے لئے یہ بڑی بات ہے۔

بہ حیثیت شاعر، افسانہ نگار، وقائع نگار، محقق مترجم، ناقد، مورّخ و مقرر...... الغرض مجموعی طور پر دیکھا جائے تو خیالؔ صاحب ہمہ جہت شخصیت کے طور اپنے کو آپ جائز انداز میں منوا چکے ہیں۔ اب ڈھلتی عمر میں مختلف مشاغل کے ساتھ ساتھ ادبی وصحافتی سرگرمیوں میں بھی عملی طور حصہ لیا کرتے ہیں۔

غلام نبی خیالؔ کی اب تک انگریزی، اُردو اور کشمیری زبانوں میں مختلف موضوعات پر تین درجن کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

صحافت کے زمرے میں یہ جتانا کافی ہے کہ خیال نے ''وطن'' کے نام سے کشمیری اخبار 1964ء میں اجرا کیا۔ 1968ء میں ہفت روزہ ''اقبال'' اُردو میں جاری کیا جو 1975ء میں روزنامہ بنا اور اَب 2003ء سے بلاناغہ انگریزی ہفت روزہ ''ووئس آف کشمیر'' اُن کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے جس میں سیاسی و ادبی سرگرمیوں کا احاطہ بے باکی سے ہوتا ہے۔ خیالؔ صاحب اخبار کو تجارت کے بجائے خبر ونظر کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

علمی و ادبی قابلیت اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں خیالؔ کو ریاست و ملک کے نامور گرامی اداروں نے اعزازات وانعامات سے نوازا ہے۔

..........●●● ....

•......ایاز رسول نازکی

خیالؔ صاحب: اپنی ذات میں ایک انجمن

اپنے حافظے کو کھنگال کر دیکھا، کچھ ہاتھ نہ لگا کہ محترم غلام نبی خیالؔ کو میں نے پہلی بار کب اور کہاں دیکھا؟ اُن کے نام گرامی سے واقفیت البتہ بہت پہلے سے رہی۔ شاید سن بلوغ کو پہنچنے اور ادب و شاعری سے شغف پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہی خیالؔ صاحب سے رابطہ البتہ تب ہوا جب وہ اپنا اُردو اخبار ''اقبال'' نام سے نکالتے تھے۔ اس میں ایک جاندار ادبی صفحہ ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے لڑکپن کے ایام میں اس صفحے کے لئے اپنی کچھ ''آزاد'' نظمیں ارسال کی تھیں۔ دراصل ہمارے گھر میں اس زمانے میں بھائی فاروق نازکی کی وساطت سے لگ بھگ ہند پاک میں شائع ہونے والے بیشتر ادبی جریدے آتے تھے۔ ان میں جو نام مجھے یاد آرہے ہیں وہ ہیں 'شب خون، صبا، نیرنگ، خیال، نیا دور، آجکل، ماہِ نو وغیرہ۔ شب خون میں چھپنے والی شاعری سے خاصا متاثر ہوا، وہ بھی یوں کہ لگا ایسی نظمیں تو میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ نظمیں لکھیں اور چند ایک شب خون کے مدیر محترم شمس الرحمٰن فاروقی کو اِرسال کردیں۔ فاروقی صاحب نے از راہِ مُروت خط کا جواب مرحمت فرمایا۔ یہ ایک In land لفافہ تھا۔ تحریر مجھے یاد ہے کیوں کہ یہ اس زمانے میں کسی نے Citation سے کم اہم نہیں سمجھی۔

عزیزم:۔
آپ کی نظمیں دیکھیں۔ اچھا شعر کہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مشقِ سخن جاری رکھیئے۔ گاہے گاہے یاد کیا کیجئے۔
شمس الرحمٰن

اس مختصر سے تبصرے نے حوصلہ بڑھایا۔ ہمت بڑھی اور میں نے اندھا دھند نظمیں لکھ
شروع کیں اور کچھ رسالوں، کچھ اخباروں کو بھیجنے کی سعی کی۔ اِسی دوران 1975ء کے اختتام پر واپسی
ہوئی اور پھر سے کشمیر میں لکھنے والوں سے اور ان کی تخلیقات سے فیض یاب ہونے کا موقع میسر ہوا۔ جن
لوگوں کی تخلیقات سے اب کے متعارف ہوا اُن میں غلام نبی خیالؔ صاحب کا اسم گرامی بھی تھا۔ وقت
گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی کتابیں پڑھنے کا موقع فراہم ہوا۔ خاص کر ''گاشرِ منار'' جس کے
بارے میں قبلہ میر غلام رسول نازکیؔ نے تعریف کی سند عطا کی تھی۔ خیالؔ صاحب کو مشاعروں میں
اور پھر ٹی وی پر دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ پہلی ملاقات کب ہوئی یاد نہیں لیکن ایک ملاقات بہرحال
حافظے میں آج بھی تروتازہ ہے۔ خیالؔ صاحب قبلہ والد صاحب سے ملنے اور انہیں اپنی تازہ تصنیف
پیش کرنے کے لئے گھر آئے تھے۔ جتنی دیر وہ بیٹھے رہے ہیں انہیں غور سے سنتا رہا۔ خیالؔ صاحب کی
دلنواز شخصیت، ان کے قد دراز، شگفتہ مزاج اور تکلم و تبسم سے متاثر ہوا۔ والد صاحب کا ذکر چلا ہے تو کہتا
چلوں کہ جہاں انہوں نے خیالؔ صاحب کے ترجمہ عمر خیامؔ کی خوب تعریف و توصیف کی تھی وہیں انہوں
نے ایک اور موقع پر اُن کی ایک اور تصنیف کے بارے میں بھی میری موجودگی میں خیالؔ صاحب کو فون
پر نہ صرف مبارک باد دی تھی بلکہ یہاں تک کہا تھا کہ اس موضوع پر اِس کتاب سے بہتر کوئی کتاب ان
کی دانست میں موجود نہیں تھی۔

خیالؔ صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اگر شاعری
کے میدان کے شہہ سوار ہیں تو صحافت کے بھی بادشاہ ہیں۔ وہ ادب، ثقافت، صحافت، تاریخ، تہذیب،
تمدن ایسے تمام شعبہ جات سے نہ صرف منسلک رہے بلکہ ان تمام شعبہ ہائے علم و ہنر میں نام بھی کمایا۔
انہیں سیاست سے بھی دلچسپی رہی اور سرکاری عتاب کے بھی شکار رہے۔

کچھ سال قبل کشمیر میں وزارتِ خارجہ کی ایک ذیلی تنظیم، آئی سی سی آر کا علاقائی دفتر کشمیر میں
قائم کیا گیا۔ مجھے اس ادارے کا اوّلین سربراہ بننے کا موقع ملا۔ یہ چار سال ایسے تھے کہ جن کے دوران
مجھے کشمیر میں موجود شاعروں، ادیبوں اور دیگر فنکاروں کو قریب سے دیکھنے، سننے، سمجھنے کا موقع نصیب
ہوا۔ خیالؔ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت سے متعارف ہونے اور ان کے ساتھ کام کرنے کو میں اپنی

سعادت سمجھتا ہوں۔ وہ ہمارے مرکز کے تمام پروگراموں میں شریک رہے۔ اُن کی ہر قدم پر حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے مجھے وہ فریضہ انجام دینے میں کافی حد تک مدد کی۔ خیالؔ صاحب ہماری علاقائی مشاورتی کونسل کے ممبر بنے۔ ایک طرف اُن کی مدد سے ہمارے پروگراموں کو چار چاند لگ گئے۔ دوسری طرف مجھے اُن کی باغ و بہار شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ میرے ہر نئے ادبی کام کی بھرپور پذیرائی کرتے رہے۔ میری کئی کتابوں پر تفصیلی دیباچہ رقم فرمائے اور قبلہ نازکی صاحب کے حوالے سے کی جانے والی میری کاوشوں کی ستائش کرتے رہے۔

خیالؔ صاحب جہاں اپنی ذات میں ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں وہاں اِن کی دلچسپیاں بھی متنوع ہیں۔ اُن کا دانشورانہ افق بے حد وسیع ہے۔ وہ کسی ایک قبیل سے بندھے نہیں اور نہ ہی دانشوری کی سطح پر کسی حصار میں قید ہیں۔ وہ ایک سچے اور ایماندار فن کار کا فرض نبھاتے ہیں۔ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے ہنر سے واقف ہیں اور کھری کھری سنانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ خیالؔ صاحب نے جہاں کشمیر کے ادبی، نیز صحافتی منظرنامے میں اپنی مخصوص طرز سے بیل بوٹے کاڑھے ہیں، وہاں انہوں نے کشمیر کے عظیم الشان ثقافتی ورثے میں بھی اپنی کاوشوں سے اپنا حصہ ادا کیا۔ خیالؔ صاحب کا دور کشمیر کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا ایک پُر آشوب دور ہے۔ انہوں نے اُس دور میں ہونے والی اقدار کی شکست و ریخت کا نہ صرف بخوبی مشاہدہ کیا بلکہ اس کو قلم بند کرنے کی بھی سعی کی۔ خیالؔ صاحب کی معاصر تاریخ پر گہری نظر ہے اور اس سمت میں انہوں نے جتنا لکھا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ جس کی تمنا اُن کے مداح کر رہے ہیں، اس کی توقع بھی سلامت ہے۔ خیالؔ صاحب سے ابھی ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اُن کے تخلیقی سوتے ابھی اپنی پوری آب و تاب اور روانی کے ساتھ جاری ہیں۔

خیالؔ صاحب کے پیشرو اور معاصرین میں چند گنے چُنے نام ہیں جو ان کی طرح کئی زبانوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان تمام زبانوں میں معیاری تخلیق کا حق ادا کر سکتے تھے۔ خیالؔ صاحب فارسی شاعری سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے عمر خیامؔ کی رباعیات کا کشمیری زبان میں اعلیٰ پایہ کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ انگریزی میں لکھتے ہیں اور پورے انگریزی ادب اور اس کے ساتھ وابستہ کلاسک سے آشنا ہیں۔ وہ اُردو زبان و ادب کے عاشق بھی ہیں اور پارکھ بھی۔ کشمیری اُن کی مادری زبان ہے اور اس

زبان میں ان کی علمی اور شعری کاوشیں عیاں ہیں۔

کشمیر میں Multilingual ادیبوں اور شاعروں میں غلام نبی خیاؔل ایک منفرد حیثیت ر
جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایسے افراد کی تعداد اب کم ہوتی دکھائی دیتی ہے جو ایک ر
زیادہ زبانوں پر دسترس حاصل کر کے اپنے لئے کئی وسیلہ ہائے اِظہار کا اِنتظام کرتے ہیں۔ خیاؔ
صاحب نے کئی زبانوں کے ساتھ اپنے رشتے استوار کر کے ایک گلوبل باشندے کا رول بھی نبھایا ا
مختلف لسانی ثقافتوں کو آپس میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ اس طر
خیاؔل صاحب اپنی شخصیت میں ایک متنوع اور گوناگوں جہات کا مرقع بن گئے اور ہمارے سامنے ایک
بے حد دلکش اور دلنواز ہستی ہے جو اپنی فہم وفراست، شعروسخن اور فن کی کرنیں بکھیرتی جاتی ہے اور ارد گر
منور کئے جاتی ہے۔

ان کی ہمہ پہلو شخصیت کا غالب رنگ بہر حال ان کا کشمیری ہونا ہے۔ وہ اپنی ذات کے اند
اپنے خوبصورت وطن کو سمیٹے ہوئے ہیں، اسے سنوارتے ہیں۔ اس کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں اور اس
کی پریشانیوں سے غمزدہ بھی ہوتے ہیں۔

..........●●●..........

غلام نبی خیالؔ

تخلیقی و تحقیقی جہتیں

● ......شمس الرحمٰن فاروقی

غلام نبی خیال: عصرِ حاضر کی ایک معتبر آواز

برادرم غلام نبی خیاؔل

السلام علیکم

خط ملا۔ یاد فرمائی اور کرم نگاہی کا شکریہ۔ ان دنوں ضعف بصر کی وجہ سے اور صحت کی عمومی خرابی کی وجہ سے میرا لکھنا پڑھنا کم وبیش معدوم ہے۔ افسوس کہ میں زیادہ خدمت نہیں کرسکتا، ہر چند کہ آپ ہر طرح اس کا حق رکھتے ہیں۔ اس وقت چند الفاظ لکھ دیئے ہیں، قبول ہو جائیں تو ممنون ہوں گا، ورنہ مزید خدمت سے معاف رکھا جاؤں۔

نیاز مند

شمس الرحمٰن فاروقی

غلام نبی خیاؔل کو صرف کشمیر کا ادیب سمجھنا زیادتی اور ناانصافی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تما[م] اردو ادبی معاشرے کے ممتاز ارکان میں ہیں۔ انہوں نے نظم ونثر میں اردو ادب کی جو بیش بہا خدما[ت] انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں۔

کم لوگ ایسے ہیں، خاص کر اس زمانے میں، جو غلام نبی خیاؔل کی طرح ادب کی مختلف اصناف پر قدرت رکھتے ہوں۔ بالخصوص تحقیق میں ان کی کتاب ''اقباؔل اور تحریک حریّت کشمیر'' میر[ی] نظر سے گزری ہے۔ اقباؔل کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں اب بھی عام ہیں، لیکن اس با[ت] کو سب جانتے ہیں کہ وہ کشمیری سپرو تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ جواہر لعل نہرو اور شیخ محمد عبداللہ[ؒ کی] طرح وہ بھی کشمیر کے سچے عاشق تھے۔ غلام نبی خیاؔل نے اقباؔل کی فکر اور مزاج کے اس پہلو کو بخوبی وا[ضح]

کیا ہے۔ اقبالؔ کی قوم پرستی، اسلام دوستی، مغربی تہذیب اور خصوصاً اس کے استعماری پہلوؤں سے ان کی نفرت، ملک وقوم سے ان کی محبت، یہ سب اقبالؔ کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ غلام نبی خیالؔ نے ان مباحث پر مکمل اور بھرپور بحث کی ہے۔

موجودہ کشمیر کے مسائل اور پیچیدگیوں پر بھی غلام نبی خیالؔ کی نظر گہری ہے۔ انہوں نے سچی دلسوزی اور وطن دوستی کے ساتھ ان مسائل پر غور کیا ہے جو آج کشمیر کو لاحق ہیں۔

مترجم کی حیثیت سے میرے لئے ان کی وہ کتابیں بطور خاص اہمیت رکھتی ہیں جن میں غلام نبی خیال نے کشمیری شاعری کے اردو تراجم پیش کئے ہیں۔ سیاسی اور سماجی مسائل اپنی جگہ لیکن شاعری ہمیشہ اپنی سچائیاں رکھتی ہے اور ان کی بنا پر وہ قائم اور مستقل رہتی ہے۔ کشمیری ادیبوں نے ماضی بعید سے لے کر آج تک ملکی سطح کے ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں، ان سے زمانہ بڑی حد تک واقف ہے۔ سنسکرت شعریات اور فلسفہ میں کشمیری علما کا کام دنیا کے گوشے گوشے میں جانا جاتا ہے، لیکن کشمیر کی شاعری سے لوگ کم واقف ہیں۔ ''شیرازہ'' کا یہ دستاویزی نمبر جو غلام نبی خیالؔ کی شخصیت اور کارناموں پر مبنی ہے، اور پہلے شائع ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن خیر، اب بھی سہی، میں جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز کے اراکین اور ''شیرازہ'' کے عملے کو مبارک باد دیتا ہوں۔

............●●● ....

●......فاروق نازکی

غلام نبی خیالؔ کی اُردو شاعری

غلام نبی خیالؔ اُن معدودے چند قلم کاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے 1955 کے بعد اپنی خاص پہچان بنالی ہے۔ وہ اردو کے جانے مانے صحافی ہیں۔ انگریزی صحافت کے ساتھ بھی دو دو ہاتھ کئے ہیں اور ملک اور بیرون ملک انگریزی جرائد میں، روزناموں میں اور ہفتہ وار رسالوں میں اپنی تحریر کے نقش ثبت کئے ہیں۔ ریڈیو کشمیر سے لے کر وائس آف امریکہ تک اُن کی جولانگاہ رہی ہے۔ ریڈیو کے لئے بھی لاتعداد تحریر لکھی ہیں، جو منفرد انداز بیان کے لئے آج بھی یاد کی جاتی ہیں۔

جب ٹی وی وارِدِ سری نگر ہوا تو انہوں نے ''نیوز ویک'' نام کے ہفتہ وار پروگرام میں ایک نیوز Anchor اور تجزیہ نگار کے رول میں نہ صرف اپنے آپ کو ثابت کیا بلکہ دوسروں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال بن کر ابھرے۔ پھر ان سے میں نے ایک سیریل بھی لکھوایا جو ''شب رنگ'' کے نام سے آج بھی ٹی وی کے مقبول ترین سیریلز میں شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سیریل 1982 کے آس پاس اختتام کو پہنچا۔

غلام نبی خیالؔ کا تعارف قدرے مشکل عمل ہے۔ آپ شاعر خیالؔ سے ملنے جایئے تو ضرور صحافی خیالؔ سے مل کر آئیں گے۔ آپ ناقد خیالؔ سے گفتگو کیجئے بعد میں معلوم ہوگا کہ آپ محقق خیالؔ سے گفتگو کر رہے تھے۔ آپ عالمی ادب کے پارکھ اور ''گاشری منار'' کے مصنف کی لافانی علمی کتاب کے خالق سے محو گفتگو ہو جائے تو بعد میں پتہ چلے گا کہ آپ چودھری خوشی محمد ناظر کے ''جوگی'' سے مل آئے ہیں۔

غلام نبی خیالؔ ایک ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت کا نام ہے۔ خیال جہدِ مسلسل کی ایک متاثر کن داستان ہیں لیکن فن اور بیش قیمت صلاحیتوں کے آگے وہ جدو جہد کچھ معنی نہیں رکھتی۔

خیالؔ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ ایک زبردست صحافی ہیں۔ جس نے کشمیری زبان کو
''وطن'' جیسا اخبار دیا۔ اس اخبار کا ''امن نمبر'' ایک ریفرنس کے طور پر ہمارے عہد کے لئے ایک بہت
بڑا حوالہ بن گیا ہے۔ اس نمبر میں چرچل سے لے کر برٹرنڈ رسل، جمیلہ بوپاشا، ڈاکٹر سویکارنو اور بلراج
ساہنی سے لے کر شمیم احمد شمیم تک سبھی موجود ہیں اور امن کو اپنے طور پر زیر بحث لاتے ہیں۔ امن ایک
نغمہ بن کر ابھرتا ہے اور خلاؤں میں بکھر جاتا ہے۔ ''امن نمبر'' میں کوئی غیبی طاقت کارفرما تھی۔ ''امن
نمبر'' امن کی دہائی دے رہا تھا اور برسہا برس پہلے کہہ رہا تھا:

یہاں ابھی بم گرا نہیں ہے
یہاں ابھی کچھ ہوا نہیں ہے
یہ ننھے بچے یہ سب کھلونے
یہ کارخانے یہ دستکاروں کا سوئی دھاگا
تم ہی سے بھائی! تم ہی سے بھائی!
امن کی بھیک مانگتا ہے

(نامعلوم)

اس کے بعد یہی وادیٔ جنت نشاں، گہوارۂ امن و آشتی خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاش بن
گئی۔ یہ ''امن نمبر'' نے پیش گوئی کی تھی کہ امن کے چراغ کو شر کی ہواؤں سے بچائے رکھنا۔

اس بات پر میرا پختہ یقین ہے کہ غلام نبی خیالؔ کو زندہ رکھنے کے لئے تاریخی کتاب ''گاشرِ
منار'' کشمیری نثری ادب میں کافی ہے اور جہاں تک شعری بصیرت اور دیوانگی میں فرزانگی کا تعلق ہے،
یہ کام عمر خیامؔ نے ان کے لئے آسان کر دیا ہے۔ جیرالڈ نے خیام کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انگریزی میں
اس کو دوبارہ کشف کیا ہے۔ خیالؔ اس کے الفاظ کے اندر ایک احساس اور ایک
قوت کی طرح بیٹھا ہے جس کا اعتراف ناقدوں نے کیا ہے۔ بقول میر غلام رسول نازکیؔ: ''یہ بات
واقعی قابلِ تحسین ہے کہ عمر خیامؔ کی رباعیات کا یہ کشمیری ترجمہ پڑھنے کے بعد آدمی ایک قسم کی تشفی محسوس
کرتا ہے، تشنگی نہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمہ کشمیری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

کہیں کہیں ایسا گمان ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب نے حسنِ بیان، شعر کی لطافت اور استعاروں کے لطیف استعمال میں عمر خیامؔ پر بھی سبقت حاصل کرلی ہے۔"

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ خیامؔ کے جو بھی ترجمے میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں میراجیؔ کا ترجمہ "خیمے کے آس پاس" کافی وقیع اور بھرپور ہے۔ کشمیری زبان کا واحد ترجمہ غلام نبی خیالؔ کا "رباعیاتِ عمر خیامؔ" ہے جو خیالؔ کو کشمیری ادب میں تب تک زندہ رکھے گا جب تک کشمیری زبان زندہ ہے۔ اس وقت اس موضوع کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا موقع نہیں ہے مگر خیامؔ خیالؔ کی ایک اور شناخت کا نام ہے یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔

آج میں ایک اور پہلو کی طرف آپ کی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہے غلام نبی خیالؔ کا مختصر سا مجموعۂ اردو کلام "شبنم کا آتش کدہ"۔

اردو ریاستی عوام کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بہت دیر تک ہماری تحریری زبان اردو ہی رہی، کاروباری، سرکاری اور ذاتی سطح پر اردو ایک رابطے کی زبان بن کر ابھری اور پھر تخلیقی سطح پر جموں سے کشمیر تک، مظفر آباد سے گلگت تک، لداخ کی بلندیوں سے سانبہ کے چٹیل میدانوں تک اردو کا سکہ چلتا رہا۔ خیالؔ نے اردو میں ایک مقتدر اخبار ہفت روزہ "اقبال" بھی لگ بھگ آٹھ سال تک شائع کیا۔ اور وہ اسی دوران اردو کی طرف راغب ہوئے۔ ان کی اردو شاعری غالب کی طرح بے رنگ من است ہی سہی، ترجمۂ خیامؔ کے پائے کی نہ سہی مگر اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

"شبنم کا آتش کدہ" میں دو حصے ہیں۔ پہلے مختصر سے حصے میں شاعر کی جوانی کے دوران کہی گئی عشق اور رومان کی تصویر کشی اور اس جذبے کی والہانہ عکاسی اور کشمیر کی خوبصورتی، حسنِ جمال، آبشاروں کی چھنک، چٹانوں سے ٹکراتی ہواؤں کی کھنک، جھیلوں کی خاموشی، ندیوں کا خرام، غرض امن کی، سکون کی اور راحت کی فراوانی ہے۔ جمالِ کشمیر کا بیان خیال نے کبھی حفیظؔ کے رنگ میں کیا ہے، کبھی خوشی محمد ناظرؔ کی اور کبھی غلام رسول نازکیؔ کے انداز میں برتا ہے۔

دوسرے حصے میں جو اس مجموعے کا بڑا حصہ ہے اُس جدوجہد کی داستانِ خوں چکاں بیان ہے جس کی ترجمانی علامہ اقبالؔ نے یہ کہہ کر کی تھی:

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس حصے میں بے اطمینانی اور عدم یقینیت کی ایک ایسی فضا ہے جس نے کشمیری عوام کو ایک مسلسل تشکیک میں گرفتار کیا ہوا ہے۔ یہ تشکیک وتوہم ایک عجیب وحشت خیز ذہنی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ اس حصے کی شاعری میں جبر و کراہ، بے رخی اک طرف اور دوسری طرف مایوسی، ڈر اور مصلحت ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں:

تیرگی میں چیختی ہے کیوں یہاں آوازِ دل

موسمِ گل پھر رہا ہے دربدر اس شہر میں

☆

میرے ارض وطن کب تک تیرا یہ حال یوں سہہ لوں

کہ گزرے صبح ماتم اور پھر شام غریباں ہو

☆

میں نے بھی اشک بہائے جو دامن پر گر کر آب ہوئے

پر دل کے غم دل میں رکھے جو آہوں سے سیراب ہوئے

اس میں تیغ وسناں کا موسم ہے جہاں گل لالہ کی جگہ خون کے چراغ جلتے ہیں۔ جہاں صبح کا بھولا شام تو کیا، کبھی لوٹتا ہی نہیں۔ حزن وملال کا یہ موسم اگر چہ اپنی شدت کھو بیٹھا ہے مگر ابھی تک جاری ہے۔ یہ وبا قابو سے باہر ہے۔ مگر اس کے اثرات ہنوز کشمیر کے رگ وریشے میں موجود ہیں۔ یہی حصہ خیال کے مجموعے کا آخری حصہ ہے۔ وہ اگر چہ اُمید کا دامن نہیں چھوڑتے لیکن جو خوف مسلسل پچیس چھبیس سال سے اس خطۂ زمین کا مقدر بن گیا ہے وہ ایک ایک لفظ میں عیاں ہے۔

اس حصے میں سرخ رنگ اور سرخ پھول زیادہ نمایاں طور پر ابھرتے ہیں۔ یہ شعوری کیفیت سہی، مگر تحت الشعور میں رچی ہوئی ایک ٹریجیڈی ہے جس میں کہیں نہ کہیں خوف زدہ راتوں اور بیمار دنوں کے زخم موجود ہیں۔ ان لفظوں میں کہیں کہیں نغمگی کے ساتھ ساتھ آگ بھی آ گئی ہے۔

غلام نبی خیال کی اُردو شاعری کشمیر کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جن ادوار کی ترجمانی کی گئی ہے وہ ایک ایپک کا موضوع ہے اور یہ کیا کم ہے کہ آنے والی نسلیں اس سے ایک حوالے کا کام لیں گی جو شکست و ریخت کا عمل اب دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے جاری ہے وہی ان نظموں کی تکنیک میں دکھائی دیتا ہے۔ شاعر ایک مربوط بے ترتیبی سے عمارت بنا کر رہا ہے۔ کھڑکیاں دروازے ایک ہی سائز کی نہیں ہیں۔ دیوار و در کے درمیان آنکھیں ابھر آتی ہیں جو بظاہر روشن ہیں۔ اسی طرح ایک الگ تکنیکی کارفرمائی وجود میں آتی ہے، جس میں شعور سے زیادہ لاشعور اور تحت الشعور کا اہم رول ہے۔

............●●● ....

......●......

• ......علی احمد فاطمی

غلام نبی خیال کی فیض شناسی

غلام نبی خیالؔ ترقی پسند بزرگ ادیبوں وشاعروں میں سے ایک ہیں۔علم وادب کی دنیا میں ان کی شناخت کے کئی حوالے ہیں۔ یوں تو وہ بنیادی طور پر صحافی ہیں۔ایک بے باک و بے خوف صحافی ،جس نے زنداں کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔صحافت کے علاوہ اِن کا گہرا تعلق شعروادب سے بھی ہے۔وہ ادیب تو ہیں ہی ساتھ ہی ایک شاعر بھی ہیں۔خیالؔ تخلص اسی نسبت سے ہے۔اس کے علاوہ تنقید، ترجمہ وغیرہ میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔بحیثیت مجموعی ان کی حیثیت ایک شاعر کے ساتھ ساتھ مفکرودانشور کی بھی ہے جس کی شاعری محض سیر وتفریح کا ساماں نہیں بلکہ زندگی سے پیکار ہے۔جس کی تنقید میں بھی ایک نظریہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ خیالؔ کوایسے شعراز یادہ پسند ہیں جن کے یہاں نظریہ کے ساتھ ساتھ جمالیاتی رچاؤ اور نفسیاتی کساؤ نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں ان کے سب سے پسندیدہ شاعر فیض احمد فیضؔ ہیں۔ یوں تو انہوں نے درجنوں شعرا پر مضامین لکھے ہیں لیکن فیضؔ پر لکھا ہوا ان کا طویل فکر انگیز اور بصیرت افروز مضمون بعنوان ''تلخیٔ امروز اور شیرینیٔ فردا کا شاعر'' ہے۔خیال رہے کہ خیالؔ صاحب نے فیضؔ کی شاعری میں اولاً تلخیٔ امروز کودیکھا اس کے بعد شیرینیٔ فردا کو تلاش کیا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر ترقی پسند شاعر اولاً لمحہ موجود میں جیتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ سنجیدہ شاعر اس میں کچھ ایسی دائمی قدریں جذب وپیوست کرتا ہے کہ مقامیت، آفاقیت میں بدل جاتی ہے اور لمحاتیت،ابدیت میں۔فیضؔ جس کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔مضمون کی ابتدا ہی ان جملوں سے ہوتی ہے:۔

''فیض ایک ایسا شاعر ہے جس کے فن کی تجزیہ نگاری اس بات کی متقاضی ہے کہ اس عمل میں فصاحت کے ساتھ اس کے ہمہ جہت فنی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لئے فیضؔ کی شاعری کے سالم

اور بھرپور حوالے دیئے جائیں کیوں کہ ایسی آفاقی اور ابدی شاعری کا انتخاب بسا اوقات مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن اس عمل، اس کے فکر وفن پر تحریر کردہ کسی بھی مقالے کا حجم فیضؔ کے نام پر مجموعہ ہائے شعر سے بھی زیادہ ہوگا جو کسی بھی تجزیہ نگار کے لئے عام طور پر ممکن العمل نہیں ہے۔''

ترقی پسند تنقید کے بارے میں عام خیال یہ رہا ہے کہ اس کے مباحث فکری ونظریاتی زیادہ ہوتے ہیں فنی کم۔ جبکہ یہ سراسر غلط ہے۔ یہاں بھی بغور ملاحظہ کیجیے کہ خیالؔ نے فن کی گفتگو پہلے کی ہے فکر کی بعد میں اور پھر کل ملا کر فکر وفن کی اصطلاح استعمال کی ہے جو اکثر ایک ایسی وحدت میں ڈھل جاتی ہے کہ جس کو الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے کہ ذکر کا بھی اپنا ایک اسلوب ہوا کرتا ہے اور فن خود فکر کے راستے تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس اقتباس کے بعد ایک شاعرانہ جملہ قلم سے نکلتا ہے جو بہت غور طلب ہے۔ ''فیض کرب کا شیدائی ہے جو حسنِ ماہ سے دل کو جلاتا ہے۔'' یہاں بھی کرب درد پہلے ہے اور حسنِ ماہ بعد میں اور یہ کرب فیض کا نیا نہیں ہے اردو شاعری میں کرب و درد اور رنج وغم کی ایک سنجیدہ و گہری روایت رہی ہے۔ میرؔ نے غم کو نشاطِ غم میں تبدیل کیا اور غالبؔ نے فلسفہ غم میں۔ جگر جیسا جذبہ معصوم کا شاعر بھی یہ کہہ گیا۔

دل گیا رونقِ حیات گئی غم گیا ساری کائنات گئی

خیالؔ اردو شاعری کی عظیم روایت سے واقف ہیں۔ ترقی پسند دانشور ہیں۔ تلخی امروز پر ان کی نظر ہے جس طرح فیضؔ کی نظر تھی۔ اسی لئے وہ فیض کی باطنی شاعری جو خارج کے دباؤ سے جنم لیتی ہے اسے دماغ سے کم دل سے زیادہ پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو قریب پاتے ہیں۔

''میں خود اس تجربے کے انوکھے دور سے گزر چکا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مولانا آزادؔ، جواہر لال نہرو، سجاد ظہیر، ناظم حکمت اور جولیس فیوچک کے علاوہ ذوالفقار علی بھٹو اور سب سے بڑھ کر میں اپنے آپ کو فیض احمد فیضؔ کے عاشقوں اور فدائیوں میں شمار کرتا ہوں۔''

تنقید کی معروضیت کے لئے کہا جاتا ہے کہ وابستگی سپردگی کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی دوری اور عدم وابستگی (Detachment) بھی ضروری ہے ورنہ معروضیت کو عقیدت میں تبدیلی ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن خیال کے مکمل شعور میں جذباتیت کم اور معروضیت زیادہ ہے۔ اس لئے اپنی تمام تر عقیدت

عشق کے باوجود، ایک سماجی کیفیت اور زندانی حقیقت نظر آتی ہے۔اسی لئے وہ اپنے دورانِ اسیری کو ان اکابرین کے دور سے وابستہ کر کے زنداں سے قریب محسوس کرتے ہیں۔ جیولس فیوچک کا جو اقتباس پیش کیا ہے وہ فلسفۂ غم کم اور فلسفہ محبت زیادہ ہے، جہاں غم شادمانی میں بدل جاتا ہے جہاں گرفتاری، سرشاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔کم وبیش یہی کیفیت وہ فیض کی شاعری میں محسوس کرتے ہیں اور بلاتردد یہ کہتے ہیں۔ ''جیولس فیوچک کا یہ اقتباس یہاں پر اس لحاظ سے برمحل اور حسب حال سے کہ فیض احمد فیضؔ کے یہاں ان دنوں کے خیالات اور حیات پرور محسوسات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔''

یہ جملہ مقالہ نویسی اور فیض شناسی کی کلید بن جاتا ہے اور وہ فیضؔ کی شاعری میں پوشیدہ ہر اُس بدصورتی کو گرفت میں لے لیتے ہیں جس کو فیضؔ نے خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی تخلیقی عمل ہوا کرتا ہے۔خوبصورت کو خوبصورت پیش کرنا آسان ہے لیکن بدصورت کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا بہرحال ایک مشکل و پیچیدہ عمل ہو رہا ہے لیکن ہر بڑا شاعر اس سے نبردآزما ہوتا ہے اور اسے کمالِ فن سے تہذیب شاعری اور تہذیب زندگی کا جزو اعظم بنا دیتا ہے۔حسنِ ذات کو حسنِ کائنات میں بدل دیتا ہے۔انفرادی عشق اجتماعی عشق میں تبدیل ہو کر کائناتی ہو جاتا ہے۔خیالؔ فیضؔ کے ان کمزور لمحوں کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں جہاں اکثر قارئین و ناقدین کی نظریں نہیں پہنچنے پاتیں۔ وہ فیضؔ کی زندگی کے ان مشاہدات و تجربات کو بھی پیش کر کے تجزیہ کرتے ہیں جسے جدید ناقد لاتعلقی ظاہر کرتا ہے اور دونوں کو الگ الگ کر کے دیکھتا ہے اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ عمدہ شاعری شعورِ علم سے نہیں شعورِ کائنات سے جنم لیتی ہے۔ بڑی شاعری صرف رومان و وجدان سے نہیں فکر و فلسفہ اور اس سے زیادہ انسانی درد و کرب سے جنم لیتی ہے۔فراقؔ گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے ۔

''انفرادیت، اگر ہم غور کریں تو سراسر مانگے کی چیز ہے۔ ہر شاعر کا وجود ہزاروں ''ہموں'' سے بنا ہے۔اس کی شخصیت و انفرادیت حقیقتاً ایک کمپوزٹ فوٹوگراف ہے بلکہ شاعر کا ہی نہیں ہم سب کے جسم تک اپنے مخصوص خط و خال کے باوجود نسل، ملک، زمانہ اور آباواجداد کی دین ہے۔''

(اردو کی عشقیہ شاعری)

ایک جگہ اور پتے کی بات کہتے ہیں۔

''عالمِ مجاز یا مادی کائنات کی عظمت کا احساس جتنا شاعر یا فن کار کو ہوتا ہے اتنا ہمہ شما کو نہیں ہوتا
ہم رومان کو حقیقت سے اور وجدان کو مادیت سے الگ کر کے دیکھتے ہیں جبکہ باطنی طور پر
سارے عناصر باہم انضمام کی صورت اختیار کر کے ایک نئی حقیقت اور نئی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں
فیضؔ کی رومانی و وجدانی شاعری پر تو سبھی سر دھنتے ہیں لیکن سماجی اور خارجی شاعری جو اسی رومان
وجدان کی توسیع ہے اسے عام طور پر اس طرح سے پسند نہیں کیا جاتا ہے۔سب آج کی اور دل
شاعری تو پسند کرتے ہیں لیکن آنے والے کل اور آئندہ لمحوں پر توجہ کم کم جاتی ہے لیکن ایک اچھا قار
اور پارکھ دوربین اور دور شناس بھی ہوتا ہے۔اسی لئے خیالؔ لکھتے ہیں ۔

''فیضؔ آنے والے کل کے تناظر کو بھی اپنی دوربین نگاہوں سے دیکھ کر بدلتے ہو
حالات کی عکاسی کرنے والا ایک منفرد فنکار تھا۔بیسویں صدی میں جہاں اُس نے ایران، چین
سنکیانگ اور افریقہ کی کشتہ سرزمین اور عوام کے سوختہ دلوں کی دھڑکنوں کو اپنے احساس کے کان لگا
پوری طرح سن لیا وہاں اس کے لاشعور میں اُن اقوام میں اس وقت آزاد ہوئے ممالک میں استعمار
شخصی حکومتوں کے ناقابلِ برداشت اور عفونت زدہ تسلسل کے اختتام کا بھی ایک اندازہ تھا۔یہ صورت
حال مصر، لیبیا، بحرین، تیونس، عراق اور افغانستان میں شعلہ بہ داماں ہے۔''

یہ جملے اور اس کے بعد کے متعدد جملوں میں آپ کو ایک نقاد کم اور صحافی کی دانشوری زیا
جھلکتی دکھائی دے گی۔یہ ایسی کوئی بُری بات بھی نہیں۔اس سے جانچ پرکھ کا سباق بڑا ہوتا ہے اور وژ
بھی۔اب اس شعر کو آپ محض لفظی رعایت تک محدود نہیں کر سکتے:

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

رزقِ خاک کی اصطلاح بعضوں کی نظر میں غیر ادبی و غیر شاعرانہ ہو سکتی ہے لیکن فیضؔ نے
اسے غیر معمولی طور پر محض قافیہ نہیں بلکہ حالیہ زندگی اور سیاست کا تخلیقی حوالہ بنا دیا۔خیالؔ کی نظر
زندان نامہ اور رودادِ قفس کے ایسے ہی عناصر تلاش کر کے اسے ایک نیا زاویہ دیتی ہیں جس سے فیض
شناسی کوسوں دور رہی ہے۔''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گے'' نظم کو سبھی پڑھتے ہیں، آگے بڑھ

جاتے ہیں لیکن خیالؔ اس کے نہ صرف پس منظر بلکہ پیش نظر کو بھی سمجھ کر لکھتے ہیں۔

''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' روزن برگ جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے جو مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہے۔فیضؔ کی اس نظم کی آفاقیت عجیب وغریب ہے۔اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی، جھانسی، جلیا والہ، قصہ خوانی، سٹالن گراڈ، ملایا، کینیا، کوریا، تلنگانہ، مراقش، تیونس سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔''

کیا اس نظم کو اس وسیع تر زاویہ سے دیکھا گیا۔غالباً نہیں اور یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ فیضؔ ایک بڑے شاعر کے ساتھ ساتھ خود ایک بڑے صحافی بھی تھے اور ذمہ دار صحافی کی نظریں عالم انسانیت پر ہوتی ہیں جو جغرافیہ کی تمام سرحدیں ختم کر دیتی ہیں۔ خیالؔ خود بھی عمدہ صحافی ہیں اس لئے صحافت، شعریت، پیغام اور انسان سب ان کے قلم اور ذہن میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں اور تفہیم وتعبیر کی ایک نئی دنیا آباد کر جاتے ہیں، جس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے یہ مضمون جو فیضؔ کی کئی ایسی نظموں کے تجزیوں پر پھیلا ہوا جسے عام طور پر فیضؔ کے قارئین وشائقین نظر انداز کر جاتے ہیں۔اس لئے کہ اس میں وہ نغمگی اور کیفیت نہیں ہے جس کے لئے فیض جانے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات سچ ہو لیکن اس سچائی سے کون انکار کرے گا۔انسانی دردمندی میں دوسرے کے غموں کی شرکت میں اور غم کے خلاف مزاحمت میں جو سرور اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے وہ وقتی سرور کے مقابلے میں دائمی ہوتا ہے اور جس کی گونج اور کاٹ دور تک دکھائی دیتی ہے اور دیر تک قائم رہتی ہے۔

ایرانی طلبا ہوں یا افریقہ کے غلام، فلسطین ہو یا مشرقِ وسطیٰ یا دنیا کا کوئی اور خطہ سب کے سب فیضؔ کی رجز خوانی کا حصہ بنتے ہیں لیکن اس رجز میں نوحہ کم، غصہ زیادہ ہے۔ دِقت کم، مزاحمت زیادہ ہے اس لئے کہ فیضؔ ان ترقی پسند شاعروں میں سے تھے جہاں امید نشاط کا دامن کبھی الگ نہیں ہوتا۔تبھی تو وہ کہتے ہیں:

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

پھر یہ کہتا ہے:

نجاتِ دیدہ ودل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور پھر آخر میں یہ لہجہ بھی در آتا ہے:

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل پہ ہی ڈالے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

ہوسکتا ہے کہ بعض جدید ناقدین کی نظر میں فیضؔ کا یہ مزاحمتی لب ولہجہ ناگوارہ، ناپسندیدہ ہو یہ کہ یہ لہجہ فیضؔ کا اصل لہجہ نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت اچھے لگتے ہیں جب بوسۂ لب کی بات کرتے ہیں بوسۂ زنجیر کا لہجہ انہیں راس نہیں آتا۔ ادبی جمہوریت میں سب کو اپنی اپنی رائے رکھنے کا حق تو ہے لیکن حق بھی اسی کو دیا جاسکتا ہے جس نے دنیا کی اجتماعی شاعری پرکھی ہو جس نے انسانی اضطراب وانتشار کی شعریات کو سمجھ رکھا ہو۔ وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ عشقیہ شاعری میں جو حسن سرگوشی کو حاصل ہے وہ مزاحمتی شاعری کا عیب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح احتجاجی شاعری کی بلند آہنگی محبت کی شاعری کو راس نہیں آتی ثابت یہ ہوا کہ ہر نوع کی شاعری کی شعریات اور جمالیات مختلف ہوا کرتی ہے۔ ایک ہی پیمانے مختلف نوع کی شاعری کو پرکھنا مناسب نہیں ہوا کرتا۔ یہ بات کم از کم ناقد کو تو سمجھنا ہی ہوگی کہ وہ عام قارئین کے مقابلے بہرحال ذی علم وذی شعور ہوتا ہے۔

غلام نبی خیالؔ فیضؔ کی رومانی ومزاحمتی دونوں طرح کی شاعری کو ان کے مخصوص انفرادی افتاد طبع اور اُس عہد کے ماحول کو ذہن میں رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ روس کا انقلاب ہو یا ہند کی تحریکِ آزادی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی ہو یا اشتراکیت کی دروں بینی، فیضؔ ان سب کو الگ الگ خانوں میں رکھنے

ہوئے بھی شیر وشکر کرتے ہیں۔ ایسا اس لئے بھی کہ انہوں نے صوفی ازم سے مارکسزم تک اور جمال سے جلال تک کا سفر اپنے مخصوص رومانی اور کہیں کہیں کلاسیکی انداز سے طے کیا ہے۔ خیالؔ صاحب نے درمیان کچھ اور واقعات جوڑے ہیں جس سے یہ عمدہ مضمون تنقید کی پٹڑی سے اُتر کر تاثرات اور واقعات کے دائرے میں آجاتا ہے، نیز خیالؔ صاحب کے اندر کا صحافی جاگنے لگتا ہے جو کبھی کبھی ضروری بھی ہوتا ہے۔ اس سے ایک سخی اور سماجی پس منظر اُبھرتا ہے اور پھر قلم سے ایسے جملے برآمد ہوتے ہیں:۔

''اسی پس منظر میں فیضؔ نے ساری دنیا کے درد کی دہکتی آگ کو اپنے دل سے ہم آغوش کر کے اسے بار بار جلایا تھا تا کہ دُکھ بھرے سنسار کی تکالیف کا آتش فشاں سبزہ زار دامن اور ترقی کے پھولوں کا سدا بہار گلستان بن جائے۔''

یہ آتش فشانی اور دردِ انسانی ہی اسے زندانی بناتا ہے لیکن زنداں میں بھی وہ نشاط کی کلیاں کھلاتا ہے، جسے خیالؔ صاحب نے بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ جس سے فیضؔ کے تصورِ حیات پر تو روشنی پڑتی ہی ہے مقصدِ حیات اور مقصدِ شاعری کے باب بھی وا ہونے لگتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

اسی مقام پر وہ نظم ''دریچہ'' کا خوبصورت اور معنی خیز تجزیہ کرتے ہیں۔ ان جملوں کو دیکھئے:۔

''دریچہ'' فیضؔ کی وہ دہکتی اور حدت و حرارت سے بھرپور نظم ہے، جس کا تانا بانا اس نے زنداں میں تصوراتی طور پر اس وقت باندھا ہوگا جب وہ جیل کی کسی کھڑکی سے باہر دیکھ کر اور پہروں تک ٹکٹکی باندھ کر ہر چیز کو اپنی نظروں میں سمو لیتا ہے...... وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب کر انسانی زندگی میں پیچھے کی طرف مڑ کر جھانکتا ہے تو وہاں پر اسے ہزاروں سچ صلیبوں پر اپنے خون چکاں چہرے لئے لٹکے نظر آتے ہیں۔ انسانیت ماتم کناں ہے کہ جن عظیم انسانوں نے ایک عام آدمی کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کے لئے اپنی زندگیاں صرف کیں انہیں بعد میں دارورسن کی آزمائش سے گزرنا پڑا۔''

اور پھر اسی وطن پرست اور انسان دوست کی گفتگو سے مضمون آگے بڑھتا ہے جو پھیل کر عالمِ انسانیت کا مرکز و محور بن جاتا ہے۔ یہ تنقیدی جملے بھی کس قدر کام کے ہیں:۔

''شاعری دنیا میں خوبصورتی کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ یہ وہی خوبصورتی ہے جسے کیٹس نے Truth is beauty, Beauty is truth کہا تھا۔ فیضؔ نے خاص طور پر اپنے قید و بند کے چار سال کے دوران اس حدیث دِل کے صحیفے کو اپنے فن کی جولانیوں سے آراستہ کرنے اور اسے دنیا تک پہنچانے کا ایک عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا ہے۔''

کچھ اور جملے بھی ملاحظہ کیجئے:

''فیض کے یہاں تخلیقی عمل میں ترتیب نظر نہیں آتی۔''

''کلام فیضؔ میرے لئے انجیل کا درجہ رکھتا ہے۔''

اور مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے۔

''فیض احمد فیضؔ حال کا ترجمان اور مستقبل کی بشارت کا شاعر ہے۔ وہ امید اور سرخوشی کا منادی ہے۔''

خیالؔ صاحب کے اس طویل وگراں قدر مضمون میں اگرچہ حقیقت ومعروضیت ہے لیکن کہیں کہیں عقیدت بھی ہے۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تنقید کا مربوط ومنضبط رشتہ اور رویہ نظر نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے یہ بات سچ ہو لیکن یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ خیالؔ (professional) کے نقاد نہیں ہیں۔ وہ شاعر ہیں اور صحافی بھی۔ اس لئے ان کے مضمون میں صحافت کی صداقت اور وسعت اور شاعرانہ کیفیت نظر آتی ہے جو دل کو لگتی ہے۔ انہوں نے فیض کی محبوب شخصیت اور محبوب شاعری دونوں کو جس طرح جانچا پرکھا ہے وہ متوجہ کرتا ہے اور متاثر بھی کرتا ہے اور الگ الگ قسم کے فیض کو پیش کرتا ہے۔ فیضؔ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مستقبل میں بھی لکھا جاتا رہے گا لیکن اس طرح کے تاثراتی ونیم تنقیدی مضامین کم پڑھنے کو ملیں گے اور یہ جذبہ تو بالکل ہی نہیں ملے گا:

پھولوں سے مہکتا ہوا یہ تذکرۂ فیضؔ

شاید میرے صحرا کو بھی گلزار بنادے

میں اتنے اچھے مضمون لکھنے کے لئے خیالؔ صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

............●●● ....

شفیع شوقؔ ......●

خیالؔ کی شاعری: خیالات کی شعریات

شاعر کے مزاج اور اس کے اسلوب کے درمیان رشتہ لازماً واضح ہونا چاہیئے اور پھر جب شاعر کے نام کے ساتھ بھی اس کا رشتہ سامنے آجائے تو وہ حسنِ اتفاق بھی ہے۔ خیالؔ نے جس زمانے میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا، وہ ہر لحاظ سے خیالات کے ردو قبول کا زمانہ تھا۔ ایک طرف سماج میں شاعر کی حیثیت روایت شکن خیالات کے ترسیلی وسیلے کی تھی اور دوسری طرف روایتی اقدار، عقائد اور تصورات کے استحکام کی خاطر شاعر سے تعاون کی توقعات وابستہ تھیں۔ بہر صورت اس زمانے کی تمام شعریات خیال مرکز (logocentric) تھی۔ خیالؔ نے اس ماحول میں اپنے بزرگ اور اپنے معاصر شعرأ سے ہم نوا ہوتے ہوئے بھی اپنی منفرد آواز کی تلاش میں اردو، فارسی اور انگریزی شاعری کا مطالعہ کر کے اپنے الگ شعری اسلوب کا انتخاب کیا اور بعد میں اس اسلوب کو مسلسل سنوارا۔ اس میں ایک جانب بین الاقوامی سطح پر حمایت تغیرات کے تصوّرات تھے اور دوسری جانب مقامی، روحانی اور اخلاقی اقدار سے پیوست رہ کر سماج میں رشتوں کے دوام کی حمایت تھی۔ تغیر اور دوام میں توازن قائم رکھنے کا شعور آج تک خیالؔ کی شاعری کا منفرد انداز ہے۔

خیالؔ نے ہر جانب خیالات اور تصورات کی آمد و رفت کے ساتھ اپنے ذہن اور شعور کو وا رکھا اور اسے جمود سے بچائے رکھا۔ خیالؔ اس کی شاعری کی طاقت ہے کیونکہ خیال ہی انسان کی سرشت میں تمام ضعیفی کی نفی ہے جو اسے معرضِ مثال میں 'دست بریدہ' (غالب) کی قوّت بخشتا ہے۔

اے خیالِ قامت آہِ ضعیفاں راعصا

بررخت نظارہ ہار الغزش از جوشِ صفا (بیدل)

لمحہ بہ لمحہ بدلتے خیالات کی وابستگی کے بغیر خود انسان اور انسان کے اطراف آب و نار، خاک و باد سے بنی یہ کائنات باعثِ ملال حد تک یک رنگ اور نفرت انگیز ہے۔

'خیالنامہ' خیال کی ایک نظم ہے، یہ اس کی کلھم شاعری کے تخلیقی عمل کی غمّاز ہے۔ شاعر کی زبان دشت تنہائی میں ایک ایسا سفر ہے جس میں ہر ایک قدم نئی حقیقتوں کا سامنا کرتا ہے۔ کوئی بھی حقیقت اس لئے طے شدہ معروضی سچّائی نہیں ہے۔ مسلسل دریافتوں کا عمل تبھی ممکن ہے جب شاعر اپنی تنہائی سے اُلفت رکھ کر آگے بڑھنے کی حرکت کو ہی اپنی منزل بنائے جس سے بنی بنائی منزلیں رد ہو جاتی ہیں۔ ٹھوس سچّائی ontic ایکدم ontological سچّائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یتھ گٹہ کارچہِ رُدہ راۓ ژ اندر کوّت پتھ چھک تنِ تنہا دژ امُت
چھک باسان کمہِ تاں پردیسگ یوّت آسکھ ڈل سائلس آمت؟
اسمانہ وسان رُدہ پاں ژادر قطرُک تہِ نہ گُنہِ کنۍ سڑ یہہ پھیران
وچھ سڑکہِ چھِ اندہ وند گرد ووتھان زن سوختہ سیٖن دِہ نیران

ترجمہ

اندھیاروں کی اس بارش میں کس اور چلا تنہا تنہا
پردیس کے باسی لگتے ہو، ڈل کی تم سیر کروگے کیا
آبشاری بارش برسے ہے قطرے کی نمی دکھلائے نا
جلتی سڑکیں، جلتے سینے ، ہے دُود میں لپٹی یہ دنیا

ایسی صورت حال میں شاعر کی ہر بات تفہیم سے محروم ہے کیونکہ دنیا اپنے شور و غوغا کو ہی اپنی عادت بنائے بیٹھی ہے۔ عادت سے مجبور لوگوں کو نئی بات دیوانوں کا مزخرف لگتی ہے جس کا دستورِ زبان ان کے قاعدہ بند اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ شاعر ہجوم میں شامل ہونے سے گریز کر کے اپنی دھُن میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے:

یمہِ بازرہ کِس گُل گوشش منز یوسہ کتھ باوکھ سوے کتھ راوی

یمہِ وانہ ژیہ یِمنی موڈن پِپٹھ وتہ ہاوُکھ ژھاران وَتھ راوی

ترجمہ

اس شور بھرے بازار میں سچ کی بات نہیں رہتی باقی

ہر موڈ فروش گاہ پاؤ گے، پرسش کرو، کھو دو رستہ

خیالؔ تمام فریب شکن حالات کے باوجود شاعر کو آج بھی رہنما کی حیثیت اختیار کرنے کے یقین پر قائم ہے کیونکہ اس میں نئے فریب تعمیر کرنے کی سکت ہے؛ نئے فریب قائم کر کے وہ جمود میں جنبش پیدا کرسکتا ہے۔

یَتھ ژھوپہ ہندِس شہرس اندر مَس ہِندِرہ تُجم وزہ نأوم کتھ

یمہِ گلہ ونہ تشینچ ترأوم کتھ ہُمہِ کھسہٕ وُنہِ سِریچ بأوم کتھ

ایمانکہِ ورق تھٲوِم سومبرِتھ اخلاصس بُتھہ پٹھہٕ گرد چھِم

سأری دِل پوشکو پأٹھی زٕچھم بَس پننی وأنج تاوِہ تجم

ترجمہ

اس شہرِ خموشی میں سوئی باتوں کو جگایا ہے میں نے

یخ بستہ جمود بھلا کر میں نادیدہ خاور لے آیا

اوراقِ پریشان ایمان کے شیرازہ میں لے آیا ہوں

ہر دل کو پھول سمجھ کر ہی اپنے دل کو جلتا رکھا

خیالؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا سے سخنوری کو پیامبری کے متوازی رکھا کیونکہ وہ مانتا ہے کہ شاعری زمانہ قدیم سے ہی سماج میں تزکیہ کا کام کرتی آئی ہے اور اسی بنا پر شاعر کو پیامبر VATES کہا گیا ہے۔ چونکہ شاعر فلکی الہام کی قوّت سے ہی شعر کہتا ہے، شاعری اس کی نظر میں vaticination کا عمل ہے۔ اس خیالؔ نے اپنے شعری مجموعے کو 'الہام' کے نام سے ترتیب دیا اور شایع کیا۔ شاعر ایک غیر معمولی وجدانی صلاحیت کی وساطت سے زبان سے نئے معنی حاصل کر کے قاری یا سامعین کیلئے شعور کی

نئی وسعتوں کو جگاتا ہے۔ 'آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں'۔ اور شاعر کا منصب ایک صریرِ خامہ کا سا ہے۔ وہ آج بھی اس عقیدے پر قائم ہے کہ شاعری انفرادی ہو کر بھی ایک سماجی پیداوار ہے جس کی اہمیت صرف اس کی سماجی افادیت پر مبنی ہے۔ شاعری کی زبان کتنی ہی انفرادی ہو، یہ آس پاس کے لوگوں کی زبان ہے اور اس کے استعمال میں ہی سخنوری کو پیامبری کے متوازی جانا گیا ہے۔ خیالؔ نے ابتدا سے ہی لوگوں کے ساتھ براہ راست رشتہ جوڑ کر ان کے زمانی اور مکانی مسائل کو اپنے اشعار اور نظموں میں پیش کیا ہے لیکن محض ترجمانی کرنے کے بجائے اس نے خود کو پیغام کے کارگر وسیلے کا منصب سونپا ہے۔ اس سے پہلے کے دو شعری مجموعوں کے نام بھی اس شعری نکتۂ نظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں: 'زنجورِ ہُند ساز' (زنجیر کا ساز)، اور 'پراگاش' (روشنی)۔

خیالؔ کی اکثر نظموں میں کردار، کردار کے آس پاس کی اشیا، کردار کے ذہنی اور جذباتی اُتار چڑھاؤ، زندگی کے آفاقی اور دائمی مسائل کی جانب شاعر کے اپنے ذاتی تصوّر کے تحت نمو اور وجود پاتے ہیں۔ اشیا اور حرکات کے درون میں اور ان کے مابین خواص حقیقی رشتوں کی آزادانہ حیثیت نہیں بلکہ یہ سب سماج کے تئیں شاعر کے طے شدہ ارتکاب اور تعہد کے تحت نئی نئی ترتیب اور تہذیب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کئی نظموں میں طلب اور امّارہ سے بھرپور کردار مادین ہیں۔ شاعر ان کے اندر گھس کر ان کے پرشور جذبات اور احساسات کو خود اپنے اندر مردانہ شخصیت کی نظر سے محسوس کر کے الفاظ میں سموتا ہے۔ نظم 'نارُک سران' (غسلِ آتشیں) میں انگریزی ناول نگار Rider Haggard کے مقبول ناول She: A History of Adventure میں مرکزی کردار عایشہؔ کے نقطہ نظر سے محبوب کیلئے تڑپ کو محسوس کر کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ جنوبی افریقہ میں سکونت کرنے والی عایشہؔ نام کی یہ عورت ایسی ہے جسے ناول نگار نے She-who-must-be-obeyed کا نام دیا ہے کیونکہ اس کی طلب سیر نشدنی کی حد تک باقی ہے اور یہی زندگی کی دائمی حرکت کی باعث ہے:

نالہِ یمہِ روٗٹ شولہِ وُن نار تہِ ناراہ چھووُن
ساسہِ بدٕ وٲرٕ یہ جُدایی ہندٕ یمس بُرنزٕ باسیٔے

ترجمہ

جس نے بھی شعلہ افروز آتش کو سینے سے لگایا

ہزاروں سال کی دوری بھی اُس کیلئے لمحوں کے برابر ہے

میانہِ بیمار زُوو یمہ گرِہ گرٛش تام کُتھ

زندگی چھے لاوِہ لنجہِ پیٹھ شِنہ تھوٚس ہش باسان

ترجمہ

اے میری بیمار وافسردہ جان، چند لمحوں کی مہمان

زندگی ایک تازہ شاخ پر ایک ذرّہ برف دکھائی دے

امید اور اعتماد ہزاروں سال کی جدائی کے کرب کو ایک فعال اور کاری طاقت بناتا ہے اور حق اور نجات ایک ایسا شہزادہ جس کی آمد مقرر ہے۔

رأژ ہُند پردہ تُلوِ پردہ تُلوِ تلمہ کریوس

نورہ محلک روپہ شہزادہ ہَنا وِنہِ کڈہ ہون

رُودہ شرانبن تہ ترٛٹن منٛز تہِ چھ سونزل ناپان

ترجمہ

پردۂ شب کو دور ہٹاؤ اسے تار تار کردو

نور کے محل میں رہنے والے شہزادے کی پہچان کرو

تند اور تیز طوفانی باران میں ہی قوس قزح جگماتا ہے

خیالؔ کی مشہور نظم 'ریشماں' میں بھی ایک طلب انگیز مادین کردار ہے، لیکن یہ ایسا persona ہے جو زمانوں اور مکانوں سے مبرا ہے اور زندگی میں ناممکن تکمیل کیلئے جنبش اور حرکت کی علامت ہے۔ اگرچہ ''ریشماں'' پہاڑی قبیلے کی جھونپڑی میں رہتی ہے، لیکن وہ اپنی فطرت اور ضرورت کے اعتبار سے اپنے مخصوص مقامی اور تمدّنی پس منظر سے نکل کر عالمگیر طاقت کی صورت اختیار کرتی ہے اور محدود جسم سے مبرّا ہو کر علامتی معنی کا مجسم بن جاتی ہے۔ نظم کی ابتدا میں ''ریشماں'' اپنے زمانہ کی

شاعری سے ہم آہنگ ہوکر ایک گوجر لڑکی کی صورت میں سامنے آتی ہے کیونکہ اس دور میں مختلف طبقوں سے جُڑے مادین کرداروں کو شاعری میں جگہ دینے کا رواج تھا۔

نیر گڑھ ہُتھ بالہٕ تیٖنٛتاٮِ۪س نِشن
ہُتھ گجرِ ڈوکس اندر چھے ریشماں پژاران ژیٖی
گرم شوقن تس چھِ صبرِ کر بانہٕ بُرِ برِ تھاوِ متی
کُس پوہول چھے زاگہِ ژھ ژھ چھے توَے
مُژ جوانی گانگلن ہندی سوٗتھی ژٹان
مکژِ ٹاساہ زیٖٹھِ کریکھاہ کارِہ دوگناہ پیوو پتھر
جتگلہٕ کمن خودرَ و گلبن خُنہ سران گوو
نیر گڑھ ووِنی شورہ پتھرس آب تراو
نارنے ژھیوٚ رووسہ چھُ ادہ ژھٹ کڈان
ٹرایہ کس شہرس اَوے تہراج گوو

ترجمہ

چلوان پربتوں کے بیچ میں
گوجروں کے ایک کلبہ میں
کہ وہاں ریشماں تمہاری منتظر ہے
گرمیٔ شوق نے اس کے کاسہ ہائے صبر کو لبریز کیا ہے
کیوں اس طرح خوف سے لرزتے ہو
کوئی چوپان تمہاری تاک میں نہیں
دیوانی جوانی بے عزمی کے کناروں کو اپنے ساتھ بہا لیتی ہے
چل، اور اپنی تپش کو ٹھنڈا کر
ورنہ تپش ہی آتشِ وحشی بن کر تمام گردوپیش کو خاکستر بنا دیتی ہے

ٹرائے کا شہر بھی ایسے ہی راکھ میں تبدیل ہوا تھا۔

ٹرائے کے شہر کا ذکر کرتے ہی ریشماں زمانوں اور مکانوں کی حدود سے نکل کر انسانی تہذیب کی تاریخ میں مرکزی قوتِ حیات کا روپ اختیار کرتی ہے۔ تکمیل کی جانب محبوب ہی انسان کی نا قابل تنسیخ جُہد کی علامت ہے جو موت اور جمود کو شکست دے کر انسان کے جسدِ خاکی کو اور اس کے ارادوں میں جلا اور جنبش پیدا کر کے ایک قابل احترام انسانی خوبی کی طرف اشارہ ہے۔ تکمیل کی تمنا اور تسخیر کا شوق حُسن کے پیچھے انسانی فطرت میں 'کُن فیکون' کا عمل ہے جس کی بنا پر آدم خاکی تمام مخلوق میں ممتاز ہے۔ ازلی گُناہ (Original Sin) کے فاجعہ آمیز واقعے کے بعد عالم فانی میں قدم رکھتے ہی انسان فطرت میں حُسن کی تلاش کیلئے سرگرداں ہے اور اسی سرگردانی کا نتیجہ انسانی تہذیب کی تاریخ ہے۔ انسان کبھی Agamemnon کا رُوپ اختیار کر کے یونانی فوج کا سالار بن کر مینلاس (Menelaus) کی خاطر ٹرائے شہر پر حملہ کرتا ہے کیونکہ پیرس (Paris) نے مینلاس کی محبوبہ ہیلن (Helen) کو اغوا کر کے وہاں قید کیا تھا۔

Trojan War کے اس بنیادی واقعے کو خیالؔ نے ریشماں کی شکل میں پھر دیکھا اور پیش کیا ہے۔

ہے اگا میمنانہٕ سند بو فوٗجی یَو
یُتھنہٕ سونچو آسہِ کیاہ اَنجام تَس
یُتھنہٕ زاٗنو کانٛہہ اجتمس ماچھُس کیتھ چاہ کھنان
ماٗلیٖ کراٗفی جینیا قربان یِنہٕ تہٕ اَتھ سٕنو
تہٕ چھو کڈیٖ متہٕ جنگس تہٕ جنگ کُرِو
پین کھاٗرِو کرتلن نیزن گرٛھو کھہرن دِوان
اومگر میدانِ جنگس منز یِہن تھاٗو وژنس
اکھ ہیلن یِیہِ باز ساسَن آسِہ دژامژ کل تو تام

ترجمہ

اے اگا ممنان کے سپاہیو!

کبھی انجام کے بارے میں فکرمند مت رہو

کبھی ان وسوسوں کو دل میں جگہ نہ دو کہ آگا ممنان کا کیا ہوگا

کہ ایجس ستھس (Aegisthus)

اس کو قتل کرنے کا ارادہ کئے پہلے ہی تیار ہے

تمہارا کام ہے بس برسرِ پیکار رہنا

جنگ جاری رہے

اپنی تلواروں کو آب دیتے رہو

ہاں یہ بھی ہمیشہ یاد رکھو

کہ ایک ہیلن اگر بازیاب ہوگی،

اُس جیسی ہزاروں ہیلنیں پیدا ہو چکی ہوں گی۔

مختلف قوموں کی تاریخ اور داستانوی ادب سے ماخوذ تلمیحات کے ذریعے خیال اس یقین کو تقویت دیتا ہے کہ حسن اور عشق کا ناقابل تنسیخ رشتہ ہی وجود میں حرکت کا باعث ہے۔ فرداً فرداً انبساط اور یاس کی کیفیتیں محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ فرد کا کام موجودات میں حسن کی تلاش کر کے اس کے ساتھ والہانہ جذباتی رشتہ بنائے رکھنا شخصیت کو وقعت اور وقار بخشتا ہے۔ ورنہ حسن اور عشق کی الگ الگ کیفیتیں وقت کے ساتھ فنا پذیر ہیں۔ خیال محبوب کے ساتھ ہم کلام ہو کر بھی اس سے دور جا کر 'اندیشہ ہائے دور دراز' کا اظہار کرتا ہے، حسن کے ساتھ اسکا رشتہ مماسی یعنی (tangential) ہے جو حسن کو باہر سے چھو کر آگے نکلتا ہے۔ خیال کی شاعری کے بارے میں یہ تعمیم ہر نظم میں محسوس ہوتا ہے؛ 'وقت چھُ پھران کمن کمن' (وقت سب پر حاوی ہے) اسکی ایک مثال ہے:

ژ یہ یوٚ دوَے زندگی ہندہ پھُلیہِ بأ تُگ لوب چھے رژھرُن
زمانس کُن وُچھت کووہ چھک ٹُلان موچ سو وأ ران کتھ؟
پچ اَکھ ژھایہ رژھ چائِس وجودس گژھ نہٕ ہرگز پینٔ
خداہ تھوُی نَے سلامت! نتہٕ ژلَن عرشس تہِ تھم نیرِ تھ

تَنے گرٕتاں دوہی گے یلہِ سمے مند ننبن یِتھ آیو

میٚہ اوسس طمہکس مجمس غمُک سرپوش تھوٚد تلمُت

خبرِ کس اُس تیو نگلن پٹھ یہ تھوِہ میونے حریُرو دِل

ترجمہ

بہارِ زندگی کے گیت سے جو عشق رکھتے ہو

زمانے کی طرف نظریں اٹھا کر کیوں کرو گے موت کی باتیں؟

میں چاہوں اس کا کوئی سایہ بھی تُم پر نہ پڑنے پائے

سلامت تُم رہو! وَرنہ ستونِ عرش ہل جائیں

کہ چند ہی روز پہلے خود زمانہ میرے در پر تھا

کہ میں نے خواہشوں سے غم کا وہ سرپوش اٹھایا تھا

نہ سوچا تھا کہ انگاروں پہ ہوگا یہ حریری دل

حسن کا شعور ذی حس فنکار کو موت پر تسخیر پانے میں معاون ثابت ہوتا ہے کہ جب وہ اس حقیقت کی پہچان کرتا ہے کہ حسن کے الگ الگ پرتو اگرچہ وقت کی تخریبی قوّت کے سامنے آتے اور جاتے ہیں مگر حسن کائنات کا جوہرِ نمود ہے کہ یہ بار بار خود کو دیکھنے کا متمنی ہے۔اس رُو سے حسن لازوال ہے۔

چھُ موتچ ہٕنٛز حقیقت ووٕنی میٚہ نِش سِردار اَفسانہ

مہ کر اَتھ سُورہ ڈیرِس پھُیٚر ژیہ بوڈنے چاندِہ گلُو پِنٛنی

میٚہ یَتھ زہراب پیالس تریشہ پیالُک ناو دِتھ موٕنی گرٕ

ژیہ چھُے تتھ کُن ؤچھتھ میٹھبن وُٹھن ہُند میوٚٹھ رَس ہوٚکھمُت

خداہ تھوی نَے سلامت ! یُتھنہ عرشس تھم ژلن نِیرتھ

ترجمہ

حقیقت موت کی میری نظر میں اک فسانہ ہے

نہ چھیڑو راکھ کو اب، ہاتھ تیرے میلے ہو جائیں

میں نے تو کاسۂ زہراب کو اک جام سمجھا ہے

تیرے نازک لبوں نے خوف کے باعث نمی کھوئی

سلامت تُم رہو! وَرنہ ستونِ عرش ہل جائیں۔

یہاں پر شیکسپیئر کا سانیٹ-18، پیش کریں تو بے محل نہیں ہوگا:

Shall I compare thee to a summer's day?
Thou art more lovely and more temperate:
Rough winds do shake the darling buds of May,
And summer's lease hath all too short a date;
Sometime too hot the eye of heaven shines,
And often is his gold complexion dimm'd;
And every fair from fair sometime declines,
By chance or nature's changing course untrimm'd;
But thy eternal summer shall not fade,
Nor loose possession of that fair thou ow'st;
Nor shall death brag thou wander'st in his shade,
When in eternal lines to time thou grow'st:
So long as men can breathe or eyes can see,
So long lives this, and this gives life to thee.

خیالؔ کی بہت ساری نظمیں، حتیٰ کہ سیاسی نظمیں بھی، 'تصور جاناں' کو معرضِ خیال میں لاکر اور معروضات کا انتخاب کر کے لسانی متن تشکیل دیتی ہیں۔اس طرح کی شعریات میں معروضات کے زمانی، مکانی، اور مادی وجود اور معروضات کے مابین قابل ادراک رشتوں کی ثانوی اہمیت ہے۔حسن ہی حقیقت ہے اور حقیقت ہی حسن۔اس سچائی کے ادراک میں انسان کی آزادی مضمر ہے۔خیالؔ کی نظم 'آج کا یہ دن' حسن، حقیقت اور آزادی کے تلازمی رشتے کی موزون مثال ہے:

از یک دوہ چانہ لسنگ میانہِ بسنگ دوہ

از یک دوہ شیٖنہس منز سأل کرنگ زونہِ کھسنگ دوہ

یہِ دوہ یُس اننہ باپتھ خونِ دلہٕ ستۍن ژ اسہِ رۆنگ

یہِ دوہ یمہِ کِس کزلی شامس فِداہ کوٚرگاش چشمن ہُند

یہِ دوہ یُس تاپہ مندنٕن پھوٚل مشک ژھٹہ وٕن گلاباہ ہٕیو

اماوِسی راٗژ منز زَن تارُکھاہ پرٕ یزلیوو

یہِ دوہ یمہِ کِمن بُرنزٕن دعاے خاٗرکری کری شانت سپدان دِل

یہِ دوہ یُس شُری اَسُن ہیٚو تھنہٕ چھُ پیومُت لُولی سمیَس منز

ترجمہ

یہی دن ہے ترے اور میرے جینے کا

یہی دن ہے خلاؤں اور ستاروں، وسعتوں میں سیر کرنے کا

یہی وہ دِن کی جس کی صبحِ تاباں کی تمنّا لے کے خونِ دِل بہایا ہے

یہی وہ دِن کی جس کی سُرمئی شاموں کی خاطر ہم نے اپنی دید قرباں کی

یہی وہ دِن کہ جومہکا گُلِ معطر کی مانند دھوپ میں روشن

اماوس کی گھنیری رات میں کوکب ہے جو روشن

اسی دن کے ہر اِک لحظہ کی خاطر ہم دعائیں مانگیں،

سکونِ قلب پائیں گے

یہ دِن ضامن ہماری برکتوں کا، پائیداری کا اور یاری کا

کہ ایسے دِن میں مائیں گود میں ننھوں کو لینے کی کریں خواہش

یہی دن ہے کہ ہر شاعر کی روح بھی نغمہ خواں ہو جائے

کہ ایسے ہی دنوں میں وقت بانہوں میں بہاریں کس کے رکھتا ہے

یہِ حُسنچ ٹاٹھ وِز قائیم یہ لولُک میوٹھ دم باقی

خلوصچ دری پزٕ یک دستورایما نُک قسم باقی

وٕ ڈِنِ آکاشہ پیٹھی یاہُو گوٚن بُتراٗژ ہندی بُلبل

ۂ زِن قندیل آسن ہندی ۂ زِن سنطور ستون ہندی

زمانکہِ دأ ٲدی لدٕ محبوبہ! اوٗش ووتھراوغزلاہ تُل

یہ دوہ منگی منگی اوٗنم یہ چھُ چانہِ آسنُک دوہ

یہِ دوہ انسانہ سندِ ہ لسنُک تہٕ بسنُک دوہ

ترجمہ

ابھی تو حسن تاباں ہے، ابھی ہے عشق کا جوبن

ابھی دستورِ حق باقی، ابھی ایمان ہے محکم

فلک کی وسعتوں میں کوئلیں اُڑتی رہیں ایسے

زمیں پر نغمہ خواں ان بلبلوں کو، کوئی نہ روکے

قندیلِ آرزو روشن رہے، سنطور بجنے دو

زمانے کے ستائے افسردہ اے محبوب!

آنسو پونچھ، غزلیں گا!

گوٗان تِتھنی دوہن پیٹھ شاعرن ہندی رُوح

رٹان تِتھنی دوہن اندر چھُ موسم نالہِ متہِ سونتس

ترجمہ

ترے ہی طرب کی خاطر یہ دن میں مانگ کر لایا

یہ دن انساں کے جینے کا یہ دن انساں کے ہنسنے کا

آدم خاکی کی آزادی اور اسکے نتیجے میں حاصل طرب کی ضمانت اس بات میں مضمر ہے کہ انسان زندگی کے ہر لمحے کو بیش بہا جان کر اس میں جی لے:

چوں ابر بہ نوروز رخ لالہ بشست　　　برخیز و بجام بادہ کن عزم درست

کاین سبزہ کہ امروز تماشا گہ تست　　　فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

(خیام)

...........●●● ....

● ......قدوس جاوید

غلام نبی خیال: معتبر و مستند محقق

کن فیکون کے اسرار و رموز خدائے بزرگ و برتر ہی جانتا ہے۔ انسان اپنے محدود ماحول یا بے کنار کائنات سے متعلق اگر قلم اٹھاتا ہے تو اسے بھی توفیق خداوندی ہی ماننا چاہئے اور خداوند خود بھی چاہتا ہے کہ وہ جو صاحبان فکر و فن ہیں وہ اپنے قلم کے وسیلے سے حقائق اور مسائل کی پردہ کشائی کرتے رہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پہلی مخلوق جو خدا نے پیدا کی وہ قلم ہی ہے۔ اوّل مخلوق القلم (ترمذی شریف)۔

لیکن قلم 'علِم' بھی ہے، 'عمل' بھی اور 'علَم' بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ غلام نبی خیال کی تازہ ترین کتاب ''خیال قلم'' کو کس خانے میں رکھا جائے؟ اس کا جواب ہر اس شخص کو معلوم ہے جو خود کبھی کشمیر کے حوالے سے اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے اور ان کو بھی جن کے ورطۂ خیال میں کشمیر بستا ہے۔ غلام نبی خیال کی ''خیال قلم'' میں شامل تحریروں کا مطالعہ ذہن پر تاثر کی پہلی چھاپ یہی چھوڑتا ہے کہ اگر کشمیر سے متعلق اضافی علم حاصل کرنا ہو، کشمیر کو عصری حالات کے جبر سے نجات دلانے کے لئے لائحہ عمل طے کرنا ہو یا پھر فرسودہ سیاست سے الگ تعمیری اور منطقی انجام تک پہنچنے کے لئے علم بلند کرنا ہو تو ''خیال قلم'' کا مطالعہ ضروری ہے۔ غلام نبی خیال نے فیض احمد فیضؔ کا یہ شعر نقل کیا ہے:

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

الفاظ فیضؔ کے قلم سے نکلے ہیں لیکن مضمون کی جڑیں ہر کشمیری کے ذہن و ضمیر میں بہت دور، بہت اندر پیوست ہیں۔

''خیال قلم'' کا ایک نمایاں امتیاز اس کا [illegible] کھرا لب ولہجہ ہے جو ان کی شخصیت کی بھی پہچان ہے۔ خیالؔ صاحب نے اپنے انفرادی شعور اور اجتماعی لاشعور میں محفوظ کشمیر کی کئی دہائیوں بلکہ صدیوں کی ادبی اور ثقافتی، سماجی اور سیاسی نشیب وفراز کی تاریخ کے اشارے پیش کئے ہیں، کچھ تحقیقی، کچھ تنقیدی انداز میں اور کہیں سوانحی خاکوں کی شکل میں تو کہیں صحافتی تبصروں کے روپ میں۔ چوں کہ خیالؔ کے قلم کے روشن سمندر میں سچائیوں کا زہر بھی ہے اور امرت بھی، اس لئے اس کے منتھن مطالعے کے لئے صرف اور محض ادبی اپروچ کافی نہیں ہوگا بلکہ کشمیر کی تاریخ کی ہر لمحہ کروٹیں بدلتی لہروں کو بھی گرفت میں لانا ہوگا۔ اس مرحلے سے گزر جانے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آئے گا کہ کن لوگوں نے کشمیر کو نیا کشمیر بنانے کی کوششیں کیں اور وہ کون لوگ تھے جن کی سازشوں کی وجہ سے کشمیر، کشمیریوں کے خوابوں کا کشمیر نہیں بن سکا۔

''خیال قلم'' میں غلام نبی خیالؔ صاحب نے دونوں طرح کے لوگوں کی قطاریں پوری ایمانداری کے ساتھ قارئین کے سامنے کھڑی کردی ہیں۔ ان کے چہروں کو پہچاننا یا نہ پہچاننا قارئین کی ذمہ داری ہے۔ اس ضمن میں خیال قلم میں مولانا محمد سعید مسعودی، شورش کشمیری اور مجاز وغیرہ کے حوالے سے ان کے بعض انکشافات چشم کشا بھی ہیں اور عبرت ناک بھی۔ غلام نبی خیالؔ کی ایک اہم خوبی اُن کی حقیقت نگاری ہے۔ کبھی یہ حقیقت نشتر کی طرح دل میں چبھتی ہے تو کبھی ہونٹوں پر تبسم بھی پیدا کرتی ہے۔

منٹو اور کشمیر کے حوالے سے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام منٹو کے 19/نومبر 1952ء کے خط سے ہر شخص واقف ہے۔ اس خط کے ان جملوں کی صداقت سے کس کو انکار ہوگا:

۱۔ کشمیری خواہ مسلمان ہو یا ہندو، وہ ہر حالت میں کشمیری ہے۔

۲۔ تم کشمیر کے باشندے نہیں لیکن تمہاری روح کشمیری ہے۔

خیال کے مطابق منٹو نے اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرتے ہوئے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''مجھے ندامت ہے کہ میرے آبا واجداد نے ہجرت کی۔ جور وستم سہنا بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا فرار ہے۔''

منٹو نے اپنے مضمون میں مہجورؔ کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ خیالؔ صاحب نے اپنے مضمون میں کشمیر اور کشمیریت کے حوالے سے منٹو کے جذبات کا سلسلہ مہجورؔ کے جذبات سے جوڑ دیا ہے اور چوں کہ یہ خود خیالؔ صاحب کے بھی جذبات ہیں اس لئے انہوں نے مہجورؔ کی پانچ نظموں کے اردو تر جمے نقل کئے ہیں لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ ''کشتی'' اور ''شرابی'' جیسی نظموں کا کلام مہجورؔ میں کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ لیکن یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے پھر بھی خیالؔ صاحب کا یہ خیال غلط نہیں لگتا کہ کشمیر اور سیاست کے حوالے سے مہجور کے بارے میں مبالغہ آمیزی بھی بہت کی گئی ہے۔

''خیال قلم'' کا تنقیدی جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں شامل تحریریں روایتی صنفی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ اس تصنیف میں شامل ستائیس تحریروں میں سوانح، خاکہ، تحقیق وتنقید، آپ بیتی وغیرہ اصناف کے عناصر ملتے ہیں۔ ویسے بھی اب ادب میں اصناف کی حدیں ٹھوس نہیں رہ گئی ہیں بلکہ سیال ہو چکی ہیں۔ ''خیال قلم'' کے مضامین میں بھی مختلف اصناف کی جلوہ گری نظر آتی ہے، مثلاً سوانح نگاری کے عناصر اس اقتباس میں دیکھئے:۔

''عجیب اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب فیض احمد فیضؔ، سجاد ظہیر اور ان کے کئی احباب کو راولپنڈی کیس میں ملوث کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا تو یہاں 1958ء ہی میں مجھے کشمیر سازش کیس میں ماخوذ کر کے دو سال تک قید و بند میں رکھا گیا۔'' (ص 163)

فیضؔ کے حوالے سے ہی خاکہ نگاری کی شان اس اقتباس میں محسوس کیجیے۔

''فیضؔ اور ایلس کی شادی کے بارے میں یہ پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ فیضؔ 1938 میں امرتسر میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی قیام گاہ پر اپنی ہونے والی شریک حیات سے پہلی بار ملاقی ہوا۔ تاثیر اس وقت وہاں کالج میں فیض کا ہم جماعت تھا۔ تاثیرؔ ہی نے لندن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا منشور تیار کیا تھا جہاں اس نے فیضؔ کی منگیتر ایلس کی ہمشیرہ کرٹوبیل المعروف بلقیس کے ساتھ شادی کی تھی۔'' (ص 177)

غلام نبی خیالؔ ایک مستند محقق ہیں۔ یہ بات دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ ''خیال قلم'' میں بھی ان تحقیقی انکشافات کی نادر و نایاب مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ یہاں صرف ایک آدھ نمونہ ہی پیش کرنے کی

گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ خیالؔ صاحب کا مضمون ''گوئٹے اور دیوانِ مغربی'' ویسے تو ایک بے مثل تحقیقی تحریر کی حیثیت سے مکمل قرات کا متقاضی ہے لیکن یہاں میں چند سطریں ہی نقل کروں گا۔ خیالؔ صاحب کا خیال نہیں تحقیق ہے کہ ''جب 1813ء میں لپزگ میں جنگ اقوام چھڑ گئی تو گوئٹے کے ہاتھ میں غیر متوقع طور پر کاغذ کا ایک ورق آ گیا جو ویمرؔ کے سپاہیوں نے جنگ ہسپانیہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس پر عربی میں قرآن پاک کا سورۃ الناس لکھا ہوا تھا جس میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اعظم سے فرماتا ہے کہ:

''کہہ دے اے رسول اللہؐ، میں مالکِ کائنات سے پناہ مانگتا ہوں اُس شیطان کے شر سے جو لوگوں کے دِلوں میں وسواس ڈالتا ہے، خواہ یہ وسواس پیدا کرنے والا جن ہو یا انسان۔''

گوئٹے اس کلام اللہ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی تشریح اس کی اپنی زندگی کی تصویر بن گئی۔''

غلام نبی خیالؔ کا تحقیقی شعور کتنا بالیدہ ہے اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

''تحقیق کا صبر آزما کام اس امر کا متقاضی ہے کہ اُن قدیم ادبی اور ثقافتی خزانوں کو کھنگالا جائے جن کی چابیاں زمانے کی دست برد سے کھو گئی ہیں اور ان کے دروازے وا کرنے کے تمام راستے ہم پر مسدود ہو چکے ہیں۔ تحقیق کار کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے یا قدیم نسخے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لئے بے پناہ صبر اور استقامت کا مالک ہو جس کی بدولت وہ کسی بھی غیر مصدقہ تخلیق کو تاریخی اعتبار سے حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی توثیق یا تصحیح کر سکے۔'' (ص 194)

اسی طرح غلام نبی خیالؔ کے مضامین میں عمدہ تنقیدی رویوں کی بھی کمی نہیں۔ خیالؔ صاحب، گوپی چند نارنگؔ، شمس الرحمان فاروقیؔ یا حامدیؔ کی طرح جا و بے جا غیر مانوس انگریزی الفاظ و تراکیب استعمال کر کے قارئین کو مرعوب کرنے اور ان کے لئے مسائل کھڑے کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن خیالؔ صاحب اپنی تحریروں میں کشمیر کی سماجی و ثقافتی، علمی و ادبی اور سیاسی تاریخ کی کروٹوں کو جس طرح بنیادی حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں اس کی وجہ سے خیالؔ صاحب کی تنقید زمین سے جڑی رہتی ہے اور قارئین کو ان کی تنقید کی تفہیم اور قبولیت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اس زاویئے سے خیال صاحب کی تنقید نگاری اپنی ایک منفرد شعریات کی حامل ہے جو محمد دین فوقؔ، عبدالاحد آزاد اور رنند لال کول طالبؔ وغیرہ کے علاوہ کسی اور تنقید نگار کے یہاں کم ہی نظر آتی ہیں۔ ''خیال قلم'' میں خیال

صاحب کی تنقید نگاری کے اس انفراد وامتیاز کی مثالیں علامہ اقبالؔ، غنی کشمیریؔ، فیضؔ جوشؔ، حفیظؔ، منٹواور اختر محی الدین، خوشی محمد ناظر اور طاوؔس بانہالی وغیرہ سے متعلق ان کے مضامین میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بحثیت مجموعی ''خیال قلم'' کشمیر کے معتبر شاعر، محقق، ترجمہ کار اور صحافی محترم غلام نبی خیال کی ایک ایسی قابلِ قدر تصنیف ہے جس میں کشمیر کو مرکز میں رکھ کر شعروادب پر، سیاست اور ثقافت کی رنگ آمیزی کے ساتھ تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ ان تحریروں میں رواں دواں، تلخی امروز اور شیرینی فردا کو گرفت میں لے کر غور وفکر کریں تو آپ بھی یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ''خیال قلم'' صرف ایک کتاب نہیں، کشمیر اور کشمیریت میں ایک نئی روح پھونکنے کی پُر خلوص کوشش ہے اور اگر آپ کو کشمیر سے محبت ہے اور کشمیریت سے عقیدت ہے تو ''خیال قلم'' کے مطالعے کے بغیر آپ کی محبت اور عقیدت ادھوری رہ جائے گی۔

● ...... بشر بشیر

''جہانِ خیال'' میں کشمیر کے سنسکرت کے مشاہیر کا تذکرہ

ادب، صحافت اور تحقیق اپنی بنیادی ماہیت سے تین الگ شعبے ہیں اور تینوں کے الگ الگ تقاضے ہونے کے باوجود یہ آپس میں بہت حد تک مشترک بھی ہیں۔ اِن کی انفرادی اور مشترکہ خصوصیات کے حوالے سے کافی کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ فنِ تحریر سے وابستہ اشخاص کا ذاتی، طبعی اور ذہنی میلان کسی خاص شعبہ میں، اُن کی دلچسپی اُجاگر کر کے اسے جلا بخشتا ہے اور یوں قارئین کی نظر میں ایسے اشخاص کی اوّلین اور نمایاں شناخت قرار پاتی ہے۔ بحیثیت قلمکار غلام نبی خیالؔ اِن تینوں شعبوں سے یکساں طور اس طرح جُڑے رہے ہیں کہ یہ طے کرنا قدرے مشکل ہے کہ کِس شعبہ میں اُن کا قد اُن کی جسمانی قد و قامت کی طرح زیادہ بلند ہے۔ ادبی ذوق کی بنا پر خیالؔ صاحب اپنے ادبی سفر کی شروعات سے ہی اِن تینوں شعبوں میں متواتر قلم آزمائی کرتے رہے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر اُن کی تحریروں میں کچھ ایسی مشترکہ خصوصیات پیدا ہوئیں جن کا الگ الگ زاویوں سے تجزیہ کریں تو کہیں مثبت اور کہیں منفی نتائج مل سکتے ہیں۔

شاعری میں ایسے عناصر کی نشاندہی خاصا مشکل کام ہے تاہم اُن کی منظومات میں توسیعی استعارات (Extended Metaphors) کا استعمال اِس ضمن میں ایک نمایاں اور واضح مثال کے طور پیش کیا جا سکتا ہے۔ خیالؔ کے نثری کارناموں میں اُن کی مرتب کردہ کتابوں کے مقدمے اور تنقیدی مضامین کے علاوہ مقامی اور عالمی شہرت کے اُدبا، شعرا اور فلسفہ دانوں کے متعلق تعارف اور تجزیات شامل ہیں۔ اِس ضمن میں اُن کی کتاب گاشری مُنار (روشنی کے مینار) خاص طور سے قابل ذِکر ہے جو

1973ء میں شائع ہوئی اور جسے ساہتیہ اکادمی اور ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے ایوارڈ دیئے گئے۔ اِس کتاب میں مشہورِ عالم ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور کارناموں سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ کشمیری زبان میں ہومر (یونانی)، ورجلؔ (لاطینی)، کالیداسؔ (سنسکرت)، پشکنؔ (روسی)، گوئٹےؔ (جرمن)، اقبالؔ (اردو) اور ٹیگور (بنگالی) جیسی نامور ادبی شخصیات کے متعلق وہ بنیادی اہمیت کی باتیں بہت ہی آسان پیرایہ میں کتاب میں درج کی گئی ہیں جو ادب کے طالب علموں کے لئے خاص دلچسپ اور کارآمد ہیں۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جتنی اطلاعات اِس کتاب میں اِن مشاہیر کے متعلق فراہم کی گئی ہیں اُن تک طلباء کی رسائی سالہا سال تک عام حالات میں ممکن نہیں۔ کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کو دیکھ کر ہو نہ ہو خیالؔ صاحب کے ذہن میں یہ خیال انگڑائی لیتا رہا ہو کہ کشمیر کے اُن بلند پایۂ مفکرین، عالموں، فلسفیوں اور شاعروں کے متعلق بھی کچھ اِسی نوعیت کے مضامین لکھنے کی ضرورت ہے جو عالمی سطح پر مشہور ہونے کے باوجود اپنے ہی وطن میں اُس حد تک معروف نہیں جتنا کہ اُن کا اصل مقام ہے۔ ظاہر ہے کہ اِس میں سب سے بڑی دشواری زبان کی ہے۔ کشمیر زمانہ قدیم سے ہی علم وفن کا ایک اہم مرکز رہا ہے جس کی بنا پر پورے برصغیر میں اِسے ''شارداپیٹھ'' بھی کہا جاتا تھا۔ اِس حیثیت سے یہ جگہ اِس حد تک مقدس اور قابلِ احترام تصور کی جاتی تھی کہ حصولِ علم کے لئے گھر سے روانگی پر طالب علم اِس سرزمین کی طرف رُخ کر کے نَمن (سجدہ) کیا کرتے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مختلف ادوار میں حکمرانوں کی طرف سے مقامی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں کی سرپرستی کی گئی۔ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ درباری اور علمی سطح پر زبانوں کا استعمال بھی بدلتا رہا۔ کبھی جس زبان کا بول بالا رہا وہی بعد میں متروک ہو کر رہ گئی اور دوسری زبان کا چلن عروج پا گیا۔ اِس بدلاؤ کا سب سے نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ کسی خاص وقت میں معرض وجود میں آنے والے ادبی اور تخلیقی شاہکار عوام کے ذہن ونظر سے اوجھل ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں سنسکرت، فارسی اور عربی میں تحریر شدہ علمی ذخائر سے یہاں کے عام لوگ ناآشنا ہیں۔

سنسکرت کے حوالے بات کریں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ معیار اور مقدار کے اعتبار سے جتنا کچھ

اِس زبان میں کشمیر میں لکھا گیا ہے اُس کی بنیاد پر اِس خطہ کو ہمیشہ ایک اہم مرکز کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ ''جہانِ خیال'' میں مصنف نے سنسکرت کے چھ ایسے نامور عالموں کے متعلق تعارفی مضامین لکھے ہیں جن کا تعلق کشمیر سے ہے اور اپنی تحریروں کی وجہ سے دُنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔ اِس ضمن میں ''ابھینو گپت''، کشمیر میں سنسکرت کا گوہرِ تابدار عنوان سے نو صفحات پر مشتمل ایک مضمون ہے۔ درحقیقت ابھینو گپت کے متعلق ضروری معلومات مضمون کے آخری چار صفحات میں موجود ہیں اور پہلے پانچ صفحات میں کشمیر میں سنسکرت کے حوالے سے عمومی جائزہ درج ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھینو گپت کے متعلق بہتر جانکاری وہی شخص فراہم کرسکتا ہے جسے سنسکرت پر عبور حاصل ہو اور اس کے متعلق بنیادی مواد میسر ہو۔ اِس تمام دشواری کے باوجود خیالؔ صاحب چند ایک مضامین اور حوالہ جات کی بنیاد پر ہی اِس مضمون کا تانا بانا بُنتے ہیں۔

ایک چابکدست ادیب کی حیثیت سے زبان کے مناسب استعمال اور صحافی کی حیثیت سے خیالات کی مربوط ترتیب کاری کے ہنر نے مصنف کو یہ اعتماد بخشا ہے کہ چند تعارفی نکات کو ایک مضمون کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اصل موضوع تک آنے سے پہلے ایک پس منظر کو تمہیدی طور بیان کیا گیا ہے جو مبتدی کو اُس ماحول سے متعلق آگاہی فراہم کرتا ہے کہ جس میں ابھینو گپت جیسا فلسفہ داں اور عالم پیدا ہوا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے قارئین کے لئے مواد کی دستیابی یا نارسائی بھی مصنف کے زیرِ نظر رہی ہوگی جس کی بنا پر مبادیات پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

ویسے تو عمومی طور دستیاب ثانوی ماخذوں میں ابھینو گپت کی حیات اور کارناموں سے متعلق معلومات کی اتنی کمی نہیں ہے کیونکہ اِس عالم نے اپنی تصنیفات خاص طور سے ''تنترا لوک'' اور ''پراتر نشکا وِورنا'' میں ذاتی زندگی اور اپنے پیش رؤں کے متعلق بھی لکھا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے اتری گپت نامی شخص کا بھی ذکر کرتا ہے جس کا تعلق مدھیہ پردیش یعنی موجودہ اتر پردیش سے تھا اور جسے قنوج کے راجہ یشو ورمَن کی سرپرستی حاصل تھی۔ مشہور فاتح للتادتیہ نے جب اِس علاقہ کو فتح کیا تو اتری گپت نامی برہمن عالم سے متاثر ہو کر اُسے اپنے ساتھ آنے کی درخواست کی اور پھر اپنے وطن میں جہلم کے کنارے ایک خوبصورت گھر بنوا کر اُسے رہنے کے لئے دیا اور ساتھ ہی ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی۔

ابھینو گپت نے اپنے دادا کا نام وراہ گپت لکھا ہے جو ایک بڑا عالم اور شِو بھگت تھا۔ اُس کے باپ کا نام نرسِمہا گپت اور ماں کا نام وِملکلا تھا جیسا کہ کشمیر سنسکرت سیریز کے تحت شائع شدہ تنترا لوک کے جلد اوّل شلوک یا صفحہ 14 کا حوالہ دے کر جی ٹی دیش پانڈے نے بھی لکھا ہے۔ 180 صفحات پر مشتمل دیش پانڈے کی تصنیف کردہ کتاب جو 1989ء میں ساہتیہ اکادمی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، انگریزی میں لکھی گئی یہ کتاب اب تک چار بار چھاپی گئی ہے۔ اِس کتاب میں ابھینو گپت کی زندگی، تصانیف، خاندان، اساتذہ، فلسفہ، تصورِ وحدانیت، جمالیات، رَس دھونی، موسیقی، پرتبھا تنترا، شعریات اور تنقید کے حوالے سے اُس کی دین اور اُس کے بعد آنے والے مصنفین پر اُس کے اثرات پر کافی معلومات درج ہیں۔ علاوہ ازیں بہت ایسے اشارے بھی اِس کتاب میں درج ہیں جو قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً اِس بات سے متعلق مختصر سی بحث کی گئی کہ ابھینو گپت کا اصل نام شاید کچھ اور ہی تھا۔ چنانچہ اِس ضمن میں ''تنتراک لوک'' سے ہی بطورِ حوالہ جو سطر پیش کی گئی ہے اُس کے معنی یوں ہیں کہ اس کتاب کا مصنف ابھینو گپت ہے جسے یہ نام استاد (گرو) نے دیا ہے۔ غلام نبی خیالؔ صاحب نے پنڈت دینا ناتھ شاستری کے مضمون سے کرشن بجوا کی کتاب کا حوالہ دے کر ابھینو گپت کی ایک محفل کی لفظی شبیہہ بیان کی ہے۔ اُس کی تصویری صورت مذکورہ کتاب کے سرورق پر دی گئی ہے۔

تفاصیل اور وضاحت سے گریز کرتے ہوئے بھی یہ اشارہ لازم ہے کہ ابھینو گپت کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا تاہم وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کی بنیاد پر اپنے پیش رؤوں کے برعکس بہت مشہور ہوا۔ ظاہر ہے کہ خاندانی علم اور مذہبی طریقہ کار کی تربیت پانے کے ساتھ ساتھ وہ اُس فلسفہ سے کافی متاثر ہوا ہوگا جو زمانہ قدیم سے اِس خطہ میں موجود رہا تھا اور جسے ہم آج کی اصطلاح میں ''فلسفہ توحید'' کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر بلجی ناتھ پنڈت بہت محتاط انداز سے لکھتے ہیں کہ ممکن ہے آچاریہ واسو گپت کا تعلق بھی اتری گپت کے ہی خاندان سے ہو۔ آچاریہ واسو گپت کا زمانہ ابھینو گپت سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کا ہے اور اُسی نے دنیا بھر کے عالموں کی روحانی تربیت کے لئے ''شِو سوتر'' نام والا شاستر پیش کیا ہے جس کی اہمیت کشمیر کے شیو فلسفہ میں مسلمہ ہے۔

''جہانِ خیال'' میں کھیمیندر، سنسکرت طنز و مزاح کا بادشاہ، عنوان کا مضمون اوّل الذکر مقالہ سے زیادہ مربوط اور مواد کے اعتبار سے بہتر ہے۔ غالباً اِس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ کھیمیندر سے متعلق شعبہ سنسکرت دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر برج موہن چترویدی کے 1983ء میں ساہتیہ اکادمی کے لئے لکھے گئے مونوگراف کا ڈاکٹر چمن لعل رینہ کا کشمیری ترجمہ دستیاب ہوا ہے جس سے مضمون نگار کو بھی کافی مدد ملی ہوگی۔ فاضل مضمون نگار نے اِس ماخذ کا بحوالہ ذکر کیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ خیالؔ صاحب سنسکرت مشاہیر سے متعلق مضامین کے سلسلے میں آنندوردھن سے متعلق آخری مضمون کے اختتامی پیراگراف میں دیانتداری سے جو لکھتے ہیں وہ باقی کے مضامین پر بھی حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

''آنندوردھن پر قلم اُٹھانے سے پہلے تحقیق کے حوالے سے جو مواد انگریزی یا اردو میں مطلوب تھا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُس کی اپنی تخلیقات ''دھنیہ لوک'' کے سوا اس کی کوئی اور تصنیف موجود نہیں۔ اِن پر اگر کسی محقق نے خامہ فرسائی کی بھی ہے تو وہ تحریریں بھی سنسکرت ہی میں ہیں جن سے ہم واقف نہیں......''

فہرست مضامین کے تحت اگرچہ مذکورہ بالا عنوان ہی درج ہے تاہم اصل متن میں کھیمیندر کی جگہ ''کشمیر کا کھیمیندر'' رقم ہے جس میں آئندہ تحقیق کاروں کے لئے یہ اشارہ بھی ہے کہ اِس نام کی کچھ اور بھی مشہور شخصیات گزری ہیں۔ عنوان کا دوسرا حصہ ''سنسکرت طنز و مزاح کا بادشاہ'' لکھ کر اسے اور بھی مخصوص بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ اِس وجہ سے ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوا ہے کہ صاحب مضمون نے جو خاکہ کھینچا ہے اُس کی حدیں کچھ اِس قدر پھیلی ہیں کہ عنوان اُس کا احاطہ نہیں کر پاتا۔

کھیمیندر کی ادبی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو طنز و مزاح ہے لیکن مضمون کی عبارت پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف اسی پہلو پہ توجہ مرکوز کرنے کے بجائے اِس شخصیت کا ایک اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ طنز و مزاح کے میدان میں کھیمیندر کی چار اہم تصنیفات کا نام لیا جاتا ہے۔ اِن کتابوں کے نام یوں ہیں:۔

ا) کال وِلاس

ب) سمے ماترِکا کاویہ مالا سیریز کے تحت ممبئی میں 1886ء میں چھاپی گئیں۔

ج) نرم مالا

د) دیش اُپدیش   یہ دونوں کتابیں کشمیر سنسکرت سیریز کے تحت سری نگر سے 1923ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن چاروں کتابوں کے انگریزی میں تراجم بھی ہوئے ہیں۔

اِن کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کھیمیندر دراصل سماج کی اصلاح چاہتا ہے۔ سرکاری کارندوں کی بدعنوانیاں اور رشوت خوری، برہمنوں کی فریب کاری، کاروبار میں حرص اور لالچ، توہم پرستی، جنسی جنون، دلالوں اور خوشامدیوں کی کارستانیاں، تعلیمی طریقہ کار کی بے ضابطگیوں، شاعروں اور قلم کاروں کی سماج کے تئیں لاتعلقی، مالی نظام میں ہر سطح پر خرد برد غرض سماج میں ہر طرح کی برائیوں کا حکایات اور منظومات کی صورت میں بیباک طور دھجیاں اڑاتا ہے۔ راجاؤں کے دور اور کائستھوں کی عملداری میں اِس انداز کا طرزِ اظہار ایک جرأت مند اصلاح کار ہی برت سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو سماج میں اِس قسم کے نامور ہمیشہ سے چلے آئے ہیں اور اِس وجہ سے کھیمیندر کی اِن تصانیف کی آج کے دور میں بھی کافی اہمیت ہے۔ ذی حِس ذہنوں کی مناسب ترجمانی ان تصانیف میں ہوتی ہے۔ ''درپ دلن'' نام کی ایک اور تصنیف میں کھیمیندر کے خاندان، دولت، علم، حُسن و جمال، شجاعت، خیرات اور عبادت سے متعلق دلچسپ حکایات بیانیہ منظومات کی صورت میں شامل کی ہیں۔ اگرچہ اِس تصنیف میں اُس طرح درجِ بالا تصانیف جیسا طرزِ بیان اختیار نہیں کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر اِسے براہ راست طنز و مزاح میں شامل نہیں کیا جاسکتا تاہم یہ کتاب بھی سماجی اصلاح کے مقصد سے ہی تصنیف ہوئی ہے۔ اِس کتاب کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ جیسا کہ خیالؔ صاحب نے بھی مضمون میں رقم کیا ہے کہ دورِ جدید میں پہلی بار 1871ء میں اُس کی گم شدہ کتابوں میں سے پہلی تخلیق کا پتہ چلا اور پھر کم از کم اٹھارہ دیگر تخلیقات بھی دریافت ہوئیں۔ یہاں پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے اور جس کا ذکر زیرِ بحث مضمون میں نہیں ہے کہ یہ پہلا نسخہ تنجور تامل ناڈو میں ملا تھا جس میں کھیمیندر کی کئی تصنیفات شامل تھیں۔ کھیمیندر کی اب تک دریافت شدہ اٹھارہ تصانیف کے علاوہ اور چودہ کتابوں کے ناموں کا ذکر یا حوالہ باقی مصنفین کی کتابوں میں ملتا ہے جس میں سے ایک ''نرپاولی'' بھی شامل ہے جس کا تعلق تاریخ کشمیر سے تھا اور جس کا حوالہ کلہن نے بھی اپنی راج ترنگنی میں دیا ہے۔ گویا کشمیر میں تاریخ نویسی

کی کلہن سے بھی پہلے کی ہے۔ نہ صرف کھیمیندر بلکہ اور بھی چند تحریری ماخذوں اور تاریخ دانوں کا ذکر راج ترنگنی میں ملتا ہے۔ کھیمیندر کی ''نرپاولی'' کے متعلق کلہن کا خیال ہے کہ یہ ایک شاعر کی تخلیق ہے مگر اِس میں کئی کوتاہیاں بھی ہیں۔ شاید اُسی طرح جیسے کلہن کے تاریخ نویسی کے فن کے متعلق آج کہہ سکتے ہیں۔

زیرِ بحث مضمون میں کھیمیندر کی تخلیقات سے طنز نگاری کے حوالہ سے کئی اقتباسات کے تراجم بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔

کشمیری زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں میں سے کسی نے کھیمیندر کی باقی تصنیفات کے متعلق اگر کچھ پڑھا یا سنا نہ بھی ہو تاہم ''نرم مالا'' کے ایک حوالے کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ جس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ گیارہویں صدی میں بھی سنسکرت کے علاوہ مقامی زبان (جو ظاہر ہے کشمیری ہی ہوگی) میں شعر کہے جاتے تھے اور اس طرح لل دید سے قبل تین سو سال کشمیری میں شعروشاعری سے متعلق ''نرم مالا'' میں حوالہ ملتا ہے۔ یہاں پر اِس غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہوگا کہ ''نرم مالا'' سے جو سطر بطورِ حوالہ عام طور پیش کی جاتی ہے وہ کسی مشاعرہ یا محفلِ شعر سے تعلق نہیں رکھتی۔ اِس سے یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ جس تناظر میں یہ حوالہ دیا جاتا ہے اُس میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے بلکہ اِس کی افادیت میں کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ''نرم مالا'' کے جس منظر سے یہ حوالہ ماخوذ ہے وہ بظاہر ایک مذہبی تقریب ہے۔ گرو اپنے شاگردوں کے ساتھ شِو کے نام پر ایک بڑے شراب کے برتن کو سجادیتے ہیں۔ پہلے خود پیتے ہیں اور اس کے بعد گھر کی عورتیں، دوست اور رشتہ دار کافی مقدار میں پیتے ہیں اور پھر لوٹ پوٹ ہو کر کچھ گانے اور کچھ رونے لگتے ہیں۔ کچھ مستی میں ڈوب کر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔ اسی منظر کو آگے بڑھا کر درج کیا ہے کہ'' گرو خود بھی نشہ میں مست تھا۔ اُس نے ستار، بانسری اور ڈھول کی بلند آوازوں کے ساتھ اپنے وطن کی زبان میں نظم گائی۔ اپنی نشست سے آہستہ آہستہ اٹھ کر مسرور انداز سے ایک بازو اور دوسرا ہاتھ اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر ناچنے لگا......'' اس کے بعد عبارت میں ایسی باتوں کا ذکر ہے جس کے متعلق خیالؔ صاحب نے کچھ اس طرح ذکر کیا کہ ہے نقادوں نے کھیمیندر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے کیوں کہ ایسی تحریروں میں فحش نگاری کا عنصر نمایاں ہے۔

اِس منظر کے آخری شعر کے معنی یوں ہیں:۔

''بے شک بہار میں گرووُں کے لئے زمین سونے سے اسی طرح بھری ہوتی ہے جیسے بیماریوں کے وقت معالجوں کے لئے اور حاکموں کے لئے خزان کے موسم کی فصل کے وقت ہوتی ہے۔''

کتاب کا خاتمہ جن اشعار پر ہوتا ہے اُن کے معنی کچھ یوں ہیں۔

''یہ نرم مالا، حاکموں، دفتری ملازموں اور کچھ ایسے ہی لوگوں کی بداعمالی کا تذکرہ ہے جو ایسی گری ہوئی حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ اَچھے لوگوں کی تفریح کے لئے تحریر کی گئی ہے تا کہ وہ ہنس پائیں۔اور اس میں تمام لوگوں کے لئے کچھ فائدہ مند صلاح ہے۔''

''کال وِلاس'' کے آخری بند کا ترجمہ جو اِس کتاب میں موجود ہے سے کچھ اندازہ ضرور ہوسکتا ہے کہ یہ کتاب کال ولاس جو پُر مذاق، دِلکش ہنسی سے بھرپور ہے اور حیرت انگیز کہانیوں اور دنیاوی مصلحتوں کے ذریعے تمام فن اور چالاکیوں کو واضح کرتی ہے، تمام اچھے لوگوں کو پسند آئے۔ یہ تصنیف کھیمیندر کے تخیل کے سمندر سے چاند کی طرح ابھری ہے اور کاش یہ ہمیشہ اچھے لوگوں کے دلوں کو فرحت بخشے۔''

اسی طرح دیش اپدیش کا آخری بند یوں ہے۔

''یہ متفرق چیزیں جو میں نے کہی ہیں تمام کی تمام تفنّنِ طبع کے لئے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ نیک اور خاص افراد کبھی اِن کی طرف دھیان دیں۔ کھیمیندر انکساری سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ اُسے نقل کرنے میں کوئی مہارت نہیں لیکن نقل کے بہانے ایک دیہی علاقے میں رہنے والے لوگوں سے یہ مشورہ کی باتیں کہتا ہے۔''

کلہن اور اُس کی تصنیف کردہ کتاب راج ترنگنی سے اکثر پڑھے لکھے لوگ واقف ہیں۔ غلام نبی خیالؔ نے ''کلہن۔ کشمیر کا اوّلین مورّخ'' عنوان سے ایک مضمون اپنی کتاب ''جہانِ خیال'' میں شامل کیا ہے۔ راج ترنگنی کی اہمیت مدنظر رکھتے ہوئے اِس مضمون کے لئے اور بھی کچھ دِلکش عناوین تجویز کئے جاسکتے ہیں۔ بقول پروفیسر پی این پشپ ''کلہن نے برصغیر ہند ہی میں نہیں بلکہ ایشیا بھر میں تاریخی موضوعات پر شاعری کی ایک نئی راہ نکالی۔'' اس اعتبار سے کلہن کو ایشیاء کا پہلا باقاعدہ مورّخ

بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ''با قاعدہ'' اِسلئے کہ کشمیر میں کلہن سے پہلے بھی ایسی تالیفات اور تصانیف کی روایت موجود تھی جن کا تانا نا تاریخی مواد سے بُنا گیا تھا۔ خود کلہن نے سرورَت، کھیمیند ر، ہپلا راج، پدم مہر اور چھولا کر کی تصانیف کے علاوہ ''نیل مُت پران'' کا ذکر ابتدائیہ ہی میں کیا ہے۔ قارئین کے ایک طبقہ کو کلہن کے لئے ''با قاعدہ مورخ'' کی اصطلاح استعمال کرنے سے مکمل اتفاق نہیں ہوسکتا۔ اِس ضمن میں ماضی کے حالات بیان کرتے ہوئے قصّے، کہانیوں اور اساطیر کو تاریخی مواد کے طور برتنا خامی تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستند تاریخی مواد کی عدم موجودگی کی بنا پر ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کلہن خود اس تصنیف کو ''کاویہ'' یعنی نظم کہتا ہے۔ راج ترنگنی آٹھ ترنگوں (حصّوں) پر مشتمل ہے۔ اِن میں آٹھویں ترنگ سب سے لمبی ہے اور اس میں کلہن اپنے دور کے حالات بیان کرتا ہے۔ یہ ترنگ پڑھ کر کوئی بھی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ اُسے تاریخ نویسی کا اعلیٰ شعور تھا لیکن یہ تاریخ ماضی کے اُن حکمرانوں کے متعلق اور عوامی یادداشت پر مبنی ہے۔ خیاؔل صاحب نے اپنے مضمون میں راج ترنگنی میں درج کئی واقعات سے متعلق عقلی بنیاد پر چند دلچسپ سوالات بھی اٹھائے ہیں مثلاً یہ کہ ''کلہن کہتا ہے کہ شاندار بادشاہ اشوک نے سری نگر شہر کی بنیاد ڈالی جس میں مال و دولت سے بھرپور چھیانوے لاکھ گھر تعمیر کئے گئے۔ کیا یہ بیان بحث طلب نہیں ہے کہ ہزار سال قبل سری نگر شہر میں چھیانوے لاکھ مکانات تعمیر کئے گئے جن میں ظاہر ہے کروڑوں لوگ رہتے ہوں گے جب کہ موجودہ شہر سری نگر کی کُل آبادی تیس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔''

اسی طرح کا ایک اور سوال راجہ مہر کل کے دور سے متعلق ہے جس کے بارے میں کلہن نے لکھا ہے کہ چندر کوہل کی صفائی کے دوران ایک ایسی چٹان بیچ میں آگئی جسے ہٹایا نہ جاسکا تو راجا کو دیوتاؤں نے خواب کی حالت میں بتایا کہ ایک باعصمت و باکردار عورت ہی اسے ہاتھ لگا کر ہٹا سکتی ہے۔ اُس نے پہلے اونچے خاندانوں کی خواتین کو پتھر ہٹانے کا حکم دیا لیکن چٹان اپنی جگہ سے ہل نہ پائی جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے ملک میں کوئی بھی عورت اپنی عصمت لٹائے بغیر نہیں جی رہی تھی۔ بعد میں چندراوتی نامی ایک کمہارن کے ہاتھوں سے چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ تب تک راجا نے تین کروڑ عورتوں کو مع اُن کے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے تہہ تیغ کروا ڈالا۔ بقولِ خیاؔل صاحب کیا

اُس وقت کشمیر کی آبادی کا ایک حصہ تین کروڑ خواتین اور اُن کے کروڑوں رشتہ داروں پر مشتمل تھا، یقین نہیں آتا۔"

راج ترنگنی کے مختلف زبانوں میں بہت تراجم ہوئے ہیں۔ مضمون نگار نے بنیادی متن کی ترتیب اور چند تراجم کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

تراجم کی صورت میں یہ کتاب پڑھتے وقت ایک دِقت اسمائے خاص کے تلفظ کے بارے میں ہوتی ہے۔ سٹائن کے انگریزی ترجمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ قرار دی جاتی ہے کہ اُس نے کافی محنت سے اُن جگہوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جن کے ناموں کی صورت وقت گزرنے کے ساتھ بگڑی ہے۔ زیر بحث مضمون میں ایک شخص "اُکالا" کا ذکر ہوا ہے جسے کئی اور تبصرہ نگاروں نے اُچھل لکھا ہے۔ اِس قسم کی بہت ساری مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ اِن تمام کوتاہیوں کے باوجود یہ کتاب تاریخ کشمیر سے متعلق ایک بیش بہا معلوماتی خزانہ ہے جس کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی جاتی رہے گی۔ اگر آج یہ کتاب موجود نہ ہوتی تو کہاں سے ہم ماضی کے عظیم بادشاہوں، فاتحوں، خواتین حکمرانوں، حملہ آوروں، سیاسی تبدیلیوں اور یہاں کے باشندوں کے رہن سہن کے طریقوں، عقائد، رسوم اور اقدار کی جانکاری پاتے۔ راجہ گونند سے لے کر، بھکشا چر اور جے سمہا تک حکمرانوں کے حالات وکوائف اور عوام کی مصیبتوں اور سیاسی وسماجی انقلابات کا ایک جامع خاکہ راج ترنگنی میں ملتا ہے۔ رانی شومتی، رانی دِدا اور کوٹہ رانی جیسی خواتین، راجہ لو، راجہ سندیمان، راجہ میگواہن، راجہ تنجن، راجہ وینہ دت، راجہ پرورسین اور راجہ اونتی ورمن جیسے رعایا پرور، اُپہ دیو اور بومہ دیو جیسے کم عقل راجہ، للتادیتہ جیسے فاتح، راجہ سندرسین جیسے بداعمال اور راجہ مہر کل جیسی سفاک شخصیتوں کے واقعات اِسی دریچے سے ہم دیکھ پاتے ہیں اور اس سب پر بھاری وہ اہم تجزیہ جو کلہن کشمیر کی ابتدا سے لے کر 1248ء تک کی تاریخ کے باریک بینی سے مطالعہ اور اپنی فہم ودانش پر پرکھ کر راج ترنگنی کی پہلی ہی ترنگ کے انتالیسویں شلوک میں بیان کرتا ہے اور جس کا حوالہ دے کر خیالؔ صاحب نے مضمون کو اختتام تک پہنچایا ہے کہ "کشمیر ایک ایسا ملک ہے جسے فوج کے ذریعے نہیں بلکہ پیار اور روحانی شفقتوں کی بدولت ہی جیتا جاسکتا ہے۔ جہاں کے باشندے نتائج کے طور پر دوسری دنیا سے ہی ڈرتے ہیں۔"

''کشمیر میں سنسکرت کا گاتا جائے بنجارا'' ذیلی عنوان مقرر کر کے ''جہانِ خیال'' میں بلہن پنڈت کے متعلق ایک مضمون شامل ہے۔ ذیلی عنوان میں ایک معروف و مانوس شعری فقرہ کے استعمال سے قاری کے ذہن میں شیرین صوتی آہنگ اُبھرتا ہے جو مطالعہ کے لئے راغب کرتا ہے تاہم معنوی اعتبار سے اِس میں دو سُقم پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور سے ''میں'' اور ''بنجارا'' الفاظ کے استعمال سے۔ مذکورہ فقرہ میں لفظ ''میں'' سے مراد کشمیر کے حدود کے اندر اور بنجارا عام طور پر ایسے کسی شخص کے متعلق بولا جاتا ہے جو خانہ بدوش ہو نہ کہ مستقل سفر یا سیاحت پر۔ گویا بنجارا کے ساتھ ایسی خستہ معاشی حالت کا بھی احساس اُبھرتا ہے جو بلہن جیسے شخص کے لئے زیادہ موزون نہیں کیوں کہ اسے صرف کشمیر میں بلکہ کشمیر سے باہر بھی کافی عزت و احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں کلہن کی راج ترنگنی کی ساتویں ترنگ کے شلوک 935 سے 938 تک کی عبارت کا انگریزی ترجمہ از رنجیت سیتارام پنڈت ملاحظہ ہو۔

> "During the reign of King Kalsa, Bilhana who had gone away from Kashmir and whom king Paramandi of Karnatka had made a Vidyapati and whose parasol was the only one which was seen by the elephants in the Karnatic army when the king was on the march, after hearing of the liberality of Harshdeva, the friend of good poets reckoned even such prosperity to be deceptive."

خیالؔ صاحب لکھتے ہیں کہ بلہن راجہ ہرش کے دور (1011-1098ء) میں کشمیر سے سفر پر روانہ ہوا جس کے متعلق انہوں نے کوئی حوالہ تو دیا نہیں ہے البتہ اِسی پیر یگراف میں راج ترنگنی کے مذکورہ بالا اقتباس کا اردو مفہوم بھی درج کیا ہے۔ واضح رہے کہ ہرش راجہ کلش کی وفات اور اُتکرش کی چند دنوں کی حکومت کے بعد کشمیر کا حکمران بنا۔ مذکورہ مضمون میں بلہن کے معاشقہ اور شادی سے متعلق چند دلچسپ روایات کو درج کیا گیا ہے۔ ''وکرمانک دیو چرتر'' بلہن کی اہم تصنیف ہے جو چالوکیہ خاندان کے نامور راجہ وکرمانک دیو (وکرمادتیہ) کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہے۔ خیالؔ صاحب لکھتے ہیں کہ ''بلہن نے اپنے خاندان اور وطن 'کشمیر' کے بارے میں اپنی خود نوشت سوانح حیات

''وکرمانک دیوچرتر'' میں خود ہی اپنا تعارف کرایا ہے۔ یہ دراصل چالوکیہ راجوں کے حالات پر مبنی ایک بیانیہ بھی ہے۔''

''وکرمانک دیوچرتر'' اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے جس کے سترہ باب چالوکیہ کے راجوں خاص طور سے وکرمادتیہ کے کارناموں سے متعلق ہیں۔ یہ سب کچھ لکھ کر بلہن کو وطنِ عزیز کشمیر کی یاد کچھ اُسی طرح ستاتی ہے جیسے کہ نامور فارسی شاعر رودکی اپنے شہر مولیان سے دوری کی بنا پر اپنی مشہور غزل میں لکھتے ہیں۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

''بلہن کے وکرمانک دیوچرتر کے سترہویں سرگ (باب) تک ایک آدھ بار کشمیر کا ضمنی ذکر ہوا ہے اور کشمیر کے قدرتی حسن کے ڈھنگ پر اُن کا طرزِ بیان بھی آراستہ و پیراستہ ہے لیکن اٹھارہویں سرگ کے شروع سے آخر تک کشمیر کا ماحول، کشمیر اور بلہن کی اپنی کہانی پھیلی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ وکرمانک دیوچرتر کے سترہویں باب کو لکھنے کے بعد شاعر کی زندگی میں ایک خلا جیسا پیدا ہوا اور وہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اِس حالت میں شاعر کو اپنا وطن کشمیر یاد آتا ہے۔ لہٰذا شاعر نے کشمیر کے بارے میں لکھنا چاہا تو ماضی میں ڈوب کر اٹھارہویں باب کی تخلیق کی اور اس سے شاعر کی ساری خستگی دور ہوگئی۔''

''ہمارا ادب'' مشاہیر نمبر جلد اوّل میں ڈاکٹر گنجو اپنے مضمون میں بلہن کی پرور پور اور اپنی جائے پیدائش سے متعلق درج کردہ اطلاعات کی بنا پر جو عبارت لکھتے ہیں اُسے بحوالہ وادین میں خیال صاحب نے بھی اپنے مضمون میں شامل کیا ہے۔ یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے کہ گنجو صاحب نے یہ اقتباس دراصل یوں رقم کیا ہے کہ ''بلہن نے اُس وقت کے سری نگر کا محلِ وقوع اس کے جغرافیہ کے عین مطابق ہی دیا ہے۔ کلہن، ہیون سانگ اور بودھ کتابوں کی بنیاد پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ موریا بادشاہ اشوک نے سری نگر راجدھانی کی داغ بیل ڈال دی......'' کلہن، ہیون سانگ اور نامذکورہ بودھ کتابوں کو درمیان میں گھسیٹ کر کئی تاریخی حقائق کا تذکرہ بلہن سے منسوب ہوتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ اس عبارت کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے لکھتے ہوئے ڈاکٹر موصوف کی توجہ

بلہن سے بڑھ کر ہیون سانگ پر مرکوز رہی ہے اور پھر ہیون سانگ اور کلہن کی عبارات کو ملا کر پیش کرتے ہوئے نظریہ سامنے آتا ہے وہ نہ تو مکمل طور کلہن سے اور نہ ہیون سانگ سے مطابقت رکھتا ہے۔ آگے چل کر خیالؔ صاحب کے مضمون میں یہ تمام باتیں بلہن سے منسوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اِس بارے میں ایک مختصر سی وضاحت لازم ہے کہ دونوں مضامین میں الگ الگ ماخذوں سے لی گئی اطلاعات خلط ملط ہو کر کچھ ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ جو علاحدہ طور ان مواخذ میں درج خیالات کی یا تو نفی کرتی ہیں یا دھندلا کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اِن چند جملوں پر غور کریں گے:۔

''موریہ بادشاہ اشوک نے سری نگر راجدھانی کی داغ بیل ڈالی۔ اس سے پہلے پران دھشٹھان (پاندریٹھن) ہی کشمیر کی راجدھانی تھی۔ اشوک نے نئی راجدھانی آج کے بادامی باغ کے آس پاس بنوائی اور یہاں پر بٹارک وہار بھی تعمیر کیا......''

جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا گیا کہ خیالؔ صاحب کے مضمون میں عندیہ ملتا ہے کہ یہ خیالات بلہن نے پیش کئے ہیں اور گنجو صاحب بلہن کے ساتھ ساتھ کلہن، ہیون سانگ اور بودھ کتابوں کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیتے ہیں۔ راج ترنگنی کے ترنگ اول شلوک ۱۰۴ میں اشوک کے سری نگری شہر بسانے کا ذکر ملتا ہے اور پھر ترنگ سوم شلوک 49 میں سرشٹ سین کے دورِ حکومت میں پرانی راجدھانی میں کئی مقدس عمارات کی بنیاد کے لئے نذرانہ پیش کرنے کے متعلق ذکر کرتا ہے۔ اشوک نے کس جگہ سرینگر کو بسایا تھا۔ اُس کا تعین نہ ہی کلہن اور نہ ہی بلہن نے کیا ہے۔ گویا بلہن سے متعلق مضمون تحریر کرتے ہوئے ڈاکٹر گنجو نے چند پُر کشش اضافی معلومات درج کرتے ہوئے ایک طرف اختصار سے کام لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر الگ نکتہ سے متعلق ماخذ کا حوالہ حاشیہ میں درج کر کے اعتباریت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

بلہن نے پرور پور اور اپنی جائے پیدائش سے متعلق کچھ اہم معلومات اپنی کتاب کے آخری باب میں درج کی ہیں۔ پرور پور شہر کا تذکرہ ویسے بھی کشمیر کی تاریخ سے متعلق تقریباً ہر اُس کتاب میں ملتا ہے جس میں ہندو دور کے راجاؤں کا ذِکر ملتا ہے۔ تاریخیت کی بنا پر ''وکرمادتیہ مانک چرت'' ان میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شہر ہاری پربت کے گردونواح میں تورمان کے بیٹے راجہ

پرورسین نے تعمیر کروایا تھا اور راجدھانی پاندریٹھن سے وہیں منتقل کی گئی۔ بلہن کے مطابق اُس کی پیدائش شہر سے تین میل کی دوری پر جیون (زیون) کے نزدیک کھونموش (کھونموہ) گاؤں میں ہوئی۔ اس سلسلے میں خیالؔ صاحب نے بھی ڈاکٹر گنجو کے مضمون کا حوالہ دیا ہے۔

مضمون میں بلہنؔ کی چوراپنچ شکا (شاعری) اور کرن سندری (ناٹک) کے متعلق مختصر جائزہ شامل ہے۔

ہر قلمکار کا ایک ذاتی اندازِ بیان یا اسلوب ہوتا ہے۔ کوئی بھی خیال اظہار کی صورت پانے کے لئے مناسب اور موزون الفاظ کا تقاضا کرتا ہے۔ گویا قلمکار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس کے ذہنی کارخانے میں جو نادر تصورات اُبھرتے رہتے ہیں اُن کو بیان کرنے کے لئے اُس کے سامنے الفاظ کا ایسا ذخیرہ موجود ہو کہ ہم معنی اور مماثلت رکھنے والے الفاظ حسب ضرورت صف باندھے سامنے ہوں اور قلمکار، تلفظ، آہنگ، کیفیت کی پہچان کر کے انہیں صحیح جگہ پر استعمال کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ ضروری نہیں کہ اس عمل میں ہر بار گہری سوچ میں ڈوبنے کی ضرورت پڑے بلکہ اکثر صورتوں میں لفظ از خود روانی سے اپنی جگہ لے لیتے ہیں۔ جہاں تک موضوع یا عنوان کے اختراع یا انتخاب کا تعلق ہے اِس بارے میں ہر قلمکار نسبتاً زیادہ غور و فکر سے کام لیتا ہے۔ ہر قلمکار کی خواہش ہوتی ہے کہ عنوان پُرکشش ہو لیکن اِس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ عنوان اور عبارت میں پوری مطابقت ہونے کے ساتھ ساتھ اِس کے معنی شک وشبہات کے دائرہ میں نہ آئیں اور نہ ہی اس کے متعلق اختلاف و اعتراض کی گنجائش رہے۔ سوم دیو کی کتھا سرت ساگر سے متعلق مضمون کا ذیلی عنوان ''دنیا میں کہانیوں کا اوّلین مجموعہ'' لکھا گیا ہے۔ ہندوستان میں کہانیوں سے متعلق لوگوں کی دلچسپی کے حوالے سے تعارفی کلمات کے بعد مضمون نگار یوں رقمطراز ہیں کہ ''ہندوستان میں یہ بے شمار کہانیاں سالہا سال تک سینہ بہ سینہ کہی اور سنی گئیں اور بعد میں سب سے پہلے گناڈیہ نے انہیں ایک مقامی بولی پشاچی میں جمع کر لیا اور اپنے مجموعے کا نام ''برہت کتھا'' رکھا جو اب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اِس کے بعد ایک کشمیری شاعر پنڈت سوم دیو نے اس گنج گُم گشتہ کی باقیات سے استفادہ کر کے گیارہویں صدی عیسوی میں ''کتھا سرت ساگر'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب قلم بند کر لی......''

اِس عبارت کے عنوان کی روشنی میں یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ گناڈی کی ''برہت کتھا'' ناپید ہونے کی وجہ سے اب سوم دیو کی ''کتھا سرت ساگر'' کو ہی دنیا میں کہانیوں کا اوّلین مجموعہ کہا جاتا ہے۔ مضمون نگار آگے لکھتے ہیں کہ ''ایک تاریخ دان کے مطابق اس کا سال تحریر 1050ء بتایا گیا ہے۔ یہ عرصہ کھیمیندر کے بعد تیس سال کا عرصہ بتایا جاتا ہے۔''

کھیمیندر کی کتاب ''برہت کتھا منجری'' جس کا تذکرہ مضمون نگار نے اسی کتاب میں کھیمیندر سے متعلق مضمون میں بھی کیا ہے گناڈی کی ''برہت کتھا'' کی کہانیوں پر مبنی ہے اور شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود سوم دیو کی ''کتھا سرت ساگر'' کو کس بنیاد پر دنیا میں کہانیوں کا اوّلین مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور قلمکار نے برہت کتھا منجری کے متعلق ''کتھا سرت ساگر'' کو یہ درجہ دیا ہو۔

کسی بھی تحقیقی یا تنقیدی نوعیت کے مضمون میں خیالات کی ترتیب کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ محقق کے لئے لازم ہے کہ اگر کسی واقعہ سے متعلق آرا کا آپس میں اختلاف ہو تو انہیں ایک ہی ساتھ درج کر کے اپنی رائے کا اظہار اور جواز بھی پیش کرے۔

مضمون میں وشنو شرما کی پنچ تنتر کو بھی اس بنیاد پر زیر بحث لایا گیا ہے کہ اس میں ''کتھا سرت ساگر'' سے مستعار لی گئی کہانیاں شامل ہیں۔ کتھا سرت ساگر کی کہانیوں میں ''ویتال پچیسی'' نام سے معروف پچیس کہانیوں پر مشتمل ایک اہم حصہ الگ طور بھی کافی مشہور ہو چکا ہے جس میں ترو کرم سین نامی بہادر عقلمند بادشاہ اور ویتال کے درمیان گفتگو اور اُن دلچسپ کہانیوں کے آخر میں ویتال کی طرف سے راجہ کی ذہانت کا امتحان اور ساتھ ہی اُس کی خاموشی توڑنے پر مجبور کئے جانے کی غرض سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات شامل ہیں۔ مضمون نگار نے ''کتھا سرت ساگر'' کی کئی ایک کہانیوں کا ذکر کیا ہے تاہم ویتال پچیسی کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں ہوا ہے۔

کشمیر میں سنسکرت کے مشاہیر کڑی کے تحت ''جہانِ خیال'' میں آخری مضمون آنند وردھن کے متعلق ہے۔ مشرقی شعریات میں آنند وردھن کی تصنیف ''دھونیا لوک'' بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ سنسکرت شعریات اور تنقید میں معیار اور مقدار کے اعتبار سے سب سے زیادہ کام کشمیر میں ہوا ہے۔ اس تمام سرمایہ میں سب سے اعلیٰ اور پہلا مقام دھونی کے نظریہ کو ہے جس کا تعلق شعری جمالیات

سے ہے۔ آنند وردھن سے پہلے لفظ اور معانی (ابھِدھا) اور استعارہ (لکشن) کے تعلق سے بحث و نظریات موجود تھے لیکن اُس نے فنِ شاعری میں زبان کی اُس قوت کی نشاندہی کر کے اُسے شاعری کی روح قرار دیا جو لغوی اور استعاراتی معنی سے آگے بڑھ کر جذبات اور احساسات کو جلا بخشتے ہوئے معنی کی اُس الگ سطح کو خلق کرتی ہے جس کا ماحصل جمالیاتی کیف وسرور ہے۔ صوتی، معنوی یا فکری اعتبار سے شعر کتنا بھی عالمانہ یا عامیانہ ہو اعلیٰ پایہ کا فن پارہ قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اِس میں ذوق جمال کی کیفیت موجود نہ ہو۔ اِس نکتے کو مثال سے سمجھانا ہو تو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی دوشیزہ کے جمال کے انگ اور اُبھار کی ساخت اچھی ہونے کے باوجود دیکھنے والے کے لئے پُرفریب اور پُراثر نہ ہو تو حسین نہیں کہلائی جاسکتی۔ دھونی حقیقت میں ایک جمالیاتی تصور ہے جس کا تعلق اشاریات کی بنیاد پر معنی ازخود سمجھانے سے ہے۔ آنند وردھن نے دھونی کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے بالعموم پراکرت اور سنسکرت میں پہلے سے موجود یا خود تخلیق کردہ ایسے اشعار کو بطور مثال پیش کیا ہے جن میں صنفِ نازک کی رعنائیوں اور ان سے وابستہ لذت کا تصور ابھرتا ہے۔ دھونی کے نظریہ سے متعلق جن چند مضامین تک ہماری رسائی ممکن ہے اُن کی روشنی میں قاری کی توجہ اصل معاملہ سے ہٹ کر دوسری جانب چلی جاتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ خیال صاحب بھی رقمطراز ہیں کہ ''جیسا کہ کہا گیا کئی دیگر سنسکرت علماء اور فضلا کی طرح آنند وردھن کے اعصاب پر بھی ایک یا دوسرے روپ میں عورت ہی سوار ہے۔''

دھونی کی اصطلاح کے لئے موزون متبادل لفظ ذہن میں نہیں آپاتا ہے تاہم لغوی اعتبار سے ''گونج'' کسی حد تک اس کے قریب ہے۔ موزون متبادل کی عدم موجودگی میں اگر ''گونج'' لفظ کے ذریعے ہی کسی حد تک دھونی کی نزاکت سمجھنے کی کوشش کریں تو کچھ اِس طرح کی وضاحت ہوسکتی ہے کہ کوئی بھی صوتی اظہار یا اس کے نتیجہ میں جو تاثر یا شبیہہ فوری طور معرض وجود میں آکر قاری کے دل و دماغ میں سرایت کرنے کے بعد اُس کی داخلی کیفیات کے ساتھ اُس کے ذہن میں اُبھرتی ہے۔ اُسی گونج کو دھونی کہہ سکتے ہیں جس انداز سے خاکسار اس نظریہ کو سمجھ سکا ہے اگر وہ اصل نظریہ سے زیادہ دور نہیں تو یوں کہوں گا کہ شیخ العالم کا یہ شلوک بہت حد تک اس تصور کو منفرد انداز میں اس طرح پیش کرتا

ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ اگر آنندوردھن کے زمانے میں موجود ہوتا ہے تو شاید اسے بحث و عبارت میں شامل کر کے اپنے نظریہ اور اُس کے اطلاق سے متعلق کئی اور اہم پہلوؤں کو اُجاگر کر لیتا۔

ہاہہِ اکہِ سنگر تار زن وزن
گُنبر وَزَن دوئی کتھ
سوظون اشارِ ستی بوزن
کو ظون بوزن نہٕ دما مہ گتھ

ترجمہ

ایک ہلکی سی سانس کی ہوا سے بلند و بالا پہاڑ تار کی طرح بجنے لگیں گے۔
آواز کی یہ گونج مکرر آتی رہے گی
نیک طینت بس اشارے سے ہی سبق لیں گے
جبکہ نادان پر ڈنکے کی چوٹ بھی اثر نہیں کر سکتی

تنقید کے شعبہ میں یوں تو ساختیاتی فکر ایک نیا اور تازہ ترین تصور مانا جاتا ہے جس کے فروغ و تشہیر میں دریدا اور سوئیسر جیسے بیسویں صدی کے مفکرین کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے جبکہ قریباً ایک ہزار برس قبل آنندوردھن کے قائم کردہ نظریہ اور اس نظریئے کی توثیق و تفہیم کے طور ابھینو گپت کی تحریروں میں اس تصور کو اُجاگر کیا جا چکا ہے۔ اس امکان کو بھی مکمل طور مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

جس تصور کو عصرِ حاضر میں ایک نئی فکر سے تعبیر کیا گیا وہ دراصل اُس ہزار سالہ پرانے تصور کا احیائے نو ہے جو کشمیر میں آنندوردھن اور اُس کے بعد ابھینو گپت نے پیش کیا تھا۔ اِس امکان کو بھی یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ ہو نہ ہو ساختیاتی فکر کے حوالے جو مباحث سابقہ دہائیوں میں منظرِ عام پر آئے اُن کی بنیاد بھی وہی تصنیفات ہوں۔ بُہلر جیسے یورپی عالم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے کشمیر سے بہت بڑی تعداد میں سنسکرت کے قلمی نسخے خچروں پر لاد کر لئے تھے جن میں سے کچھ بمبئی، کچھ کلکتہ اور کچھ پونا جیسے شہروں تک پہنچائے گئے اور بہت سے نسخے جرمنی، برطانیہ اور فرانس کی لائبریریوں میں محفوظ ہوئے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ساختیاتی نظریہ کو موجودہ دور

میں متعارف ومشہور کرنے والے عالموں میں سے سنسکرت کی جانکاری رکھنے والے کسی شخص کواس طرح کی تصنیف ہاتھ لگی ہو۔اغلب وامکان کی بحث میں پڑے بغیر بھی یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ ساختیاتی فکر جسے عصرِ حاضر کا تازہ ترین فکری رویّہ قرار دیا جاتا ہے اس کی بنیاد زائد از ایک ہزار سال قبل کشمیر سے وابستہ عالموں نے ڈالی ہے۔آنندوردھن سے قبل جمالیات کے تعلق سے کئی مفکرین نے ادب خاص طور سے ناٹک کے محاسن کے متعلق نظریات پیش کئے تھے جن میں ''رس'' اور اِس کے اقسام بہت ہی باریک بینی سے وضع کئے گئے تھے۔آنندوردھن نے اِن تصورات کو کہیں پر بھی رَد نہیں کیا بلکہ ''دھونی'' کا نظریہ پیش کرکے اسے شاعری کی روح قرار دیا۔

آنندوردھن سے متعلق خیالؔ صاحب کے مضمون کے آخری پیراگراف کا حوالہ اس مضمون میں پہلے ہی دیا گیا ہے، جس کے مطابق اردو یا انگریزی میں اس موضوع پر مطلوب موادنہ ہونے کے برابر ہے۔مضمون نگار بہت ہی دیانتداری سے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ دھنیہ لوک کے تجزیہ سے متعلق اُن کے مطالعہ کی بنیاد عنبر بہرائچی کا اسّی (80) صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے اور ساتھ ہی اپنے ذاتی تجزیہ کی روشنی میں عنبر بہرائچی کی سنسکرت سے واقفیت سے متعلق سوالات اُٹھائے ہیں جو معقول بھی دکھائی دیتے ہیں۔

''جیسا کہ کہا گیا کئی دیگر سنسکرت علماء اور فضلا کی طرح آنندوردھن کے اعصاب پر بھی ایک یا دوسرے روپ میں عورت ہی سوار رہی ہے۔''

خاکسار بھی سنسکرت یا آنندوردھن کی تحریروں سے کون سا واقف ہے کہ درج بالا بیان کی توثیق کرے یا آنندوردھن کا دفاع یا وکالت کرسکوں البتہ ربطِ خیال اور نظریۂ دھونی سمجھنے کی کوشش میں ذہن کو اسی نکتہ پر مرکوز کرکے بھٹکنے سے بچا کر یہ محسوس کیا کہ اَمثال کا تجزیہ کچھ اُس انداز سے کیا گیا ہے کہ اصل معاملہ پسِ پشت گیا ہے اور غیر ضروری باتوں پر زیادہ توجہ دینے سے قاری کا ذہن بھی بھٹک جاتا ہے۔ایک مثال یوں ہے کہ گوداوری کے کنارے کی جگہ ایک نایکہ روز اپنے عاشق سے ملتی ہے۔ کچھ وقت بعد ایک برہمن اسی جگہ کے آس پاس پوجا کرنے آتا ہے جس سے اُن کے راز و نیاز پوشیدگی میں خلل پڑ جاتا ہے۔وہ چاہتی ہے کہ برہمن اِس جگہ نہ آئے مگر کہے، تو کیا کہے کرے تو کیا کرے۔ برہمن کو اِس جگہ آنے پر ایک کتا تنگ کرتا ہے جس سے وہ ڈرتا بھی ہے۔ایک دِن یہ نایکہ برہمن کو کہتی

ہے کہ جو کتا آپ کو پریشان کرتا تھا اُسے کل ایک شیر نے مار ڈالا ہے جو یہیں جھاڑیوں میں رہتا ہے اور اب آپ کے راستے کی یہ رکاوٹ دور ہوگئی اور اب آپ بلا جھجک روز یہاں آسکتے ہیں۔ گویا وہ برہمن کو اِس جگہ آنے کے لئے کہتی ہے مگر جو برہمن کتے کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ وہ شیر کی موجودگی کی اطلاع پاکر کیوں کر اِس جگہ کی طرف رُخ کر سکے۔ آنندوردھن اِس حکایت کے ذریعہ یہ وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح لفظ (شبد) اور اُن کے معنی (ارتھ) لغوی معنی یا جانے پہچانے تصورات سے بالکل اُلٹے صورت حال کو پیدا کر سکتے ہیں۔ نایکہ برہمن کو آنے کو کہتی ہے مگر اصل میں اُسے ''آنے سے'' روکتی ہے۔

اس قبیل کی ایک اور مثال جو مضمون میں موجود تو نہیں تاہم یہ سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے کہ آنندوردھن کس طرح یہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کسی خاص سیاق اور پس منظر میں متن اور معانی اپنے عام وضع شدہ منصب سے الگ رہ کر کسی دوسرے ہی تصور کو اُجاگر کرتے ہیں۔

پاروتی من ہی من شنکر کو چاہتی ہے اور اُس سے بیاہ کی خواہش رکھتی ہے۔ وقت آنے پر شوجی (شنکر بھی شو کی ہی دوسری صورت ہے) ریشیوں کو پاروتی کے والد ہیماوَن کے پاس اُس کا رشتہ مانگنے کے لئے بھیجتا ہے۔ اِس موقعہ پر پاروتی بھی باپ کے ہی پاس ہوتی ہے اور جب ریشی اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہیں۔ پاروتی منہ پھیر کر کنول کے پھول کی پیتاں گننے لگتی ہے۔ منہ پھیر کر پھول کی پیتاں گننا بظاہر ریشیوں اور اُس کے والد کے درمیان ہونے والی بات چیت سے لاتعلقی کو ظاہر کرتی ہے، لیکن قاری کس طرح پاروتی کے جذبات کو اِس منظر میں محسوس کر پاتا ہے یہ تو اُس کے تخیل سے تعلق رکھتا ہے۔

''جہانِ خیال'' میں کشمیر کے جن سنسکرت مشاہیر کا تذکرہ ہوا ہے اُن کے نام سنسکرت علم وادب کی تاریخ میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں کشمیر کی شان وعظمت کو بھی دوبالا کرتے ہیں۔

خیالؔ صاحب اس اعتبار سے قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے اِن مشاہیر سے متعلق اردو کے قارئین کے لئے بنیادی معلومات فراہم کیں ہیں۔ اس مضمون میں ہماری کوشش رہی ہے کہ قارئین کے لئے نہ صرف ایک جائزہ پیش کیا جائے بلکہ کہیں کہیں مصنف کی پیش کردہ آرا کو کسی اور نکتہ نظر سے بھی آنکنے کی کوشش کریں۔ اِس طرح کی اضافی اطلاعات سے بنیادی مضامین کی اہمیت کسی بھی طرح کم نہیں ہوتی۔

..........●●● ....

●...... فاروق فیاض

"یہ بہار مجھ کو دغا نہ دے!"
غلام نبی خیالؔ کے شعری مجموعے "الہام" کے حوالے سے

غلام نبی خیالؔ کشمیری شاعروں کے اس کارواں کا رہرو ہے جس نے شعوری طور اپنی مادری زبان کو تخلیقی اِظہار کی خاطر ایک طاقتور وسیلے کی طرح استعمال کیا۔ اگر چہ اس قبیل سے وابستہ ہمارے شاعروں کو مغربی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ بھی تھا مگر مادری زبان کے ساتھ گہری وابستگی اور commitment کی بدولت انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کے لئے کشمیری زبان ہی کا اِنتخاب کیا۔ اس طرح سے ایسے سخن وروں نے اس زبان کو ایک دانشورانہ جہت عطا کی۔ ان شاعروں نے محض روایتی شاعری کی صنف کو اپنے شعری تجربوں کے اِظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنے تجربوں کے اِظہار کی خاطر ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے نئے نئے تجربے بھی کئے۔ اس نوع کے شاعروں نے عالمی ادب کے کلاسیکی شاہکاروں کا بھی ترجمہ کیا اور اس طرح وہ بھرم توڑ کے رکھ دیا کہ کشمیری زبان کا دامن اتنا وسیع نہیں ہے کہ یہ دوسری عالمی زبانوں کی ادبیات کا بوجھ اٹھانے کی متحمل ہو سکے۔

غلام نبی خیالؔ اس قبیلے سے وابستہ شاعروں میں اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے تخلیق کے ساتھ ساتھ ترجمے کا فن بھی شعوری طور اپنایا ہے۔ اس طرح ان کی بدولت کشمیری شعری اور نثری ادب میں معیار اور مقدار کی شکل میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور اسے خاطر خواہ بڑھاوا بھی ملا۔ موجودہ ادبی بحث یا discourse زیر نظر رکھنے سے یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ کسی بھی جغرافیائی خطے میں انسانی سماج یا تہذیب کے حوالے سے کوئی بھی فنی یا فکری نہج تب تک صحیح اور معروضی طور پر کسوٹی پر پرکھی نہیں جا سکتی جب تک کہ تاریخی دور میں، جس کے اندر فن کار کی ذہنی پرداخت ہوئی ہو، تخلیق ہونے والی

ادبی تخلیقات کا بغور مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ اگر ہم اپنی ہی تہذیب اور ادبی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں ۔اس میں ہمیں کئی اختلافات اور دوریاں نظر آئیں گی۔ حتیٰ کہ ہمارے مورّخوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان تاریخ ساز اور تہذیب شناس شخصیات کو نظر انداز کیا ہے جن کے کارناموں پر ہم آج بھی نازاں ہیں اور جن کے سہارے ہم اپنی مخصوص مشترکہ ثقافتی وراثت کی بنیاد قائم رکھے ہوئے ہیں ۔ یہ قومی ذمہ داری اور تہذیبی کردار مورّخوں سے زیادہ ہمارے ذی حس اور باشعور فن کاروں اور شاعروں نے نبھایا ہے جنہوں نے ان شخصیات کے کلام کو سینہ بہ سینہ آنے والی نسلوں تک پہنچا کر ہم پر احسان کیا ہے۔

اس تمہیدی پس منظر میں جب ہم اپنی شعری اور نثری تخلیقات کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں تو ان تخلیقات کے فنی حسن ،فکری عمق ،تکنیکی دلکشی سے قطع نظر ، یہ تخلیقات مختلف تاریخی ادوار میں کشمیریوں کے ذہنی روّیوں ، سیاسی نہجوں ،سماجی مقاصد اور نفسیاتی پیچیدگیوں اور جذباتی تضادوں کے تئیں علامتی ، اشاراتی اور تمثیلی اشارے بھی سامنے لائی ہیں۔

غلام نبی خیاؔل کا مجموعہ شعر ''الہام'' کئی ایسے ہی اشاروں کی جانب ہمارا ذہن اور توجہ مبذول کرتا ہے۔خیاؔل صاحب کا شمار موجودہ دور کے ان شعرا میں ہوتا ہے جو پچھلی نصف صدی سے کسی تھکاوٹ یا رکاوٹ کے بغیر کشمیری زبان کے ادب میں معیار اور مقدار کے لحاظ سے اسے مالا مال کر رہے ہیں۔ کشمیری زبان کو اگر چہ آج علمی اور تخلیقی وقار حاصل نہیں پھر بھی اسے ایسی شخصیات کی پذیرائی حاصل ہے جن میں غلام رسول نازکیؔ ، مرزا عارفؔ بیگ ، دینا ناتھ نادمؔ، رحمان راہیؔ ، امین کاملؔ، غلام نبی فراقؔ ، رشیدؔ نازکی ، غلام نبی گوہرؔ، مظفر عازم اور غلام نبی خیاؔل وغیرہ شامل ہیں۔

شعری مجموعہ ''الہام'' 1970ء کے بعد خیاؔل صاحب کی شعری تخلیقات کا گلدستہ ہے جس کا اعتراف شاعر بذات خود کتاب کے آغاز میں کرتا ہے۔اس مجموعے میں نظمیں ،غزلیات ،شہر آشوب، نعت ،منقبت ، دعا ، مرثیہ اور شعری تراجم وغیرہ شامل ہیں۔شاعر روایت کے ساتھ اپنا رشتہ منسلک رکھتے ہوئے ''الہام'' کی ابتدا ''بنی آدم'' عنوان کی نظم سے کرتا ہے مگر وہ روایتی انداز میں بھی خطابیہ لہجے میں ربِ کائنات سے دستگیری کے لئے دست دعا ہے بلکہ وہ علامتی انداز میں تخلیقِ آدم کے حوالے سے

رب العزت کو کائنات کا مرکز اور حیات کا سرچشمہ تصور کرتا ہے:

گاسہ ٹُل واوہ دَگو سیتی وسان گوو بون گُن
نار لہرو بیہ ہیوت نار چھکُن رقص کرن
وشفہ کَنِز ما سہ خدائن تہِ یہ آدم یوت اون
جانہ ور بولنہ لوگ بوڈ چھ خدا بوڈ چھ خدا

شاعری کے بارے میں خیالؔ صاحب کتاب کے پیش لفظ میں یوں خیال آرائی کرتے ہیں:

''شاعری میری نظروں میں الہام کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خال ہی کسی کو ودیعت ہوتا ہے۔ جسے الہام کا فیضان حاصل نہ ہو وہ کبھی ایک اچھا شاعر نہیں بن سکتا اور اس کی شاعری ذہنی کشمکش اور نفسیاتی جدوجہد کا نتیجہ ہی ہوگی۔''

یہی وجہ ہے کہ خیالؔ صاحب نے اپنے اس شعری مجموعے کا نام ''الہام'' رکھا ہے۔ خیالؔ صاحب شاعری میں رومانوی مزاج کے قائل ہیں۔ عشقِ آدم اور حسنِ ارضی ان کے شعری تجربات کا بہت بڑا محرک ہے۔ جذبات کو پا بہ آتش کرنے والے گونا گوں پہلو شعری تراکیب اور صورتوں سے پنہاں لہکتے مہکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری خود بھی انجان خوابوں کے اُن جزیروں کی سیر کرتا ہے جہاں فقط حسن کی تاجداری، عشق کی تابداری اور ناز برادری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ لطیف جمالیاتی حسن کی بدولت ان کی شعری تخلیقات کو ایک ابدی فنی حسن اور نفسیاتی شبیہہ عطا ہوتی ہے۔

''الہام'' کتاب میں درج تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر فطری حسن کی گود میں جلوہ فشاں نسوانی حسن کا بے حد پرستار اور شیدائی ہے۔ وہ اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش سے محبوب کے وجود کو ایسی دھیمی آنچ عطا کرتا ہے جس سے سخت سے سخت تصورات بھی پگھل کے رہ جاتے ہیں۔ یہ کلاسیکی لہجے سے مکمل انحراف ہے۔

بلی کمبرس ریشم ڈوپٹہ گنڈتھ   بلہِ شانن زلفکھ شال ولتھ
گیسو چہ ڈیکس پیٹھ چھج وہرتھ   مس وانکہ چھ گردنہ نال ولتھ

کنہ دورن ہنزہ یمہ گرایہ وچھتھ   یمہ لالہ روخن ہنزہ ڈالہ وچھتھ

مشکل چھ گژھان دل سنبالن   مستانہ مژن امہ حالہ وچھتھ

"تخلیق"، نظم میں شاعر آدم اور حوا تمثیل کے پس منظر میں جدید انسان کی جنسی بھوک اور نفسیاتی اضطرار کی کیفیت منعکس کرتا ہے، جس میں زمان ومکان دونوں ایک دوسرے میں ضم ہوکر شعری عمل کو ایک جلوہ بار صورت بخشتے ہیں۔ تخلیق آدم سے لے کر موجودہ آدم زاد تک کا سفر ایک بیدزار سے جوئے چشمہ تک کا سفر دکھایا گیا:

یتھ ویرہ وارس منز کوٚت ژاییکھ

ینہ سرفن اتھ وچھ بچھناوکھ

وولہ ووٗنی میے نش، ژی چھکھ سوٗ وا

بےٚ چُھس آدم،

وولہ ناگہ بلس پیٹھ اَزشامن

ووٗنی وون بدنن ہندہ وصلہ کرو أسی نوو تخلیق

آدم اور حوا کا المیہ صرف اوّلین انسانی کرداروں کا المیہ نہیں ہے جسے زمان ومکان کی حدود سے پرے پیش کیا گیا بلکہ یہ اس دھرتی پر پیش کئے جانے والے مسلسل عمل کا بھی ایک ردِّ عمل ہے جو کردار، جائے وقوع، پس منظر اور وقت کی رفتار کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس عمل کے کردار بے حس، ساکت اور مجبور نہیں ہیں بلکہ وہ جاندار، متحرک اور خود مختار ہیں۔ اس المیے کا خالق محض مہا تخلیق کار نہیں بلکہ خود آدم زاد ہے جو اپنی انا کی تکمیل کی خاطر مسرّت، شادمانی اور نفسیاتی سکون کی راہیں تلاش کرتا ہے۔

استعاراتی برتاو خیاؔل صاحب کی شاعری کی ایک مخصوص جزوی خصوصیت ہے مگر جب شعری تجربے اور اظہار کی فنی ہم آہنگی عمل میں آتی ہے تو شعر میں خوش کن شعریت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ شعریت تجربے اور زمان ومکان کی حدود کو پھلانگتا ہوا ایک آفاقی تاثر اور تجربہ کی ساخت کا باعث بن جاتا ہے:

اَدہ متہ پرژھتہ شمع کتھ پریز لیاے فونوسُس رقصاہ کور

بزمہ اندر یبلہ وأژ حکایت چانس روٗنہِ دامانس تام

میانی ناگچ وَنہ وژ ھ شنہ ژھٹھ تنہ مژراوتھ بدنس چھاوٗ

چانہ بہارچ نوزک خوشبوے وأ ژ نہ زانھ وارانس تام

''خیال نامہ'' عنوان کی نظم میں شاعر گزشتہ دو دہائیوں کے ہنگامے کے پس منظر میں جنم لینے والی تبدیلیوں اور اس کے نتیجے میں مخصوص روایات، بھائی چارے، ہمسائیگی، سماجی مساوات اور انسانی اقدار کے عجیب وغریب تجربے کا ماتم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اردگرد رونما ہونے والے تلخ حادثات اور واقعات سے اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے۔ وہ اس درد کا اِظہار چاہتا ہے تاکہ اس کے دل کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہو سکے مگر ایسا گوش بر آواز دل نایاب ہے۔ اسے اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں رہتا اور وہ اپنے وطن میں بھی اپنے آپ کو بیگانہ ہی محسوس کرتا ہے:

چُھنہ میانین دِلہ چن دُبراین کُن دارتھ روزان کانھ آدم

یُس لل وان لل وان سینہ پھوٹم، سے دُودنہ بوزان کانھ آدم

زمانہ حال کی ٹیس اور ویرانی کو شاعر ماضی کی بشاشت کے تصور سے رفع کرنا چاہتا ہے۔ وہ آج کی وارداتوں کا متبادل گزرے کل کے گلستانوں میں دیکھنے کی خواہش کرتا ہے:

یبلہ دُورِہ گلستانن گل پھلی، زن پٹنی وارہ بہار میہ آو

یبلہ کانسہ لوکٹ شری اسناہ کور، زن پوت پھیرتھ لوکچار میہ آو

نظموں کے ساتھ ساتھ خیال صاحب کی غزل بھی بے کل من والے بنی آدم کی جذباتی خواہشات اور اُمیدوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مگر اظہار صرف جذبات کے ہنگامہ خیز تلاطم کا بیان نہیں بلکہ اظہار شاعرانہ حسن کو برقرار رکھتے ہوئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ دیکھئے خیالؔ صاحب کے ان غزلیہ اشعار میں کیسی حبسی اور لمسیاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اور شعری تجربے کی داخلی شبیہہ کو خارجی منظر کی وساطت سے نمایاں کیا گیا ہے:

یہ تاپہ کرائے دوپہرچ یہ آمہ نیومت دوہ

میہ گوژھ نہ سونتھ دغاہ دِیُن یہ چھس عذابس منز

......☆......

تہ شہر بسیائے ءکتی مکانس میہ وژ ووگن

سے خیمہ تہ سے واو تہ وارانہ ونے کیاہ

......☆......

یتھ شہرس منز غم تہ دُرو گیائے

وَنتم گس کیاہ نمہ سوغات

زیرِ تبصرہ شعری مجموعے میں شاعر نے برصغیر کے عظیم شاعروں غالب، اقبال، ٹیگور، احمد ندیم قاسمی، ساحرلدھیانوی، نذرالاسلام وغیرہ کے اشعار کے نمونے بھی منظوم ترجمے کی صورت میں شامل کئے ہیں۔ اس کی بدولت اس کے شعری حسن میں اضافہ ہی ہوا ہے اور ایسی مساعی کی بدولت کشمیری زبان کے فکری اور فنی کینواس میں ایک رنگارنگ آرائش جلوہ فگن ہوکر اپنا جادو جگاتی ہے:

''یہ دوپہر بھی جلی ہوئی، یہ دن بھی خاک رنگ ہے

یہ بہار مجھ کو دغا نہ دے، میں ہوں شدید عذاب میں''

(کشمیری سے ترجمہ)

............●●● ....

تہ شہر بسیائ ، کتی مکانس میہ وڑ ووکن

سے خیمہ تہ سے واو تہ وارانہ ونے کیاہ

......☆......

یتھ شہرس منز غم تہ دُرو گیائ

وَنتم کَس کیاہ نمہ سوغات

زیر تبصرہ شعری مجموعے میں شاعر نے برصغیر کے عظیم شاعروں غالب، اقبال، ٹیگور، احمد ندیم قاسمی، ساحرلدھیانوی، نذرالاسلام وغیرہ کے اشعار کے نمونے بھی منظوم ترجمے کی صورت میں شامل کئے ہیں۔اس کی بدولت اس کے شعری حسن میں اضافہ ہی ہوا ہے اور ایسی مساعی کی بدولت کشمیری زبان کے فکری اور فنی کینوس میں ایک رنگارنگ آرائش جلوہ فگن ہو کر اپنا جادو جگاتی ہے:

"یہ دوپہر بھی جلی ہوئی، یہ دن بھی خاک رنگ ہے

یہ بہار مجھ کو دغا نہ دے، میں ہوں شدید عذاب میں"

(کشمیری سے ترجمہ)

............●●● ....

● ...... مجروح رشید

غلام نبی خیالؔ کی کشمیری غزل

غلام نبی خیالؔ معاصر کشمیری شاعری کی ایک معتبر شعری آواز ہیں جنہوں نے کشمیری شاعری کو بالعموم اور کشمیری غزل کو بالخصوص نیا لب ولہجہ عطا کیا۔ اُن کی شعری تخلیقات کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی شعری روایات سے بھی باخبر ہیں اور بدلتی رُتوں کے مزاج اور تقاضوں سے بھی واقف ہیں۔ انہوں نے جہاں اپنی تخلیقی توانائیوں سے کشمیری نظم کو اپنے اظہار کا اہم وسیلہ بنایا وہاں غزل اُن کے شعری مافی الضمیر کو بیان کرنے میں ہمہ جہت ہونے کے ساتھ ساتھ طاقتور شعری ہیئت ثابت ہوئی۔

معاصر کشمیری غزل کی ابتدائیوں تو مہجورؔ کی غزل ہی مانی جاتی ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ نئی کشمیری غزل کا سورج رحمٰن راہیؔ، امین کاملؔ، غلام نبی خیالؔ اور دوسرے نامور شعرا کی غزلیات سے ہی کشمیری زبان کے شعری اُفق پر نمودار ہوا۔ یہ شعرا جہاں عصری زندگی کے تازہ تر تجربات سے دوچار ہیں وہاں یہ اپنے ماضی سے شعوری یا لاشعوری طور پر رشتہ بنائے رکھے ہیں۔ غلام نبی خیالؔ، رحمٰن راہیؔ اور امین کاملؔ کی طرح اپنی شعری دنیا آباد کرنے میں اس لئے بھی کامیاب ہوئے ہیں کیوں کہ ان کی تخلیقات بالخصوص ان کی غزل ایک ایسے حساس شاعر کے ذہن کی پیداوار ہے جس کی رگوں میں خیال و خواب کی ایک ایسی قوس قزح روشن ہے جو قاری کے دل و دماغ کو نہ صرف روشن کرتی ہے بلکہ اپنے رنگوں کی بدولت اُس کے تصورات کے خاکے میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔

گولاٰیِ صُبحکہِ انمانہٕ وُچھ میہٕ خوابس منز
یُسند قدم چھُ شہُل ناگ یتھ سرابس منز

(نثری ترجمہ: گلابی صبح کے انداز میں خواب میں جسے میں نے دیکھا/اُسی کو دیکھا جو صحرا میں ٹھنڈے چشمہ کی مانند ہے۔)

غلام نبی خیالؔ کی غزل بنیادی طور پہ انسانی نفسیات کے ہمہ جہت پہلوؤں سے ترتیب پاتی ہے جن میں انسانی محبت بھی شامل ہے۔ عشق کے بجائے محبت کا لفظ میں نے اس لئے برتا کیوں کہ خیال کی غزل محبت کے متنوع رنگوں سے معمور ہے۔ عشق کے برعکس اُن کی غزل کا خمیر ارضی زندگی کی لذتوں سے اُٹھتا ہے جو نہ صرف انسان کو زندگی جینے پہ آمادہ کرتا ہے بلکہ اُسے زندگی کرنے کا ہُنر بھی سکھاتا ہے۔ اُن کی غزلوں کا شعری کردار پرانی کشمیری غزل کے راوی کے مُقابلے میں ایک طاقتور ذات اور انفراد کا حامل ہے جو خیالؔ کی غزل کو ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ یہ شعری کردار مروّجہ اور سطحی رسموں کا پابند نہیں بلکہ ایک باغی ہے جو تمام طرح کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے جتن کرتا ہے اور اس لئے سامنے آنے والی ہر شے سے متصادم ہے۔ یہ کردار تقدیر کا رونا نہیں روتا بلکہ اپنی ذات میں پوشیدہ تضادات اور قوتوں کی تلاش جستجو میں محو ہے۔

یہ تاپہٕ کٕراے دُپہر چ یہ آمہٕ نیومُت دوہ
قسم میٚہ سونتہٕ کہِ سحرُک بہٕ چھُس عذابس منز

(نثری ترجمہ: یہ جھلستا ہوا دوپہر اور یہ بجھا بجھا سا دن، مجھے قسم ہے سحرِ بہار کی کہ میں عذاب میں ہوں۔)

پرون چھُ پرانان نۆ وچھُ نوان
میٚتہِ کانہہ موسم پیِیہ ہے راس

(نثری ترجمہ: پرانی چیزیں پرانی ہو کے رہ جاتی ہیں اور نئی چیزیں نِکھرتی جاتی ہیں۔ کاش مجھے بھی کوئی موسم راس آتا۔)

دِل زاٴلتھ پرزلاٴوم رات
وولہ ووٚنی دِلکس دادس وات

(نثری ترجمہ: دل کو روشن کر کے میں نے رات کو منوّر کیا۔ آ بھی جاؤ اور دل کی بات

سُن لو۔)

غلام نبی خیالؔ کی غزل کا استعارہ اور موضوع ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔مطلب یہ کہ خیالؔ ایک ایسے شاعر ہیں جسے اپنے مخصوص خیالات کو منفرد شعری احساس کے قالب میں ڈھالنے کا ہُنر اپنے وسیع تر مشرقی شعری روایات کے مطالعے سے حاصل ہوا ہے۔اُن کا انداز بیان اور طرزِ اظہار کی روانی اور شگفتگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انہوں نے علم بیان اور علم کلام کی مبادیات کو بہت اچھی طرح سمجھا اور پرکھا ہے جب ہی تو اُن کے شعر روانی اور شگفتگی کی عمدہ مثالیں بن کے ابھرتے ہیں۔

نصف راتس تہٕ یوٚ دوے چانہِ رویک بڑونتھ گوو شوقس

میٚہ باسیو او برہ مُنزی کھوٚت آفتاب آہستہ آہستےَ

(نثری ترجمہ: نیم شب جب میرے شوق کو تمہارے رُخ زیبا کا فریب سا لگا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ بدلی سے سورج آہستہ آہستہ اُبھرنے لگا)

از تاں چھوُم چانین وعدن ہُند شہجار

از تاں جگرس مِلوُم زلہٕ وُن نار متیو

(نثری ترجمہ: آج تک میں تمہارے وعدوں کی چھاؤں میں لطف اندوز ہوتا رہا، اور آج تک میرا جگر تمہاری محبت کی دھیمی آنچ سے جلتا رہا)

راتھ ژھونڈُم بازرتےَ دُنیا

از ییلہِ گرِہ وُتس تتہِ رووُس

(نثری ترجمہ: کل تو میں نے ساری دنیا اور خلا کا سفر کیا، آج جب گھر کی طرف مراجعت کی تو وہاں کھوگیا۔)

خیالؔ صاحب کی غزل کے شعروں کی یہ چند مثالیں اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ یہ اُن کے تازہ انفرادی تجربات کا اظہار ہیں جن سے شاعر کو گزرنا پڑا ہے اور جنہوں نے شاعر کو ایک رمزیہ اور علامتی لب ولہجہ اختیار کرنے کیلئے تخلیقی سطح پر آمادہ اور مجبور کیا ہے جو شاعر کے

لئے ایک اہم تخلیقی وسیلہ بن گیا ہے۔

بے طول صحرا پدوٹرے مونڈُتھ بہارژھاران ژکوروو تُھ
گلابہ ہوسکی ژپھ پنکی پاٹھی ووُنی ہر کھنا یہ رات ڈلہِ ہے

(نثری ترجمہ: بے انت صحرا تم نے پاؤں تلے روند ڈالا، بہار کی تلاش میں تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، گلابی ہوس کے لئے تُم پت جھڑ کی طرح جھڑ جاؤ تاکہ یہ رات ڈھل جائے۔)

صحراوٕ کر لب تشنہ خدائے چھِ اُسی مجنون
ژٕ ریشاہ دِیہ کانہہ تس معاوض اُش ٹارٕ دِمو

(نثری ترجمہ: ہم مجنون، صحرا کے تشنہ لب ہیں، کاش اُنہیں کوئی پانی پلاتا ہم اُنہیں اپنی بھیگی پلکیں دے دیتے۔)

سُہ تہِ اوس وقت سائنی سیکلی نافہٕ ژھٹان اُسی
یِتہِ آوسےَ دآن چھِ بے دانہٕ وَنے کیاہ

(نثری ترجمہ: وہ بھی ایک وقت تھا جب صحرا معطر ہوا کرتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے کہ انار کے پھل بے دانہ ہیں۔)

اوپر جو غزلیہ اشعار پیش کئے گئے وہ اس بات کے غماز ہیں کہ شاعر گُزرے ہوئے کل کی عنایتوں سے بھی شناسا ہے اور حال کے لمحے سے بھی دست بہ گریباں، جس نے شاعر کو ماضی کی مہربانیوں سے محروم کردیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایسے اشعار میں طنز بحیثیت اہم عنصر لاشعوری طور پر شامل ہے جو شعر میں پیش کئے گئے جذبہ کی صداقت کا اثبات کرتا ہے۔

غلام نبی خیالؔ نے اپنی غزلوں میں کئی نادر استعارے اور شعری ترکیبیں تخلیق کی ہیں جو شاعر کے توانا تخلیقی ذہن کی طرف واضح اشارہ ہے۔ صحرا، شہر، رات، بہار، خواب، اُن کی غزل کی مخصوص علامات ہیں جو اُن کے کلام میں آرکٹائپس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گلابی صبح اور آمنیومُت دوہ (بُجھا بجھا سا دِن) کے ساتھ ساتھ سینکڑوں شعری ترکیبیں اُن کی ان

صلاحیت کی عکاس ہیں۔

غلام نبی خیالؔ کی غزل کا محاسبہ کرتے ہیں تو قاری ایک خوش گوار کیفیت سے گزرتا ہے کیونکہ غلام نبی خیالؔ کی غزل عروض و آہنگ کے حوالے سے خود کفیل اور مکمل ہے۔ قاری جب عروضی بھی ہو تب خیالؔ کی غزلوں کی تقطیع کرتے وقت وہ یہ ماننے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے عروض کو بڑی مہارت سے برتا ہے۔ بحرِ رمل سے لے کر بحرِ خفیف، بحرِ ہزج سے لے کر بحرِ کامل اور بحرِ مجتث سے لے کر بحرِ مُضارع تک تقریباً تمام بحریں اُن کی غزلوں میں نہایت خوبی سے برتی گئی ہیں جو شاعر کے جذبے کو اظہار کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہیں۔

............●●● ....

شیرازہ اردو ''حامدیؔ کاشمیریؔ نمبر''

ریاست جموں و کشمیر کے سربرآوردہ شاعر، ادیب اور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری انگریزی اور فارسی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ اردو کے کلاسیکل، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید ادب پر اُستادانہ دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے منفرد شعری لب و لہجہ اور اکتشافی تنقیدی نظریہ کی وجہ سے پوری اُردو دنیا میں خاصے مقبول ہیں۔ دس شعری مجموعوں اور چار افسانوی مجموعوں کے خالق حامدیؔ کاشمیری نے تحقیق و تنقید کے حوالے سے کئی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ حامدیؔ کاشمیری کی حیات اور کاناموں پر مشتمل شیرازہ کا خصوصی نمبر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

اس پتے پر منگوائیں:

● ..... کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

......●......

ولی محمد اسیر کشتواڑی ●......

''جہانِ خیال'': رنگارنگ موضوعات کا مرّقع

''جہانِ خیال'' غلام نبی خیالؔ صاحب کی تازہ ترین تصنّیف ہے۔
زیرِ بحث تصنیف مقالات (30)، تاثرات (8) اور تبصرات (14) کے تین بڑے اور چھوٹے حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ کتاب کے انڈکس (فہرست) پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے موضوعات کی رنگارنگی اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جہانِ خیال کے پہلے مقالے میں کشمیری شعروادب کا مختصر مگر پُر از معلومات جائزہ لیا گیا ہے۔ کشمیری زبان میں ادب کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں یہ جانکاری فراہم کی گئی ہے۔ ''کشمیری زبان میں ادب کی تخلیق کا آغاز باقاعدہ طور پر تحقیق کے مطابق آج سے سات سو سال قبل اُس وقت ہوتا ہے جب انگلستان میں انگریزی کے اوّلین شاعر چاسر نے Centerbury Tales کو نظم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور یہاں سرزمینِ کشمیر میں شیوزم اور روحانیت کی مبلغہ للہ عارفہ کشمیری کی پہلی فلسفہ داں شاعرہ کی حیثیت میں اُبھر رہی تھیں۔ ایک مشہور مستشرق جے ہنٹن نولز نے اس زبان کی لوک کہانیاں مرتب کرتے وقت کہا تھا کہ غالباً دُنیا کی کسی بھی زبان میں اس اعلیٰ پایہ کا لوک ادب موجود نہیں ہوگا جس قدر یہ کشمیری زبان میں پایا جاتا ہے''۔ (صفحہ :7) آگے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ ''للہ کے واکھیوں میں جن شاعرانہ نزاکتوں اور لطافتوں کا شاندار مظاہرہ ہوا ہے، اُن کے پیشِ نظر یہ کہنا کبھی کبھی مشکل ہوتا ہے کہ کشمیری زبان کی اوّلین شاعرہ ہو سکتی ہے''۔ حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کو اسلامی تصوف کے سب سے بڑے کشمیری شاعر گو قرار دیتے ہوئے خیالؔ صاحب نے لکھا ہے کہ ''شیخ نورالدین نورانی شیخ العالمؒ شاعری کی زبان

میں اس مشن کی دوسری کڑی ثابت ہوئے جسے لِلّہ عارفہ نے ہاتھوں میں لیا تھا۔ان کے کلام میں جو فلسفہ پیش ہوا ہے اُس کے مطابق انسان کی جدوجہدِ حیات کی معراج اُس وجود سے ہم کنار ہوتا ہے جسے حُسنِ مطلق یا External Truth کہا جاتا ہے"۔(صفحہ 9-11) حبّہ خاتون کو کشمیری زبان میں گیت لکھنے کی ابتدا کرنے والی پہلی شاعرہ شمار کرتے ہوئے خیالؔ کرتے ہیں کہ "حبہ خاتون کے کلام میں کشمیری سُخن گوئی میں پہلی بار گیت معرض وجود میں آیا۔اپنے محبوب (یوسف شاہ چک) کی یاد میں جو نغمے اس نے تخلیق کئے ان میں نسوانی جذبات کا بیان واظہار انتہائی پُرسوز انداز میں کیا گیا ہے۔للہٖ عارفہ اور شیخ العالمؒ کے عہد کو اگر کشمیری شاعری کا اوّلین دور اور حبہ خاتون کے دور کو دورِ ثانی کہا جائے تو محمودؔ گامی سے اس کا تیسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔محمودؔ گامی نے سب سے پہلے کشمیر کی ادبی تاریخ میں مثنوی کو متعارف کیا اور فارسی سے استفادہ کرتے ہوئے نظامیؔ گنجوی اور مولانا عبدالرحمان جامیؔ کے شاہ پاروں کو کشمیری جامہ پہنایا"۔(صفحہ 13-14)۔کشمیری غزل کا ذکر کرتے ہوئے خیالؔ صاحب نے کہا ہے کہ "غزل کشمیری شاعری کے ماتھے کا سب سے چمکتا ہوا جھومر ہے جس میں آب وتاب والے نگینے جوڑنے کا آغاز محمودؔ گامی اور رسول میرؔ نے کیا۔کشمیری غزل اپنی معنوی برتری اور اظہار کی سربلندی کے لحاظ سے ہندوستان کی کئی زبانوں کی غزلیات سے بہتر اور افضل قرار دی جاسکتی ہے"۔(صفحہ 16-17)۔کشمیری نظم کے بارے میں خیالؔ صاحب نے لکھا ہے کہ "کشمیری نظم نعرہ بازی اور ہنگامی موضوعات کی تبلیغ تک محدود رہی جس کی بنیاد عبدالاحد آزادؔ نے ڈالی۔کشمیری زبان کی بہترین نظمیں 1955ء سے لے کر 1970ء تک تخلیق کی گئیں"۔(صفحہ 18-19)۔مہجورؔ کو شاعرِ کشمیر قرار دینے کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے خیالؔ صاحب نے کہا ہے کہ "کشمیری ادب میں غلام احمد مہجورؔ کو نشاۃ ثانیہ کا نقیب کہا جاسکتا ہے جنھوں نے کشمیر کے فکروفن کو شعور اور آگہی کی دولت سے مالا مال کیا۔اپنی عوامی تخلیقات اور قوم پرستانہ منظومات کی بدولت مہجورؔ کو کشمیر کا قومی شاعر کہا جاتا ہے"(صفحہ۔19)۔زیرِ بحث مضمون میں کلچرل کانفرنس، ریاستی کلچرل اکادمی وغیرہ کی کارکردگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔انھوں نے تحقیق وتنقید و دیگر ادبی کاوشوں کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے اور اپنے مضمون کو ان لفظوں کے ساتھ اختتام تک پہنچایا ہے۔"کشمیری ادب گزشتہ سات صدیوں کے دوران زندگی کی ہر دھڑکن کو محسوس کرتا رہا ہے

اوران دھڑکنوں ،محسوسات اور تجربات کاردِعمل ساری دُنیا کے ادبی اظہار کی طرح ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔'' (صفحہ :22)۔ مجموعی طور پر مصنف نے اس مضمون میں کشمیری زبان وادب سے متعلق کچھ میٹھی اور کچھ کڑوی باتیں کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کشمیری زبان وادب کی تاریخ پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ کھوٹے اور کھرے کو پرکھنے میں بھی خاص مہارت کے حامل ہیں۔

جہانِ خیال کے دوسرے اور تیسرے مقالے میں کشمیری شاعری پر ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات اور ہم عصر کشمیری زبان وادب کی حالت، مسائل اور امکانات پر بھی بات کی گئی ہے۔ یہ دونوں مضامین پہلے ہی مضمون کا توسیعی حصّہ ہیں جن میں اُن نکات کو بیان کیا گیا ہے جو قبل ازیں اچھی طرح واضح نہیں ہوئے تھے۔ کُل مِلا کر یہ تینوں مقالات کشمیری زبان وادب کی ترقی وترویج اور اس ضمن میں مختلف قلمکاروں کی خدمات کو سمجھنے میں ممدو اور معاون بن سکتے ہیں۔ کتاب کے چھٹے، ساتویں، آٹھویں، بائیسویں، ستائیسویں اور اُنتیسویں مقالات میں بھی کشمیری ادبیات میں تہذیبی ہم آہنگی کے مناظر، کشمیری ادب میں تحریک حریت کے رجحانات، کشمیری زبان میں صوفی شاعری، مہجور کشمیر کا شاعر، تین اہم کشمیری شاعر اور کشمیری زبان کی بائبل وغیرہ اہم موضوعات پر کھلے دِل سے خامہ فرسائی ہوئی ہے۔ ان تحریروں میں خیالؔ کے ذاتی مطالعے، تجربے اور تنقیدی شعور کا عمل دخل نمایاں ہو کر قاری کو غور وخوض کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات واضح کرتے ہوئے خیالؔ رقمطراز ہیں کہ ''ترقی پسند ادبی تحریک کی بدولت کشمیری زبان میں پہلی مرتبہ افسانہ، ڈراما اور اوپیرا لکھا گیا۔ اس کے علاوہ پہلی بار میکسم گورکی، ایلیا اہرن برگ، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور کئی دیگر ادیبوں کے افسانے کشمیری میں منتقل کئے گئے۔ اس پس منظر میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہم عصر کشمیری شاعری کی شاندار عمارت ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد پر ہی استوار ہوئی ہے کیونکہ اس کے بعد کسی ایسی تحریک نے کشمیری ادبیات کو متاثر نہیں کیا۔ کلچرل کانفرنس ہی کے اہتمام سے کشمیری زبان کا اوّلین ادبی ماہنامہ ''کونگ پوش'' بھی جاری ہوا۔ ہمہ گیر طور پر ترقی پسند تحریک نے ہی کشمیری شاعری کو نئی رفعتوں اور عظمتوں سے مالامال کیا اور یہ شاعری آج ملک کی کسی بھی دوسری زبان کے ہم پلہ ہونے کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس تحریک کو بجا طور پر نئے کشمیر کے تہذیبی اور ثقافتی منظرنامے

کی آئینہ دار کہا جاسکتا ہے"۔ (صفحہ 26، 27 اور 33)۔ ہم عصر کشمیری زبان وادب کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے خیالؔ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "میری نظر میں ایک اہم مسئلہ جو ہماری مادری زبان کو دھچکا دینے کا باعث بن سکتا ہے وہ اس رسم خط میں کئی خامیوں کا اضافہ کیا جانا ہے۔ کشمیری زبان کے رسم الخط کو عام فہم اور قابلِ قبول بنائے جانے کے حامی احباب کی رائے ہے کہ اسے ازسرنو تشکیل دینے کی غرض سے حکومت کی طرف سے ایک بااختیار کمیٹی بنائی جائے جو اس کام کو صرف چند دنوں میں انجام دے سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو کشمیری زبان کے رفتہ رفتہ معدوم ہونے کا جو خدشہ لاحق ہے اس کی ذمہ داری ہمیں پر عائد ہوگی"۔ (صفحہ 35۔37)

خیالؔ کشمیری صوفی شاعری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کشمیری زبان کے سات سوسالہ طویل دَورانیہ کی سب سے مالا مال، معتبر اور بے حد اثر انگیز شاعری صوفی شاعری ہی ہے۔ سرزمینِ کشمیر نے اگرچہ لاتعداد صوفی شاعر پیدا کئے جن میں سے اکثر و بیشتر کی تخلیقات زمانے کی دست برد کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہی صوفیانہ شاعری کشمیر کی سات سو سالہ ادبیات کا سب سے بیش بہا خزانہ ہے۔ کشمیری صوفیانہ شاعروں کی تعداد سینکڑوں میں ہے جن کا کلام نہ صرف یہ کہ خلط ملط ہوا ہے بلکہ اس نوع کی منظومات بار بار ایک دوسرے کے نام سے بھی شائع کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق و تلاش کی ضرورت ہے"۔ (صفحہ:83۔91)

جہانِ خیال کے چوتھے اور پانچویں مقالے میں کشمیر میں اُردو صحافت اور کشمیر میں اُردو رباعی کے دو اہم موضوعات پر خوب بحث ہوئی ہے۔ مصنّف نے کافی تحقیق کر کے ان کو ترتیب دیا ہے۔ بذاتِ خود ایک تجربہ کار صحافی اور شاعر ہونے کے ناطے انھوں نے ان موضوعات پر دلچسپ باتیں قلم بند کیں ہیں جو اُردو زبان وادب کے اسکالروں کے لئے فائدہ مند ہیں۔ کشمیر میں اُردو صحافت کے آغاز سے متعلق جانکاری فراہم کرتے ہوئے خیالؔ صاحب رقمطراز ہیں کہ "کشمیر میں اُردو صحافت کا آغاز بالواسطہ طور پر بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں اُس وقت ہوا جب ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی رہبری میں عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور کشمیر میں بھی جموں کے مہاراجاؤں کے شخصی راج کے خلاف تحریکِ حُریت پل تول رہی تھی۔ 13/جولائی 1931ء کا دن، جواَب یومِ

شہدائے کشمیر کہلاتا ہے، چند کشمیری اہلِ دانش اور اصحابِ قلم کے لئے اُردو صحافت کی طرف بھی متوجہ ہونے کا باعث بن گیا۔'' (صفحہ 42:)۔ کشمیر میں اُردو رباعی کے بارے میں مفصل جانکاری دیتے ہوئے خیالؔ لکھتے ہیں کہ۔'' اُردو میں کشمیر کے جن شاعروں نے رباعی گوئی میں طبع آزمائی کی ہے اُن میں میر غلام رسول نازکی، شہہؔ زور کشمیری، فریدؔ پربتی، حکیم منظورؔ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ البتہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں مجموعی طور پر رباعیات کے حصّے کو نہایت کمزور اور کسی حد تک بے اثر کہا جاسکتا ہے''۔ جن رباعی گو شعراء کے کلام پر اس مقالہ میں تبصرہ کیا گیا ہے اُن میں اول الذکر شعراء کے علاوہ مرحوم محمد الیاس ملک تنویرؔ بھدرواہی کی چند رباعیات بھی شامل ہیں۔

جہانِ خیال کے چھٹے مقالے میں کشمیر میں تہذیبی ہم آہنگی کے مظاہر پر بحث ہوئی ہے۔ اس کے مُصنف نے لل دید اور شیخ العالمؒ کو اس تہذیبی ہم آہنگی کے دو بلند مینار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حضرت شیخ ؒ اپنی زندگی میں لل ایشوری کے فلسفۂ حیات اور تصوّرِ انسانیت کی شائستگی اور پاکیزگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کشمیر کے اِن اوّلین سخنوروں کا کلام ایک دوسرے سے الگ کرنے میں آج بھی محققین کو دقتیں پیش آتی ہیں''۔ (صفحہ 45:)۔ کشمیری ادب میں تہذیبی ہم آہنگی کا سُراغ لگاتے ہوئے خیالؔ رقمطراز ہیں کہ ''کشمیر کی علمی اور ادبی دُنیا میں جہاں پنڈت مفکروں اور دانشوروں نے فارسی زبان میں نام پیدا کیا ہے وہاں مسلمان شاعروں شمس فقیرؔ، صمدؔ میر اور عبدالاحد زرگر نے اپنے کلام میں سنسکرت اصطلاحات کو وہ معنی آفرینی بخشی ہے کہ ان سخنوروں کی انتہائی لامحدود علمی استعداد کے پیشِ نظر اس کے بامحاورہ استعمال کا مشکل سے یقین آتا ہے''۔ (صفحہ 48)۔

زیرِ بحث کتاب کے نویں مقالے میں اُنیسویں صدی میں اُردو اخبارات اور کشمیر کے موضوع پر بات کرتے ہوئے تحریر ہوا ہے کہ ''برصغیر کے اخبارات وجرائد میں سے سفیرِ ہند امرتسر، دکن پنچ حیدرآباد، سرمور گزٹ ناہن، چودھویں صدی راولپنڈی، پنجابی اخبار، الوقت گورکھپور اور دیگر رسائل قابل ذکر ہیں جن کے نسخے بدقسمتی سے آج موجود نہیں ہیں۔ ان میں وقتاً فوقتاً کشمیری عوام کی زبوں حالی اور شاہی استبداد کے پنجے تلے دب کر ان کی بے بسی کا حال زیرِ تذکرہ لایا گیا ہے''۔ (صفحہ 92-93)۔ خیالؔ نے ان ہی اخبارات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے

ہوئے یہ بتانے کی زوردار کوشش کی ہے کہ اُردو اخبارات اور جرائد نے کشمیریوں کی زبوں حالی سے بیرونی دُنیا کو آگاہ کرنے کی حتی الوسع کوشش کی اور صحافیوں کی جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی جن میں ایک کشمیریوں کی حالت زار پر روشنی ڈالتا جبکہ دوسرا گروپ جس میں لال کول جیسے صحافی ان خبروں اور تبصروں کو محض ایک واویلا قرار دے کر دوسرے گروہ کی بات کو کاٹنے میں مصروف رہتا تھا۔

دسویں مقالے میں کشمیر کے مایہ ناز سپوت ابھینو گپت کو سنسکرت کی دُنیا کا گوہرِ نایاب قرار دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''ابھینو گپت (950-1020ء) نے اپنی ستر سالہ زندگی میں پینتیس (35) تصانیف تخلیق کیں جن میں سب سے زیادہ ضخیم اور سب سے مشہور ''تانترلوک'' ہے جسے تمام فلسفیانہ علوم کی انسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔اس میں بالخصوص کشمیر کے شیو فلسفے کی توضیح وتشریح بھرپور انداز میں کی گئی ہے...... مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دُنیا کے مفکروں، منطقیوں اور فلسفہ دانوں کے لیے جو مقام اصحابِ دانش و بینش کی نظروں میں طے پایا ہے اس میں ابھینو گپت کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اس کا ہم پلہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔اس لحاظ سے دُنیا کے اس عظیم مفکر پر سارے ہندوستان اور خاص کر کشمیر کو فخر حاصل ہے''۔(صفحہ۔114)۔

جہانِ خیال کے گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں مقالات میں بالترتیب کھمیندر، کلہن اور بلہن کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں پر بات ہوئی ہے۔کشمیر کے یہ تینوں مقتدر اصحابِ قلم ادبی دُنیا میں شہرتِ تامہ رکھتے ہیں۔خیال نے نہ صرف اُن کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں انمول معلومات فراہم کی ہیں بلکہ بعض معلومات پر مُستند حوالہ جات دے کر تنقیدی نگاہ ڈال کر اپنا مافی الضمیر بھی بیان کیا ہے۔اُن کی نظر میں کھیمیندر سنسکرت میں طنزومزاح کا بادشاہ تھا۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ دیگر فنونِ لطیفہ کے علاوہ کھیمیند ر سماجی طنزومزاح کا موجد بن گیا۔اس لحاظ سے آٹھ ابواب پر مشتمل اس کی تخلیق ''سمے ماترکا'' روزمرہ کے گھومتے پھرتے حکیموں، بھکارنوں، دکاندار لڑکیوں، سادھوؤں، چوروں اور سماج کے دیگر نچلے پائے کے طبقات کی زندگی کے دلچسپ اور ظریفانہ بیانیہ کی ایک نادر مثال ہے''۔(صفحہ:118) کلہن کو کشمیر کا اولین مورّخ تسلیم کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ''کلہن پنڈت کو ہندوستان کا اوّلین مورّخ اور سرکردہ شاعر کہا جاسکتا ہے جس نے

گیارہویں صدی عیسوی میں ''راج ترنگنی'' کے نام سے پہلی تاریخ رقم کی جو کئی دسنسکرت تاریخ دانوں کے برعکس زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہ کر ہم تک آپہنچی ہے''۔(صفحہ:125)۔بلہن کی خودنوشت سوانح حیات ''وکرمانک دیو چرتر'' کا ایک تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اس کی شاعرانہ عظمت کو یوں واضح کیا گیا ہے۔''بلہن قدیم سنسکرت شعرا میں اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس نے اپنے پیارے وطن کشمیر کی جی بھر کر تعریفیں کی ہیں۔اس نے جو نغمے لکھے وہ اس نے ''چورا پنج شکا'' نامی پچاس بندوں پر مشتمل مجموعے میں مرتب کیے۔اس تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں تخیل کی بلندی، فنکارانہ کمال اور تغزل کی کارفرمائی نے اسے ایک پُراثر مجموعہ بنادیا ہے۔ بلہن کو ازمنہ وسطیٰ کے عظیم شعراء میں گنا جاتا ہے جب کشمیر سارے ہندوستان میں سنسکرت ادبیات اور خاص کر شعریات کا سب سے بڑا گہوارہ تھا اور اس کے کلاسیکی سرمائے میں بلہن پنڈت نے اپنے قلم کی موشگافیوں سے خاطر خواہ اضافہ کیا جس کی بنا پر وہ ہزار سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہندوستان کے برگزیدہ سنسکرت لکھاریوں کی صفِ اوّل میں اپنے مرتبہ پر شان وشوکت سے براجمان ہے''۔(صفحہ:145-139)۔

جہانِ خیال کے چودھویں، پندرہویں ،سولہویں ،بیسویں ،بائیسویں ،تیئسویں اور ستائیسویں مقالے میں بالترتیب سوم دیو، آنندوردھن ،طاؤس بانہالی ،فتح محمد خاں آزر عسکری، سرفراز حسین خاں، تحسین جعفری، احمد شمیم ،مسعود کشفی ،مہجور ،حسین علی تنہا انصاری ، رحمان راہی ، دینا ناتھ نادم اور امین کامل کے ادبی کارناموں کا تنقیدی مطالعہ ہوا ہے۔سوم دیو کو کہانی کا اوّلین خالق اور آنندوردھن کو شہنشاہِ بلاغت ثابت کرنے کے بعد راہی ، نادم اور کامل کی شاعری کا ایک تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔خیال لکھتے ہیں کہ ''راہی کی شاعری میں اگر ایک طرف شبنمی حلاوت اور ریشمی سرسراہٹ کی تازگی محسوس ہوتی ہے وہاں کامل کے کلام میں معنوی کاری گری کا ایک ایسا معجزہ کارفرما ہے جو اپنے جادوئی اثر سے پڑھنے والے کے قلب وذہن کو جھنجھوڑ کے چھوڑتا ہے۔اسی طرح نادم اور راہی کے مقابلے میں کامل کے لیے تحقیق ایک جنون تھا۔میرے خیال میں ان تینوں معتبر کشمیری شاعروں کے کلام کو نہایت گہرائی اور گیرائی سے ناقدانہ کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ آج تک

ایسا نہیں ہوا ہے لیکن اب ہونا چاہیئے''۔(صفحہ:361-360)۔

زیرِ بحث خیالؔ کی تصنیف کے اُنیسویں ،بیسویں اورتیسویں مقالے میں والٹرلارنس، سی۔این۔ٹنڈیل بسکو اورقدیم یونان کے ممتاز المیہ نگار یوری پیڈیز کوزیرِ بحث لایا گیا ہے۔خیالؔ کا کہنا ہے کہ۔''سروالٹرلارنس کی کتاب ''کشمیر کی وادی'' ہمارے خیال میں کشمیراور کشمیریوں کے رہن سہن ،عادات واطواراوران کی سیاسی ،سماجی اورثقافتی زندگی کی دلکش آئینہ دار ہے۔مذکورہ کتاب اُن بے شمارتصانیف میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے جومغربی دانشوروں نے کشمیر کی خوبصورت وادی کے بارے میں وقتاً فوقتاً تخلیق کیں''۔(صفحہ:232)۔سی۔ایل ٹنڈیل بسکوکو کشمیر میں تعلیم کا مُہم جُو مبلغ شمار کرتے ہوئے متعلقہ مقالے میں لکھا گیا ہے کہ ''بسکو کی بے لاگ محنت کے نتیجے میں جو بسکو سکول اور مشنِ ہسپتال قائم کئے گئے وہ آج بھی کشمیر کی علمی اورسماجی دُنیا میں روشن میناروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔حقیقت میں بسکو ہی کشمیر میں باضابطہ اور جدید تعلیم وتدریس کا نابغۂ عہد بانی کہلایا جائے گا''۔(صفحہ:242)۔

یوری پیڈیز کے سوانح اورڈراموں کا تفصیلی تذکرہ قلمبند کر کے خیالؔ یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ یوری پیڈیز کے عالمی شہرت یافتہ ڈرامے ''میڈیا'' کا انھوں نے خود کشمیری میں ترجمہ کیا ہے جو کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری کے اہتمام سے کتابی شکل میں 1998ء میں شائع ہوکر منظرِعام پرآ گیا تھا۔

زیرِنظر کتاب کے سترھویں مقالے میں ریاستی محکمہ اطلاعات کی اُردو خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ اٹھارہویں اوراکیسویں مقالوں میں بالترتیب بھگوت گیتا کے اُردو تراجم اورٹنڈیل بسکو کے سفرنامہ لداخ سے متعلق اہم باتیں ہوئی ہیں۔محکمہ اطلاعات کے قیام کے بارے میں خیالؔ تحریر کرتے ہیں کہ ''ریاست جموں وکشمیر میں محکمہ اطلاعات آج سے پچاسی سال قبل مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکمرانی میں قائم ہوا۔محکمے کی طرف سے ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے حوالے سے حکومت کے سارے پریس نوٹ اوردیگر تشہیری مواد بھی اُردو ہی میں شائع ہوتا رہا اور کبھی کبھی ان کا انگریزی ترجمہ قومی پریس کی خاطر کیا جاتا تھا۔محکمہ کی جانب سے ''مکتوب'' نام کا ایک خبرنامہ بھی شائع ہوتا رہا۔گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں محکمے نے ''تعمیر'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا جسے محکمے کی طرف سے اُردو کی

خدمت کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے''۔ (صفحہ:183-182)۔خیالؔ بھگوت گیتا کے فارسی اور انگریزی ترجموں کا ذکر کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ ''بھگوت گیتا کے اُردو تراجم کی تعداد اگرچہ چند قلم کاروں نے بارہ سے لے کر نوے تک بتائی ہے لیکن انھوں نے کسی مترجم کا نام تک نہیں لیا ہے۔ حیدر آباد کے شیخ عبدالغنی کے مقالے سے ہمیں بھگوت گیتا کے جو اُردو ترجمے حاصل ہوئے وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، منورؔ لکھنوی، حسن الدین احمد، منیر بخش عالم، ساجد صدیقی، سروانند کول پریمی، ملو چودھری وغیرہ وغیرہ نے کئے ہیں''۔ چنانچہ خیالؔ صاحب نے ان ہی اُردو ترجموں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے۔ مقالہ نمبر اکیس میں مُصنف کانٹڈیل بسکو کے سفرنامہ لداخ ایک دلچسپ اُردو ترجمہ شامل ہوا ہے جو خیالؔ کی فن ترجمہ کاری میں اُستادانہ حیثیت کا ٹھوس ثبوت ہے۔ یہ ترجمہ اتنا شاندار اور رواں ہے کہ اس کے ترجمہ ہونے کا یقین ہی نہیں آتا۔

چوبیسویں مقالے میں خیالؔ صاحب نے سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ''منٹو اگرچہ سیاستدان نہیں تھا لیکن سیاسی کوائف اور حالات پر اُس کی نظر نہایت گہری تھی۔ خاص طور سے وہ کشمیر کے حالات سے بخوبی آگاہ رہنے کی مسلسل کوشش میں رہتا تھا کیونکہ وہ خود کشمیری الاصل تھا اور کشمیر منٹو کے زمانے میں ہندوپاک کے درمیان ایک ایسے تنازعہ کا مرکز بنا ہوا تھا جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ کشمیر کے حوالے سے منٹو کے افسانے صرف چند ایک تک محدود ہیں''۔ (صفحہ: 302-301)۔ پچیسویں مقالے میں خیالؔ نے ''چند یادگار ملاقاتیں'' کے ذیل میں جگرؔ مرادآبادی، اسرار الحق مجازؔ، شاذ تمکنت، انورؔ صابری، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین وغیرہ کے ساتھ ہوئیں اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جگرؔ صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں تو دیکھا کہ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتے تھے اور بات ادب کی ہو تو کھُل کر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اسی طرح وہ کبھی عجیب سے اطوار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ فراقؔ گورکھپوری کو مغربی ادب پر خاصا عبور حاصل تھا۔ وہ عام طور پر بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ کر اپنی باتوں سے ہمیں مستفید کرتے۔ کئی بار انھوں نے ہماری فرمائش پر شعر سُنائے''۔ (صفحہ 315-313)۔ مقالہ نمبر چھبیس میں خیالؔ نے دُنیائے ادب کی دس عظیم کتابوں (ہومر کی ایلیاڈ، کالی

داس کی شکنتلا، ورجل کی اینیڈ، شاہنامہ فردوسی، ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی، شیکسپیئر کا ہیلمٹ، گوئٹے کا ماؤسٹ، دیوانِ غالب، ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس اور اقبالؔ کا پیامِ مشرق) پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اسے اگرچہ اپنی فارسی سخن گوئی پر ناز تھا مگر دُنیائے ادب نے اُسے فقط ایک عظیم اُردو شاعر ہی کی حیثیت میں جانا اور پہچانا۔ ''پیامِ مشرق'' اُردو کے سب سے متنوع اور ہمہ جہت شاعر علامہ اقبالؔ کی ساری تصانیف میں اہم ترین مجموعۂ کلام ہے''۔ (صفحہ :350-346)۔ اٹھائیسواں مقالہ ''کشمیری زبان کی بائبل'' سے متعلق ہے جو ایک تعارفی نوعیت کا مختصر سا مضمون ہے۔ خیالؔ صاحب 133 برس پُرانے بائبل کے اس نسخۂ نایاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اسے 1959ء میں سری نگر کے آل سینٹس چرچ کے ایک پادری سے صرف ایک روپیہ دے کر حاصل کیا تھا۔ وہ تفصیلات فراہم کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''۱۸۸۴ء میں چھپنے والی یہ دستاویزی کتاب بڑے سائز کے 874 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی طباعت آج کی کمپیوٹر چھپائی سے بہتر دکھائی دیتی ہے۔ کتاب کو انتہائی حُسن اہتمام سے پنجاب بائبل سوسائٹی کے زیر اہتمام لدھیانہ کے مشنری چھاپ خانے میں طبع کیا گیا ہے۔ ماڈرن لنگو یجز نام کی تصنیف کے بارے میں پروفیسر جیالال کول کا کہنا ہے کہ بائبل کا یہ کشمیری ترجمہ پادری ٹی۔ آر۔ واڈ نے کیا ہے۔ میری تحویل میں بائبل کا یہ نسخہ 27 ابواب پر مشتمل ہے جن میں عام طور پر وہی اخلاقی تعلیمات درج ہیں جو ہمیں قرآنِ پاک میں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں''۔ (صفحہ:365-362)۔ جہانِ خیال کے اُنتیسویں مقالے میں بُرزہ ہامہ کو کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا سنگِ میل ظاہر کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر محققانہ انداز میں بات کی گئی ہے۔ خیالؔ صاحب رقمطراز ہیں کہ ''تاریخ کے دستاویزی شواہد اور آثارِ قدیمہ کے باقیات سے یہ بات مسلمہ طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ سرزمینِ کشمیر کی تاریخ کم از کم پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ اس کے واضح ثبوت راجدھانی سرینگر میں ڈل جھیل کے مغربی کنارے پر کشمیر کی تاریخ کے کھنڈرات ملے ہیں۔ اس جگہ کو بُرزہ ہامہ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں بھوج پتر کے زمانے کی جگہ۔ بُرزہ ہامہ کی قدامت کے پیش نظر کشمیری زبان کو بھی ہمالیائی خطے کی سب سے پُرانی یعنی پانچ ہزار سال کی عمر کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ بُرزہ ہامہ سری نگر شہر کے

شمال میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر مشہور عالم ڈل جھیل کے مغربی کنارے پر واقع ہے''۔(صفحہ:366)

جہانِ خیال کا دوسرا حصّہ اُن تاثراتی مضامین پر مشتمل ہے جو روبینہ ناز ، رفیق سرہانوی، ڈاکٹر قدوس جاوید، رفیق بانڈے، وحشی سعید، رفیق احمد اور ڈاکٹر محی الدین زور نے غلام نبی خیالؔ کی شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں قلمبند کئے ہیں۔ یہ مضامین دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ ان پر تفصیلاً بات کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ڈاکٹر قدوس جاوید لکھتے ہیں کہ ''غلام نبی خیالؔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک صحافی، ادیب، شاعر، محقق، نقاد اور دانشور ہیں۔ چونکہ ان کی تحریریں عام طور پر کشمیری تہذیب وتمدن، رسوم ورواج، علوم وفنون اور شعر وادب کے موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے اُن کا شمار گنے چُنے ماہرینِ کشمیریات محمد یوسف ٹینگ کے علاوہ مرغوبؔ بانہالی، رحمان راہیؔ، شفیع شوقؔ وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ دراصل غلام نبی خیالؔ نے ریاست جموں وکشمیر میں اُردو تحقیق وتنقید کے ارتقا میں ایک اہم رول ادا کیا ہے لیکن ابھی تک ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا گیا ہے''۔

جہانِ خیال کے تیسرے حصّے میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر قدوس جاوید، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر ریاض توحیدی، منوّر حسن کمال ، ڈاکٹر احسان احمد، فاروق نازکی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، سیفی سرونجی، ڈاکٹر شفیق سوپوری، سالک دھامپوری اور خالد حسن کے وہ تیرہ تبصرے ہیں جو انھوں نے غلام نبی خیالؔ کی تصنیفات۔ کاروانِ خیال، خیال قلم، گاشری منار، پراگاش، شبنم کا آتش کدہ، خیال قلم، فغانِ کشمیر اور کشمیر کی وادی وغیرہ پر ضبطِ تحریر میں لائے ہیں۔ اوّل الذکر تاثراتی مقالات کی طرح یہ سارے تبصرے بھی مجموعی طور پر پڑھنے کے لائق ہیں۔ ان تبصروں پر بھی بات کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے تاہم مجھے احمد ندیم قاسمی کے ''کاروانِ خیال'' نام کی کتاب پر لکھے ہوئے چند سطور مُشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرنے پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ قاسمی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ''کاروانِ خیال'' کے ابواب کے عنوانات ہی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے بارے میں ایک بار لکھا تھا کہ غلام نبی خیالؔ کی اس تصنیف کی مثال ایک چمن زار کی ہے جس میں اُن تمام رنگوں کے پھول کھل رہے ہیں جو اَب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آئے ہیں''۔(صفحہ 665۔ جہانِ خیال۔ سہ ماہی فنون لاہور۔ اپریل تا جولائی 1999ء)۔

مجموعی طور پر جہانِ خیال 2017ء میں جموں وکشمیر کی اُردو نثر کی تازہ ترین اور ضخیم کتاب ہے جو مواد اور موضوعات کی رنگا رنگی کے اعتبار سے کافی معیاری، معتبر اور معلوماتی دستاویز ہے۔ کشمیر، کشمیریت اور کشمیریوں پر لکھی جانے والی اُردو نثر کی بہترین کتابوں میں اسے جگہ مہیا کرنا برمحل اور بجا ہے۔ اس کتاب سے وہ لوگ زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو کشمیر میں اُردو زبان کی صورت حال کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ کتاب چھاپ کر خیالؔ صاحب نے عملی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اُردو زبان و ادب کی خدمت میں ابھی بھی ہمہ تن مصروف و مشغول ہیں۔

............●●● ....

ہمارا ادب ''کرشن چندر نمبر''

اُردو افسانے کے قد آور افسانہ نگار کرشن چندر کے صد سالہ جشن یوم پیدائش کے سلسلے میں اکادمی ''ہمارا ادب'' کی خصوصی اشاعت ''کرشن چندر نمبر'' پیش کر رہی ہے۔ اس خصوصی شمارے میں اُردو کے مقتدر شخصیات نے ''کرشن چندر اور کشمیر'' کے موضوع کو نمایاں طور پر اُجاگر کیا ہے۔

اس پتے پر منگوائیں:

● ...... کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

...........●...........

●......جان محمد آزاد

بوستانِ خیالؔ

دُنیائے ادب کے ساتھ غلام نبی خیالؔ کی شناسائی نصف صدی سے زیادہ کی ہے۔آپ نے مختلف ادوار میں ادب اور صحافت کے متعدد شعبوں کو اپنے افکار و محسوسات کی تازگی سے شگفتہ کیا ہے۔ متنوع صلاحیتوں کے مالک خیالؔ صاحب ایک اچھے انشا پرداز ایک خوش آہنگ شاعر اور ایک بے باک صحافی بھی ہیں۔ چنانچہ آپ ریاست میں شائع ہونے والے اوّلین ادبی رسالے ''کونگ پوش'' کے دو برس تک مدیر رہے ہیں۔ یہ نقشِ اوّل گویا آپ کی ادبی صلاحیتوں کا واضح اعتراف بھی تھا جو بعد میں آپ کی ناقدانہ فکر و نظر کا اعتراف بھی ثابت ہوا۔

غلام نبی خیالؔ نے گزشتہ صدیوں کے دوران تخلیق ہونے والے کشمیری شعر و ادب کو اپنی دھڑکنوں میں بسایا اور پھر اس کے بعض درخشندہ ابواب کو مختلف ادوار میں ترجمہ کرنے کی پیہم کوشش کی ہے۔آپ نے مختلف اصناف سخن کا ترجمہ کر کے جہاں کشمیری شعر و ادب کے خزینوں میں اضافہ کیا وہیں اہلِ کشمیر کے فن پاروں کو اردو زبان میں منتقل کر کے ہر ادبی کروٹ کے نشانات صحرائے وقت پر ثبت کئے ہیں۔آیئے دبستان خیالؔ، سے ہم چند ایک حصوں کے یہ اقتباسات ملاحظہ کریں۔ یہ پہلا اقتباس بیٹی اور باپ کے درمیان ایک لوک گیت سے لئے گئے مکالمے کا ہے۔ یہاں باپ اپنی بیٹی سے یوں کہہ رہا ہے:۔

بیٹی صبر میں ہر ایک جبر کو سہنا ہوگا
آج ہی گھاٹ سے پانی کا ایک مٹکا لے کر

ساس سسر کے پاؤں دھوے

پیاری بٹیا اپنے گھر جا

اب تیرا میکے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے

اب اپنے سسرال میں تجھ کو

جیسے تیسے رہنا ہوگا

بیٹی سب کچھ سہنا ہوگا۔!

ایک اور مثال۔ خواجہ حبیب اللہؒ نوشہری کے صوفیانہ کلام کو ''کسی سے نہ کہنا'' کے عنوان سے اردو میں یوں منتقل کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:۔

جو اِک روز دیکھا برہنہ اُسے

گلِ نور جیسا تھا اُس کا بدن

سہیلی کسی سے نہ کہنا کہیں

کہ پھیلے گی سارے جہاں میں یہ بات

وہ اک روز جب خود ہی آغوش میں آ گیا

اُسی لمس کی تاب سے آج تک جل رہی ہوں

اُسے میری قربت گوارا نہ تھی

کسی سے نہ کہنا سہیلی کبھی

چلے جنگلوں کی طرف عارفان عاشقان

سنا جب یہ منصور نے سوختہ جاں ہوا

انا الحق کی آواز پھر گونج اٹھی

یہاں سے وہاں اور وہاں سے بھی دور

کسی سے نہ کہنا سہیلی کبھی

کہ یہ بات پھیلے گی ہر سُو ضرور

آیئے اب دیکھیں عبدالاحد نادمؔ کی ایک کشمیری نعت شریف کو اُردو کا منظوم لبادہ کس کامیابی سے پہنا رہے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

ماہ مدینہ، شاہِ عرب ہو
اندھیارے میں نور دِکھا
ذکر تیرا ہر دم بر لب ہو
اندھیارے میں نور دِکھا
چاندنی رات ہے جلوہ دکھلا
چاند بھی پھر شرمائے گا
رحمتِ باراں مجھ پر کب ہو
اندھیارے میں نور دِکھا۔!

عبدالاحد زرگر جیسے رُجحان ساز شاعر کے کلام میں سنسکرت الفاظ و اصطلاحات کا جو برمحل استعمال ملتا ہے، اُسے ایک اجنبی زبان میں منتقل کرنا کبھی کبھی ناممکن سا نظر آتا ہے لیکن خیالؔ جیسے کہنہ مشق مترجم نے یہ کارنامہ بھی کر دکھایا۔ کلام کی روح کو کہاں تک چھو پائے ہیں یہ الگ مباحثہ ہے لیکن ترسیل کا انداز کس قدر مؤثر ہے ہم فی الوقت اسی کا اندازہ لگانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ترجمہ ''دِل میں تیر چُبھا'' کے عنوان سے ہوا ہے:

میں الہڑ سی دوشیزہ
میری جوانی کے گلِ تازہ کی رنگت پڑ گئی پھیکی
بس یہی میرے دل میں جیسے تیر چُبھا
میں تھی ایک درخت تناور
ایک آرے نے کتنے گہرے زخم لگائے
نے کی مانند اب سوراخوں سے چھلنی ہوں۔

خیالؔ نے محمود گامی کے اُن اشعار کو بھی اُردو میں منتقل کیا ہے جو آج بھی سینکڑوں لوگوں کے

ہونٹوں پر مچلنے کو بے قرار رہتے ہیں۔ خیالؔ کے روپ میں محمودؔ کو ایسا مترجم ملا جس نے اسے اردو دنیا سے متعارف کرایا۔

خیالؔ صاحب نے محمود کی بعض دیگر تخلیقات بھی اُردو میں منتقل کی ہیں ایسے بعض ترجمے آپ کے مجموعے ''خیابان کشمیر'' میں شاملِ اشاعت ہیں۔ ''گل لالہ'' مہجورؔ کی ایک مشہور طنزیہ نظم ہے۔ اسے آپ نے نہایت لطیف انداز میں یوں اردو کا لبادہ پہنایا ہے:

اے گل لالہ ! ذرا تو حالِ دل اپنا سُنا
داغ دل لایا جہاں سے اُس جہاں کی کچھ بتا
کیا وہاں بھی قتل آدم کے لئے ہتھیار ہیں
کیا وہاں بھی عورتوں بچوں کے دامن تار ہیں
اے گل لالہ! ذرا تو حالِ دل اپنا سنا

سچ پوچھیں تو غلام نبی خیالؔ کے روپ میں کشمیری زبان وادب کو گویا ایک ''اصطلاح ساز انجمن'' حاصل ہوئی ہے۔ آپ کی اصطلاحیں مانوس، مروّج اور عام فہم رہی ہیں۔ آپ نے مختلف ادوار میں کشمیری زبان وادب کے خزینے میں گراں قدر اضافے کئے اور تنقید وتردید سے بے نیاز ہو کر کشمیری زبان شہہ پاروں کو اردو میں منتقل کرتے رہے۔ چنانچہ ''صمدؔ میر'' کی اوّلین شعری تخلیق ''داستان درد جان'' کا ترجمہ کیا تو مقامی طور ادبی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ یہاں اس ترجمے سے ایک اقتباس پیش ہے:

سہیلی کار مشکل بن گیا بارِ گراں آخر
مگر سب کچھ مجھے سہنا پڑا خاموش رہ رہ کر
وہ لالہ کی طرح میرا بدن بھی ہوگیا کالا
مگر سب کچھ مجھے سہنا پڑا خاموش رہ رہ کر
میں آئی اس جہاں میں پر نہیں معلوم کیوں آئی
کہ ساری عمر بس غم کے سوا اور کچھ نہیں پایا

یہ لکھا اپنی قسمت کا کسے بخشوں، کہاں رکھوں
میں اپنے ہونٹ سی کر خود ہی سب کچھ جھیلتی ہوں اب

عمر خیامؔ کی عالمی شہرت کی رباعیات سے اہل کشمیر بھی مختلف ادوار میں مستفیض ہونے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مرزا عارف بیگ نے بھی عمر خیامؔ کی رباعیات کو کشمیری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن ناقدین نے خیالؔ صاحب کے ترجمہ کی زیادہ سراہنا کی۔ غلام نبی خیالؔ اس ایک شعر کی مثال دیتے ہیں:

چوں قدِ تو سرو تو نیست مے گویم راست　　　چوں روئے تو ماہ نیست روشن گفتم

فارسی میں ''روشن گفتم'' اور ''مے گویم راست'' کی اصطلاحیں مخصوص معنی رکھتی ہیں لیکن عارفؔ بیگ چونکہ فارسی زبان کی اِن نفاستوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ لہٰذا خیالؔ کے الفاظ ہیں:

" The translator not knowing delicacy of the language has translated the complete verse incorrectly by rendering these metaphors as " won mea panas kun" (I told my self) and " chhe pazrich jaay " (This is the place of truth)"

دریں اثنا خیالؔ نے خود خیامؔ کی ڈیڑھ سو رباعیات کا کشمیری زبان، میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ نصف صدی پہلے شائع ہو کر قارئین کے وسیع حلقوں میں بے حد مقبول رہا۔ آپ نے پروفیسر پُشپ کے ساتھ مل کر ''سمتر انندن پنت'' کے ہندی کلام کو کشمیری لبادہ پہنایا۔ خیالؔ نے رحمان ڈار کے عظیم فن پارے ''شش رنگ'' کا جو اُردو ترجمہ کیا، یہاں اختتام پر اُس ترجمے کے یہ اشعار پیش ہیں:۔

کوئی بھی حال تجھ سے میرا کیوں نہیں کہتا　　　میں بارِ ہجر سہہ نہیں سکتی ہوں مرے یار
کیسے میں چھوڑ دوں تجھے کچھ بھی کہیں یہ لوگ　　　تیرا میرا وصال ازل خود ہی لکھ گیا
سونے کے بندے اور وہ سامان زیب تن　　　سب کو دِکھا رہی تھی اور اِترا رہی تھی میں
لیکن بتاؤں کیسے وہ پھر بھی نہیں آیا　　　شاید کہ پلائے مجھے وہ جام وصل شب
اب ہوں یہ میرے ہاتھ اور دامان ہو اُس کا　　　یہ اُس کی عنایت ہے کہ طعنوں میں پلی ہوں

● ...... ناصر مرزا

کشمیر کی ثروت مند تہذیب کا نغمہ

ایک ہمہ رنگ دستاویز، چمن زارِ نظر، متنوع مجموعۂ مضامین، لائقِ اعتماد مآخذ، جس کا مطالعہ دیدہ و دل کے لئے باعثِ فرحت ہے۔ یہ ہے نامی گرامی شاعر و ادیب، نقاد و محقق، صحافی و قلمکار جناب غلام نبی خیالؔ کی تازہ تخلیق ''جہانِ خیال''۔

جہانِ خیالؔ میں صفحۂ اوّل پر قاری کا استقبال مرزا غالبؔ کے خیال آفرین اس شعر سے کیا جاتا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس شعر پر ایک نظر اور کتاب کے مندرجات پر دوسری نظر، قاری کو دونوں کے درمیان ایک نادیدہ ربط کا اشارہ دیتی ہے۔ نیز منعمِ حقیقی کے تئیں مصنف کے شکر و سپاس بجالانے کی سعادت حاصل ہونے کا حوالہ بھی دیتی ہے۔ کتاب ہاتھ میں لیتے ہی پہلا تاثر رشک کا پیدا ہوتا ہے۔

مصنف کی تازہ تصنیف دراصل ان کی 32/ویں کتاب ہے جو منظرِ شہود پر آئی ہے۔ کئی دہائیوں پر مشتمل ان کے علمی، ادبی اور صحافتی کیریئر کا یہ ایک اہم پڑاؤ اور ایک اہم سنگِ میل ہے (جسے راقم کے ساتھ دورانِ گفتگو، وہ آخری سنگِ میل ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔) تاہم اس مقامِ بلند پر، جہاں وہ فی الوقت ہیں، ان کا ذوق وشوق، عزم وارادہ، سپاہی جیسا دبدبہ غالباً روزِ اوّل رہا ہوگا۔

قابلِ ذکر ہے کہ ان کی شخصیت ایسی ہے کہ لگتا ہے شاعر نے کسی اور پسِ منظر میں، جو پیشن گوئی کی تھی، وہ ان کے حق میں پوری ہو رہی ہے۔

وہ جب آئے گا تو موسمِ گل میرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

عام مشاہدہ ہے کہ اپنی وادئ حیرت میں کچھ (یا غالباً بہت سے) بچے ہمیشہ بچے ہی رہ
ہیں! جبکہ کچھ بچے، بچپن کی دہلیز پار کر کے جوان ہو جاتے ہیں اور بعدازاں "اب قویٰ مضمحل ہو
غالبؔ، اب عناصر میں اعتدال کہاں" کہتے ہوئے بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں۔ تاہم خیالؔ صاحب
کی ہر لمحہ فعال و متحرک شخصیت ایسی ہے کہ بلا مبالغہ اور بغیر خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ شباب ان پر آ کر
ٹھہر گیا ہے! اور یہ نئی تصنیف اسی پُر ثمر شجر اور سدا بہار شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ تازہ تصنیف خیالؔ کے
اسی سلسلے کی ایک کڑی لگتی ہے جس میں کاروانِ خیال، اِظہارِ خیال، فکرِ خیال اور خیال قلم نام کی کتابیں
پہلے ہی علمی و ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

غور طلب ہے کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ دورِ حاضر میں بڑی تحقیق صرف تحقیقی اداروں
اور یونیورسٹیوں میں ہوتی ہے! اس میں شک نہیں کی مدارس اور جامعات میں تدریس کے ساتھ تحقیق
جڑی ہوتی ہے۔ تاہم جہانِ خیالؔ پر ایک نظر ڈالنے سے ایک اور خیال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ تحقیق
یونیورسٹی نظام کے باہر بھی ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے۔ جہانِ خیالؔ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے
اندازہ ہوتا ہے کہ کس عرق ریزی اور محنت شاقہ سے، ادارتی عمل و دخل اور جامعاتی تعاون کے بغیر بھی
قابلِ لحاظ تحقیق و تالیف کا کام غلام نبی خیالؔ انجام دے رہے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں شامل تیر
مضامین اس دعوے کی دلیل کے طور پیش کئے جا سکتے ہیں۔

"جہانِ خیالؔ" قدیم و جدید کشمیر کا ایک حسین سنگم ہے۔ خیالؔ کا مطالعہ وسیع ہے۔ انہیں
کلاسیکی اور جدید ادب پر یکساں دست رَس حاصل ہے جس کا مظاہرہ ان کے موضوعات کے تنوع سے
ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف اس میں قدیم کشمیر کے نمایاں کرداروں بشمولِ ابھینو گپت، جو بقولِ خیالؔ
کشمیر میں سنسکرت کا گوہر تابدار رہے، نیز کھمیندر، سنسکرت طنز و مزاح کا بادشاہ، کلہن۔ کشمیر کا اوّلین
مورّخ، بلہن۔ ثقافتی یکجہتی کا علم بردار، سوم دیو۔ کہانی کا اوّلین خالق، آنندوردھن، بلاغت کا بادشاہ کے
زیرِ عنوان تحقیقی مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ دوسری طرف سر والٹر لارنس اور کشمیر، ٹنڈل، بسکو، شاعر
کشمیر مہجور، غلام رسول طاؤس بانہالیؔ، سعادت حسن منٹو، دینا ناتھ نادمؔ اور امین کاملؔ پر معلوماتی مضامین
قاری کو قدیم و جدید کے اسرار سے آگاہ کرتے ہیں۔ بھگوت گیتا کے اردو تراجم، کشمیری زبان میں بائبل

کے 133 رسال پرانے نایاب نسخے کی بازیافت پر مقالے نئے انکشافات کا پتہ دیتے ہیں جبکہ کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کا نشان زدہ بُرزہامہ خیالؔ صاحب کا خاص مضمون مرکزِ توجہ بنتا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ حالیہ ایام میں کشمیریات سے دلچسپی رکھنے والے برزہامہ کی تہذیب کی ازسرِنو کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ تاہم ایسے موضوعات پر مواد کی کمی طالبِ علموں اور محققوں کو ہمیشہ درپیش رہتی ہے۔ خیالؔ نے اس پر انہیں حاصل معلومات سپردِ قرطاس کر کے اہم علمی خدمات سرانجام دی ہے۔ ایک اور اہم مضمون جس پر معلومات عنقا ہیں، اس مجموعے کی زینت ہے۔ خیالؔ نے اس پر وقت تمام مزید معلومات اکھٹی کی ہیں، یہ ہے ''انیسویں صدی کے اردو اخبارات اور کشمیر'' ماضی قریب سے واقف ہونا قومِ کاشمر کے لئے اتنا ہی لازمی ہے جتنا قدیم اور جدید کشمیر کے مختلف پہلوؤں سے۔ اس موضوع پر کشمیر کے معروف محقق مرحوم پروفیسر اکبر حیدری کے ہم مرہونِ منت ہیں، جنہوں نے ہندوپاک کی لائبریریوں میں موجود اور محفوظ قدیم اردو اخبارات کی ورق گردانی کر کے کشمیر کے حوالے سے ان میں چھپے مواد کو جمع کرنے میں اوّلیت حاصل کی۔ خیالؔ اسے قابلِ قدر مگر ناکافی سمجھتے ہوئے اس پر مزید معلومات فراہم کرنے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔

یہ مضمون پڑھ کر میری ذاتی معلومات میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔

بہرحال سارے مضامین اس لائق ہیں کہ پڑھے جائیں اور بار بار پڑھے جائیں۔ یہ سبھی مضامین خاص توجہ کے لائق ہیں جن میں کشمیری ادب میں تحریک حریت کے رجحانات، کشمیری زبان میں صوفی شاعری، سر والٹر لارنس اور کشمیر، یارانِ وطن جو چلے گئے، لداخ کا سفرنامہ، ٹنڈل بسکو، منٹو کی مناجات بحضور خالقِ کائنات، چند یادگار ملاقاتیں (جگر مرادآبادی، فراقؔ گورکھپوری اور مخدوم محی الدین کے ساتھ) شامل ہیں۔ علاوہ ازیں تین اہم کشمیری شعراؑ کے زیرِ عنوان دینا ناتھ نادمؔ، رحمان راہی اور امین کاملؔ پر خاص تحریر اور دنیا کی دس عظیم کتابیں کے زیرِ عنوان مضمون میں ہومر کی ایلیاڈ، کالی داس کی شکنتلا، شاہنامہ فردوسی، ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی، شیکسپیئر کے ہیملٹ، نیز دیوانِ غالب اور اقبالؔ کے پیامِ مشرق پر تعارفی نوٹ معلومات افزا اور فکر انگیز ہیں۔

خیالؔ صاحب کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ انہیں کئی تہذیبوں سے شناسائی ہے۔ انہوں نے کئی ادوار کا بچشمِ خود ملاحظہ کیا ہے۔ ان کے قیمتی تجربات اور وسیع مطالعہ کی خوبی کا احساس جہانِ خیالؔ

سے ہوتا ہے۔ موصوف ایسی شخصیات میں سے ہیں جنھیں اپنی ذات میں ایک انجمن کہا جاتا ہے۔ اکیلے خونِ جگر سے فن کی آبیاری کرنا کوئی ان سے سیکھے۔

خیالؔ صاحب کی ذات ایسا آئینہ خانہ ہے جس کے ہر آئینے میں کئی ساحرانہ صورتیں نظر آتی ہیں۔'' غلام نبی خیالؔ کی زبان سادہ اور شستہ ہے۔ کوئی بھی مضمون پڑھتے ہوئے قاری کا رکنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے عموماً حقائق سے گفتگو کی ہے اور طویل مباحث سے مضامین کو گراں بار نہیں کیا ہے۔''

''جہانِ خیال'' میں آخر پر ''تصانیفِ خیالؔ'' کے زیرِ عنوان ''لولک پرتو'' سے لے کر ''شبنم کا آتش کدہ'' تک خیالؔ کی اب تک کی شائع شدہ 32 کتابوں کا مختصر تعارف دیا گیا ہے جن میں رباعیاتِ عمر خیام (ترجمہ)، گاشری منار، گلزارِ خیال، اقبالؔ اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر، اختر محی الدین اور فغانِ کشمیر نمایاں نظر آتی ہیں۔

مجموعی طور پر ''جہانِ خیال'' ریاست جموں وکشمیر کے علمی وادبی حلقوں کے لئے خیالؔ صاحب کا ایک خوبصورت اور قیمتی تحفہ ہے۔ یہ کشمیر کی ثروت مند تہذیب کا ایک حسین نغمہ ہے۔ توقع ہے اسے ہر سطح پر سراہا جائے گا اور کشمیریات سے دلچسپی رکھنے والے اس سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

لازم ہے کہ ہمارے علمی وادبی حلقے بالخصوص وادیٔ گل پوش کی جامعات (بشمولِ کشمیر یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر اور اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) کے متعلقہ شعبے خیالؔ صاحب کے اس تحقیقی سرمایے سے استفادہ کرنے کے لئے عملی اقدامات اُٹھائیں۔ خیالؔ نے جو موضوعات زیرِ بحث لائے ہیں، جو اشارے دیئے ہیں، جو حوالے فراہم کئے ہیں ان سے امکانات کے ہزاروں دیئے روشن ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے اور مزید تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

خیالؔ کی علمی، ادبی وتحقیقی خدمات کا اعتراف سرکاری وغیر سرکاری سطحوں پر ہوا ہے تاہم جامعاتی سطح پر یہ ہونا ابھی باقی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خیالؔ کی تاحال شائع شدہ 32 تصانیف سے نئی نسل کو متعارف ہونے کے لئے خاطر خواہ مواقع فراہم کئے جائیں گے اور یہ کہ جامعاتی سطح پر ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف ہو۔

●●●

●...... شبیر احمد شبیر

غلام نبی خیالؔ: صاحبِ اسلوب کشمیری شاعر

علمِ بلاغت کی رُو سے سخنورانہ اسلوب تین اقسام پر مشتمل ہے۔ علمی اُسلوب، اَدبی اُسلوب اور خطابی اُسلوب۔ متنی اور موضوعی لحاظ سے اُسلوب کی اِن تین اقسام کی نوعیت مختلف اور جداگانہ گردانی گئی ہے۔ اختلافِ نوعیت کے اِس تناظر میں اسلوب کی اِن تین اقسام پر بیک وقت اور یکساں گرفت نہایت دشوار ہے۔ اِسی دشواری کی بِنا پر ادبی حلقوں میں ایسے سخنوروں کی تعدادی قلّت عیاں ہے جنھوں نے تحریرات اور تصنیفات میں بلاغت سے عبارت اِن تین اقسامی اسالیب پر مساوی عبور و مہارت کا مظاہرہ کیا ہو۔ خوش قسمتی سے سخنوروں کے اِن کم تعدادی ستاروں میں کشمیر کے ادبی دبستان سے وابستہ کچھ ایسے اُدبا بھی شامل ہیں جن کے ریاضت کش قلم نے قرطاسِ ادب پر لگاتار طبع آزمائی کر کے اسالیب کی تین اقسام پر گرفت پانے کی حسبِ مقدور کوشش کی ہے۔ ریاضت کے پیہم عمل میں منہمک ایک ممتاز سہ اقسامی اُسلوب شِناس کا نام ''غلام نبی خیالؔ'' ہے۔

شہرِ سری نگر کی پائین بستی میں وِلادت یافتہ غلام نبی خیالؔ کی ادیبانہ شخصیت ہمہ جہت رہی ہے۔ اِس ہمہ جہتی وصف کی رُو سے غلام نبی خیالؔ کا شاعرانہ لہجہ اُن کی ادبی اُسلوب شناسی کا غماز ہے۔ خیالؔ صاحب کے مختلف تقریبات اور علمی محفلوں میں پڑھے جانے والے تحقیقی اور تنقیدی مقالات سے اُن کی علمی اُسلوب شناسی کا عندیہ کھلتا ہے۔ جبکہ اسی طرح کے باوقار دانشورانہ اجتماعات میں خیالؔ صاحب کے تقریری لہجے میں اِظہار پانے والے انمول خیالات اُن کی حسب مقدور خطابی اُسلوب

شناسی کی گواہی دیتے ہیں۔ صحافت کا پہلو دار شعبہ بھی خیال صاحب کو جولاں گاہ رہا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادبی شاہکاروں کا کشمیری میں ترجمہ کرنے کا ہنر بھی خیال صاحب نے بارہا آزمایا ہوا ہے۔

غلام نبی خیالؔ کشمیری اور اُردو زبان پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ مضامین کے موضوعات پر کامل گرفت اور خیالات کا تسلسل اِس میدان میں خیالؔ صاحب کی مہارت اُجاگر کرتے ہیں۔ واقعات اور معلومات کے تئیں خیالؔ صاحب کی خوش بیانی کا یہ عالم ہے کہ عدیم الفرصت قاری کا دِل بھی پورا مضمون پڑھے بغیر کتاب رکھنے کی نہیں سوچ سکتا۔ حسن ادا کی خوبی خیالؔ صاحب کی سرشت میں میں پیوست ہے۔ میری رائے میں غلام نبی خیالؔ کا طرزِ اظہارِ قلم اِس تعلق سے انفرادیت کا حامل ہے۔

غلام نبی خیالؔ کی اختصار نویسی سے اُبھرنے والی جامعیت کئی مقامات پر توجہ کی طالب ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ غلام نبی خیالؔ ایجازی کوزے میں معنوی تنوع کا بحرِ بیکراں سمونے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ یہی وہ خاص جوہر ہے جو نثر نگاری میں انہیں کو نمائندہ حیثیت کا حامل بناتا ہے۔ غلام نبی خیالؔ صاحب کی نثری خوش اُسلوبی کا ایک اور روشن پہلو یہ ہے کہ اُنہوں نے کسی بھی تحریری عبارت میں ابہام کی ایسی گرہ نہیں لگائی ہے کہ قاری کو پرت سے پرت اُٹھا کر معانی اور مراد تک پہنچنا پڑے۔ قارئین کی عام ذہنی استعداد کو زیرِ نظر رکھ کر خیالؔ صاحب نے اپنے خیالات صاف، سادہ اور سلیس زبان میں بیان کئے ہیں۔ مگر اسلوب اِس حد تک بھی سلاست آمیز نہیں کہ اس کے عامیانہ ہونے کا احساس اُبھرے۔ نقد و نظر کی سطح پر اِس کو نثری ادب کا حسن مانا جاتا ہے۔ اِس حسن سے آراستہ مثالیں نایاب نہ سہی پر کمیاب ضرور ہیں۔ اُردو زبان کے متوازی کشمیری زبان کا ادبی ذخیرہ بھی خیالؔ صاحب کی غیر معمولی ادبی صلاحیت کا غماز ہے۔ گو انگریزی میں ان کا کوئی تحریری نسخہ میری نظر سے نہیں گزرا تاہم صحافت کی حد تک اس زبان پر خیالؔ صاحب کی خاصی دسترس کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک کشمیری ادیب و صحافی ہونے کے ناطے غلام نبی خیالؔ کو کشمیری زبان اور تہذیب سے مثالی محبت ہے۔

نثری ادب کے موضوعاتی تنوع میں ادیبانہ جوہر نمایاں کرنے والے غلام نبی خیالؔ نے رمز و ایما سے عبارتِ شاعرانہ اسلوب کو بھی اپنے درونی جذبات اور سیمابی احساسات کا اِظہاری وسیلہ بنایا۔ خیالؔ صاحب کی شاعرانہ صلاحیت آنکنے اور جانچنے کے تعلق سے یہ امر قابل تذکرہ ہے کہ نثری

ادب اوراس سے عبارت اُسلوبی آرائش کی نسبت شاعرانہ اُسلوب جداگانہ لطافت ونزاکت کا حامل ہے۔ اِس اسلوب میں طبع آزمائی کے دوران کچھ ایسے پیچ درپیچ قواعد ولوازمات سے سابقہ پڑتا ہے کہ خیالات کے موجزن قلزم کی ترنگیں بہاؤ کے تئیں اِنسدادی اُلجھنوں سے دوچار ہوجاتی ہیں۔ ایسی الجھنوں میں تخلیقی اور تخیلی مراحل پر کبھی کبھی شاعروں کی ذہانت گھٹن سی محسوس کرتی ہے۔ عروضی بندشیں، قافیائی پابندی، تعقید وتنافر کا خیال، لفظی غرابت سے احتراز، ردیف وقافیہ کے معنوی ربط کا اہتمام، تشبیہات واستعارات کا جاذبِ احساس برتاؤ، شعری متن میں شعریت کے جلوے اور آہنگ میں موسیقیت کا جوہر، یہ اوراس طرح کے کئی اور اصول وضوابط خیالات اور اِظہارجذبات میں حائل ہو کر متعدد مقامات پر شاعر کی سوچ اور قلم کو شل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُردو زبان کے نامور مشاق شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کو بھی اِن پابندیوں کی پیچیدہ صورتوں کے تئیں کہنا پڑا کہ:

بہ قدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

شاعرانہ اسلوب کے ان شرطیہ لوازمات کی تنگی کے باوجود جس انداز اور پیہم کوشش سے غلام نبی خیالؔ نے راہ نکالنے کا عزم صمیم اپنا شعار بنایا اُس کی بدولت ان کی کارکردگی شاعری کے میدان میں بھی عیاں اور نمایاں رہی ہے۔ خیالؔ صاحب نے 1961ء میں معروف فارسی رباعی گو عمر خیامؔ کی رُباعیوں کا کشمیری زبان میں ترجمہ کیا۔ ترجمے کی ہئیت چوں کہ شاعرانہ تھی اِس لحاظ سے اِس ترجمے کو خیالؔ صاحب کے اوّلین شعری نمونوں میں گنا جاسکتا ہے۔ رباعیات خیامؔ کے منظوم کشمیری ترجمے سے خیالؔ صاحب کی ابتدائی شاعرانہ کاوشوں کا ذکر میں نے اس سے پہلے کیا کہ اس کی گہرائیوں سے خیالؔ صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کے آبدار موتی اُبھر آتے ہیں۔ شاعری میں خیالات کی وسیع ترین اظہاری آزادی ہے۔ زبان وبیان برتنے میں بھی تخلیق کار کسی طرح کی حد بندی کا مکلّف نہیں ہوتا۔ اپنے تخیلی خاکے کو لفظی، ترکیبی، محاوراتی، تشبیہی، کنایاتی، استعاری اور دیگر صنعتی جواہر سے مزّین ومرصع کرنے میں ہر مرحلے پر مخیرّ اور مختار ہوتا ہے۔ مگر ترجمہ کاری کے معاملات اس کے بالکل اور یکسر برعکس ہیں۔

ترجمہ کاری میں عائد شدہ اصولی بندشوں کے تناظر میں ترجمہ ایسا ہنر ہے جس کی نزاکتیں مترجم کی صلاحیتوں کو کئی سطحوں پر جانچ پرکھ کر اس کے مقام اور مرتبے کا تعین کرتی ہیں۔ اس صورتِ حال

میں تخلیق کاری کی نسبت ترجمہ کاری کی دشواری عیاں ہو جاتی ہے۔ ترجمہ کاری میں بنیادی اہمیت شاعرانہ صلاحیت کو حاصل رہتی ہے۔ شاعرانہ جوہر جس شخص کی طبیعت میں، جس حد تک فروزاں ہو ترجمہ کاری بھی اسی حد تک جاذبِ احساس ثابت ہوسکتی ہے۔ ترجمہ کاری کے فنی لطائف میں جمالی حسن کے ساتھ ساتھ صوتی اور جذباتی عناصر کا بھی خیال رکھنا لازم ہے۔ ان لطائف کا ایک زبان سے دوسری زبان میں انتقال اسی صورت میں ممکن ہے جب ترجمہ کار الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کے مترادف کی تلاش کا اہل ہو۔ جذباتی اور نغمہ کی تاثیر کا بحال اور برقرار رہنا بھی ترجمہ کار کے لئے ایک صلاحیت پیما آزمائشی مرحلہ ہوتا ہے۔ علامتوں، تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں جیسی صنعتوں میں زبان وادب کی مقامی رواج کی رعایت بھی ترجمہ کاری کی اصولی پابندیوں میں شامل ہے۔ اس تمہیدی آئینے میں رباعیات خیام کا منظوم کشمیری ترجمہ یقیناً خیالؔ صاحب کا عظیم شاعرانہ کارنامہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ رہی بات ترجمہ کاری سے وابستہ فنی اصول وضوابط کی اس بارے میں ترجمے کی معیاریت اور ادبی مقام کا تعین نقد ونظر کے کامل ماہرین کی ذمہ داری ہے۔ اِس تناظر میں یہ اصول بھی زیر نظر رہے کہ رباعیات کا ترجمہ رباعیات کے مخصوص اوزان میں ہونا ضروری نہیں۔ رباعیاتی اسلوب میں مضمر مضامین اور موضوعات کا خلاصہ ترجمہ کار کسی بھی عروضی وزن میں پیش کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

رباعیات خیاؔم کے منظوم کشمیری ترجمہ کے بعد منظر عام پر آنے والا ''پراگاش'' نامی شعری مجموعہ بھی خیالؔ صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ شعری مجموعہ 1965ء کے اس دور میں نمودار ہوا جب غلام نبی خیالؔ کا شاعرانہ شباب اور اس سے پیوست جذبات واحساسات نہایت جوبن پر تھے۔ اس زمانے میں محمود گامی کی شاعرانہ کاوشوں سے آغاز اور رسل میرؔ کے بانکے تخیل سے آرائش پانے والا کشمیر کا غزلیہ لہجہ غزل کے لغوی معنی تک محدود رہتے ہوئے عاشقانہ اسلوب پر مشتمل تھا۔ اگرچہ رسول میرؔ کی اس عاشقانہ اسلوبی شربت کو پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ کی شاعرانہ کوشش میں موسیقیت سے وابستہ نئے معیارات بھانپ کر وقت کے نئے ظروف میں ڈال کر کچھ ہلکی پھلکی تبدیلیوں کا تعارف کیا تھا تاہم غزل کے اساسی بیانی انداز میں کوئی نمایاں فرق دیکھنے کو نہیں ملا۔ غلام نبی خیالؔ کے دور میں تخلیقی اور تخیلی سطح پر تقاضے بدلنے کی مزید اور مستزاد امکانات کا احساس غزل گوئی کے تئیں نئی

اسلوبی صورتوں کا متلاشی تھا۔ ایسے میں غلام نبی خیالؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ایک اور آزمائشی مرحلے سے سابقہ پڑا۔ اس آزمائشی مرحلے سے گزرتے ہوئے غلام نبی خیالؔ نے روایتی اور جدید امکانات کی آڑی ترچھی دراڑوں سے ہو کر ایک درمیانی راستہ تلاش کیا۔ قافلوں کو رواں دواں کر کے جہاں خیالؔ صاحب نے روایتی غزلیہ لہجے کی بھی تقلید کی وہیں زمانے کے نئے تقاضوں کو بھی کشمیری غزل کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر آزمایا۔ اس ہنرمندانہ وصف کی نمود نے غلام نبی خیالؔ کے غزلیہ لہجے میں طرز احساس اور زبان و بیاں کا ایک نیا اور انقلابی انداز پیدا کیا۔ ایک طرف رندانہ طبیعت ان کے خیالات کو رنگین سخنی کی جانب کھینچتی تھی تو دوسری طرف ان کے ذہنی ظرف سے ٹپکنے والی سیاسی اور سماجی شعور کی بوندیں انہیں احتجاجی اسلوب برتنے کی صلاح دیتی تھیں۔ یوں غلام نبی خیالؔ کے شاعرانہ تذبذب اور تلون پر مرزا اسداللہ خان غالب کے اس شعر کا مفہومی خلاصہ صادق آنے لگا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　　　کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

روایتی عاشقانہ غزلیہ لہجے کی تقلید میں غلام نبی خیالؔ کا رندانہ جذبہ جوش کی انتہا پر نظر آتا ہے۔ کئی غزلیہ اشعار میں خیالؔ کا یہ رندانہ جوش متانت کا لبادہ چاک کر کے عریانیت کا آہنگ پیش کرتا ہے۔ اسلوب کا یہ عریانی انداز خیالؔ کے اُس شاعرانہ کلام میں مضمر ہے جس کا عنوان ہے ''أ رِکس گامس منزٕ أ رِکس گامہٕ سوندرِ ستیٕ عشق گرٕ ھنہٕ پتہٕ''

اس غزل کا مطلع اور مقطع کچھ اس طرح کے شوخ اور رِندانہ جذبات سے معمور ہے:۔

ناگہٕ بلس پٹھ سمکھن تروٕتھ صبجن شامن یہ چھُ مشکل
ٹلٕی وُزٕ نوٕتھ شوہرہ تہ کتھٕ کرِ گاٖمکی گاسن یہٕ چھُ مشکل
دوٕ بے پگاہ چھے زُوٕن طیس پٹھ ژٕ نٕبٕ گلبن تل موٕ تاہ گرٕو
دوٕ پتھم گرہ کٕبن گُس فند کرہ تے نیرہ بہٕ شامن یہ چھُ مشکل

کشمیر کے روایتی غزلیہ لہجے کا مجموعی طور جائزہ لیا جائے تو خیالؔ اس طرح کے اسلوب میں اکیلے بھی نہیں۔ کشمیری زبان کے کئی غزل گو شعراء نے اسلوب اپنایا ہے۔ شاید اس لئے کہ عاشقانہ جوش کی انتہا فطری طور اثر انداز رہتی ہے۔ اس لئے ایسے ہر اسلوب کو اِنسانی سرشت سے منسوب کر کے

روایتی غزل گوئی کی تقلید زنجیر کی ایک کڑی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

غلام نبی خیالؔ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ رندانہ طبیعت کے باوجود وہ اصولوں کے پابند رہتے ہیں۔ خاص کر سماجی معاملات میں۔ اصولوں کی اِس پاسداری کا ایک رُخ یہ ہے کہ غلام نبی خیالؔ حقیر اور عارضی مفادات کے حصول کی خاطر کسی قصیدہ خوانی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ زہر ہلال کو قند کہے جانے کے روادار نہیں نظر آتے۔

وہ علم وادب کے لئے اہلیت کو بنیادی درجہ دیتے ہیں۔ خیالؔ کی یہ سوچ اِن اشعار سے ظاہر ہے۔

قصیدہ کارِ بدن پرٛی تہٕ کارساز بنیاے　　فریب کالہٕ پگاہ کھیٚوتہٕ فند باز بنیاے

مہ وَن زِ آیہ لکھن وٲلی جلدہ ساز بنیاے　　مہ ون زمانہٕ متھاں رودغازٕ ہایہ بتھِن

توٚے ژٕں گوٚرِکہ تہٕ کاندرادب نواز بنیاے　　چھِ اہل دِل تہٕ ژٕں لگی متی دُکاندٲری کُن

نااہلوں کی قصیدہ خوانی کرنے سے علم وادب پر پڑنے والے قبیح اثرات کو جس طنزیہ لہجے میں خیالؔ نے بیان کیا ہے اُس سے خیالؔ کی سنجیدگی کا وصف عیاں ہو جاتا ہے۔

انسان کئی ایسے جواہر بیرونی لامحدود دنیا میں تلاشنے کی غلطی کرتا ہے جو اُس کے عالم اصغرے موسوم اپنے وجود کی تہہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ خیالؔ کا یہ شعر اِس مضمون کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ازیٚلہ گرہ وُتُس تتہٕ رُووس　　کالہٕ ژھنڈم دُنیا تے شُنیاہ

خیالؔ صاحب کے اِس شعر پر مجھے اپنا ایک شعر یاد آیا جس کا متن کچھ اس طرح ہے۔

وہ پھول تھا، کھلا تو میرے گھر کے سامنے　　جس کو تلاش کرتے پڑے چھالے پاؤں میں

وقتی حالات وحادثات میں کچھ دانشمندانہ مصالح کے پیش نظر شاعر کے اصلاح پسند خیالات اظہار پانے سے رہ جائیں تو شاعر کے جذبات پر قنوطیت کی دھند چھا جاتی ہے۔ غلام نبی خیالؔ کا شاعرانہ مزاج بھی جب اس طرح کی قنوطی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے تو ان کی زبان پر بے ساختہ یوں اشعار جاری ہو جاتے ہیں:

کریڈِ تھرِ بن مژ بند گوٚمُت چھُس　　سُوٚنتہٕ ہواوُ کھ خوشبوت اوسس

عقل وعشق میں تفریق کرنے کا شاعرانہ اظہار کچھ اس انداز سے آشکارا کرتے ہوئے

غلام نبی خیالؔ نے عقل کو مصلحت پسند اور عشق کو ہر طرح کی مصلحت سے بے نیاز قرار دیا ہے۔

عقل روزِ خیالن تھواں دوہے سَر پوش　　　دِلن تہٕ راز گری افشاد وہے حُباب منز

یعنی عقل کا شعار ہمیشہ خیالاتی ظرف کو سر پوش سے ڈھانپنے کا رہا ہے۔ اس کے برعکس عشق اپنے اندر مضطرب حباب کی تاب نہ لا کر ہر راز فاش کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں حباب کو عشق کا قائم مقام مان کر خیالؔ نے استعاری اسلوب برتا ہے۔ عشقیہ جذبات کی تپش سے چہرے کی بدلنے والی حالت جب یہاں تک پہنچے کہ عشق کو اپنا محبوب بھی نہ پہچان سکے تو عاشق کے دل کی گہرائیوں سے استعجابی جذبات کا ابھرنا فطری اور بدیہی امر ہے۔ اس طرح کی حالت و کیفیت جب غلام نبی خیالؔ کے شاعرانہ پیکر پر طاری ہوتی ہے تو تخیّل سے اس طرح کے شعر ٹپکنے لگتے ہیں۔

ؤنہِ لَس پھری پھری برأنتی گرٕھاں چھم　　　پھری پھِری وونس بے چھُس، بے چھُس

یعنی عشق کی بھٹی میں تپ کر میرا حلیہ کچھ اس انداز سے تبدیل ہوا ہے کہ میرے محبوب کو بار بار مجھے دیکھنے پر بھی میری پہچان کے تیئں تذبذب رہتا ہے۔ گو اس کے یقین و گماں کا یہ تلملاتا انداز بھانپ کر میں اس کو اپنے ہونے کا بھروسہ دیتا ہوں مگر وہ ہے کہ مجھے پھر بھی پہچان نہیں پاتا۔

غلام نبی خیالؔ کے کئی غزلیہ اشعار سے عندیہ ملتا ہے کہ انہوں نے اُردو زبان کے شعری ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کا اثر ان کے اشعار سے واضح طور جھلکتا بھی ہے حالانکہ خیالؔ نے الفاظ کے انتخاب سے اس اثر کو زائل کرنے کے آزاد کوشش کی ہے۔ ایک ایسا ہی شعر ہے:۔

خیالہٕ چون ازل تےٚ ابد فقط اِنکار　　　ژہ کہنز ہانزٕ ہ ووٕن درویش زندگی منز ژا کھ

خیالؔ کے اس شعر کا اسلوب مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے اشعار سے متاثر نظر آتا ہے۔

یہ مسائل تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

خیالؔ نے یہ اثر استادانہ طریقے سے پوشیدہ رکھنے میں جس حد تک کامیابی پائی ہے وہ قابل

داد ہے۔ کیونکہ یہ اثر اس کی خیال بندی کی گہرائیوں میں جھانک کر ہی بھانپنا ممکن ہے۔ خیالؔ کے برعکس کشمیری زبان کے معروف غزل گو شاعر غلام احمد مہجورؔ نے غالبؔ کے اس شعر سے لیا ہوا اثر آسانی سے عیاں کیا ہے۔ مہجورؔ کے غزلیہ شعر میں غالبؔ کے شعر کا یہ تاثیری انداز یوں آشکارا ہوتا ہے۔

چانہِ کتھہٕ مہجوٗرہ چاواں عارفن آب حیات

مانہٕ ہوٗتھ درویشِ کأمل آسہکھ نۓ حلقہٕ دار

خیالؔ کی غزلیہ شاعری کے آئینے سے ان کی شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے۔ دوسری ادا سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ خیالؔ کا غزلیہ اسلوب ان کی رندانہ مستیوں اور عاشقانہ چلبلیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مجازی عشق کے جلوے خیالؔ کے شاعرانہ جذبات میں ایسا ہی ہیجان بپا کرتے ہیں کہ ان کے رشحاتِ قلم میں اس طرح کے غزلیہ اشعار بھی نظر آتے ہیں۔

ژٕیہ یادٕ أسی سوراتھ وصلچ میہٕ نالہٕ رٹکھ ژٕ زن ژمے یگھ

میہٕ اوس یاوٗن سٕہ پیوم ہاوٗن دیاں جوأنی چھ طفلہٕ آساں

خیالؔ محبوب سے کہتا ہے کہ تجھے وہ شب وصل یاد ہوگی جب میں نے تجھ کو بانہوں میں لیا اور تو سکڑ سی گئی۔

غلام نبی خیالؔ کی غزلیہ شاعری میں جمالیاتی سطح پر احساسات کو تراوت بخشنے والی اشیاء کا تذکرہ ان کی فطرت پسندی کا غماز ہے۔ اس تعلق سے ان کی ایک غزل کا یہ مطلع شعر مثالی حیثیت کا حامل ہے۔

وُنِس تام باوٕتھ حکایت گُلن ہنٛز گلابن مشکھ نتھ غزل مُشکہٕ ناوٕتھ

یمن ژٕھر نظر کرنہٕ زانہہ نَو بہارن تمن ڈٕ وَنن ہُند فسانا چھُ بأقے

یعنی اب تک تو نے پھولوں کی کہانی سنائی اور گلابوں سے خوشبو لے کر غزل کو معطر کر دیا، جن کی طرف نو بہار نے بھولے سے بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔ ان ویرانوں اور بھسم ہوئے میدانوں کے افسانے ہنوز باقی ہیں۔

اس شعر میں علم بدیع سے عبارتیں معنوی صنعت مراعات النظیر کی جھلک بھی ملتی ہے۔

جمال پسند غلام نبی خیالؔ کے شاعرانہ مزاج کو حالات کی کاری ضرب سہہ کرنابود ہونے والے فطری مناظر کی یاد بے قرار کرکے اُن کے حسنِ ماضی کا خیال بے تاب کرتا ہے۔ اِس بے تابی کو غلام نبی خیالؔ یوں اظہاری قالب میں ڈھالتے ہیں۔

تمے چھِ رنگ مگر مئزی میہٕ رأو بادم وأر

یتھن بہار پھولاں اوس تتھن وُڑان از خاک

یعنی رنگ وروپ کشمیراور کشمیر کے ماحول کا وہی ہے، البتہ میری نظر سے بادام واری اوجھل ہوئی۔ جس مقام پر ماضی قریب میں بہار کی جولانیاں جوبن دکھاتی تھیں، آج اُسی مقام پہ دھول اور گردوغبار اُڑتا دکھائی دیتا ہے۔

علم بدیع کی ایک معنوی صنعت کوصنعتِ تکرار یا صنعت تکریر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اِس صنعت کے برتاؤ سے شاعر اپنے کسی شعر میں کسی ایک لفظ کوئی بار استعمال کرتا ہے۔ لفظ یہ بار بار اور اتصالی برتاؤ اگر ذوقِ سلیم کو بھائے تو حسن تکرار یا تکرار ملیح کہلاتی ہے اور اگر ایسی لفظی تکرار طبیعت پر ناگوار گزرے تو تکرارِ قبیح کہلاتی ہے۔ غلام نبی خیالؔ نے اپنے ایک غزلیہ شعر میں تکرار ملیح یعنی حسن تکرار کی مثال پیش کی ہے۔ شعر کی اسلوبی صورت یوں ہے:

راتچ کتھ مۃٕ گژھی تن آدا صبحٲے صبحٲے باتھ ژٲو

ژٕ تہِ چھُکھ کتھِ پٹھ کتھ کھوژاں میہٕ تہِ پہٕ کتھ گژھ نالی متیو

یعنی اگر رات کی بات اختتام کو نہ پہنچے تو صبح ہونے پر بات لپیٹی جاسکتی ہے۔ تو بھی کیسا ہے کہ تجھے بات بات پہ ڈر لگتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے گلے بھی بات پڑے۔

کشمیری میں بات گلے پڑنے کے محاوراتی جملے سے مراد ہے تہمت لگنا۔ اس معنی میں خیالؔ صاحب کے شعر میں تکرارِ ملیح کے ساتھ تجنیسی عمل بھی شامل ہے۔

محبوب کی بے وفائی کا شکوہ عاشقانہ شاعری میں مشترکہ حیثیت سے شامل رہا ہے۔ غلام نبی خیالؔ بھی شاعر ہونے کی حیثیت سے اِس شکوہ گزاری سے بے نیاز کیوں کر ہوسکتے ہیں۔ محبوب سے شکوہ کے تئیں اُن کا یہ غزلیہ شعر ملاحظہ ہو۔

داد ہے۔ کیونکہ یہ اثر اس کی خیال بندی کی گہرائیوں میں جھانک کر ہی بھانپنا ممکن ہے۔ خیالؔ کے برعکس کشمیری زبان کے معروف غزل گو شاعر غلام احمد مہجورؔ نے غالبؔ کے اس شعر سے لیا ہوا اثر آسانی سے عیاں کیا ہے۔ مہجورؔ کے غزلیہ شعر میں غالبؔ کے شعر کا یہ تاثیری اندازیوں آشکارا ہوتا ہے۔

چانہِ کتھہِ مہجوٗرہ چاواں عاٗرفن آب حیات
مانہِ ہوٗتھ درویشِ کاٗمِل آسہکھ نۓ حلقہِ دار

خیالؔ کی غزلیہ شاعری کے آئینے سے ان کی شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے۔ دوسری ادا سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ خیالؔ کا غزلیہ اسلوب ان کی رندانہ مستیوں اور عاشقانہ چلبلیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مجازی عشق کے جلوے خیالؔ کے شاعرانہ جذبات میں ایسا ہی ہیجان بپا کرتے ہیں کہ ان کے رشحاتِ قلم میں اس طرح کے غزلیہ اشعار بھی نظر آتے ہیں۔

ژیٚہ یاداٗسی سوراتھ وصلچ میٚہ نالہٕ رٹکھ ژٕ زَن ژمے یگھ
میٚہ اوس یاوٗن سُہ پیوم ہاوٗن دپاں جواٗنی چھُ طفلہٕ آساں

خیالؔ محبوب سے کہتا ہے کہ تجھے وہ شب وصل یاد ہوگی جب میں نے تجھ کو بانہوں میں لیا اور تو سکڑ سی گئی۔

غلام نبی خیالؔ کی غزلیہ شاعری میں جمالیاتی سطح پر احساسات کو تراوت بخشنے والی اشیاء کا تذکرہ ان کی فطرت پسندی کا غماز ہے۔ اس تعلق سے ان کی ایک غزل کا یہ مطلع شعر مثالی حیثیت کا حامل ہے۔

وُنس تام باٗوتھ حکایت گُلن ہنز گلابن مشکھ نتھ غزل مُشکہٕ ناٗوتھ
یمن ژٕھر نظر کرنہٕ زانہہ نو بہارَن تمن ڈٕوَنن ہُند فسانا چھُ باٗقیٕ

یعنی اب تک تو نے پھولوں کی کہانی سنائی اور گلابوں سے خوشبو لے کر غزل کو معطر کر دیا، جن کی طرف نو بہار نے بھولے سے بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔ ان ویرانوں اور بھسم ہوئے میدانوں کے افسانے ہنوز باقی ہیں۔

اس شعر میں علم بدیع سے عبارتیں معنوی صنعت مراعات النظیر کی جھلک بھی ملتی ہے۔

جمال پسند غلام نبی خیالؔ کے شاعرانہ مزاج کو حالات کی کاری ضرب سہہ کر نابود ہونے والے فطری مناظر کی یاد بے قرار کر کے اُن کے حسنِ ماضی کا خیال بے تاب کرتا ہے۔ اِس بے تابی کو غلام نبی خیالؔ یوں اظہاری قالب میں ڈھالتے ہیں۔

تمے چھِ رنگ مگر مۄنزِ میہٕ رأو بادم وأر

یتھن بہار پھولاں اوس تنبسن وُڑان از خاک

یعنی رنگ وروپ کشمیر اور کشمیر کے ماحول کا وہی ہے، البتہ میری نظر سے بادام واری اوجھل ہوئی۔ جس مقام پر ماضی قریب میں بہار کی جولانیاں جوبن دکھاتی تھیں، آج اُسی مقام پہ دھول اور گرد وغبار اُڑتا دکھائی دیتا ہے۔

علم بدیع کی ایک معنوی صنعت کو صنعتِ تکرار یا صنعت تکریر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اِس صنعت کے برتاؤ سے شاعر اپنے کسی شعر میں کسی ایک لفظ کو کئی بار استعمال کرتا ہے۔ لفظ یہ بار بار اور اتصالی برتاؤ اگر ذوقِ سلیم کو بھائے تو حسن تکرار یا تکرار ملیح کہلاتی ہے اور اگر ایسی لفظی تکرار طبیعت پر ناگوار گزرے تو تکرارِ قبیح کہلاتی ہے۔ غلام نبی خیالؔ نے اپنے ایک غزلیہ شعر میں تکرار ملیح یعنی حسن تکرار کی مثال پیش کی ہے۔ شعر کی اسلوبی صورت یوں ہے:

راتچ کتھ متہٕ گژھی تن آدا صبحأے صبحأے باتھ ژٹو

ژ تہِ چھُکھ کتھِ پتھ، کتھ کھوژاں میہٕ تہِ ییٚہٕ کتھ گژھ نالٕی متیو

یعنی اگر رات کی بات اختتام کو نہ پہنچے تو صبح ہونے پر بات لپیٹی جاسکتی ہے۔ تو بھی کیسا ہے کہ تجھے بات بات پہ ڈر لگتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے گلے بھی بات پڑے۔

کشمیری میں بات گلے پڑنے کے محاوراتی جملے سے مراد ہے تہمت لگنا۔ اس معنی میں خیالؔ صاحب کے شعر میں تکرارِ ملیح کے ساتھ تجنیسی عمل بھی شامل ہے۔

محبوب کی بے وفائی کا شکوہ عاشقانہ شاعری میں مشترکہ حیثیت سے شامل رہا ہے۔ غلام نبی خیالؔ بھی شاعر ہونے کی حیثیت سے اِس شکوہ گزاری سے بے نیاز کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ محبوب سے شکوہ کے تئیں اُن کا یہ غزلیہ شعر ملاحظہ ہو۔

چھاوٕنس کیٖتھ میہٕ ونتہٕ تھوٗوتھ کیا   یاوُنک ویٗو رباٗ گراٗ وتِھ گوکھ

یعنی اے محبوب تو نے اب میرے اشتغالِ عشق کے لئے باقی ہی کیا رکھا۔ شباب کا بانکپن تو نے بانٹ لیا۔

خیالؔ کے شاعرانہ مزاج میں انانیت کا عنصر بھی جاگزیں ہے۔ اِس انانیت کا واضح اشارہ خیالؔ صاحب کے کئی مقطع کے اشعار سے ملتا ہے۔ مفکرانہ نِگاہ سے دیکھیں تو انانیت نمائی کا یہ اثر بھی اُن کے اُردو اشعار کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اِس ضمن میں غالبؔ کے یہ دو مقطع کے اشعار مثال کی حیثیت کے حامل ہیں:۔

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے   کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

ریختہ کے تم ہی اُستاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میر تقی میرؔ کے غزلیہ اشعار میں بھی کئی جگہوں پر یہ انائی اسلوبِ شعر نظر آتا ہے۔

غلام نبی خیالؔ کے اشعار میں انانیت سے عبارت تصورات اُن کے دو مقطع کے اشعار میں دیکھئے۔

از تہِ خیالؔ چھُ اکھ شاعر سانن تہٕ لچھن منز بس چھُ کُنے

گس گس چھکھ یتہِ ٹکٕ ناو پرٕ ژھان، سےٚ چھے لچھ ناوِہٕن منز ناواہ

یعنی آج بھی خیالؔ نامی ایک ایسا شاعر ہے جو ہزاروں لاکھوں شاعروں میں منفرد اور یکتا ہے۔ کس لئے تو ہر ایک سے استفسار کرتا پھرتا ہے کہ وہی (خیالؔ) لاکھوں ناموں میں خاص نام ہے۔

سخن وَرَن ہُند یقین چھند ریوٗ رتہٕ نغمہٕ کارَن سرُوٗد ہٕند ریوٗ و

غلام نبُی ین خیالؔ گوٚو گیوٚ غزل پرکھنا یہِ شام ڈلہِ ہے

یعنی جمع ہونے والے سامعین کا یقین ماند پڑا اور نغمہ نگاروں کا سرود سرد ہو گیا۔ ایسے میں اگر تو غلام نبی کے شاعرانہ خیالات نغماتی سانچوں میں ڈھال کر سناوٗ گے تو اِس شام کے ڈھل جانے کا بہانہ بنتا۔

اِس زمانی اسلوب کے شعر میں مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے اِس قطعی شعر کا (کسی حد تک) پرتو نظر آرہا ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

اِس اَنا نمائی کے باوجود خیالؔ صاحب نے اپنے تخلص کو مختلف غزلوں میں جس خوبصورت معنوی انداز میں استعمال کیا ہے وہ خیالؔ صاحب کی شاعرانہ ذہانت کا ہی خاصہ قرار پا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

غلام نبی خیالؔ کے غزلیہ اشعار سے ماخوذ یہ دو اشعار:

چانی خیالہٕ ہردَم غم ہیوٚت نہ زانہہ خیالؔن　　نتہٕ یُس دوہا کڈن پیوٚسے اوس حادثٕ ساتھا

یعنی تیرے ہی خیال میں مگن رہتے ہوئے خیالؔ کبھی غمگین نہ ہوا۔ ورنہ جو بھی دن گزرا کسی حادثے سے کم نہ تھا۔ لطف یہ ہے کہ اِس شعر میں تخلص کے برتاو سے علم بیان سے عبارت صنعتِ تجنیس غیر ارادی طور آشکارا ہو گئی ہے۔ یعنی ایک خیال سے مراد خیالؔ کی شخصیت اور دوسرے خیال سے ذہنی خیالات مراد ہیں۔

ژ یہ کو وہ خیالُن خیال ترووتھ میہٕ ہوٚ جواں دِل بۄن چھُ مشکل

جواں عشق پزہ ہمیشہ چھاون دپاں جوٗنی چھےٚ طفلہٕ آساں

یعنی اے محبوب تو نے کیوں خیالؔ کا خیال ترک کیا۔ مجھ جیسا جوان ملنا بہت مشکل ہے (یعنی عاشق شاعر)۔ جواں عشق کو ہمیشہ برتنا چاہئے کہ جوانی بچے کی مانند اضطراری ہوتی ہے۔ یہاں بھی خیال لفظ کی وہی تجنیس صورت اور معنوی فرق عیاں ہے

غلام نبی خیالؔ کی اِرتقائی شاعرانہ زندگی میں رنگوں کا بدلاوٗ بھی دیدنی ہے۔ اِس اِرتقا کے ایک مرحلے پر خیالؔ صاحب کو دُنیا کی ناپائیداری کو محسوس کر کے ایک اثر آفریں غزل کی صورت میں اُجاگر ہو جاتا ہے۔ اِس اثر انگیز غزل کا مطلع ہے۔

جانانہٕ لگیو دُنیا چھُ تاوَن اُخر میژِہ تل ساون ہو

کتھٕ کَرِنی نےٕ اتھٕ مۄرِناوَن اُخر میژِ تل ساون ہو

یعنی اے محبوب میں تم پر فدا۔ یہ دنیا ناپائیدار اور خسارے کا گھر ہے۔ آخر مٹی کے نیچے دفن ہونا ہے۔ باتیں کرنے والے ہاتھ ملتے دکھائی دیں گے کہ آخر مٹی کے نیچے دفن ہونا ہے۔

غلام نبی خیالؔ کے غزلیہ اشعار کا ایک تحسینی پہلو یہ بھی ہے کہ اِن میں عروضی اوزان کی چست

بندش نظر آتی ہے۔ اِس لحاظ سے خیال صاحب اپنے اُن ہم عصر شعرا کی صف میں شامل ہیں جن کے غزلیہ اشعار عمودی کسوٹی پر کھرے اُترتے ہیں۔

کئی غزلیہ اشعار میں غلام نبی خیالؔ کا لہجہ حالات و واقعات کی سنگینی دیکھ کر احتجاجی ہے۔ احتجاج کے اِس لہجے کا واضح عندیہ پانے کے لئے اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کلہ ژٹِتھ گلن ہندی قبرستان وُچھ بستی بستی نارہ دزاں

بوٗ ژحاصِل ہے اَسہِ آویوٗ ہے کمہٕ ٹِکۍ وۄنہٕ نَے حاصِل نہٕ کہِں

یِیِتہٕ سرِ بازر بے عار پرٕ دِکۍ ژون پہرن زندگانی وۄٚ ہواں

یمہ اسہٕ وِنۍ خاب انان أسم تمہ رأژن ہٕندی دردِل نہٕ گُنی

خیالؔ صاحب کے شاعرانہ ذخیرے میں کہیں کہیں پر صوفیانہ جلوے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جس طرح مرزا غالبؔ کے کلام میں کئی جگہوں پر محض اتفاق سے ایسے تصوفی جلوؤں کی جھلملاہٹ دیکھنے کو ملتی ہے۔ خیالؔ صاحب کے اشعار میں صوفیانہ مضامین کے اِن جلوؤں سے اشارہ ملتا ہے کہ خیالؔ صاحب نے صوفیانہ تصنیفات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں خیالؔ صاحب کے یہ اشعار:

محفلِ اذکار أس طیٚس پٔتھ پانہٕ خدا اوس صدر نشین

أتھی منز بڈٕ بوٗ ڈ بختاوار اژاوتہٕ ژھرۍ چندہ بۄرۍ نم راتھ

راتک شب اوس شمس فقیرُن شامَے دۄ پُن خیالس پگھ

شُنیاہ گرٛشھی تھےٚ دُنیاہ اُوتھ سأری شش رنگ پُرۍ نم راتھ

پہلے شعر کے بارے میں خیالؔ صاحب خود لکھتے ہیں کہ یہ شعر میں نے حضرت امیر خسروؔ سے مستعار لیا۔

خیالؔ صاحب کے کئی غزلیہ اشعار سے عیاں ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے تخیل میں زیادہ تر اثر مرزا غالبؔ کی غزل گوئی سے لیا ہے۔ اِس تعلق سے خیالؔ صاحب کی ایک غزل کا یہ مطلع ملاحظہ ہو:

تَس گُمتس وُوٕنی پھِرا گوٚ ووُوٕنی کیاہ وَنہٕ کتھٕ کنٕز لُولی سُہ آو

تاپہٕ ٹیٚو کا اکھ دارِ کنِہتھ زن ژاہو وتہٕ برہ کنٕز ستی دراو

اِس شعر کا متن اور سیاقی انداز مرزا غالؔب کے اِس غزلیہ شعر سے میل کھاتا ہے۔

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا ۔۔۔ تیرا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

خلاصہ یہ کہ غلام نبی خیاؔل اپنے دورِ ادب کے ایسے بالغ نظر اور زرخیز ادیب اور شاعر ہیں جن کے ادبی تحائف سے نئی ادبی پود مستقبل بعید تک رہنمائی پاتی رہے گی۔ خیاؔل کے پہلودار اور مضمون ومعانی آفرین لہجے سے شہ پا کر آنے والا نیا شاعر کشمیری ادب میں نفع بخش اضافہ کرسکتا ہے۔

..........●●● ....

......●......

● ...... عیاش عارفؔ

غلام نبی خیالؔ بحیثیت ڈراما نگار

ڈراما یونانی زبان کے لفظ ڈراو سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں عمل یا ایکشن۔ زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر کو مانا گیا ہے۔قدیم زمانہ سے لے کر آج تک فنی اصطلاح میں ڈراما کا اطلاق اس صنف ادب پہ ہوتا ہے جس کے الفاظ میں گفتار کی محترک قوّت اور کردار میں عمل وارادہ کی کیفیت موجودہ ہو۔عملی تجربات کی روشنی میں واضح ہو چکا ہے کہ ڈراما فنونِ لطیفہ کی ایک صنف ہے۔

جہاں تک کشمیری زبان میں صنف ڈراما کی تاریخ کا تعلق ہے، ہمیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ سینکڑوں سالوں پہ محیط ہماری منفرد تہذیب اور کلچر میں صنف ڈراما ایک خاص اہمیت کا حامل رہی ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ کشمیر کا کلچر اور اس کی روایت دنیا کی قدیم ترین روایتوں میں سے ہے۔اس خوبصورت وادی کے خوبصورت پھول ہمیشہ اپنی مہک سے دنیائے فکر کو دعوتِ فکر دیتے آئے ہیں۔

قدرت نے جہاں اس وادی گلپوش کو اپنے بے انتہا حسن سے مالا مال کیا ہے وہاں اس جنت میں ایسے سپوت پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نہ صرف اپنی ریاست میں بلکہ ملک اور بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی قابلیت اور ذہانت کا لوہا منوالیا ہے۔ ایسے ہی سپوتوں میں جناب غلام نبی خیالؔ ہے جو نہ صرف ایک اعلیٰ پایۂ کے ادیب، دانشور اور صحافی ہیں بلکہ ڈراما نگاری کی دنیا میں بھی اُنہوں نے ایک تاریخ رقم کی ہے۔

خیال صاحب کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صفات اور صلاحیتیں وافر مقدار میں ملی ہیں جو

ایک کامیاب انسان بننے کے لئے درکار ہیں ۔ جب ریاستی کلچرل اکادمی نے مجھے غلام نبی خیاؔل صاحب کے بارے میں اپنے خیالات قلمبند کرنے کی دعوت دی۔اس دوران ریاست کے ممتاز اداکار شری بنسی مٹوجی نے وفات پائی۔

بنسی مٹوالمعروف اکبر چاچا جنہوں نے دوردرشن کیندرسری نگر کے ایک مشہور سیریل ''شب رنگ'' میں اپنی بہترین اداکاری کے جوہر دِکھا کرلوگوں کے دِلوں میں ایک خاص جگہ بنائی تھی ۔یہ سیریل جناب غلام نبی خیال نے لکھا تھا اور اس کے ہدایت کار اور پیش کار جناب فاروق نازکی تھے۔حالانکہ بنسی مٹوجی نے اسٹیج ،ریڈیواور ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں بہت سارے کردار نبھائے ۔ مگرلوگ انہیں اکبر چاچا کے نام سے زیادہ جانتے تھے۔اس صدمے کے دوران میں جموں میں قیام پذیر تھااور یہ میری خوش بختی تھی کہ میں شری بنسی منتوجی کی آخری رسومات میں حصہ لے سکا۔شمشان بھومی سے گھر واپس لوٹتے ہوئے میں 1981ء کے دور میں چلا گیا۔جب دوردرشن کیندرسری نگر سے مشہور سلسلہ وارڈرامہ ''شب رنگ'' کا آغاز ہوا۔

دیکھا جائے 1970ء سے لے کر 1980ء تک کا دور ہماری ریاست میں ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک سنہری دُور رہا ہے۔ایک طرف جہاں ہمارے سرکردہ ادیبوں کی کاوشوں سے بہت خوبصورت اور معیاری ادب منظر عام پر آیا۔دوسری جانب ہمارے معتبر ڈراما نگاروں نے صنف ڈراما کوایک نئی سمت بخشی ۔ بہت سے بہترین ڈرامے اور سیریل لکھے گئے جن کی کہانیاں اور کردار آج بھی دیکھنے اور سننے والوں کے دل ودماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔خاص کر طنز ومزاح اور کامیڈی سے بھرپور ڈرامہ لوگوں نے زیادہ پسند کیے ۔یہی وجہ ہوئی کہ خیاؔل صاحب نے لوگوں کا مزاج اور ڈراما کے تئیں ان کی خاص دلچسپی کا نبض ٹٹولتے ہوئے سیریل ''شب رنگ'' کا تانا بانا تیار کیا جس میں لوگوں کی زندگی کے روزمرہ مسائل اور سماج سے جڑے ہوئے دیگر مسئلوں کوطنز ومزاح کا جامہ پہنا کرعوام کے احساسات اوران کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی۔شروع شروع میں سیریل مہینے میں دوبار ٹیلی کاسٹ ہورہا تھامگر دس قسطوں کے بعد خیاؔل صاحب اور فاروق نازکی صاحب کے باہمی مشورے کے بعداس کے پلاٹ میں نئی تبدیلی لائی گئی ۔اس سیریل کے شروعاتی اداکاروں میں مکھن لعل صراف، ہردے ناتھ گرٹو،

بشیر منصور، قاضی فیض، جی ایم وانی، اشوک زالپوری، محترمہ ریتا جلالی اور دیگر اداکار کام کر رہے تھے۔ ایک نئی فیملی کو متعارف کرایا گیا جس میں وادی کے ہردلعزیز فنکار شادی کول المعروف شمس الدین التمش، اوشا تکو المعروف بیگم سلال، فاروق شیخ المعروف غنہ اور میں عیاش عارف۔ میرے کردار کا نام عیاش ہی رکھا گیا۔ کیوں کہ میرا کردار منچلا طبیعت کا کردار تھا۔ اس نئی فیملی کے متعارف ہونے کے ساتھ ہی یہ سیریل راتوں رات کامیابی کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اب اس کا ٹیلی کاسٹ ہفتے میں دو بار ہونے لگا اور یہ نئے کردار اس قدر عوام میں مقبول ہو گئے کہ آج بھی قریب 38 سال گزرنے کے بعد لوگوں کی زبان پر ان کرداروں کے نام اور ان کے مکالمے بالکل تر و تازہ ہیں۔ خاص کر شمس الدین کے یہ دو مکالمے ''بیگم سلال ژہ کیاز گوئے ملال۔ اور غنہ غنہ غنہ فون فون ہا'' کو لوگوں نے اپنی روزمرہ بول چال میں طنز و مزاح کا حصہ بنا لیا تھا۔ اِن کرداروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ راستے میں پیدل چلنا یا کسی پبلک پلیس پر جانا کافی محال بن چکا تھا۔ اِتفاقاً اگر کسی شخص کی نظر ہم پڑتی تو آناً فاناً لوگوں کی بہت بڑی بھیڑ اُمڈ پڑتی تھی۔ پھر وہاں سے نکلنے کے لئے بڑی مشقت کرنا پڑتی تھی۔ مگر لوگوں کی محبت اور اُن کا پیار دیکھ کر ہمیں ایسا لگتا تھا کہ ہم بھی کسی مشہور فلمی اداکار سے کم نہیں ہیں جو آج کل بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے کافی محرکات ہیں جو میں اس وقت زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا ہوں۔

سیریل ''شب رنگ'' کی کامیابی کا راز اس کا بہترین سکرپٹ، خوبصورت پروڈکشن اور اعلیٰ ہدایت کاری ہیں جس کا سہرا خیالؔ صاحب اور فاروق نازکی صاحب کے سر جاتا ہے۔ بعد میں دوردرشن کے قانون کے مطابق اس سیریل کے ہدایت کار تبدیل ہو گئے اور نئے ہدایت کار آئے جن میں اشوک جیلخانی اور راجیش کول صاحب شامل ہیں جن کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کے باعث اس سیریل کی کامیابی میں کوئی کمی اور آخرکار یہ سیریل 104 قسطوں پر اختتام پذیر ہوا۔ یہ سیریل دُوردرشن انڈیا میں پہلا طویل ان ہاؤس سیریل کا ریکارڈ قائم کر گیا۔

فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم مشاہدے میں آتی ہیں جب کوئی ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار بیک وقت کمال کے درجے تک پہنچ سکا ہو۔ ایسی ہی باکمال شخصیات میں جناب غلام نبی خیالؔ صاحب کا نام قابلِ ذکر ہے۔ خیال صاحب اپنے سے کم تر اور کم رتبہ لوگوں میں ایسے گھل مل جاتے

ہیں جیسے کہ ان کے ساتھ صدیوں کا رشتہ ہے۔ وہ گھر گرہستی کے معاملات سے لے کر حسن و عشق کی داستان تک کسی بھی موضوع پر اپنا نظریہ یا رائے ٹھونسے بغیر ہی بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اپنے دِل کی بات زبان پر لاتے ہیں۔ خیالؔ صاحب کو ریا کاری چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ میری خوش نصیبی کہ خیالؔ صاحب مجھے بے حد عزیز رکھتے ہیں۔ میں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی بے پناہ شخصیت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ کچھ ایسا پایا ہے جو میری پیشہ وارانہ زندگی میں کافی کام آیا۔ خیالؔ صاحب ہمارے ادب اور ثقافتی گلشن کے وہ پھول ہیں جس پر نہ صرف ہم بلکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔

..........●●●..........

شیرازہ اُردو ''صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر''

اِس خصوصی اشاعت میں صوفیانہ موسیقی کی ابتداء، اس کا تدریجی سفر، اساتذہ کے کوائف، صوفیانہ موسیقی میں گایا جانے والا عارفانہ کلام، اس میں بجائے جانے والے ساز، سرکردہ موسیقاروں کے ساتھ انٹرویو، نادر و نایاب تصاویر، نوٹیشن اور دیگر اہم دستاویزات شامل ہیں۔

اس پتے پر منگوائیں:

● .....کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

......●......

●...... محمد یوسف مشہورؔ

رُباعیاتِ عمر خیامؔ کا کشمیری ترجمہ

غلام نبی خیالؔ نے رُباعیات عمر خیامؔ کا کشمیری ترجمہ کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ کشمیر، جسے کبھی ایران صغیر کے نام سے جانا جاتا تھا اپنے فارسی زبان وادب کے لئے سبک ہندی میں خاص مقام رکھتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہے کہ سبک کشمیری بجائے خود ایک منفرد سبک ہے۔ یہاں کے شعرا نے برصغیر کی سرحدوں سے نکل کر ایران میں بھی اپنا سِکہ جمایا۔ عروج وزوال کے آفاقی اصول کے تحت کشمیر میں سیاسی تبدیلی کے ساتھ ہی لسانی تبدیلی بھی رونما ہوئی۔ فارسی کی جگہ اردو اور پھر انگریزی نے لی ہے مگر کشمیری زبان اب بھی اپنی جگہ ویسے ہی قائم ودائم ہے جیسے سنسکرت، پالی اور فارسی کے دور میں تھی۔ اس نے ان سب زبانوں سے خوب خوب استفادہ کر کے اپنے دامن کو وسیع کیا ہے۔ کشمیری قوم ''خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدِرْ'' کے سنہری ضابطے کے تحت ہر دور میں آمادہ علم وہنر وصنعت وحرفت رہی ہے۔ چنانچہ جہاں تک رسائی ممکن ہوسکی ہے وہاں سے اکتساب کیا ہے اور کیا جارہا ہے۔ اسی رجحان کے چلتے دُنیا کی مختلف زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، اردو وغیرہ سے کشمیری زبان میں ترجموں کا سلسلہ شدومداور شوق وذوق سے جاری ہے۔ فارسی زبان چوں کہ یہاں صدیوں تک علمی و ادبی اور سرکاری زبان رہی ہے اس لئے اس کے ساتھ ہمارا رشتہ قریب کا رہا ہے۔ ہزاروں فارسی الفاظ کشمیری میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ اسی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہزاروں فارسی ضرب الامثال اور کہاوتیں ہماری روزمرہ کا ناقابل تنسیخ حصہ بنی ہوئی ہیں۔ ہماری علمی وادبی اصطلاحات کا بیشتر ذخیرہ فارسی زبان کا مرہون منت ہے۔ سچ پوچھو تو کشمیری زبان میں عربیت بھی فارسی کے ہی واسطے سے در آئی ہے۔ کشمیر اور فارسی کا رشتہ سیاسی کم اور علمی زیادہ ہے۔ کشمیریوں نے بلالحاظ مذہب فارسی زبان میں

استعداد بہم پہنچائی۔ درجنوں فارسی مثنویاں کشمیری زبان میں ترجمہ کرنے میں ہندو مسلم شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں۔ دورِ جدید میں اگرچہ عمومی سطح پر کشمیر میں فارسیت کا غلبہ کم ہو چکا ہے تاہم خصوصی سطح پر فارسی زبان وادب کی تعلیم بالا ثانوی سطح سے کالج اور یونی ورسٹی سطح تک اب بھی فراہم کی جارہی ہے۔ فارسی کی شاہکار تخلیقات کو کشمیری زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ جو صدیوں قبل شروع ہوا تھا آج بھی نہایت انہاک سے جاری ہے۔

اسی پس منظر میں دیکھا جائے تو غلام نبی خیالؔ کا ''رباعیاتِ عمر خیامؔ'' کا کشمیری ترجمہ دونوں زبانوں (فارسی اور کشمیری) کے علم وادب میں قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔ نیز یہ ترجمہ ایران اور کشمیر کے درمیان قدیم تہذیبی وثقافتی رشتے کو ازسرِ نو استوار کرنے کی جانب سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں فارسی بولنے والے اپنے ثقافتی سرمائے کا اس خطہ میں اثر ونفوذ سے حوصلہ پائیں گے وہیں کشمیری زبان بولنے والے لوگ اپنی علم دوستی پر ناز کرنے کا جواز پائیں گے۔ اصل انسانی جوہر یہی ہے کہ:

تو برائے وصل کردن آمدی　　　　نے برائے فصل کردن آمدی

اس موقر تخلیق کے ترجمہ کی اہمیت وافادیت اور ترجمہ کار کی علمی وتخلیقی صلاحیتوں کی داد دینا اس لحاظ سے بھی بجا ہے کہ شعری اصناف میں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل اور قطعہ کے مقابل رُباعی ایک مشکل اور نادر فن ہے۔ ہر کس وناکس کو اس فن پر عبور حاصل نہیں ہوتا ہے۔ عربی شاعری میں یہ صنفِ شعر سرے سے ہی مفقود ہے۔ فارسی میں یہ صنف ایجاد ہوئی، پروان چڑھی اور پھلی پھولی۔ اس کے باوجود خود فارسی زبان میں بھی اس صنف کا سرمایہ مقدار کے لحاظ سے نسبتاً کم ہے۔ اُردو زبان میں بھی اس فن میں طبع آزمائی کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور جتنے ہیں ان میں سے کئی شعرا کو ماہرین عروض قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ کشمیری زبان میں شعرا اگرچہ مقامی اصناف شعر واکھ (واکیہ) وژن (وچن)، شرک (شلوک)، عربی وعجمی اصناف قصیدہ، مثنوی، غزل اور مغربی اصناف سانیٹ، ہائیکو، نظم، جدید اوپیرا وغیرہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر رباعی فارسی کی وساطت سے متعارف ہونے کے باوجود ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔

شمیم اختر نے جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کے کشمیری انسائیکلوپیڈیا کی چوتھی جلد میں رباعی کے

عنوان سے اپنے نوشتے میں غلام حسن بیگ عارفؔ اور میر غلام رسول نازکی کی سمیت کئی شعرا کی (ان کے بقول) رباعیات کو محض دوبیتی اور قطعہ کے زمرے میں گنوایا ہے۔ البتہ محمد امین کامل، پروفیسر غلام محمد شوریدہ کی رباعیات کو فن کے معیار پر پورا اترنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس صورت کو مدنظر رکھ کر ہم یہ بات تسلیم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کشمیری شاعری کو اس دشوار صنفِ سخن سے آشنا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرنا ہی چاہیے۔ لٰہذا غلام نبی خیالؔ نے عمر خیامؔ کی رباعیات کا ترجمہ اسی صنف میں کر کے اس کمی کو پورا کرنے کا اہتمام کیا ہے جو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ غلام نبی خیالؔ نے ویسے بھی اردو، انگریزی اور فارسی کی کئی کتابوں کے منثور اور منظوم ترجمے کر کے کشمیری شعر و ادب کا دامن مالا مال کیا ہے مگر عمر خیامؔ کی رباعیات کا ترجمہ مئے دو آتشہ کا حکم رکھتا ہے وہ یوں کہ رباعی ایک نپی تُلی، مختصر، مجمل، پُر از حکمت و دانائی اور مخصوص چوکھٹے میں بند صنفِ سخن ہے۔ گویا خیر الکلام ماقلَّ و دلَّ کے وصف سے موصوف یہ صنف سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی متقاضی ہے۔ چار مصرعے اس طرح یکے بعد دیگرے اپنا تاثر قائم کرتے ہیں کہ قاری یا سامع ان کے باہمی ربط اور مجموعی تاثر سے شاعر کے تخلیقی تجربے میں شریک ہو کر محظوظ اور سرشار ہوتا ہے۔ یہ تو عام رباعی گو شعرا کا حال و معاملہ ہے مگر عمر خیامؔ کا معاملہ اس بارے میں زیادہ توجہ طلب ہے۔ وہ نابغۂ روزگار، عبقری ذہن کا مالک، علم ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، جغرافیہ، نجوم و فلکیات میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ اُس جیسا ذہین و فطین سائنس دان فن شاعری میں دوسری اصناف کی بجائے رباعی کی طرف اس لئے متوجہ ہوا ہوگا کہ یہاں کم سے کم الفاظ کی مالا میں علم و عرفان اور اسرار و رموز کے گوہر تابدار پرونے کا ہنر آزمانے کا اچھا خاصا موقعہ ملتا ہے۔ رباعی گوئی اور ریاضی دانی منطقی اختصار سے نکتہ آفرینی کا عمل ہے۔ کشمیری زبان کے شعری سرمائے میں یہ ترجمہ اضافے کا حکم رکھتا ہے۔

یہ سطور صفحہ قرطاس پر رقم کرتے ہوئے میری مجبوری یہ کہ میں غلام نبی خیال کی ترجمہ کی ہوئی رباعیات کی کوئی مثال دے کر اپنی بات قارئین کرام کو باور نہیں کرسکتا کیوں کہ وہ کشمیری زبان میں ہیں اور اردو قارئین کے لئے زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم کے مترادف ہوسکتی ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ کرنے بیٹھ جاؤں تو اس سے نفسِ مضمون کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ دوگونہ دِقت کا باعث ہوں گی۔ تاہم

یہ تاثر پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ کشمیری قارئین اس ترجمے سے عمر خیاؔم کے ذہنِ رسا اور کلاسیکی فارسی شاعری کے سنہری عہد سے شناسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ کشمیری زبان کی ادبی تاریخ اس ترجمہ کاری کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کرچکی ہے۔ جب جب اِس کی ورق گردانی کی جائے گی کہ عمر خیام کے نام کے ساتھ ہی غلام نبی خیال کا نام عزت واحترام اور فخر سے لیا جائے گا۔ یہاں یہ بات کہنا برمحل ہے کہ مشرقی شاعری میں سے جن عظیم فن کاروں کی فی زمانہ مغربی ممالک میں بہت زیادہ پذیرائی ہورہی ہے اُن میں مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی اور رباعیات عمر خیام خصوصی طور شامل ہیں۔ ان دونوں تخلیقات کو عالمی سطح پر شہرتِ دائم حاصل ہے۔ جبھی تو ان کے ترجمے متعدد زبانوں میں ہوتے ہیں اور آج بھی ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ اِن کو بحث وتمحیص اور نقد ونظر کا موضوع بنایا جارہا ہے۔ ترجمے کے علاوہ ان پر حاشیے اور ان کی شرحیں لکھی جارہی ہیں۔ اہل ذوق اس سلسلے میں مزید معلوماتِ کے لئے ان کتب سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس ترجمے کے مطالعے سے ہمارے شعرا اپنے کلام میں گہرائی، گیرائی اور نکتہ آفرینی پیدا کرسکتے ہیں۔ عام قارئین اس ترجمہ کو پڑھ کر اصل شاعر عمر خیاؔم کے ذہنی افق کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں اور ساتھ ہی ترجمہ کار کی فارسی زبان پر دسترس اور اُس کے محاورے کو کشمیری محاورے میں منتقل کرنے کی صلاحیت کی داد دیئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے ہیں۔ اِس غیر معمولی علمی کام سے خیاؔل نے خیاؔم کو کشمیری قارئین کے لئے ازسرِ نو دریافت کیا بلکہ یہ باور کرایا کہ عظیم لوگ وفات پاجانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور دنیا اُنہیں زندہ وجاوید بنانے کے لئے ان کے کارناموں کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے اور پرکھنے کے نت نئے اسباب وعلل تلاش کرتی ہے:

پاس آکر دیکھتے، پھر دُور جاکر دیکھتے
ہم سے ہوسکتا تو ہم تم کو برابر دیکھتے

............●●● ....

●...... احسان کشمیری

''گاشری منار'': عالمی ادب کا اک نادر نمونہ

غلام نبی خیالؔ کشمیر کے کہنہ مشق شاعر، صاحب طرز ادیب، تحقیق کار، نقاد اور صحافی ہیں۔ وہ بیک وقت تین زبانوں کشمیری، اردو اور انگریزی میں گزشتہ ساٹھ برس سے برابر لکھ رہے ہیں۔ اس دوران ان زبانوں میں اُن کی بتیس (32) کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کے لئے انہیں وقتاً فوقتاً درجن کے قریب ملکی اور مقامی سطح کے انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

''گاشری منار'' (روشنی کے مینار) غلام نبی خیالؔ کی طرف سے اہل کشمیر اور کشمیری زبان کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے، کیوں کہ اس نوع کی کوئی کتاب کم از کم برصغیر کی کسی بھی زبان میں میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

یہ کتاب دنیا کے ممتاز شاعروں کی حیات اور فن کا احاطہ کرتی ہے جن میں دنیا کی گیارہ زبانوں کے سربرآوردہ سخن وروں کا مصنف نے خود ہی انتخاب کیا ہے۔ ان میں ہومر (یونانی)، ورجل (لاطینی)، کالی داس (سنسکرت)، امرالقیس (عربی)، ڈانٹے (اطالوی)، حافظ (فارسی)، شیکسپیئر (انگریزی)، گوئٹے (جرمن)، پشکن (روسی)، اقبال (اردو) اور ٹیگور (بنگالی) شامل ہیں۔

عالم سخن کے قابل ستائش نمائندوں پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں، البتہ ''گاشری منار'' کی طرز پر ایسی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آسکی ہے، جس میں متذکرہ شاعروں ہی پر تحقیقاتی اور تنقیدی مقالات کی شیرازہ بندی کی گئی ہو۔ اس لحاظ سے اسے منفرد کتاب کہا جاسکتا ہے۔

اس کتاب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ خاص کر انہوں

نے یونانی، لاطینی، فارسی اور اطالوی زبانوں کے کلاسیکی ادبیات کا بغور اور انہماک کے ساتھ گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ہومر، ورجل اور ڈانٹے پر ان کے مطالعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کتاب کے حوالہ جات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی تکمیل میں لاتعداد اہم تصانیف اور دیگر کارآمد مواد کا بھرپور مطالعہ بھی کیا ہے۔

''گاشرِ منار'' کشمیری زبان کی وہ اوّلین کتاب ہے جس کے اخیر پر حوالہ جات سائنسی طریقے پر ایک جامع طریقے سے درج کئے گئے ہیں۔ ایک سو تیرہ صفحات پر پھیلے ہوئے اس انڈیکس میں اسما کے نام نستعلیق اور کتب و جرائد کے نام نسخ میں ڈالے گئے ہیں۔

یہ ایک اتفاقیہ مگر دلچسپ حقیقت ہے کہ ''گاشری منار'' کے گیارہ مضامین کو مکمل کرنے پر بھی مصنف کو پورے گیارہ سال یعنی 1960ء سے 1971ء تک کا عرصہ لگا۔ یہ کتاب 512 صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے 1972ء میں طبع کیا گیا اور اس کی قیمت پچیس روپے رکھی گئی۔ اس میں مصنف نے محنت شاقہ سے متعلقہ شاعروں کی نادر تصاویر شامل کر کے اس کے معنوی حُسن کو چار چاند لگائے ہیں۔ مثال کے طور پر ہومر کے سنگی مجسمے کی تصویر ایتھنز کے قومی عجائب گھر سے لی گئی ہے۔ ورجل کا مجسمہ بھی کیپٹولین میوزیم، فلاسفرس ہال، روم نے بھیجا ہے۔ کالی داس کا قلمی خاکہ اکھل بھارتیہ کالی داسا پریشد، اُجین سے موصول ہوا ہے۔ جیوٹو ڈی بونڈون کی بنائی ہوئی ڈانٹے کی شبیہہ نیشنل میوزیم، فلورنس کے شکریہ کے ساتھ شاملِ کتاب کی گئی ہے۔ حافظ شیرازی کی تصویر برٹش میوزیم کی عطا کردہ ہے۔ گوئٹے کی شکل کا عکس نئی دہلی میں جرمن سفارت خانے نے بھیجا ہے۔ پشکن کی تصویر ہند میں روس کے سفارت خانے کے شعبہ ثقافت کی عطا کردہ ہے اور ٹیگور کی شبیہہ مغربی بنگال میں شانتی نکیتن کے شعبہ اشاعت سے ملی ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بسیار کوشش کے باوجود خیالؔ صاحب کو عربی شاعر امرالقیس کی تصویر یا قلمی خاکہ حاصل نہیں ہو سکا۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ بقول خیالؔ صاحب ''گاشری منار'' کا نام مرحوم اختر محی الدین نے تجویز کیا تھا اور اس کا گرد پوش ریاست کے ممتاز مصور مرحوم غلام رسول سنتوش نے مزین کیا تھا۔

''گاشرِ منار'' کو 1974ء میں ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکیڈیمی نے پہلا انعام دیا اور اگلے سال یعنی 1975ء میں اسے ہندوستان کی سب سے معتبر ساہتیہ اکادمی (نیشنل اکیڈیمی آف لیٹرس) کی طرف سے تین سال میں لکھی گئی بہترین کشمیری کتاب کا انعام عطا کیا گیا۔

اکیڈیمی کے انعامات کی تقسیم کے سلسلے میں نئی دہلی میں 21رفروری 1976ء کو جو تقریب منعقد ہوئی اُس میں اکیڈیمی کی طرف سے ''گاشرِ منار'' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''اس تصنیف کو دنیا کی چند عظیم الشان ادبی ہستیوں پر محققانہ مقالات اور ایک پختہ اور فن کارانہ طرزِ تحریر کی وجہ سے گزشتہ تین سال کے لئے کشمیری زبان کی بہترین کتاب قرار دیا جاتا ہے۔''

اس سے قبل ممبئی سے شائع ہونے والے مشہور ادبی رسالے PEN کے اکتوبر 1974ء کے شمارے میں پروفیسر ترلوکی ناتھ رینہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''اس کتاب میں کشمیری نثر میں ایک نئی زمین ہموار ہوئی ہے۔ مقبول اُردو اخبار ''اقبال'' کے مدیر غلام نبی خیاؔل کو متعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُن کا سیمابی ذہن نہ تو ادبی اِظہار کے کسی ایک ذریعہ تک محدود رہ سکا ہے اور نہ ہی اُن کی عالمانہ برتری ایک زبان کے دائرے میں بند ہوسکی ہے۔ وہ پانچ زبانوں انگریزی، فارسی، عربی، اُردو اور کشمیری پر عبور رکھتے ہیں۔ خیال صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ اپنی مادری زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔''

سری نگر سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ''ایکارڈ'' کے جنوری 1976ء کے شمارے میں پروفیسر نصرت اندرابی نے ''گاشرِ منار'' پر ایک طویل تبصرہ میں لکھا، ''کشمیری زبان میں نثر کی صنف صرف چند برس قبل تک ناپید تھی۔ جن کشمیری ادیبوں نے اس صنفِ ادب کو اپنی زبان میں متعارف کرایا اُن میں Poet Laureate غلام نبی خیاؔل بھی شامل ہیں۔ ''گاشرِ منار'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے دنیا کے بڑے بڑے شاعروں پر قلم اُٹھاتے وقت اُن کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا جس کی بنا پر ان شاعروں کو کشمیری قارئین سے متعارف کراتے ہوئے ان کا بھرپور جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ مجموعہ کشمیری ادب میں ایک یادگار اضافہ ہے۔''

نئی دہلی میں منعقدہ ساہتیہ اکادمی کی تقریب پر خیاؔل صاحب نے انگریزی میں ''گاشرِ منار''

کی شانِ نزول اور اس کی تخلیق کے محرکات کو زیرِ بحث لایا۔ تقریر کے اخیر پر خیالؔ صاحب نے ٹیگور کی ایک دعائیہ نظم کے یہ اشعار پڑھے:

Let my Love for thee be so
closely Knit with my life
As in the music with rabab
It is my fervent wish
That surrender my life to thee
with all the Love I have

فروری 1976ء میں اخبار ''انڈین ایکسپریس'' کے مدیر کلدیپ نیئر کے کہنے پر انگریزی روزنامہ میں ''گاشری منار'' پر جو تبصرہ شائع ہوا اُس میں خیالؔ صاحب کے اس اِظہارِ خیال کو بھی شامل کیا گیا تھا، ''کشمیری کتابیں پڑھنے والوں کا یہ عالم ہے کہ ''گاشری منار'' کی صرف ڈھائی سو جلدیں چھاپی گئیں، جن میں سے ایک سو سرکاری کتب خانوں کے لئے خریدی گئیں اور باقی سو جلدیں میں اپنے احباب میں تقسیم کرتا پھر رہا ہوں۔''

''گاشری منار'' کے بارے میں زیرِ بحث شاعروں کے فن پر جس پُرکاری اور تجزیاتی نظر سے بحث کی گئی ہے وہ خیالؔ صاحب کے وسیع تر مطالعہ کی گواہی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ہومر کی شاعری کے بارے میں یہ تاثرات کہ ''ہومر کا قلم اس قدر اثر کا مالک ہے کہ ہم اس کے کرداروں کے جذبات اور احساس کے ہمراہ اپنے آپ کو بھی غیر شعوری طور پر شامل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایکلیز کا وقتی غصہ ہم پر بھی غالب آ جاتا ہے۔ ایگامنان اور ہیکٹر سے ہم جاں نثاری اور عالیشان جرأت کا درس لیتے ہیں۔ ہیلن ہمارے جنسی جذبات کو بھی ہوا دیتی ہے۔ ہم ناسیکا کو معصومیت اور حُسن کا بہترین نمونہ جان کر اس کی وہی عزت کرتے ہیں جو اُس کو اوڈیسیس نے کی۔ اسی طرح اوڈیسیس کی بے قرار زندگی ہمارے سکھ چین کو بھی لوٹتی ہے۔'' (مقالہ ہومر)

ایک انسان جو محاسن ماحول کے اثرات قبول کرتے ہیں وہ بہر حال کسی نہ کسی صورت میں اس کے خیالات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ٹیگور انسانی وجود کے ان سبھی سیاہ اور سفید رنگوں پر نظر رکھتے تھے،

لیکن اس کے ساتھ ان کا ضمیر انہیں صداقت، حق اور نیکی کا ثنا خواں بناتا تھا۔ ان کے ڈرامے انسانی احساسات اور فکری اور ذہنی تبدیلیوں کے ترجمان ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے دو ڈراموں ''راجہ اور رانی'' اور ''وسرجن'' میں ملکہ گنہ وتی اسی سیلاب میں بہہ گئی ہے کہ کالی دیوی کے نام انسان یا حیوان کی قربانی دینے سے وہ کسی حد تک فرحت محسوس کرتی ہے۔

اس جگہ ٹیگور مرد اور عورت دونوں کی اُس برائی اور اچھائی کا پردہ فاش کرتے ہیں جو یا تو اُن کی زندگی کو اندھا بناتی ہے یا اسے دوسروں کے لئے رہنمائی کا رُتبہ عطا کرتی ہے۔ (مقالہ ٹیگور)

''گاشری منار'' بلاشبہ کشمیری ادب کے تنقیدی اور تحقیقی شعبے میں ایک خاطر خواہ اضافہ ہے، جسے پڑھنے والے مدتوں تک ایک نادر تحفہ کی حیثیت میں یاد رکھیں گے۔

............●●● ....

● ...... حسن انظرؔ

غلام نبی خیالؔ کی منظوم ترجمہ کاری: ایک جائزہ

غلام نبی خیالؔ کشمیر کے ایک معروف صحافی، شاعر، مصنف اور مولف ہیں۔ اسّی سال کی عمر میں اپنی بتیسویں کتاب ''جہانِ خیالؔ'' چھپوا کر ثابت کر چکے ہیں کہ ضعیف العمری میں بھی کاروبارِ شوق کو جاری رکھا جاسکتا ہے اور ''پرورشِ لوح وقلم'' کی جاسکتی ہے۔ آپ کی کتابوں میں شاعری کے ساتھ ساتھ تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی وغیرہ ہر طرح کے معاملات سے متعلق مواد ملتا ہے جو مجموعی طور پر معلومات میں اضافے کا باعث ہی نہیں مسرت انگیز اور دل چسپ بھی ہے، اگر چہ کہیں کہیں پر بعض حضرات کے لئے اختلافات کے دروازے بھی وا ہوتے ہیں۔ میرے لئے ذاتی طور پر موصوف ایک قابلِ احترام شخصیت ہیں کیوں کہ جہاں ان کے اکثر معاصرین نے اردو جیسی ہر دلعزیز زبان سے اعراض برتا وہیں خیالؔ صاحب نے اپنی مادری زبان کشمیری کے ساتھ ساتھ اردو میں لکھتے رہنے کو لازمی سمجھا جس سے آپ کی لسانی رواداری واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے آپ کی نثری اور شعری تخلیقات میں دوسروں کی مصلحت اندیشی کے باعث جھجکتے ہوئے بات کرنے کی عادت کے برعکس کھل کر اور ضمیر کی باتیں کہنے کی جرأت بھی نظر آتی ہے لیکن میں اُن کی نرگسیت اور خودستائی کی جھلکیوں پر معترض بھی رہا ہوں۔ اس ضمن میں اِن کی تازہ ترین کتاب ''جہانِ خیالؔ'' کے صفحہ نمبر 27 پر درج اس مبالغہ آمیز بیان کو ہی لیجئے شاید آپ بھی میرے اعتراض کو حق بجانب ہی قرار دیں گے۔

''ترقی پسند تحریک کا سورج غروب ہونے کے بعد کشمیری زبان نے تاحال کوئی دوسرا نادمؔ،

راہیؔ، کاملؔ، یا خیالؔ پیدا نہیں کیا۔"

یوں خیالؔ صاحب گویا ایک مجموعہ اضداد شخصیت رکھتے ہیں۔ فی الحال ان کے کشمیری شعری تخلیقات کے منظوم اردو تراجم ہی ہماری توجہ کے مرکز بنے رہیں گے جن کے بارے میں بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ منظوم ترجمہ کاری کی ایک اچھی مثال ہیں۔ کشمیری زبان کی نثری و شعری تخلیقات کو اُردو اور دوسری زبانوں میں یوں تو پہلے بھی کئی لوگوں نے منتقل کیا ہے لیکن اکثر اوقات غیر شاعرانہ انداز میں اور اصل تخلیقات کی روح کو مجروح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عرب و عجم میں دراصل ابن رشیق اور جرجانیؔ کی روایات اور تصورات کے مطابق آج بھی کسی شاعر کو کما حقہ سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے دوسرے شاعر کے ذریعے سے لازمی سمجھا جاتا ہے، میں ذاتی طور پر اسی خیال کا سو فیصد قائل ہوں کیوں کہ میں نے کشمیر کے درس و تدریس سے منسلک عام اساتذہ کو اُن کی بساط کے مطابق ترجمہ کاری میں بہت مصروف پایا ہے لیکن وہ عموماً فائدہ پہچانے کی جگہ نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ اس تناظر میں غلام نبی خیالؔ کی ترجمہ کاری خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ موصوف کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں شروع سے ہی شعر کہتے آئے ہیں اور ایک مقتدر شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے بھی جاتے ہیں۔ ان کی منظوم ترجمہ کاری کو بھی ویسے پہلے ہی تسلیم کیا جاچکا ہے خاص طور سے عمر خیامؔ کی فارسی رُباعیات کے کشمیری میں منظوم ترجمے کی بنیاد پر اُن کی کوششوں کو خوب سراہا بھی گیا ہے۔

کشمیری زبان کی جن شعری تخلیقات کو غلام نبی خیالؔ نے اردو میں ترجمے کیلئے منتخب کیا ہے وہ انتخاب بھی بجائے خود قابلِ توجہ ہے۔ ان کی اپنی طبع زاد شاعری کو دیکھتے ہوئے تو اُن سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ صرف رنگین جذبات و خیالات والی یا حسن و عشق والی شاعری کو ہی منتخب کریں گے لیکن یہاں تو پیر عزیز اللہ حقانیؔ، عبدالاحد ناظمؔ، ولی اللہ متوؔ اور عبدالاحد نادمؔ جیسے نعت گو شعراء کے کلام کو بھی شامل انتخاب رکھا گیا ہے۔ یہ رنگ موصوف کی کاوشوں میں یقیناً ایک نیا اور اضافی رنگ ہے۔ اسی طرح سے لوک گیتوں کو بھی جگہ ملی ہے۔ صوفی شعرا خاص طور سے رحمٰن ڈار، احد زرگر، شمس فقیر کے ساتھ ساتھ اشتراکیت اور آزاد خیالی کیلئے مشہور کشمیری شعرا کی تخلیقات کو بھی اس گلدستے میں سجا رکھا

ہے۔ یہ حسنِ انتخاب بہت ہی قابل داد ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کن تخلیقات کا کس طرح اور کتنی کامیابی کے ساتھ ترجمہ ہو پایا ہے۔ ترجمے کو یوں بھی ایک مشکل بلکہ ناممکن العمل خواب گردانا گیا ہے۔ انگریزی زبان وادب سے منسلک ایک قلمکار نے یہاں تک بھی کہہ دیا ہے کہ

" In translation of poetry what we usually lose is the poetry itself."

یعنی شاعری کا ترجمہ کئے جانے پر جو ایک چیز چھوٹ ہی جاتی ہے وہ خود شاعری ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا پھر یہ مطلب بھی نہیں کہ شاعری کی ترجمہ کاری کی کوئی افادیت اور اہمیت نہیں ہے۔ سردست ہم غلام نبی خیالؔ کی زیرِ نظر ترجمہ کاری کے حوالے سے روشنی ڈالیں گے۔

میں سب سے پہلے کشمیری زبان کے ایک ہر دل عزیز صوفی شاعر صمد میر کی غزل (یاوژن) اور اس کے اردو منظوم ترجمہ پر بات کرنا پسند کروں گا۔ پہلے دونوں یعنی اصل تخلیق اور اس کے ساتھ ساتھ خیالؔ کا کیا ہوا منظوم ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

ویسی کار مشکل بارگوٚب گوم وبتراوُن پیٛوم
گلالہ پانس کالہِ رنگ گوم وبتراوُن پیٛوم

ترجمہ

سہیلی ! کارِ مشکل بن گیا بارِ گراں آخر
مگر سب کچھ مجھے سہنا پڑا خاموش رہ رہ کر
وہ لالہ کی طرح میرا بدن بھی ہو گیا کالا!
مگر سب کچھ مجھے سہنا پڑا خاموش رہ رہ کر

کیا کرنہ آیوس سمسارس غمہ رٛوس ناکھیٛوم
کرِ کیاہ ازلس یی لیکھتھ گوم وبتراوُن پیٛوم

ترجمہ

میں آئی اس جہاں میں پر نہیں معلوم کیوں آئی
کہ ساری عمر بس غم کے سوا اور کچھ نہیں کھایا
یہ لکھا اپنی قسمت کا کسے بخشوں کہاں رکھوں؟

میں اپنے ہونٹ سی کر خود ہی سب کچھ جھیلتی ہوں اب

دردل مالیُن دکہ دِتھ گوم وأرِی وُ ے کریوٗٹھ پیٚوم

حق اوس ہَشہ ہُنْد، سخ کورُم زوم وبتراوُن پیٚوم

ترجمہ

نکالا مجھ کو میکے سے میرے محبوب میکے نے

مگر سسرال میں بس رنج دیکھے اور ستم جھیلے

میں اتنا مانتی ہوں ساس کا مجھ پر تو حق ہی تھا

مگر اس کی بڑی بیٹی بھی مجھ پر ظلم کرتی ہے

اتھ چرخہ یندرس توسہ کٔروم، ورتلہ رودم اوم

پوٚل گوم بازرٕ مول وستھ گوم وبتراوُن پیٚوم

ترجمہ

یہاں چرخے پہ آٹھوں پہر میں نے پشم کاتی تھی

مگر اس میں پڑا کمزور بل اب کیا کروں کہہ دے

گئی بازار تو قیمت ملی بس کوڑیوں جیسی

سہیلی! اب تو بس چپ چاپ سہتی ہوں جو سہنا ہے

صمد میر کی اصل تخلیق (غزل نما یا ریختہ) تو اصل میں بیس اشعار پر مشتمل ہے اور بحر و وزن کے اعتبار سے ایک خوب صورت نمونۂ فن ہے۔ موسیقی اور الفاظ کے انتخاب کے لحاظ سے بھی یہ ان کے ایک کامل استاد سخنور ہونے کا ثبوت ہے جبکہ ترجمہ پابند نظم کی طرح موزون اور بحر و وزن کا احساس دیتے ہوئے بھی ایک کم تر تاثیر والی کوشش ہے۔ کسی شیخ مکتب کی طرح اگر چہ لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ شعر کی روح تک اتر کر اُسے منتقل کرنے کی شاعرانہ کوشش ضرور ہوئی ہے۔ لیکن مترجم کی سہل پسندی بھی نظر

آہی جاتی ہے۔ مثلاً یہ پانچویں اور چھٹے اشعار کا ترجمہ تو بہت ہی قابلِ تعریف ہے۔

کہوں کیا اب مری سوتن بھی گھر میں آن پہنچی ہے
کہوں کیوں کر کہ یہ دوہری مصیبت بھی اٹھاتی ہوں

ان اشعار کی زبان سلیس اور صاف ہونے کے ساتھ ساتھ پُرکار بھی ہے، خاص طور سے ''دوہری مصیبت'' سے معنوی تہہ داری بھی پیدا کی گئی ہے۔ لیکن ترجمہ کے مطلع میں وہ بات نہیں بن پائی ہے جو صمدؔ میر نے شعری کردار یا متکلمہ سے کہلوایا ہے کہ

گلالہ پانس کالہ رنگ گوم ویتراوُن پیٖوم

یعنی'' میرے لالہ رنگ (سرخ وسپید) بدن کا رنگ بھی اب کالا پڑ چکا ہے لیکن مترجم اصل شعر کی روح تک نہیں پہنچ پائے ہیں کہ ع

وہ لالہ کی طرح میرا بدن بھی ہو گیا کالا

سرخ اور دمکتے ہوئے گل لالہ کا کالا پڑ جانا تو شعری خوبصورتی کے ساتھ ساتھ پُر جوش اور خوب صورت بدن پر غموں کی سیاہی چھا جانے کی دلیل ہے جبکہ ترجمے میں کہے گئے'' لالہ کی طرح کالا'' پڑ جانے کو اصولی طور پر خلافِ مشاہدہ اور بے معنی ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

مہجورؔ، غلام نبی عارض، چمنؔ لعل چمن، غلام احمد نازؔ وغیرہ کی منتخب کی گئی نظموں وغیرہ کے ترجمے تو قابلِ قبول ہیں کیوں کہ ان میں کوئی خاص فکری گہرائی یا تہہ داری ہے بھی نہیں لیکن اصل معاملہ تو معنیاتی تہہ داری کی حامل صوفیانہ شاعری اور عقیدتی یعنی نعوت پاک وغیرہ کے تراجم کا ہے جہاں بھر پور احتیاط اور فنی لوازمات کے لئے محنت پر کسی Compromise کی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ محمود گامیؔ کی نظم'' میرے معشوق''، حبیب اللہ حبیؔ کی نظم'' کسی سے نہ کہنا'' اور چند لوک گیتوں کے اردو تراجم میں برتی گئی زبان بھی مجموعی طور پر اچھی ہے اور اصل تخلیقات کی روح بھی بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل ہوئی ہے لیکن ان کے برعکس رحمٰن ڈار کی ایک بے حد منفرد اور خوب صورت نظم'' شش رنگ''، پیر عزیز اللہ حقانیؔ کی نعت شریف اور بعض دوسری شعری تخلیقات کے تراجم میں تساہل پسندی کی جھلکیاں بھی صاف طور پر نظر آتی ہیں۔

پہلے حقانیؔ اور دیگر نعت گو شعرا کے کلام اور اُن کے عمل میں لائے تراجم کے سلسلے میں یہ عرض کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ ایسی عقیدت کی زائیدہ شعری تخلیقات کو منتقل کرنے کے لئے اصل تخلیق کار کی سی وجدانی کیفیات کا پیدا ہونا یا نہ ہونا بہت ہی اہم معاملہ ہے۔ اچھی اور بہترین نعت گوئی کے لئے تو بلاشبہ وہی یا کچھ ویسی ہی عقیدت، جاں نثاری اور جذباتی وابستگی لازمی ہے۔ جس طرح حسان بن ثابتؓ، امام بوصیریؒ، مولانا جامیؒ، جان محمد قدسیؒ، سعدیؔ، رومیؔ، خسروؔ یا حقانیؔ وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ دیگر لوگ بھی ضرور نعت لکھ سکتے ہیں اور لکھ بھی چکے ہیں لیکن اُن میں صرف فنّی اور لسانی مقاصد کی حصولیابی ہی نظر آتی ہے۔ غلام نبی خیالؔ بھی شاید نعت کی طرف صرف فنّی لسانی ضرورتوں کے باعث ہی مائل ہوئے ہیں۔ حضرت جامیؔ نے تو ایک بے قرار جاں نثار اور فدائی رسولؐ کی حیثیت سے بے شمار نعوتِ پاک لکھیں اور جا بجا اپنی جان بلکہ ''با جملہ فرزندان'' ہر چیز رسولِ کریمؐ پر وار دینے کی بات کہی اور دہرائی ہے۔ جان محمد قدسیؔ کی ایک نعتِ شریف تو سینکڑوں نعت گو شعراء بشمول مرزا غالبؔ کو اسی زمین میں نعت لکھنے کی محرک بنی اور اس نعت شریف کا مطلع یہ ہے:

مرحبا سیّد مکی مدنی العربی   دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

خیر اب ہم فی الحال پیر عزیز اللہ حقانیؔ کی زیرِ بحث نعت اور اُس کے ترجمے کی طرف آتے ہیں۔

گوٚو جہاں تازہ بہ رخسارِ رسول عربیؐ
روٗٹ گلو مشک زِ انوارِ رسول عربیؐ
روز و شب درایہ پھٹِتھ پرِ ڈٔٹھ شمس و قمر
ذرہ چین آیہ بہ انوارِ رسولِ عربیؐ
روزِ بر عرش بریں نورِ حقس سجدٕ کٔرِتھ
جبہ ناز عرقبارِ، رسول عربی
نیرِ سردار عرب جلوہ دِواں در عرصات
امتکی جامہٕ علم دارِ رسولِ عربیؐ
انبیاء ساری وَنن بار خدایا نفسی
ربِ اغفرلی اُمم کارِ رسول عربی

خم کمر خاک بسر خستہ جگر حقانیؔ
آش ہبتھ آو بہ دربار رسول عربیؐ

اس وجدآور نعتِ شریف کا جو ترجمہ غلام نبی خیالؔ نے کیا ہے وہ یوں ہے۔

ہے جہاں تازہ زِ رخسار رسول عربیؐ　　گل مہک اٹھے زگفتار رسول عربیؐ
روز و شب خنداں ہیں اور شمس و قمر ہیں تاباں　　نور برسا ہے از انوارِ رسول عربیؐ
حشر کے دن بخشوائیں گے وہ امت کے گناہ　　امتی ہوں گے بہ دربار رسول عربیؐ
انبیا سارے کہیں گے کہ خدایا نفسی　　رب اِغفرلی اُمم کار رسول عربیؐ
خم کمر خاک بسر خستہ جگر حقانیؔ　　دیکھو آیا ہے بہ دربار رسول عربیؐ

اصل تخلیق اور اس کے زیر بحث اردو منظوم ترجمے پر تقابلی زاویئے سے نظر ڈالئے تو اصل نعت شریف بہرصورت ترجمے کے مقابلے میں ایک بہت ہی کامیاب اور بے حد پُر تاثیر تخلیق نظر آجائے گی۔ مترجم نے حالاں کہ اس بے حد مقبولِ عام اور شاید اب تک کی بہترین کشمیری نعت کے نو اشعار میں سے پانچ اشعار کو ہی ترجمے کے لئے چُن لیا ہے۔ پھر بحر و وزن ہی نہیں اصل نعت میں برتے گئے عربی اور فارسی کے اکثر الفاظ اور تراکیب کو بھی من و عن مستعار لے کر اپنے کچھ ہی گِنے چنے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ کوئی آزاد ترجمہ کرنے کی کوشش تک نہیں کی گئی ہے حالاں کہ خود حقانیؔ صاحب نے متذکرہ نعت جان محمد قدسیؒ اور مولانا جامیؒ کی دو مختلف نعتوں سے متاثر ہو کر ہی لکھی تھی۔ جان محمد قدسیؔ کی اُس نعت شریف کا مطلع پہلے ہی درج کر چکا ہوں جس کی زمین میں اسے لکھا گیا ہے یعنی۔

مرحبا سیّد مکی، مدنی العربیؐ　　دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اُسی نعت میں وہ منفرد قسم کا شعر بھی شامل ہے جس کے ردِ عمل میں رسولِ کریمؐ نے ان کو مبینہ طور پر بخواب دیدار دے کر جنت کی بشارت بھی دی تھی۔ وہ شعر یوں ہے۔

نسبتِ خود بہ سگے کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شُد بے ادبی

اور مولانا جامیؔ کی نعت شریف کا مطلع یوں ہے۔

گل از رُخت آموختہ نازک بدنی را　　بُلبل ز تو آموختہ شیرین سخنی را

جاؔمی کی یہ نعت بھی اپنے فنی لسانی اور جذباتی پس منظر کی وجہ سے زبان زدِ ہر خاص و عام رہی ہے لیکن حقاؔنی نے اُن کی زمین اور ان کے مواد سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ایک منفرد انداز میں اسے دوبارہ تخلیق یا تشکیل نو کے عمل سے گزارا ہے۔

اس کے برعکس ولی اللہ متو، عبدالاحد ناظم اور عبدالاحد ناؔدم کی منتخبہ نعوت کا ترجمہ کسی قدر بہتر اور کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ ولی اللہ متو کی نعت شریف کا ترجمہ خاص طور سے زبان و بیان کی روانی اور تاثیر کے اعتبار سے پُرتاثیر ہے، دو اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں ؎

خوار ہوں اک نفس امارہ نے مارا یا رسولؐ
عالم تذلیل میں ہر دن گزارا یا رسولؐ
کارِ بد ایسے کئے شیطان بھی شرمندہ ہو
دین و دنیا کی یہ بازی میں بھی ہارا یا رسولؐ

عبدالاحد ناؔدم، جنہوں نے مجذوبانہ انداز میں اچھی نعتیں لکھی ہیں اور جو خاص طور سے نسوانی لہجے کے باعث کشمیری عورتوں میں بہت ہی مقبول ہوگئی ہیں۔ ناؔدم کو بعض قرابت داروں نے عطار د روؔمی و جاؔمی کے برابر مقام دیا ہے جو بہر حال اُن کا محض حُسنِ خیال یا مبالغہ ہی ہوسکتا ہے۔ خیاؔل نے بھی اُن کی ایک مشہور نعت کو ترجمے کے لئے چن لیا ہے۔ اُس نعت کا پہلا شعر یوں ہے ؎

مکی قمر تہ مدنی شمسا　　گاہ ہاو تمسا ماہِ رُخسار

خیاؔل صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ؎

ماہِ مدینہ شاہِ عرب ہو　　اندھیارے میں نور دِکھا

اگر مترجم نے متذکرہ شعر کا ہی ترجمہ کیا ہے تو اسے بہت ہی آزاد اور تخلیقی انداز کا ترجمہ کہا جاسکتا ہے لیکن اگر ناؔدم کی ترمیم شدہ شاعری جو میر غلام رسول ناز کی اور عبدالرشید ناز کی کے ہاتھوں سامنے لائی گئی ہے تو پھر بات دوسری ہے۔

صوفی شعرا میں سے عبدالاحد زرگر کی ایک خوب صورت نظم ”سُے میہ دلس کان“ کا ”دل میں

چھا تیر'' کے عنوان سے تاثر اور زبان و بیان کے لحاظ سے اچھا ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ البتہ رحمٰن ڈار کی نظم ''شش رنگ'' کا ترجمہ بہت مشکل امر ہے کیوں کہ یہ نظم دراصل شاعر کے ایک مخصوص جذب و کیف اور اسلوب و انداز کی آئینہ دار تخلیق ہے۔

خیالؔ صاحب تو خیر کسی کشف و الہام کی صورت حال سے دوچار نہ تھے اور بطور ایک ترجمہ کار اُنہیں ایسا ہونا بھی نہیں چاہیئے تھا سو انہوں نے وجدان کی جگہ شعوری کوشش سے ہی یہ ترجمہ کیا ہے اور ایک قابل تعریف کوشش کی ہے۔ ترجمے کی زبان کا تاثر اور روانی کا اندازہ لگانے کے لئے اس نظم کا پہلا بند ملاحظہ کیجئے۔

آؤ کہ ڈھل نہ جائے جوانی کی یہ بہار
آؤ کہ سر کروں ترے قدموں پہ میں نثار
تیرا خیال دل سے بھلایا نہیں گیا
تیرے حضور آئی ہوں انصاف تو ہی کر
نر ہو کہ مادہ دردِ جگر سب کے لئے ہے
میں گوش بر آواز ہوں، آواز مجھے دے

اگرچہ ترجمہ بھی خوبصورت اور پُر تاثیر ہے لیکن اصل نظم کی بات تو بہر صورت الگ ہی ہے۔ اُس نظم کے بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بارِ دگر شاید خود رحمٰن ڈار سے بھی لکھی نہیں جاتی۔ ٹھیک جس طرح انگریزی کے شاعر ایس ٹی کولرج ایک مخصوص موڑ میں اپنی ادھوری نظم ''کُبلا خان'' لکھ جانے کے بعد دوبارہ اس طرح کا موڑ کبھی نہ پا سکے اور وہ نظم ہمیشہ ادھوری ہی رہ گئی۔ اُدھوری ہو کر بھی وہ نظم اُن کے لئے انگریزی شعری ادب میں ان کو ایک صفِ اوّل کا شاعر بنانے کے لئے کافی تصور کی گئی ہے۔ ''شش رنگ'' بھی ویسی ہی ایک خاص نظم ہے جس کو شاید خود شاعر بھی منتقل، ترجمہ یا (Transcreate) کرنے سے قاصر ہی رہ جاتا۔ خیالؔ صاحب کی کوشش ایسے میں قابلِ ستائش ہے۔

............●●● ....

منشور بانہالی

غلام نبی خیال: صبحِ فردا کا سخنور

غلام نبی خیال کا 2005ء میں ایک اور مؤقر شعری مجموعہ ''الہام'' کے نام سے منظر عام پر آیا جو کشمیری شعری ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں آپ کا تقریباً گزشتہ چار دہائیوں میں موزوں کیا ہوا کلام شامل ہے۔ زیر بحث مجموعہ شعر کا پیش لفظ مرقوم کرتے ہوئے آپ اپنے شعری موقف کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔ ''شاعری میری دانست میں ایک ایسا ہی عطیہ ہے جو کسی کسی کو ہی ودیعت ہوتا ہے۔ جس شخص کو فیضانِ الہام حاصل نہیں وہ ایک اچھا شاعر نہیں بن سکتا اور اُس کا کلام محض ایک ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی محنت اکثر بے ڈھنگی ہوتی ہے اور ایسا تحقیق کار خود کو تسلی دینے کے لئے یوں ہی اپنے کلام کے قبول عام ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔''

درج بالا بیان کے پس منظر میں شاعر موصوف کے اِس استدلال کی کہاں تک تائید یا توثیق ہوتی ہے، اس کے لئے آپ کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ خیال صاحب ایک سرکردہ اور معتبر سخنور ہیں۔ تقریباً 184 صفحات پر پھیلے ہوئے زیر بحث ''الہام'' نامی اس شعری مجموعے کا شعری منظر نامہ مختلف الجہات ہے جس میں تقریباً 30 غزلیات اور 73 کے قریب منظومات شامل ہیں، جو ایک نئی حسیت اور فکری تمازت سے آراستہ ہیں۔ فطری آمد آپ کے کلام کا ایک نمایاں وصف ہے جس میں ایک گہری فکری بصیرت، تہہ داری اور جمالیاتی آرائش پائی جاتی ہے۔ آپ کو کشمیری زبان

کے شعری ادب کا گہرا مطالعہ ہونے کے علاوہ اُردو کے کلاسیکل اور جدید شعرا کا بھی سیر حاصل مطالعہ ہے۔آپ نے اُردو، انگریزی اور فارسی کے کئی مشاہیر ادب کی کئی تخلیقات کو اپنی مادری زبان میں ترجمہ کر کے کشمیری شعری ادب کو نئے فکری آفاق سے متعارف کرایا اور اِسے مالا مال کردیا۔آپ کے کلام پر اقبالؔ کے کلام کا نمایاں اثر ہے اور آپ نے اقبالؔ کی کئی اردو اور فارسی تخلیقات کو کشمیری زبان کے لباس سے مزّین کیا ہے، جن میں آپ کی فارسی غزل:

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم

نوائے وقت، بوئے گُل، افکارِ انجم اور خطاب بہ جاوید اور اُردو میں ''زندگی'' جیسی نظمیں شامل ہیں۔فارسی زبان میں آپ نے حافظؔ شیرازی کی غزل ع دل مے رود زِ دستم صاحب دلاں خُدارا۔ بنگالی میں ''قاضی نذرالاسلام'' کی نظم ''ادھ کھلے ارمان'' اُردو میں مرزا غالبؔ کی غزل:

سب کہاں کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں۔احمد ندیم قاسمی کی نظم ''آدمی کہتا ہے'' اور ساحرؔ لدھیانوی کی نظم ''جنگ'' کے اتنے خوبصورت اور جاندار تراجم کئے ہیں کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔آپ نے رچرڈ دوم۔لوئی آرگان کی نظم (جنگ عظیم سے متعلق فرانس کے غداروں کا ذکر) اور مشہور انگریزی نقاد شاعر ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی نظموں سے متاثر ہوکر بھی نظمیں کہی ہیں جو کشمیری زبان میں اہم فن پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

''الہام''، شعری مجموعہ کے آغاز میں ''بنی آدم'' کے عنوان سے جو نظم موجود ہے، ہیتی اعتبار سے ایک آزاد نظم ہے، جس میں دنیا میں اِنسان کی آمد اور اُس کی سرگزشت حیات کا ایک فکر انگیز خلاصہ موجود ہے۔اِس میں آدم کی زبانی دنیا میں پہلی بار اُس کے آنکھ کھولنے کا بیان اور پھر ہنگامہ ہائے حیات اور آلائش دنیا میں اُس کے مصروف ہونے کا ذِکر ہے کہ انسان کس طرح دنیا میں پاکیزہ خیالات اور معصوم جذبات لے کر آتا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سماپاتا۔لیکن پھر خواہشات کا دامن پھیلاتا جاتا ہے اور بالآخر افسردہ خاطر ہوکر بادل نانخواستہ دُنیا سے چلا جاتا ہے:نظم کے چند اشعار:

زندگی ناد میٕہ لوٗیم تہٕ بہ سپدُس موجوٗد

أچھ زہ مژربم ژواپأری وُچھم گاش پھوٗلان

● ...... منشور بانہالی

غلام نبی خیالؔ: صبحِ فردا کا سخنور

غلام نبی خیالؔ کا 2005ء میں ایک اور مؤثر شعری مجموعہ ''الہام'' کے نام سے منظر عام پر آیا جو کشمیری شعری ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں آپ کا تقریباً گزشتہ چار دہائیوں میں موزوں کیا ہوا کلام شامل ہے۔ زیرِ بحث مجموعہ شعر کا پیش لفظ مرقوم کرتے ہوئے آپ اپنے شعری موقف کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔ ''شاعری میری دانست میں ایک ایسا ہی عطیہ ہے جو کسی کسی کو ہی ودیعت ہوتا ہے۔ جس شخص کو فیضانِ الہام حاصل نہیں وہ ایک اچھا شاعر نہیں بن سکتا اور اُس کا کلام محض ایک ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی محنت اکثر بے ڈھنگی ہوتی ہے اور ایسا تحقیق کار خود کو تسلی دینے کے لئے یوں ہی اپنے کلام کے قبول عام ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔''

درج بالا بیان کے پس منظر میں شاعر موصوف کے اِس استدلال کی کہاں تک تائید یا توثیق ہوتی ہے، اس کے لئے آپ کے کلام کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ خیالؔ صاحب ایک سر کردہ اور معتبر سخنور ہیں۔ تقریباً 184 صفحات پر پھیلے ہوئے زیرِ بحث ''الہام'' نامی اس شعری مجموعے کا شعری منظر نامہ مختلف الجہات ہے جس میں تقریباً 30 غزلیات اور 73 کے قریب منظومات شامل ہیں، جو ایک نئی حسیت اور فکری تمازت سے آراستہ ہیں۔ فطری آمد آپ کے کلام کا ایک نمایاں وصف ہے جس میں ایک گہری فکری بصیرت، تہہ داری اور جمالیاتی آرائش پائی جاتی ہے۔ آپ کو کشمیری زبان

کے شعری ادب کا گہرا مطالعہ ہونے کے علاوہ اُردو کے کلاسیکل اور جدید شعرا کا بھی سیر حاصل مطالعہ ہے۔ آپ نے اُردو، انگریزی اور فارسی کے کئی مشاہیر ادب کی کئی تخلیقات کو اپنی مادری زبان میں ترجمہ کر کے کشمیری شعری ادب کو نئے فکری آفاق سے متعارف کرایا اور اِسے مالا مال کر دیا۔ آپ کے کلام پر اقبالؔ کے کلام کا نمایاں اثر ہے اور آپ نے اقبالؔ کی کئی اردو اور فارسی تخلیقات کو کشمیری زبان کے لباس سے مزّین کیا ہے، جن میں آپ کی فارسی غزل:

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم

نوائے وقت، بوئے گُل، افکارِ انجم اور خطاب بہ جاوید اور اُردو میں ''زندگی'' جیسی نظمیں شامل ہیں۔ فارسی زبان میں آپ نے حافظؔ شیرازی کی غزل ع دل مے رود زِ دستم صاحب دلاں خُدارا۔ بنگالی میں ''قاضی نذرالاسلام'' کی نظم ''ادھ کھلے ارمان'' اُردو میں مرزا غالبؔ کی غزل: سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم ''آدمی کہتا ہے'' اور ساحرؔ لدھیانوی کی نظم ''جنگ'' کے اتنے خوبصورت اور جاندار تراجم کئے ہیں کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ آپ نے رچرڈ دوم۔ لوئی آرگان کی نظم (جنگ عظیم سے متعلق فرانس کے غداروں کا ذکر) اور مشہور انگریزی نقاد شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی نظموں سے متاثر ہو کر بھی نظمیں کہی ہیں جو کشمیری زبان میں اہم فن پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

''الہام'' شعری مجموعہ کے آغاز میں ''بنی آدم'' کے عنوان سے جو نظم موجود ہے، ہیئتی اعتبار سے ایک آزاد نظم ہے، جس میں دنیا میں اِنسان کی آمد اور اُس کی سرگزشت حیات کا ایک فکر انگیز خلاصہ موجود ہے۔ اِس میں آدم کی زبانی دنیا میں پہلی بار اُس کے آنکھ کھولنے کا بیان اور پھر ہنگامہ ہائے حیات اور آلائش دنیا میں اُس کے مصروف ہونے کا ذِکر ہے کہ انسان کس طرح دنیا میں پاکیزہ خیالات اور معصوم جذبات لے کر آتا ہے اور خوشی سے پھولے نہیں سماپاتا۔ لیکن پھر خواہشات کا دامن پھیلاتا جاتا ہے اور بالآخر افسردہ خاطر ہو کر با دل نانخواستہ دُنیا سے چلا جاتا ہے۔ نظم کے چند اشعار:

زندگی ناد میٖہ لوٗیم تۂ بہ سپدُس موجوٗد

أچھ زہ مژربم ژواپأری وُچھم گاش پھوٗلان

دُور تامت بٔتھ رؤس نیول سمنٛدر ڈیوٹھم

ترجمہ: زندگی نے مجھے پکارا اور میں حاضر ہوا۔ آنکھیں کھولیں تو چاروں جانب اُجالا نظر آیا اور تاحدِ نظر چاہتوں کا ایک بحرِ بیکراں دیکھا اور اسی اثنا میں:

رنگ برنگی جانہ وارہ غأبہ پیٹھن آو وپھان

تونہ منزہ گاسہ تُلاہ پیوس سُہ گوتونہ وپھان

ترجمہ: کہیں نا معلوم مقام سے ایک خوش کُن پرندہ اُڑتے ہوئے آیا اور اُس کی چونچ سے گھاس کا ایک تنکا سمندر میں گر گیا وہ اُڑتا ہی رہا اور کہتا رہا خدا اعظیم ہے، خدا اعظیم۔ شاعر یوں گویا ہوتا ہے:

یورہ گژھنٕچ سو پتمٕ وِز ییٖلہ واتہم

گردٕ ستیٖ آسہ یہ دامن ژھوٚنمت ہا یہ گومت

کیاہ چھُنا جان بہ لوٚژاراوہ برٛونٛہی بار پٔنٕن

ترجمہ: میری آخری کی گھڑی آن پہنچے گی تو میرا دامن خواہشات نفسانی سے گرد آلودہ ہوا ہوگا۔ کامیابی کا راز اِسی بات میں ہے کہ آدمی، بے جا لالچ سے دامن بچائے اور سرخروی کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہو جائے۔

آپ کی دوسری نظم ''خیالؔ نامہ'' ہے، جس میں دراصل، آشوب عصر کا ایک تمثیلی اِظہار ہے۔ یہ نظم 38 اشعار پر مشتمل ہے، جس میں شاعر خود ہی متکلم اور خود ہی اپنا مخاطب بن کر خود کلامی کرتے ہوئے اپنی رودادِ حیات اور آشوبِ عصر کو بیان کرتا ہے:

یتھ گٹہٕ کارچہٕ رُدہ راٗژ اندر کوٚت پٔٹھ چھکھ تن تنہا دراُمت

چھکھ باسان کمہ تام پردیسک یُوت آسکھ ڈل سائلس آمت!

وٕچھ سڑکہٕ چھ انٛدٕ وندٕہ گرد وتھان زن سوختہ سینن دٕہ نیران

سٕے گوس بہ یٔس نہ پھلےٚ چھاوتھ زخمو روٗس حائصل آو کہنٛز

ترجمہ: اِس برستی بارش میں تم کہاں سے آ رہے ہو۔ لگتا ہے کہ کسی پردیس سے ڈل کی سیر کرنے کی غرض سے آئے ہو۔ آسمان سے تو لگاتار بارش برس رہی ہے لیکن زمین خشک ہے اور سڑک

کے کناروں سے جھلستے ہوئے سینوں کی طرح دھول اُڑ رہی ہے۔ اِس بازار سے کتنے ہی لوگ غائب ہو کر رہ گئے۔ اس اندھیری رات میں کسی واقف کار کا ہاتھ پکڑ لے ورنہ کھو جاؤ گے۔ مجھے بھی اپنا راستہ بھول گیا ہے اور اِسی جگہ میری روشنی چھِن گئی۔ میں تو ایک بے چارہ شاعر ہوں جو اپنے دُکھوں کا مرثیہ قلمبند کر رہا ہے۔ یہاں سچی بات کڑوی معلوم ہونے لگتی ہے۔ عیسیٰ اور سقراط کو دیوانہ کہا جاتا ہے۔ مجھے بھی طرح طرح کے الزامات دے کر معتوب کر دیا گیا۔ میری جوانی کی کمائی کے دِن، گھاٹے کی نذر ہو گئے۔ میری راتیں جو میٹھے سپنے سجانے کی تھیں بے خوابی میں تارے گننے کی نذر ہو گئیں۔ میں ہی ہوں جسے زخموں کے سوا کچھ نہ ملا۔ مجھ سے کیا تعارف چاہتے ہو، میرے بہت سے نام ہیں لیکن میں پھر بھی بے نام ہوں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنا راستہ اختیار کرو اور اپنے کام سے کام رکھو۔

خیالؔ صاحب کے ہاں غزلوں اور نظموں کے مختلف تجربات موجود ہیں۔ عشق و روماں، حقوق انساں کی پاسداری، آشوب عصر اور امن و دوستی جیسے موضوعات آپ کی غزلوں اور نظموں کے تانے بانے کو متشکل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خیالؔ صاحب صحت مند قدروں کے ترجمان ہیں۔ دینی تعلیمات کا آپ کو مطالعہ ہے۔ آپ دین اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات قرار دیتے ہیں اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰات والسلام کو عالم انسانیت کے لئے نمونۂ اکمل اور نجات دہندہ گردانتے ہیں۔ آپ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو پوری دنیا کے انسانوں کے لئے فلاح و بہبودی اور امن و محبت کا تحفہ قرار دیتے ہیں جس کی اہمیت ہر دور اور ہر زمانے میں یکساں رہے گی اور لوگوں کو منفعت سے سرشار اور فیض یاب کرتی رہے گی۔ خیالات و عقیدت کی یہ پاکیزگی آپ کے مختلف نعوت اور منظومات میں دیکھی جاسکتی ہے۔

رأژی ہُند گٹہ کاراأتھی منز سر بسر نورک ظھور
میوٹھ انسانا، مژھل منشا مولل پیغمبراہ
جلوہ گر سبزرک تہ پۂزرک یمؠ سہ وُچھ تمؠ وُچھ خدا
(نظم۔ محمدؐ)

ترجمہ: رات کا گھٹاٹوپ اندھیرا اور اِسی میں نور کا ظہور ہوا۔ یعنی ایک شریں بیاں اور مجسمہ اخلاق

پیغمبرؐ کا ظہور ہوا۔ پاک طینت اور بے لوث۔ جس نے بھی ان دیدار کیا سمجھو اُس نے خدا کا جلوہ دیکھا۔

(نعت)

ماوسٕ گٹہِ منز نورے نور   نُورے نُور سُہ عین ظہور

ترجمہ: اماوس کی اندھیری رات میں، اچانک نُور ہی نور کا اُجالا ہو گیا۔ اور آقائے دو جہاںؐ کی نورانی ذات والا صفات کا ظہور ہوا۔

تھنہ پیہ کوٗرتہٕ زیُس کھوٗنہس

وۄنہس لژھ کرِہ، ننگ ونا موس

......نارس واوس کوٗر کمی تام شبنمٕ چھرِ کاو

یہ، ہساچُھے سُے!

صورت یمی سنز، عاشق یتھ گو پانہ خدا

محمد صابؐ چھا اُمی سے ناو   (نظم۔ ورودِ حضورؐ)

ترجمہ: جہلائے عرب میں اگر بچی جنم لیتی تو اُسے گڑھا کھود کر زمین میں گاڑ دیا جاتا اس ڈر سے کہ خاندان کی عزت تار تار ہو جائے گی۔ اسی اثنا میں ایک اولعزم پیکرِ نور کا ظہور ہوا جس نے گمراہی کی دہکتی آگ پر شبنم چھڑک کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔ یہ وہی ذاتِ اقدس ہے جس کا اللہ تعالیٰ خود شائق ہے......اسی کا نام محمدؐ ہے۔

شونگنہ برۄنہہ ییلہٕ راتھ خاکِ پا تھٔنڈ چشمن موٗتھم

ساسہ بدی تارکھ وچھم خابس اندر یا مصطفٰےؐ

(نظم۔ فریاد بحضور اقدسؐ)

ترجمہ: رات کو سونے سے قبل جب میں نے آپؐ کی خاک پا کو آنکھوں میں لگایا تو تمام رات میں نے خواب میں جگمگاتے ہوئے ستاروں کو نور افشاں دیکھا۔

حسینؓ آو ووں برۄنہہ کُن دیس چھُ یاد کران

یہ پانہِ از چھُ محمدؐ پزٕ بک جہاد کران

ترجمہ: امام حسینؓ آگے بڑھے، یادِ الٰہی اس انداز سے کر رہے ہیں، گویا خود پیغمبرِ اسلامؐ سچائی

کی خاطر برسرِ پیکار ہیں۔

غلام نبی خیالؔ کشمیری غزل کے اُستادِ سخن ہیں اور اس کی ماہیت اور فنی نزاکت سے بخوبی آشنا ہیں۔ آپ بیتی اور موضوعی اعتبار سے غزل کو ایک نئی آب وتاب سے روشناس کرتے ہیں اور نئی تراکیب واستعارات اور علائم سے ایک جاذبِ فکر کشش پیدا کرتے ہیں۔ آپ مختلف زمینوں کو بروئے کار لاکر ایک نئی حسیت اور بصیرت کا اُجالا پیدا کرتے ہیں۔ ریزہ خیالی آپ کی غزلوں کا خاص وصف ہے، جس سے آپ کی غزلوں میں مختلف خیالات واحساسات اور جذبات شوق کی پھلجڑیاں چھوٹتی نظر آتی ہیں۔ جب آپ عصری شعور اور زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کی بات کرتے ہیں تو اس طرح کے اشعار کی تجسیم کاری کرکے ایک سنجیدہ تاثر پیدا کرتے ہیں۔

1۔ راتھ اُسی حقیقت چھ از افسانہ وَنے کیاہ
کتھ میأنی سمجھ پانہ بہ ننہ وانہ ونے کیاہ

2۔ تنہ شہرہ بسیایے کتی مکانس میہ ڈِژوگنز
بےُ خیمہ تہٕ سے واوتہ واُرانہ ونے کیاہ

3۔ زن نہ رُوزی سُو زان اکھ اکی سُنز
انقلابو بُنیأوی کم دستور

4۔ قدمس قدمس ییتہٕ ووہراوِتھ شورہ تہٕ نار
زُو چھاوُ ین أدٕہ قدمن چانین پأرِ دِمو

5۔ چھ اہلِ دِل تہٕ وۄں لگمتی دکانداری کُن
توے وۄں گوری تہٕ کاندر ادب نواز بنیأے

6۔ کم کم جوان بے قضا پاوِکھ وومُرن سُے دۄکھ پالن چھم
مأج کشیری وَن کوتاہ بیہ چون قرض نکھ والن چھم

1) زمانے کی قدریں بدل گئیں۔ جو بات کل تک حقیقت تھی آج اُسے ایک افسانہ سمجھا جارہا ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو، اب اس سے زیادہ کھل کر بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

2) جب سے ہم نے شہر میں اپنے مکان کی بنیاد ڈالی تھی۔ تب سے کتنے عالیشان محل تعمیر ہوئے اور ہم ہیں کہ ابھی تک دیواروں پر خیمہ لگائے ہوئے ہوا کے جھونکے برداشت کر رہے ہیں۔

3) انقلاب زمانہ نے ایسی کروٹ بدلی کہ ایک دوسرے کی پہچان ختم ہوگئی اور محبت اور دوستی فقط نام کی چیزیں رہ گئیں۔

4) یہاں قدم قدم پر آگ اور بارود بچھا ہوا ہے اور ہم پھر بھی اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے تیار ہیں۔

5) اب ادب بھی کاروبار کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے، جو ارفع خیالی کا ثمرہ سمجھا جاتا تھا۔ اور سطحی دماغ کے لوگ یعنی چوپان اور نانوائی تک ادب کا شوق فرمانے لگے ہیں۔

6) کیسے کیسے جوان لوگ بے موت مارے گئے جن کا ساری عمر مجھے افسوس رہے گا۔ اے مادرِ کشمیر میں کیسے آپ کا قرض چکا سکتا ہوں۔

عشق و رومان آپ کی غزلوں کا ایک من پسند حصہ ہے جس کو آپ مختلف پیرائیوں اور اشاروں اور کنایوں سے بیان کرتے ہیں بلکہ اپنی نظموں میں بھی اپنے جذباتِ عشق گُل باری اور شکوہ سنجی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کے خیال میں عشق زندگی کی علامت ہے اور رفیقِ حیات ہے۔ عشق میں مصلحت کوشی کام نہیں آتی بلکہ اس میں حوصلہ اور ہمت درکار ہے۔ آپ کے مطابق ایک سچے عاشق کو قدم قدم پر آزمائشوں کا سامنا رہتا ہے اور زمانے کی مخالفتوں کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے۔ لیکن محبت کا غم تمام غموں کو بھلا دیتا ہے اور یہی حاصلِ حیات ہے۔ جذبات واحساسات کی یہ گُل شگفتگی یوں اشعار کی صورت اختیار کرلیتی ہے:

1۔ عقل تہٕ روز خیالن دوہے تھوان سر پوش
دِلن تہٕ راز کٔر افشا مٔتِس حُبابَس مٔز

2۔ دِل خیالَس چھُ شیشہ خانک سِر
راز رشتگ لگُن ژٕ بأوتھ آکھ

3۔ یور تھومس ٹوٹھ زُو جان پیشکش !
تورہ دوہنم ٹاٹھی یارن بیہ تہٕ کینہ

4۔ چائٕ یہ بستی مأ تھر پرٕتھم شہرک اُستھ شہر موٗٹھم
لول چھِ ظالم اَخرپے لگہِ خاصن عامن یہ چھُ مشکل

1) عقل مصلحت کوشی سے کام لے کر محبت کے رازوں کو پوشیدہ رکھتی رہی لیکن دل نے بے خطر، ہوکر اور حالتِ جنون میں محبت کے رازوں کو فاش کر دیا۔

2) خیاؔل کا دِل محبت کے سربستہ رازوں کا آئینہ خانہ ہے۔لیکن میرے محبوب اِسے کیا کہیے کہ آپ نے اِس راز کو فاش کر دیا۔

3) میں نے اپنے محبوب کو اپنی جان بھی پیش کر دی لیکن مزید قربانی کا تقاضہ کرنے لگا۔

4) شاعر، گاؤں کی دُلربا حسینہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تمہاری اس بستی نے مجھ پر ایسا جادو کر دیا کہ میں شہر کو چھوڑ کر گاؤں کا ہو کر رہ گیا۔ یہ سب تمہاری خاطر میں کر رہا ہوں۔محبت ظالم شے ہے۔یہ راز اب عام لوگوں پر آشکار ہوگا، اور یہ بڑی مشکل بات ہے۔

جذبات محبت کے یہ بھڑکتے ہوئے شعلے آپ کی مختلف نظموں میں بھی لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً:

چونے چھُ سُہ غم یُس نہ بیہ کانٛہہ غم چھُ تھوانی
گرٛدھ رُمہ ریشن آے ژٕ یہ اتھ مست جوانی

(نظم: چون حُسن میون عشق)

ترجمہ: میرے محبوب تمہاری محبت کا غم ایسا ہے جو مجھے دنیا کے تمام غموں سے چھٹکارا دیتا ہے۔میری دعا ہے کہ تمہاری مست جوانی کا گلشن سدا بہار رہے۔

یِنہِ چانہ پیم زنتہ شہج لوٗہ، میٚہ گُلالس
یِنہ چانہٕ بنبم کار تیٚچ زُون ہلالس

(نظم: غم فراقؔ)

ترجمہ: تمہاری آمد سے میرے جھلستے ہوئے گل لالہ جیسے دل کو شبنم کی ٹھنڈک محسوس ہوگی اور

میرے دل کا ہلال (نوزائید چاند) پورے چاند کی شکل اختیار کرے گا۔ نظم ''ریشماں'' ایک ایسی رومانی نظم ہے جس میں شاعر دور پہاڑوں میں بسنے والی ایک پھول جیسی لڑکی کے بے مثال حسن کی تصویر پیش کرتا ہے جو مست شباب ہے اور دیکھنے والوں کی نظروں پر جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ شاعر یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ حسن ایک ایسی دولت ہے جس کی قدر و قیمت ہر جگہ موجود ہے اور حسن کی خاطر بسا اوقات شہروں کے شہر اُجڑ کر رہ گئے ہیں۔ اپنے موقف کو تقویت دینے کے لئے وہ مشہور یونانی تمثیل ''ایسکائی لس'' کا حوالہ دیتا ہے جس میں مشہور عالم حسینہ ''ہیلن'' کو حاصل کرنے کے لئے بادشاہ اگایمنان کئی سال تک سفر کر کے ''ہیلن'' کے شہر ''ٹرائے'' کو آگ کے شعلوں میں راکھ کر کے رکھ دیتا ہے اور ''ہیلن'' کو حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے شاعر کے مطابق اگر عشق کی آگ پر قابو نہ پایا گیا تو شہروں کے شہر برباد ہو کر رہ جاتے ہیں جس کا اشارہ آپ کے ہاں یوں ملتا ہے۔

نارِ نۍ ژھوٕ ہ رووٗ سہٕ چھُ ادہ ژھٹ کڈان

ترایہ کس شہرس اوٚے تہراج گو

(نظم: ریشماں)

آپ کی نظموں میں تخلیق، راہِ خطر، ہم کشمیری، سالِ نو، وقت براق ہے، خوابوں کے سراب، سانیٹ، مزارِ مہجور، صبحِ نو، یہ میرا شہر، آہِ عصر، نغمہ حسن، فریاد، شادی کی سالگرہ، دیدار، شہر نامہ، شہید، آزادی اور دعا جیسی کئی اور نظمیں ہیں جن میں ایک گہری فکری بصیرت اور فنی سحر کاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ نظم ''مزارِ مہجور'' میں آپ شاعر کشمیر غلام احمد مہجور کے مقبرے کی شکستہ حالت کو دیکھ کر کشمیری قوم کی اپنے محسنوں کی قدر ناشناسی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یوں دعوت توجہ دلاتے ہیں۔

شاعرِ کشمیر اوسکھ کاشرس مشتھی ژہ گوکھ !

اوون گو ویلہٕ کنہِ اوسکھ تس تیلۍ تس یاد پیوکھ

مشکہ ناوتھ پانہٕ گل یمہٕ پننہِ گلزار کی دہے

ترووکھ سرراہ کاشرٕ اَسۍ پرٕ دار کی دہے

ترجمہ: اے شاعرِ کشمیر! کشمیر کے لوگوں نے آپ کو بہت جلد فراموش کر ڈالا۔ جب آپ کو

فروخت کرنا تھا تب کہیں آپ کے کلام کو یاد کیا۔ آپ نے اپنے باغ کے تمام پھولوں کو مہکایا۔ لیکن کشمیری قوم نے آپ کو ناپُرساں حالت میں سرِ راہ چھوڑ دیا اور آپ کا مقبرہ ویرانی کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ اسی طرح کی نظم ''گرلز کالج'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر موصوف نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے لڑکیوں کو تعلیم کے آراستہ کرنے پر زور دیا ہے اور سماج میں لڑکیوں کی اہمیت کو محسوس کرانے کی بلیغ کوشش کی ہے:

یہِ چھ آگر حسن اشارن ہُنْد یہ چھ مرکز لولہ امارن ہُنْد
اتھ باغس کم کم پوش پھولن کم رنگہ رنگہ پوش حسین ہنْدی
(نظم گرلز کالج)

ترجمہ: یہ کالج، حسین پھولوں کا ایک گلستان ہے جہاں محبت کے جذبات کے پھول کھلتے ہیں۔ اس باغ میں نہ جانے کیسے کیسے حسین اور دلکش پھول کِھل اُٹھیں گے اور زندگی کے باغ کو شاداب بنائیں گے۔ کیوں کہ ایک خواندہ لڑکی پورے معاشرہ کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتی ہے۔

کتاب کے آخر میں ''مناجات'' کے عنوان سے بہت ہی معنی آفرین اور پُر اثر نظم ہے جو مشہور انگریزی شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ایک نظم ''عالمِ ویران'' (The Waste Land) کے پس منظر میں موزوں کی گئی ہے، جس میں شاعر اللہ تعالیٰ سے اپنی پراگندگی کا اِظہار کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار دکھائی دیتا ہے۔ شاعر انجیل مقدس سے منقول یہ حوالہ بھی دیتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے قومیں تباہ حال ہو جاتی ہیں۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ ندامت سے بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

یام ابراہیم اکہ دوہ شام ڈلتھے خوفتہ پیو......
آس اتھی اندر خداوند کریم
بوز ابراہیمہ کن تھویم ژ یہ اولاد آسہ نے
ژون ہتن ۂ ری ین تمن روزُن چھُ وۆ پرن ہُنْد غولام
............آغہ! وونہ ژٍ کرعفو

خاب چھس آبکو وچھان تعبیر چھُم نیران سراب
میانہِ دیہ وۄنی کراکس مجبور بندس ژےٖ عفو!
(مناجات)

ترجمہ: ایک دن پیغمبر ابراہیمؑ شام ڈھلتے ہی محو راحت ہو گئے، اور اُنہیں خواب میں اللہ کی طرف سے یہ اشارہ مل گیا کہ اے ابراہیم تمہاری آنے والی نسل اپنی نافرمانی کے سبب چار سو سال تک غیروں کی غلام ہو کر رہ جائے گی۔......اے اللہ میرے گناہ اب معاف فرما۔ میں غرقِ عصیان ہوں۔ میں پانی کی تلاش کرتا ہوں لیکن سراب کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مجھ پر رحم فرما اور مجھے عفو فرما۔

مجموعی طور پر غلام نبی خیالؔ صاحب ایک سر برآوردہ اور آزمودہ کار صاحب سخن ہیں اور آپ کا یہ کلام کشمیری شعری ادب میں ایک نئی حسیت اور فکری تابانی کا ترجمان ہے جس کی اہمیت ہمیشہ رہے گی اور آنے والا وقت اس کا استقبال کرتا رہے گا۔

............●●● ....

•...... مشتاق حیدر

تحقیق وتنقید کا حسین سنگم: غلام نبی خیالؔ

کلیم الدین احمد نے تنقید کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''تنقید ایک صحیح تربیت پائے شائستہ اور مہذب دماغ کا مجموعی جوہر و وصف ہے اور اُس کی بے انتہا متنوع رنگارنگ خصوصی شکلیں بھی ہوتی ہیں''۔

عبدالستار دلوی تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مواد کی فراہمی میں محقق کو جاسوس کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور اس کو مکھیوں کے ذریعے شہد کی فراہمی جیسی محنت و مشقت سے کام لینا پڑتا ہے''۔

سوانح نگاری کے بارے میں مشہور انگریزی ادیب جانسن لکھتے ہیں:

''سوانح بیانیہ تحریر کی مختلف اقسام میں سے ایک ہے۔ یہ نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہے اور نہایت آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد پر اس کا اطلاق کیا جاسکتا ہے''۔

سربرآوردہ ادیب غلام نبی خیالؔ کی تازہ کتاب ''خیالِ قلم'' پر مختصر جائزہ کی ابتدا میں ان تعریفات کو نقل کرنا میری ضرورت اس لئے بن گئی کیونکہ مذکورہ کتاب کے عنوان کے ساتھ یا تعارفی صفحے پر اس بات کا تذکرہ موجود نہیں ہے کہ آیا یہ کس نوعیت کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ البتہ جس صفحہ پر انگریزی زبان میں کتاب سے متعلق کوائف درج ہیں وہاں لفظ Genre کے آگے Literary Research لکھا ہوا ہے۔

میں نے جب کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے مضامین صرف تحقیقی نوعیت

کے نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ مضمون تنقیدی اور نیم سوانحی نوعیت کے بھی ہیں۔

اگرچہ کتاب میں شامل تمام مضامین ایک جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں لیکن جوں جوں میں قرأت کے مراحل طے کرتا گیا میرے اندر اِن سب مضامین کے بیچ ایک نامعلوم ربط کا احساس گہرا ہوتا گیا۔ آخرش جب میں نے کتاب کا پچیسواں مضمون ''خیال نامہ'' پڑھا تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یہ نامعلوم ربط مصنف کی اپنی ادبی اور سماجی شخصیت ہے جو الفاظ کی صورت میں تحلیل ہو کر ابدیت کے قالب میں سمانے میں سرگرداں ہے۔

کتاب کا مذکورہ مضمون ''خیال نامہ'' اگر بالفرض پہلے مضمون کی جگہ پر رکھا جائے تو کتاب کے مضامین میں ایک معنوی وحدت صاف نظر آئے گی جس کی تین ابعاد واضح طور پر ایک سنجیدہ قاری کو نظر آئیں گی: تحقیقی، تنقیدی اور نیم سوانحی۔

تحقیق کے زمرے میں درج ذیل مضامین رکھے جاسکتے ہیں:

چنار کے رنگ، شیخ یعقوب صرفی، غنی کشمیری، کشمیری زبان میں تحقیقی ادب، علامہ اقبال کا سفر کشمیر، اردو اور جنوب ایشائی ہم آہنگی، انگریزی اور کشمیری کا لین دین، عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم اور سعادت حسن منٹو اور کشمیر۔

تنقید کے ذیل میں مندرجہ مضامین آسکتے ہیں:

جوشؔ اور حفیظؔ کی شاعری میں کشمیریات، فیض احمد فیض: تلخیِ امروز اور شیرینیِ فردا کا شاعر، شورش کشمیری کا زورِ خطابت، خوشی محمد ناظر...... جوگی کا شاعر، اختر محی الدین...... بلبل ہزار داستان۔

نیم سوانحی زمرے میں مندرجہ ذیل مضامین رکھے جاسکتے ہیں:

اقبال اور کشمیر، ذکر رومی اور اُن کے ہم عصر مشاہیر، مفکر کشمیر مولانا محمد سعید مسعودی، یاران وطن جو چلے گئے، مقبول فدا حسین، خیال نامہ، جشن خیال- مرادآباد، غلام نبی خیال: کشمیریات کا مجسم از فاروق ارگلی۔

آخرالذکر دو مضامین خیالؔ صاحب کے لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کی ادبی شخصیت پر دو دیگر مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں شامل دو مضامین ایسے ہیں جو ہمہ وقت تحقیق اور تنقید کی نوعیت کے ہیں۔ ان مضامین کے عناوین ہیں:

اوّل: سنتوش...... کشمیر کا ممتاز مصور دوم: مجاز اور کشمیر

آیئے چند باتیں کتاب میں روا رکھے گئے معانی، اسلوب اور آہنگ کے حوالے سے کرتے ہیں:

کتاب میں شامل تقریباً تمام تحقیقی مضامین کی مشترکہ خوبی یہ ہے کہ کوئی نئی بات پیش کرتے وقت یا کسی دعوے کو غلط ثابت کرتے وقت ٹھوس شواہد اور حوالہ جات کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایسا کرتے وقت جدید سائنسی طریقہ ہائے کار کا استعمال کیا گیا ہے۔ حوالہ جات کا اندراج ایم ایل اے اسٹائل شیٹ کے عین مطابق کیا گیا ہے۔ ادبی تحقیق کی ایک خصوصیت یہ ہونی چاہیئے اور ہوتی بھی ہے کہ یہ مزید تحقیق کے لئے دروازے وا کرتی ہے۔ کتاب میں شامل تقریباً سبھی تحقیقی مضامین اس خصوصیت سے مزین ہیں۔ خاص طور پر ''شورش کشمیری کا زورِ خطابت''، ''غنی کشمیری''، ''شیخ یعقوب صرفی''، ''اردو اور جنوب ایشائی ہم آہنگی''، جیسے مضامین دیگر محققین کے لئے مہمیز کا کام کر سکتے ہیں۔

غنی کشمیری کے کرالہ پن سے متعلق مصنف کا یہ خیال کہ ''یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ملک الشعراء مرزا صائبؔ صرف ایک لفظ کے معنی معلوم کرنے کی خاطر سفر کی صعوبتیں برداشت کر لیتا'' اپنے آپ میں ایک پختہ کار سوچ کا غماز ہے۔ ساتھ ہی یہ مثبت بیان کہ اس واقعے کا سچا یا جھوٹا ہونا غنیؔ کے مرتبے میں کسی کمی بیشی کا باعث نہیں بن سکتا کیونکہ غنی بہر حال غنیؔ ہے۔ مصنف کی بالغ نظری پر دال ہے۔ ہاں اس مضمون میں خاص طور پر اور عمومی طور پر دیگر مضامین میں ایک بات کی کمی بار بار کھٹکتی ہے وہ یہ کہ فارسی اشعار اور اقتباسات کا اردو ترجمہ نہیں دیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ فنی سطح پر کوئی نقص تصور نہیں کیا جاسکتا مگر کیا کیجیے کہ زمانۂ حال میں اردو والوں کی اکثریت فارسی سے نابلد ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ اردو والوں کا فارسی سے دوری اُن کے اردو زبان وادب کی میراث سے لاتعلق ہونے کے برابر ہے۔ لیکن کیا کیجئے کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اُمید ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں فارسی متن کا ترجمہ بھی شامل کیا جائے گا تا کہ نئی پود کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکے۔

مضمون ''اردو ادب اور جنوب ایشائی ہم آہنگی'' میں فاضل محقق نے بلیغ اشاروں میں اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ یہ مضمون اردو زبان کے تحفظ اور بقا کی خاطر ایک مشن چلانے کے لئے مینی فیسٹو کی بنیاد ثابت ہوسکتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں خیالؔ صاحب نے اس مضمون میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں نا اختصار دانائی کی

روح ہوتی ہے۔اس لئے میری شکایت میری نادانی کی دلیل بھی ہوسکتی ہے۔

مضامین بعنوان ''سعادت حسن منٹو اور کشمیر'' اور ''کشمیر: فیض اور فلمستان'' ایسے مضامین ہیں جو قاری کو ایک انوکھی دنیا کی سیر کراتے ہیں، جہاں انسان ہمدرد اور ظالم، حاکم و محکوم، مجبور و مقہور، غلام و آزاد ہر دو صورتوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ خیالؔ صاحب نے ایک تجربہ کار صحافی کی نظر سے اُن فلموں پر بات کی ہے جن میں کشمیر کے حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ایسی فلموں کی تعریفیں بھی کی ہیں جن میں غیر جانب داری سے کام لیا گیا ہے۔اس طرح کے موضوعات پر قلم اُٹھانے کے لئے خیالؔ صاحب لائق صد تحسین و آفریں ہیں۔ اگرچہ ایسے موضوعات پر لکھنا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے اور اپنی زمین سے محبت کا تقاضا بھی لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ایسے موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں۔

اسی طرح مضامین بعنوان ''انگریزی اور کشمیری کا لین دین'' اور ''عقیدتی ادب کے کشمیری تراجم''، ترجمے کی اہمیت و افادیت کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہیں، ساتھ ہی قاری موضوع سے متعلق ہوئے کام کی پیش رفت سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔

جہاں تک تنقیدی مضامین کا تعلق ہے یہ تمام مضامین ناقد کی دقتِ نظر پر دال ہیں۔ فاضل ناقد نے الگ الگ مضامین کے لئے الگ الگ طریقۂ نقد سے کام لیا ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو موضوع یا متن جس طریقۂ انتقاد کا متقاضی تھا اُسے اُسی میزان سے تولا گیا ہے۔

تمام تنقیدی مضامین میں جو وصف قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ متن خصوصاً شعری متن کی تفہیم کا مشرقی انداز ہے، جہاں معانی کے ساتھ ساتھ صوت و آہنگ اور جمالیاتی حظ کی اہمیت کو بھی زیرِ نظر رکھا گیا ہے۔

مضمون بعنوان ''جوشؔ اور حفیظؔ کی شاعری میں کشمیریات'' میں دونوں شاعروں کے کشمیر سے والہانہ عشق اور اہلِ کشمیر کے ساتھ یکجہتی کا ذکر بلند آہنگ سے کیا گیا ہے۔ یہ شاید ان شاعروں کے آہنگ کی بازگشت ہے یا پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ناقد چونکہ خود کشمیری ہے اور تنقید ہو یا تخلیق دونوں میں زمانے کے اثر کے ساتھ ساتھ مقامیت کے عنصر سے گریز ممکن نہیں ہے۔موضوع کی مناسبت سے مضمون میں دونوں شاعروں (جوشؔ اور حفیظؔ) کی شاعری سے درج کی گئی مثالوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

خیالؔ صاحب مذکورہ مضمون میں حفیظؔ کی شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کشمیر سے حفیظؔ کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ غزل میں بھی کشمیر کو نہیں بھولتے۔''

حقیقت یہ ہے کہ شاعروں نے کشمیر کو غزل میں ہی یاد رکھا ہے اور جب کبھی کشمیر کو غزل سے نکال کر نظم میں جگہ دی گئی ہے تو اِس کی حقیقی تصویر قارئین تک پہنچی ہے جو قدرتی نظاروں کے ساتھ ساتھ غلامی، حسرت و یاس اور ظلم و ناانصافی سے تعبیر ہے۔

مضمون بعنوان ''فیض احمد فیضؔ: تلخیٔ امروز اور شیرینیٔ فردا کا شاعر'' میں خیالؔ صاحب نے فیضؔ کی شاعری اور ان کے نظریہ حیات، انسان دوستی اور فیضؔ کے پیامبر امن و آشتی ہونے پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ خیالؔ صاحب نے اس مضمون میں فیضؔ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کئی دلچسپ حقائق کو حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پورا مضمون قاری کو مسحور کُن طریقے سے از ابتدا تا انتہا باندھے رکھتا ہے۔

اس مضمون میں فیضؔ کے تخیل کی آفاقیت کو اُن کی شاعری کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی خوبصورت، مفکرانہ اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ فیضؔ کے حافظ قرآن ہونے کی بات سچ مچ قارئین کے لئے ایک خبر ہے۔ اس مضمون میں فیضؔ کے نکاح نامہ کے تعلق سے درج جانکاری کم اہمیت کی حامل نہیں ہے، جس کے مطابق اس نکاح نامہ میں پہلی بار کسی منکوحہ کو اپنے خاوند کو طلاق دینے کا پورا حق اور اختیار دیا گیا تھا۔ خیالؔ صاحب کے بقول یہ نکاح نامہ مکمل اسلامی اور ترقی پسند دستاویز کہلایا جاسکتا ہے۔ اسی مضمون کے ذیل میں صفحہ نمبر 189 پر خیالؔ صاحب نے بنا کسی داخلی یا خارجی شہادت یا دلیل کے فیضؔ کو دہری کہا ہے جو ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ ایسا دعویٰ کرتے وقت مصنف کو فیضؔ کی شاعری، نثری تصنیفات یا کسی اور چیز کو بنیاد بنانا چاہیئے تھا۔ ورنہ ایسے دعوے کٹھ ملاؤں کے فتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔

''شورش کشمیری کا زورِ خطابت'' ایک ایسا مضمون ہے جو نئے محققین کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوسکتا ہے۔ شورش کشمیری جیسے فرزند کشمیر پر اب تک کوئی سنجیدہ کام نہیں ہوا ہے۔ کسی نصابی یا غیر نصابی تحقیقی پروگرام کے تحت ان پر کام کرنا عصری ادیبوں اور دانشوروں کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ خیالؔ صاحب کا اپنے مضمون کے توسط سے اس طرف توجہ دلانے کو نیک فال سے تعبیر کیا جانا چاہیئے۔

''اختر محی الدین...... بلبل ہزار داستان'' جیسا مضمون خیالؔ صاحب کی دقت نظر کا غماز ہے۔

اگر اختر محی الدین جیسے کشمیری افسانہ نگار کے افسانوں کو اردو دنیا میں ترجمہ وتوضیح کے ذریعے متعارف کرایا جائے تو یقیناً وہ لوگ جو کشمیری زبان میں سنجیدہ فکشن کی موجودگی کے انکاری ہیں لال پیلے ہو جائیں گے۔
خیالؔ صاحب کا یہ مضمون ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے'' کے مصداق ہے۔

کتاب میں شامل نیم سوانحی قسم کے مضامین دلچسپی کا سارا سامان اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ قاری ان مضامین کے آئینے میں صاحبِ کتاب کی شخصیت کے ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ گزشتہ 60 برسوں میں کشمیر کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تمدنی اُتار چڑھاؤ کا بھی بہ خوبی مشاہدہ کر سکتا ہے۔

مضمون ''یارانِ وطن جو چلے گئے'' میں کشمیر کے تین اہم شاعروں طاؤس بانہالی، آزرؔ عسکری اور تحسینؔ جعفری کے سوانحی کوائف اور علمی و ادبی استبداد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ زیریں لہر کی صورت میں خیالؔ صاحب کی اپنی ادبی شخصیت سے بھی قاری روبرو ہوتا ہے۔ ہاں اس مضمون کو کسی ایسے مقالاتی سلسلے کی کڑی بتایا گیا ہے، جس کے تحت سن 1947ء کے فوراً بعد مقامی سطح پر سرکاری دار وگیر کے نتیجے میں کشمیر سے پاکستان یا پاکستانی کشمیر ہجرت کر گئے ادباء کا تذکرہ ہوگا۔ اللہ کرے کہ باقی افراد پر تذکرے جلد از جلد قارئین تک پہنچیں۔

مضمون ''سنتوشؔ کشمیر کا ممتاز مصور'' کے تناظر میں اُس عہد کے کشمیر کی تصویر آنکھوں میں رقص کرنے لگتی ہے جس میں کشمیر کے مسلمان اور پنڈت ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر ہو کر رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے تئیں ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ رکھتے تھے۔ یہ مضمون کشمیر میں ترقی پسند دور کی تہذیبی صورت حال کا بھی عکاس ہے۔

خیالؔ صاحب لکھتے ہیں کہ ''سنتوشؔ کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگر وہ مسلکی اعتبار سے اہل تشیع میں سے تھا لیکن اُس نے مذہب کی تمام تنگ نظری پر مبنی جزئیات کو خیر باد کہا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر اور روشن دماغ اور واضح نظریہ رکھنے والا فنکار تھا''۔

اس پیراگراف میں لفظ ''اگر وہ'' کی جگہ ''اگرچہ'' استعمال کیا جائے اور لفظ ''اہل تشیع میں سے تھا'' کے بدلے ''اہل تشیع تھا'' کہہ کر جملہ مکمل کیا جائے پھر لفظ ''لیکن اور مذہب'' حذف کر کے نیا جملہ شروع کیا جائے جس میں سے فقرہ ''اور روشن دماغ اور واضح'' حذف کیا جائے تو دیکھیے پیراگراف کی کیا شکل بنتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''سنتوشؔ کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگرچہ وہ مسلکی اعتبار سے اہل تشیع تھا لیکن

اُس نے تمام تنگ نظری پر مبنی جزئیات کو خیر باد کہا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر نظریہ رکھنے والا فنکار تھا''۔ جملے کی یہ صورت خیالؔ جیسے دانشور کے شایانِ شان لگتی ہے۔

مقبول فدا حسین''، ''مجازؔ اور کشمیر'' اور ''کشمیری لال ذاکرؔ'' ایسے مضامین ہیں جن میں ان اشخاص کے ذکر کے ساتھ ساتھ متوازی خط پر مصنف کی اپنی ادبی شخصیت روشنی میں آتی ہے۔ اظہارِ ذات کی یہ دبی دبی چنگاری جب شعلہ بن جاتی ہے تو مصنف بہ نفسِ نفیس ''خیال نامہ'' کے عنوان سے اپنی ادبی کاوشوں، حصولیابیوں اور کامیابیوں کا ذکر فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔

آخری سے پیشتر مضمون ''جشنِ خیال'' یو پی مراد آباد میں غلام نبی خیالؔ صاحب کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریب کی روداد ہے۔ اِسے رپوتاژ کہہ کر اس کی قدر میں کمی ہونے کا خدشہ ہے۔ اس مضمون کا آہنگ ناول سے قریب تر ہے یا یوں کہیے کہ اِسے ناول کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ اِس جشن کی خاص خوبی یہ رہی ہے کہ اس کا انعقاد مراد آباد کی خواتین کی ادبی سوسائٹی نے کیا تھا۔ سرزمین جگر مراد آبادی میں فرزند کشمیر کی عزت افزائی کشمیر کے تمام ادباء کے لئے باعث فخر ہے۔

کتاب کے آخر پر فاروق ارگلی کا مضمون بعنوان ''کشمیریات کا مجسم فکری زعفران زار۔ غلام نبی خیالؔ'' شامل کیا گیا ہے۔ کاش یہ مضمون شامل اشاعت نہ کیا گیا ہوتا تو کمپیوٹر کمپوزنگ اور چھپائی کے پیسے بچ جاتے۔ یہ مضمون نویں یا دسویں جماعت میں بچوں سے لکھوائے جانے والے سوانحی نوٹ سے کسی بھی طرح مختلف نہیں ہے۔ اس ایک مضمون کو چھوڑ کر کتاب میں شامل تمام مضامین اردو، کشمیر اور خیالؔ کی تثلیث کے مختلف ابعاد کو سامنے لاکر قاری کو محظوظ بھی کراتے ہیں اور باخبر بھی۔

......شہناز رشید

''خیال قلم'' سے منتخب تین شہ پارے: ایک جائزہ

غلام نبی خیالؔ کو جس ہمہ جہت ادبی اور صحافتی بلندی کی انفرادیت نصیب ہوئی، وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہ بیک وقت جہاں کئی زبانوں کے معروف صحافی بن کر اُبھرے، وہیں نمائندہ لب و لہجہ اور یکتا اسلوب کے شاعر، ادیب، محقق، ترجمہ کار، تبصرہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے بھی اپنی مخصوص پہچان قائم کی۔ انگریزی اور اُردو صحافت کو لے کر وہ ملکی اور بین الاقوامی توجہ کے زینے پر فائز ہوئے۔ ترجمہ کاری کی بات کریں تو اُنہوں نے مشہورِ عالم ''رباعیاتِ عمر خیام'' کا جس استادانہ ہنرمندی سے منظوم کشمیری ترجمہ کیا، وہ اُن ہی کا خاصہ ہے۔ اس اعتبار سے شاید ہی کسی دوسرے کشمیری ترجمہ کار کو اس قدر شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہو۔ شاعری تو اُن کی اوّلین پہچان ہے۔ کشمیری زبان کے صفِ اوّل کے ممتاز اسلوب کے حامل شاعر کے طور اُن کی تخلیقی انفرادیت سے ہر سنجیدہ قاری اور نقاد بخوبی آشنا ہے۔ غرض مذکورہ بالا ہر شعبے کے حوالے سے اُن کی فنی، فکری اور احساسی کاوشوں کی انفرادیت ہی اُنہیں غلام نبی خیالؔ بناتی ہے۔ غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ راقم نے ان کی نہایت معتبر کتاب ''خیال قلم'' میں موجود فقط تین شہ پاروں پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ خیال رہے کہ قارئینِ کرام خاکسار کی اس تحریر کو تبصرہ کے طور نہ لیں۔ میری یہ کوشش رہے گی کہ غلام نبی خیالؔ کے اِدراک اور اُن کی آگہی کو لے کر اُن چیزوں تک قارئین کو لے چلوں، جن کا تذکرہ نہ صرف تاریخی اور علمی اعتبار سے نہایت ناگزیر بن جاتا ہے، بلکہ اِن کے آئینے میں خیالؔ صاحب کی قلبی اور بصری شخصیت جھلملاتی نظر آتی ہے۔ اِس تصنیف کو جو کُل ملا کر چار سو اسی صفحات پر مشتمل ہے، اگر جموں و کشمیر کے ادبی سرمایے میں گنجِ بے بہا سمجھا جائے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کتاب کے سارے مضامین عالمی اہمیت کا

درجہ رکھتے ہیں ۔اس اعتبار سے اگر اِس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے ، تو یہ دنیا کی کسی بھی لائبریری میں نمایاں جگہ پا سکتی ہے۔ کتاب کے مضامین میں پہلے اُس مقالے پر بات کریں، جس کا عنوان "غنی کشمیری" رکھا گیا ہے۔ غنؔی ہماری ہی زرخیز مٹی سے پھوٹے ہیں، تو ان ہی کو لے کر بات کی اِبتدا کرنے سے اپنے حساس تفاخر کی تشفی ہوگی۔

ا۔ غنی کشمیری

غلام نبی خیالؔ کا تحریر کردہ یہ بصیرت افروز مضمون ایک نئے اور تازہ انداز میں قاری کو غنؔی کی درویشانہ شخصیت اور اُن کی بے مثال فکری آگہی سے روبرو کراتا ہے۔ یہ خاکسار اب تک مُلا غنؔی کی فقط شعری عظمت کے تذکروں سے کچھ کچھ واقف تھا، مگر خیالؔ کا یہ مدلّل مضمون پڑھ کر پہلی بار غنؔی کی قلندرانہ حیثیت اور بے نیازی سے واقف ہوا۔ مفکرانہ سوچ رکھنے والی شخصیت جب شہرت کی اونچائیوں کو چھو لیتی ہے، تب اُس پر دھن، دولت اور "عظمت" کے دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ اِس حال میں فکر، آگہی اور ضمیر کو سونے چاندی کے عوض بیچنے دُستور ہر دور میں خوب پنپا ہے۔ اِس سے دامن بچانا شاید غنؔی کشمیری جیسا مزاج رکھنے والوں ہی کا شیوہ ہے۔ غنؔی کے اِس پہلو کا نقشہ جس انداز سے غلام نبی خیالؔ کھینچتے ہیں، وہ دورِ غنؔی کی تاریخ بن جاتا ہے۔

چنانچہ خیالؔ رقمطراز ہیں:۔

"واپسی پر جب صائبؔ نے دیکھا کہ مصرعہ غنؔی نے لکھا ہے تو خواہش ظاہر کی" مطلب یہ خواہش، "کاش کہ صائب دیوان یک مِصرعہ نگاشتے و تضمینش ملا غنی مے کردے"۔

اس کے بعد، خیالؔ لکھتے ہیں، "اِس کے بعد مرزا صائب، غنؔی کا اِس قدر گرویدہ ہوا کہ اپنی ذاتی بیاض میں اُس کے (غنی کے) دوسو سے زائد اشعار درج کئے، جنہیں پڑھ کر وہ وقتاً فوقتاً محظوظ ہوتا تھا۔ یہ چند حروف غنؔی کشمیری کی شعری عظمت پر کسی بین الاقوامی یا یوں کہیئے کسی نوبل ادارے کی مہرِ تصدیق سے کم نہیں۔ غلام نبی خیالؔ نے مُلا غنی کے شعری منظر نامے کو جس طرزِ بیاں سے، اُن کی شخصیت کے آئینے میں قاری تک پہنچایا ہے، وہ کسی بھی حساس دل میں یہ خواہش بیدار کر سکتا ہے کہ کاش میری آنکھ نے بھی دورِ غنؔی کا نظارا کیا ہوتا۔ خیالؔ لکھتے ہیں:۔

''اس عالمِ عقیدت مندی اور قدر شناسی میں بھی غنیؔ نے کسی بادشاہ یا نواب کی تعریف و توصیف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا، ورنہ یہ بات چنداں مشکل نہ تھی کہ وہ دربارِ شاہی میں اشعرالشعراء بن جاتا اور انعام پر انعام پاتا، لیکن وہ بہر صورت اپنے ہی حال میں مست و مدہوش رہا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کلیمؔ کا ایک قصیدہ پسند آنے پر شاہجہاں نے اسے ایک ہزار اشرفیاں اور خلعتِ فاخرہ عطا کی تھی اور اِسی دور میں صائبؔ کو ایک نواب سے صرف ایک شعر کے صلے میں پانچ ہزار اشرفیاں ملیں جو اس نے ایران سے یوں لِکھ کر بھیجا تھا:

''دور دستاں را بہ احسان یاد کردن مشکل است

ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر مے افگند''

خیال آگے چل کر غنیؔ کی شخصیت کے ایک اور پہلو کو وا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''شہنشاہِ ہند اورنگ زیب عالمگیر نے غنیؔ کا کلام سُنا تو عش عش کر اُٹھا اور شاعر سے ملاقات کا مشتاق ہوا۔ 1079ھ بمطابق 1686ء کے دِن تھے۔ کشمیر میں سیف خان کی گورنری تھی۔ گورنر کو شہنشاہ کا حکم ملا کہ غنیؔ کو بہ تکریم و تعظیم دربار میں لایا جائے۔ سیف خان نے غنیؔ کے سامنے بادشاہ کی خواہش ظاہر کی تو جواب ملا۔ ''شہنشاہ کو لکھ دو کہ غنیؔ دیوانہ ہو گیا ہے۔'' سیف خان کو تعجب ہوا کہ بھلا ایک صاحب ہوش و خرد اور مردِ دانا کو سودائی کیسے کہوں۔ غنیؔ نے اِسی لمحے کپڑے پھاڑ ڈالے اور دیوانوں کی طرح حاکم کشمیر کے بھرے دربار سے نکلا، جس کے تین دن گزرنے کے بعد ہی (غنیؔ) اِس دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔''

یہ ہیں سرزمین کشمیر کے وہ فرزند مُلا غنی، جن کی قبر ویرانیوں کی نذر ہو کر ہماری بے مروّتی اور کم ظرفی پر طعنوں کے تازیانے برسا رہی ہے۔ غلام نبی خیالؔ نے ملا طاہر غنیؔ کی شخصیت کو نمایاں کر کے ہم تک اُس ذہن و ضمیر کی آواز پہنچادی جس کی حُرمت کی گواہی شفاف سوچ رکھنے والا دانشور ہی دے سکتا ہے۔

۲۔ کشمیری زبان میں تحقیقی ادب

''خیال قلم'' نامی تصنیف کے صفحہ 193 تا 198 تک پھیلا ہوا یہ مضمون، ایک طرف

ہمارے یہاں اب تک سرانجام دیئے گئے تحقیقی کام کا اچھا خاصا احاطہ کرتا ہے، وہیں دوسری جانب اِس مضمون میں مصنف کی بے باک شخصیت سر چڑھ کر بولتی ہے۔نڈر پن کے لئے مشہور خیالؔ نے مضمون ھٰذا میں بغیر کسی لگی لپٹی کے، جس انداز سے کہیں کہیں پوسٹ مارٹم کرنے والی قینچی کا استعمال کیا ہے، وہ واقعی اُن کے اندرون کو ظاہر کرتی ہے۔ مضمون کی ابتدا ہی میں وہ کشمیر یونیورسٹی کی ''شیخ العالم چیئر'' جواب ''مرکزِ نور'' کے طور پہچانی جاتی ہے، پر بات کرتے ہوئے خاصے مایوس نظر آتے ہیں۔اُن کے خیالات کو اگر چہ حرفِ آخر کے طور نہیں لیا جاسکتا ہے، لیکن یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ خیالؔ نے کوئی بھی دعویٰ پیش کرتے ہوئے یہ تو ضرور سوچا ہوگا کہ وہ اِس حوالے سے کیا اور کیوں کر قلمبند کر رہے ہیں۔ خیالؔ رقمطراز ہیں:۔

''اب یہ اِدارہ عامیانہ قسم کے مشاعرے منعقد کرنے اور بے سود مناظروں کا اہتمام کرنے تک ہی اپنے آپ کو محدود کر کے موت کی گھڑیاں ،گن رہا ہے۔''

آگے چل کر وہ شاید مذکورہ اِدارے کو فعال بنانے کے لئے یہ مشورہ دیتے ہیں۔

''تحقیق کا صبر آزما کام اِس امر کا متقاضی ہے کہ اُن قدیم ادبی اور ثقافتی خزانوں کو کھنگالا جائے، جن کی چابیاں زمانے کی دست برد سے کھوگئی ہیں، اوران کے دروازے،ہم پر وا کرنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ تحقیق کار کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے یا قدیم نسخے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لئے بے پناہ صبر اور استقامت کا مالک ہو، جس کی بدولت وہ کسی بھی غیر مصدقہ تخلیق کو تاریخی اعتبار سے حقائق کی کسوٹی پر رکھ کر اس کی توثیق یا تصحیح کر سکے''۔

تحقیقی کام کی اعتباریت کے حوالے سے مذکورہ مضمون کا یہی احساس لے کر اگر ''خیال قلم'' کا اِس زاویے سے بھی مطالعہ کریں تو خیالؔ کے ظاہر کردہ خیالات کی تصدیق کرنے پر مجبور رہوں گے۔ کیوں کہ اِس اعتبار سے کتاب ھٰذا میں شامل اکثر نگارشات خود اُن کی عرق ریزی اور کام سے والہانہ عقیدت کا بین ثبوت ہیں۔ کشمیری زبان میں ہوئے تحقیقی کام کو موضوع بناتے ہوئے وہ اِس پورے کے پورے ''دفتر'' کو اپنے علاوہ محض چار سر کردہ ادیبوں ہی تک محدود کرتے ہیں۔ وہ نمایاں چار اشخاص امین کاملؔ، موتی لال ساقیؔ، محمد یوسف ٹینگ اور ناجی منوّر ہیں۔اِس تعلق سے وہ امین کامل مرحوم

کے کام کو سب سے زیادہ قابلِ قدر مانتے ہیں اور ان کے کام کو حقیقت بیانی سے منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کامل کی حقیقت پسندی نے کشمیر کی ثقافتی اور ادبی دنیا میں ان کے لئے کئی دشمن پیدا کئے۔ کامل کے اُس مشہور دعوے جس میں اُنہوں نے ارنہ مال نامی شاعرہ کے وجود سے سرے سے اِنکار کیا ہے، کا دفاع کرتے ہوئے خیالؔ کہتے ہیں۔

''یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جو اِس بحثا بحثی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، اُن میں سے کسی نے بھی ایک ایسی تاریخی دلیل پیش نہیں کی، جس سے ارنہ مال کا موجود ہونا ثابت ہو جاتا۔ کاملؔ کی طرف سے ارنہ مال کو ایک فرضی شاعرہ قرار دینے کا دعویٰ آج بھی ایک مدلل جواب کا محتاج ہے۔''

خیالؔ، کاملؔ کی ہمہ جہت شخصیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

کاملؔ نے کشمیری مثنوی پر بھی قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ اُس نے کلچرل اکیڈیمی کے جریدے، شیرازہ کا ''مثنوی نمبر'' اور ''جنگ نامہ نمبر'' مرتب کر کے ہماری شاعری کے اس بیش بہا خزانے کو تنقیدی اور تخلیقی طور پر مالا مال کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ کامل کی عرق ریزی کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں۔

''کلچرل اکیڈیمی کے اردو رسالہ ''شیرازہ'' کے ''موسیقی نمبر'' میں کامل کا دلچسپ مقالہ بھی شامل ہے، جو مضمون نگار کی کشمیری موسیقی سے اُن کی وابستگی اور آگہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس مضمون کے بارے میں کاملؔ دعویٰ کرتا ہے کہ کشمیر کی صوفیانہ موسیقی پر گزشتہ پانچ سو سال کے عرصے میں پہلی بار قلمبند کیا گیا ہے۔''

مشہور ادیب، محقق اور نقاد محمد یوسف ٹینگ کے تحقیقی کام کو زیرِ قلم لاتے ہوئے غلام نبی خیالؔ اپنا لب ولہجہ یوں ظاہر کرتے ہیں۔

''ایک طرف اگر چہ ہمعصر ادب اور ادیبوں کے بارے میں اُس کے تنقیدی نکتہ نظر سے شدید اختلاف کیا جا سکتا ہے، وہاں دوسری جانب تحقیق کے حوالے سے اُن کا قلمی کام زیادہ وزن دار ہے۔ رسول میر اور مہجور پر ٹینگ کا تحقیقی کام اِس زمرے کی قابلِ ذکر مثالیں ہیں۔''

یہاں پر قاری کی یہ خواہش من ہی من میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے کہ خیالؔ صاحب، ٹینگ صاحب کی ہمعصر ادب اور ادیبوں سے متعلق ظاہر کردہ آرا کے حوالے سے اگر اپنے اختلاف کی دو ایک مثالیں پیش کرتے، تو آگے چل کر کسی نہ کسی موڑ پر ایک سودمند بحث چھڑ جاتی۔ ویسے بھی خیالؔ صاحب نے دو ایک حروف ہی میں بات کا آغاز کر دیا ہے۔ ناجی منور صاحب کے تحقیقی کام کو بھی غلام نبی خیالؔ سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ کسی شور شرابے کے بغیر اپنا تحقیقی کام جاری رکھا۔ اِسی نگاہ سے وہ موتی لال ساقیؔ کے تحقیقی کام کو قابلِ قدر جان کر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی دونوں مذکورہ محققین کے کام کی کوئی مثال سامنے نہ لا کر خیالؔ صاحب نے قاری کی تشنگی میں اضافہ کیا ہے شاید اِس وجہ سے کہ سنجیدہ قاری کے لئے دونوں صاحبان کے کام کے اعتراف کے طور یہی چند حروف کافی ہیں کہ وہ از خود اپنی جستجو اور تلاش سے اُن کے تحقیقی کارنامے کھنگالیں۔ اپنے اِسی نوعیت کے تحقیقی کام کو جو اُنہیں کلچرل اکیڈیمی کی ملازمت کے دوران سونپا گیا تھا، جس کی رو سے انہیں لکھمن کول بلبلؔ کے ''سام نامہ'' کو مرتب کرنا تھا، غلام نبی خیالؔ ایک قیمتی انکشاف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''مقامی طور پر ادبی اور ثقافتی حلقوں میں یہ عام تاثر پایا جاتا تھا کہ یہ ''سام نامہ'' ''بلبل'' نے شہنامہ فردوسی سے اخذ کیا ہے۔ لیکن دو سال کی عرق ریزی، تحقیقی جستجو اور تلاش کے بعد میں نے یہ ثابت کر لیا کہ سام نامہ، شہنامہ سے نہیں بلکہ ایک اور فارسی شاعر خواجہ کرمانی سے ترجمہ کی صورت میں تحریر کیا گیا ہے۔ خواجہ نے یہ دیو مالائی داستان اپنی مثنوی ''ہمائی و ہمایوں نامہ'' میں منظوم کی ہے۔ یہ ایک ایسا تحقیقی انکشاف تھا جس سے کئی محققوں کا دعویٰ خود بہ خود غلط ثابت ہو جاتا ہے۔''

خیالؔ کی اس عرق ریزی اور تحقیق کو قدر کی نگاہ سے اگر نہیں دیکھا جائے، تو ہم اِسے اپنی اجتماعی غفلت ہی سے تعبیر کریں گے۔ اِسی مضمون میں آگے چل کر صاحبِ مضمون ہمیں عالمِ تخیل میں حبہ کدل میں واقع آنند کول بامزئی کے گھر پہنچا دیتے ہیں، جہاں تاریخ رقم کرنے والا ایک مشاعرہ جاری ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور اس مشاعرے کی صدارت کر رہے ہیں، اور اِسی مجلس میں شاعر کشمیر غلام احمد مہجور سے ٹیگور کی ملاقات ہوتی ہے۔ یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ ایس پی کالج میں، ٹیگور کی خدمت میں شاندار استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اِسی استقبالیہ میں انہوں نے اپنی وہ شہرۂ آفاق نظم سنائی تھی، جو اُن کی نوبیل

انعام یافتہ کتاب ''گیتانجلی'' میں شامل ہے۔

Where the mind is without fear,

Where the head, held high

۳۔ اسرارالحق مجاؔز اور کشمیر

منفرد رومانی لب و لہجہ رکھنے والے، اپنے شعری اظہار کو طلسماتی رنگ و روپ بخشنے والے اور نوجوان پود پر خوشبو کی طرح چھا جانے والے مجاؔز میرے محبوب ترین اُردو شعرا میں شامل ہیں۔ جب خیاؔل کی اِس معتبر کتاب ''خیال قلم'' میں مجاؔز کو کشمیر سے جوڑنے والا مقالہ میری نظروں سے گزرا، میں چند ایک لمحوں کے لئے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اِس بظاہر ناممکن رشتے نے راقم کو یہ مختصر سا مگر بلیغ مضمون پڑھنے پر اُکسایا۔ پھر کیا تھا ''اسرار در اسرار'' راقم کو پہلی بار پتہ چلا کہ مجاؔز کشمیر بھی آئے ہیں اور یہاں مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ وہ بقول خیاؔل، یہاں کی فضاؤں میں کچھ ایسے رچ بس گئے کہ تاریخ کی ہوائیں اب بھی اُن کی سنائی شاعری کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ غلام نبی خیاؔل نے مجاز کے کشمیر آنے اور یہاں اُن کی مصروفیات کا جو خاکہ کھینچا ہے، اُسے ادبی تاریخ کا بیش بہا باب کہا جا سکتا ہے نیز خیاؔل کی تحریر پڑھنے والے کو عش عش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ 1955ء میں سری نگر کے پولو گراؤنڈ میں منعقد ایک مشاعرے کی روداد، جس میں مجاؔز بہ نفسِ نفیس موجود تھے، یوں بیاں کرتے ہیں:۔

''اسی دوران ایک شام کو سری نگر کے پولو گراؤنڈ کی اُس عمارت کے وسیع و عریض صحن میں ایک مشاعرہ ہوا، جس میں اس وقت ریڈیو کا سٹیڈیو تھا۔ اس مشاعرے میں مجاؔز بھی شریک تھا۔ سامعین میں کئی وزراء کے ساتھ ایک ادب شناس وزیر داخلہ درگا پرشاد در بھی موجود تھا۔ جب مجاؔز کی باری آئی تو اُس نے پہلے ایک خوبصورت غزل سنائی اور اُس کے بعد سامعین کی فرمائش پر اُس نے شہرہ آفاق نظم ''آوارہ'' اپنے کمزور جسم کو لہلہاتے ہوئے سنائی۔ دؔر صاحب کی فرمائش پر یہ نظم سنانے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ اِس طرح مجاؔز نے اُس مشاعرے کو لوٹ لیا۔ مجاؔز کے واپس لکھنو لوٹنے کے بعد اُس کی افسوس ناک موت کی خبر آئی جب اُسے 5/دسمبر 1955ء کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات میں ایک انجان میخانے کے باہر مردہ پایا گیا۔ اِس طرح ہندوستان میں اُردو ادب کی رومانی فضاؤں کا یہ شہزادہ اپنے عقابی پروں پر اُڑتا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا۔''

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

دل میں اُترنے والا غلام نبی خیالؔ کا یہ پیراگراف بہر صورت اُن کے اسلوب اور جداگانہ اندازِ بیاں کا احاطہ کرتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں درج مجازؔ کی اس بات نے میرے احساس کو انبساط سے بھر دیا جس میں اُنہوں نے ایک مختصر سی ملاقات میں غلام نبی خیالؔ کو اِس لئے مبارک دی تھی کہ انہوں نے شعر گوئی کے لئے اپنی مادری زبان کشمیری کا انتخاب کیا تھا۔ بقول خیالؔ۔ ''جب اُسے پتہ چلا کہ میں صرف اپنی مادری زبان کشمیری میں ہی شاعری کرتا ہوں تو مجازؔ بے حد خوش ہوا، اور مجھے تاکید کی کہ شاعر کو صرف اپنی مادری زبان میں ہی سخن گوئی کرنی چاہیئے، جس میں وہ اپنے محسوسات اور جذبات کا بہترین انداز میں اظہار کر سکتا ہے۔ مجازؔ اور کشمیر سے متعلق اس مضمون ہی سے خاکسار کو یہ پتہ چلا کہ 1946ء میں کشمیر میں شخصی راج کے خلاف جو جدوجہد شروع ہوئی تھی، اُس کی حمایت میں اسرار الحق مجازؔ نے ایک ایسی نظم لکھی تھی، جس میں انہوں نے کشمیر کے تابناک مستقبل کی بشارت دی تھی۔ سرزمینِ کشمیر کے تب کے درد و الم کو مجازؔ نے ''نیا کشمیر'' نامی نظم میں عکس بند کیا تھا۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

............●●● ....

● ...... اشرف آثاری

غلام نبی خیالؔ اور ترقی پسند تحریک

دنیا ابتدا سے ہی لمحہ لمحہ تغیر و تبدل سے گزرتی آئی ہے اور یہاں رہنے والے لوگ عقائد ونظریات، جذبات واحساسات، توقعات وترجیحات کے سلسلے میں متزلزل و لاابال ثابت ہوئے ہیں۔ روز روز نئی نئی اور مشکل و پیچیدہ ذہنی الجھنوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نئی نئی ایجادات اور بدلتے ہوئے طور طریقوں سے روشناس بھی ہوتے ہیں اور اپنے جذبات واحساسات کا اِظہار بھی کرتے ہیں۔ تبدیلی اور بدلاؤ قانونِ فطرت ہے اور اسی کا نام ارتقاء ہے۔ کائنات سے متعلق ہر چیز ارتقاء کی طرف مائل ہے اور اس عملِ ارتقاء کا اثر زبان وادب پر بھی لازم اور ناگزیر ہے۔ ترقی پسند تحریک دنیا میں موجود لگ بھگ ہر زبان وادب پر اثر انداز ہوگئی اور اپنے انمٹ اثرات چھوڑ گئی۔

ترقی پسند تحریک کا دورِ عروج 1936ء سے 1947ء تک رہا۔ ترقی پسند تحریک ہمارے شعر وادب کا ایک اہم منظر نامہ رہی ہے۔ اس نے ادیبوں اور شاعروں کی ایک نسل کو تاریک اور محدود ومسدود فکری رجحانات وذہنی میلانات سے نکال کر سنہری اجالوں تک لایا اور کئی دہائیوں تک اس کے فکر وشعور کو منور کیا۔ ادب اگرچہ سیاست سے بلند تر ہے لیکن ہر شاعر وادیب اپنا ایک منفرد و مخصوص سیاسی اور مذہبی نظریہ بھی رکھتا ہے اور اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور معاشرتی مسائل و معاملات سے کنارہ کش نہیں رہ سکتا۔ ادب اور شاعری کا راست تعلق زندگی سے ہے۔

اشتراکیت کے ساتھ کچھ لوگ اس لئے بھی جڑ گئے کہ یہ ایک بہت بڑی تحریک ہے اور اسے ایک سپر پاور سپانسر کر رہا ہے۔ کچھ لوگ اس کے مذہب بیزاری کے بنیادی فلسفے کی وجہ سے، کچھ لوگ

اس وقت کے دنیا کے دو سپر پاوروں کی باہمی رسہ کشی کی وجہ سے مخالف پاور سے نظریاتی اختلاف کی وجہ سے، کچھ لوگوں نے دیوان خانوں میں بیٹھ کر صرف زبانی خیر و شر کا فلسفہ بگھارا اور کچھ لوگوں نے جیل و زنداں کی صعوبتیں بھی سہیں۔ غرض اس تحریک کے نام پر بہت کچھ ہوا جو اچھا بھی تھا اور ناپسندیدہ بھی۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو ادب خواہ وہ نظم ہو یا نثر، تخلیق ہوا اس کے ایک حصے پر پروپیگنڈا بازی کا الزام بھی لگایا گیا۔ اس ضمن میں یہ بات ہمیشہ کہی گئی کہ ترقی پسند ایک مخصوص سیاسی نظریہ اور فکر و فلسفے کی تشہیر کر رہے ہیں جس کے وہ خود ڈھنڈورچی بن بیٹھے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس عمل سے ایک عرصہ تک ادب اور غیر ادب میں فرق کرنا بھی ممکن نہیں رہا، کیونکہ اس ادب میں عام طور پر اشتراکیت و انقلاب کا نعرہ بلند ہوتا رہا۔

ظاہر بات ہے ان تمام تغیرات و تبدیلیوں کا اثر یقیناً ادب بھی پڑتا رہا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں خوبیاں اور خامیاں بھی ہوسکتی ہیں دھوپ اور چھاؤں، نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، ساتھ ساتھ چلتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے ایک موج ساحل پر دم توڑتی ہے تو دوسری ساحل سے جا ٹکراتی ہے۔ ہر تبدیلی دراصل ایک پیغام ہے اور یہی تبدیلی ارتقاء ہے اور ادب بھی دوسری چیزوں کی طرح ہی ہمیشہ مائل بہ ارتقاء رہتا ہے۔

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں فیض احمد فیضؔ بھی تھے۔ ان دنوں سامراجی اور نو آبادی طاقتیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندوستان بھی ان کے آہنی شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ معاشرے کے باشعور لوگوں کے لئے یہ قوتیں ناقابلِ برداشت بن گئی تھیں۔ ہندوستان میں اس تحریک کے سرخیل سید سجاد ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، فیض احمد فیضؔ، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی وغیرہ کے علاوہ پورا ایک کارواں اس کے ساتھ وابستہ تھا۔ اردو زبان کے اکثر شعراء و ادباء اس کے ساتھ شامل ہو گئے جن میں بطورِ خاص پریم چند، جوشؔ اور مجازؔ وغیرہ بھی تھے۔

کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے کشمیر کلچرل کانفرنس کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی جو انجمن ترقی پسند مصنفین ہی کی ایک شاخ تھی، لہٰذا اس کے طریق کار اور فکر و فلسفہ پر ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کا براہ راست اثر تھا۔ اس کے ساتھ کئی معروف سیاسی اور ادبی ترقی پسندوں کی وابستگی تھی جن میں بطورِ

خاص غلام محمد صادق، درگا پرشاد در، شیوراج سنگھ چوہان، سید سجاد ظہیر، شیلا بھاٹیہ، محمودہ احمد علی شاہ، اومکار کا چرو، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

غلام نبی خیالؔ کشمیری زبان وادب کے ایک معروف وممتاز اور قادر الکلام شاعر، محقق ونقاد اور مترجم وصحافی ہیں۔ اردو زبان وادب کے ساتھ ان کی دیرینہ دلچسپ و مسلسل وابستگی کی وجہ سے اردو کی عالمی بستیوں میں بھی ان کو جانا پہچانا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی دلچسپ اور اچھوتے موضوعات پر فکر انگیز مضامین تحریر کئے ہیں۔ جو اردو کے معیاری رسائل وجرائد کی زینت بنے ہیں اور کئی کتابیں بھی اب تک منظرِ عام پر آئی ہیں جنہیں اردو ادبی حلقوں میں کافی سراہا اور پسند کیا گیا ہے۔

''غلام نبی خیال لکھتے ہیں کہ دو سال جیل میں نظر بند رہنے کے بعد رہائی ملتے ہی کلچرل اکادمی میں ملازمت مل گئی۔ مرزا کمال الدین شیداؔ ان دنوں اکادمی کے سیکرٹری تھے اور امین کاملؔ اور اختر محی الدین مجھ سے پہلے ہی وہاں ملازم ہو چکے تھے۔ مرزا صاحب نے جب مجھے پہلے ہی دن اپنے کمرے میں بلایا تو انہوں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔'' خیالؔ صاحب! میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اس ادارے میں دو خطرناک کمیونسٹ اخترؔ اور کاملؔ بھی کام کرتے ہیں ان سے ذرا دور ہی رہنا ورنہ ان کی صحبت میں تم بھی بگڑ جاؤ گے۔'' سوال یہ ہے کہ میں جو خود کشمیر کی ترقی پسند تحریک کا ایک سرگرم رکن رہ چکا تھا کس طرح کاملؔ صاحب اور اخترؔ صاحب سے دور رہتا؟۔''

(اقتباس: ''علامہ اقبالؔ کا سفرِ کشمیر'')

یہ بھی ایک مثال ہے کہ تخلیق کو کم اور تخلیق کار کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی جو تنقید کے مسلمہ اصول وقواعد کی خلاف ورزی تھی، اور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''ابتدا میں اگرچہ کشمیری (ترقی پسند) ادیبوں اور شعراء کی تخلیقات، سامراج کی تردید، ایٹم بم کی تباہ کاریوں اور امریکی اور یورپی سیاست کی مخالفت اور روس کی نام نہاد ترقی پسندی، سرخ سویرا اور لال انقلاب کے محور کے ارد گرد ہی گھومتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہوتی گئی جس نے جذبات پرستی اور درآمدی سیاست گری کے برعکس مقامی محسوسات اور شاعرانہ خیالات کو فکر وفن کے رنگ وروغن سے آراستہ و

پیراستہ کیا۔

غلام نبی خیالؔ کشمیر میں بطورِ خاص ترقی پسند تحریک کے فعال بانی قلمکاروں میں سے ہیں اور انہوں نے جو ادب خاص طور پر، شاعری، جس میں کشمیری زبان کی شاعری پر مشتمل قابلِ قدر حصہ شامل ہے، اس دوران تخلیق کیا یا پھر نثر میں طبع آزمائی کی، اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ خاص بات یہ کہ خیالؔ صاحب کی تخلیقات کے غیر جانب دارانہ مطالعے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ خیالؔ صاحب نہ کسی مخصوص نظریہ کی تصدیق و تائید کے لئے ڈھنڈورچی ہی بنے ہیں اور نہ ہی تنقید برائے تنقید کے ہی قائل رہے ہیں بلکہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات و مشاہدات کو اپنی علمی بساط اور وسعت نظر سے قارئین ادب تک پہنچاتے رہے ہیں جو صحیح معنوں میں بحیثیت ایک ادیب و شاعر ان کا منصب تھا۔

............●●● ....

ہمارا ادب ''کرشن چندر نمبر''

اُردو افسانے کے قد آور افسانہ نگار کرشن چندر کے صد سالہ جشن یوم پیدائش کے سلسلے میں اکادمی ''ہمارا ادب'' کی خصوصی اشاعت ''کرشن چندر نمبر'' پیش کر رہی ہے۔ اس خصوصی شمارے میں اُردو کے مقتدر شخصیات نے ''کرشن چندر اور کشمیر'' کے موضوع کو نمایاں طور پر اُجاگر کیا ہے۔

اس پتے پر منگوائیں:

☆ ...... کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

......●......

● ...... ولی محمد خوشباشؔ

آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

بزرگوں نے سچ ہی کہا ہے کہ خط اِنسانی جذبات کا نہ صرف ایک تحریری ثبوت ہوتا ہے بلکہ یہ ایک تاریخی دستاویز کا بھی درجہ رکھتا ہے۔ کئی لوگوں نے تو خط کو دِل کا آئینہ بھی قرار دیا ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے خط کے حوالے سے کہا ہے کہ خط خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہوتا ہے۔ اِس میں وہ صداقت اور خلوص ہوتا ہے جو دوسرے کلام میں کہیں نظر نہیں آتا۔ یقینی طور پر خط میں جہاں ایک اِنسان کی ساری شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے وہاں اِس سے انسانی سیرت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

خط لکھنے کا رواج کب سے شروع ہوا ہے اِس حوالے سے اب تک محققین کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر پائے ہیں۔ اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ مکتوب تحریر کرنے کی شروعات اِنسان نے اپنے خیالات اور معمولات زندگی کے حال واحوال سے اپنے عزیز و اقارب کو باخبر کرانے کی غرض سے کی ہیں اور یوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خطوط نویسی کا فن بھی عروج پکڑتا گیا۔ آج یہ سلسلہ اِس قدر بڑھ چکا ہے کہ مکتوب نگاری باضابطہ طور ایک فن کی صورت اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؒ، مولانا آزادؔ، علامہ شبلیؒ، نیاز فتح پوری اور کئی دیگر اہم شخصیات کے خطوط کی آج بھی دھوم ہے بلکہ بعض مشاہیر کے خطوط دستاویز کی حیثیت اِختیار کر چکے ہیں۔ اِن خطوط میں ایک طرف جہاں مکتوب

نگاری کی شائستگی اور تہذیبی جھلک ملتی ہے وہیں عصری رجحانات اور واقعات کی عکاسی بھی بڑے واضح اور خوبصورت انداز میں ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید احمد قادری جب دو جید شخصیتوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی ہے تو بہت سارے علمی و ادبی افکار و اِظہار کے ساتھ ساتھ مکتوب نگاری کا نقطۂ نظر بھی ظاہر ہوتا ہے اور بہت ساری غلط فہمیاں بھی دُور ہوتی ہیں۔ اِس لئے کہ خطوط ذاتی اِظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں جو معتبر اور نامور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں اُن میں کئی ایک ادیبوں اور شاعروں کے برصغیر کے ساتھ ساتھ دُنیا کے مختلف ممالک کے ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ قریبی مراسم رہے ہیں۔ ایسے ہی ادیبوں اور شاعروں میں ریاست کے ایک نامور ادیب، شاعر صحافی اور دانشور غلام نبی خیالؔ بھی شامل ہیں۔ خیالؔ صاحب نے گزشتہ چھ دہائیوں سے جہاں کشمیری زبان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے وہاں آپ نے اپنی اِستعداد کے مطابق کشمیری اور اُردو دونوں زبانوں میں تحقیق و تنقید اور ثقافت و صحافت پر مقالات کے علاوہ کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی ہے۔ آپ کی جو تحریریں ریاست اور بیرون ریاست کے معروف اور معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں اُن کو نہایت ہی پذیرائی ملی ہے۔ خیالؔ صاحب کی شخصیت ریاست کے اُن معتبر ادیبوں اور شاعروں میں اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر کافی مشہور ہے۔ اِن خصوصیات میں آپ کی مکتوب نگاری حد درجہ امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔

گزشتہ ساٹھ برسوں کے دوران آپ کے جو مراسم برصغیر کی کئی نامور شخصیات کے ساتھ رہے ہیں اُن بلند مرتبہ شخصیات نے آپ کے نام وقتاً فوقتاً ایسے بے شمار خطوط تحریر کئے ہیں جو نہ صرف خیالؔ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ وہ کئی لحاظ سے اپنی ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اِن مکتوبات میں مکتوب نگاروں کی مسرتوں اور شکایتوں نیز تلخ تجربات اور خوشگوار واقعات کی کہانیوں کے کردار بھی خنداں اور گریاں نظر آتے یں۔ خیالؔ صاحب کے نام جن متعدد شخصیات نے خطوط لکھے ہیں اُن میں تو بعض تحقیق و تنقید کا بہترین موضوع بن سکتے

ہیں۔ اِتنا ہی نہیں بلکہ اِن شخصیات سے آپ کے جو دیرینہ تعلقات گزشتہ پچپاس ساٹھ برس کے دوران رہے ہیں اُن کی بدولت خیالؔ صاحب کی زندگی میں کئی ادبی وصحافتی تحریکات کو بھی جنم ملا ہے۔ آپ کے نام جن ملکی اور غیر ملکی ہم عصر شخصیات نے بے شمار خطوط لکھے ہیں اُن میں برصغیر کی کئی سربرآوردہ شخصیات بھی شامل ہیں۔ اِن شخصیات نے آپ کی علمی بصیرت اور ذہانت کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اصل میں خیالؔ صاحب نے اپنی تحریروں کی بدولت وہ مرتبہ حاصل کیا ہے کہ اکثر لوگ آپ کو متواتر خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اِن خطوط کو پڑھ کر وہ جوش وخروش یاد آتا ہے جو اُن دِنوں اِن شخصیات کے آپسی روابط میں موجود تھا۔

زندگی جوئے رواں است وروان خواہد بود

ایں مئے کہنہ جواں است وجواں خواہد بود

خیالؔ صاحب کی علمی، ادبی اور ثقافتی بالیدگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں ٹھاکر پونچھی آپ کے نام یوں رقمطراز ہیں:۔

”غائبانہ تعارف تو تھا ہی، آپ نے اچھا کیا جو خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا۔
آپ کی تخلیق جب بھی ”بیسویں صدی“ میں شائع ہوتی ہے، دیکھ کر گونا گوں مسرت ہوتی ہے۔
آپ کی نظم سب نے ہی پسند کی۔ اس موضوع پر (یعنی امن کے موضوع پر) بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جارہا ہے لیکن آپ نے اپنے ماحول کا رنگ اُجاگر کر کے اسے نیا روپ دیا۔ آپ تھوڑے عرصہ میں ہی یہ حدود پھلانگ کر ادھر تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ کی ریاضت کی داد دیتا ہوں۔“

اِس بات سے کس کو اِنکار ہوسکتا ہے کہ خیالؔ صاحب ریاست کے ایک نامور ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال اور منجھے ہوئے صحافی بھی ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی جیسے ممتاز ادیب کے ساتھ آپ کی خط وکتابت میں جس علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی افکار کا تفصیلی جائزہ درج ہے وہ خیالؔ صاحب کے دِلآویز اسلوب اور شگفتہ اندازِ بیان کی گواہی پیش کرتا ہے۔ چنانچہ فاروقی صاحب

اپنے 30 / جون 1997ء کے ایک خط میں، جوانہوں نے خیالؔ صاحب کے نام تحریر کیا یوں رقمطراز ہیں:۔

''آپ کی تصنیف ''اقبال اور تحریک آزادی کشمیر'' انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ میں نے اسے جہاں جہاں دیکھا نئی معلومات سے بھرپور پایا۔''

مذکورہ تحریریں خیالؔ صاحب کے تصورات اور عقائد کی تعیناتی کی کارفرمائی کی واضح دلیلیں پیش کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ خیالؔ صاحب اپنے مشاہدات کو تخلیقی پیکر عطا کرنے کی جوز بردست قوت رکھتے ہیں، اُس نے آپ کو ہر خاص و عام میں مقبول بنایا ہے۔ آپ کی شخصیت کا ایک دِلآویز پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے ہمہ وقت جُڑے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ اپنے خیالات و افکار کو آپ تک پہنچانے کے لئے خط و کتابت کرتے رہے ہیں۔ حق کی بات ہے کہ سینہ خواہ داغ داغ ہو اور پنبہ رکھنے کی بھی حاجت نہ ہو پھر بھی زندگی کا سفر وہ ہوتا ہے جس سے یقینی طور پر نئے علائق پیدا ہوتے ہیں۔ اِس بات کی تصدیق درج ذیل خطوط کے اقتباسات سے کچھ اِس طرح ہوتی ہے جیسے خیالؔ صاحب برصغیر کی بستیوں پر آباد ایک ایسا تخلیقی سر چشمہ ہیں جس سے ہمارے ساتھ ساتھ آنے والی نسلیں بھی فیض یاب ہوتی رہیں گی۔

پروفیسر نند لال طالبؔ اپنے ایک خط میں خیالؔ صاحب سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں:۔

''آپ کا محبت نامہ مورّخہ 7 / جنوری 1960ء کو موصول ہوا۔ ممنون فرمایا۔ یہ سن کر اطمینان ہوا کہ لل دید کا مجموعۂ کلام پریس کو بھیج دیا گیا ہے خصوصاً یہ معلوم کر کے دو مزید واکھ یہ بھی اس میں شامل کردیئے گئے ہیں اور پروف بھی بااحتیاط دیکھے گئے ہیں۔ میری طرف سے شکریہ قبول فرمایئے۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ آپ کی توجہ کے بغیر یہ سارا کام پایۂ تکمیل کو پہنچنا ممکن نہ تھا۔

میں نے محترم مرزا صاحب (مرزا کمال الدین شیدا۔ سیکرٹری کلچرل اکادمی) کی خدمت میں وہ عریضے ارسال کئے لیکن جواب سے آج تک محروم ہوں۔ ان کے اخلاق حمیدہ کے پیش نظر مجھے یہ توقع

نہ تھی۔ ان کی خاموشی تعجب انگیز ہے۔ براہِ کرم ان کو یاددہانی کیجئے۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ کلچرل سرگرمیوں سے متعلق تمام ادارے نظام نو کی رو سے جناب صادق صاحب (غلام محمد صادق۔ وزیراعلیٰ جموں وکشمیر) کے ماتحت ہو گئے۔ اس لحاظ سے اکیڈیمی بھی ان کے ماتحت ہوگی۔ کیا انہوں نے اس کا چارج سنبھال لیا ہے؟ کیا مرزا صاحب جموں تشریف لے گئے تھے! کیا اکیڈیمی کی سینٹرل کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تھا!''

خیالؔ صاحب کے نام ملک اور بیرون ملک کی جن شخصیات نے خطوط لکھے ہیں اُن میں وہ خیالؔ صاحب کی سادگی، متانت، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کا احساس دِلاتے ہیں جو آپ کی شخصیت کے روم روم سے ٹپکتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو باتیں بعض اہم حضرات عوامی سطح پر کھل کر نہیں بول سکتے وہ باتیں بڑے رازدارانہ انداز میں اپنے ہمراز دوست واحباب اور عزیز واقارب کو خط میں لکھ دیتے ہیں۔ اِس سے ایک طرف جہاں دِل کی بات لکھ کر دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے وہیں دوسری طرف وہ اپنے ہمراز کو ہم نوا بھی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مناسب ہوگا اگر ہم یہاں پر فکرؔ تونسوی روزنامہ ملاپ نئی دہلی کے دفتر سے خیال صاحب کے نام لکھے ہوئے 24/اپریل 1972ء کو لکھے ہوئے مکتوب کا یہ اقتباس پڑھ لیں گے:۔

''آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ یعنی زندگی میں پہلا "Love Letter" لکھا۔ عشق کی تاریخ میں، یہ اہم واقعہ ہے۔ آپ کی پیش کش پہ میرا یہ وہم ایک بار پھر پختہ ہو گیا کہ میں بھی عوام کے چاہنے والوں میں ہوں۔''

اسی طرح اکبرالدین صدیقی چار قندیل آغا پورہ حیدر آباد سے 19/جنوری 1963ء کو خیالؔ صاحب کے نام ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:

''کل مجھے ''شیرازہ'' کے دو شمارے ملے۔ ایک میں آپ کا مضمون ''کشمیری زبان کی مثنویاں'' نظر سے گزرا۔ اس میں صفحہ 69 پر آپ نے چندر بدن و ماہ رو وگل اندام دو مثنویوں کا ذکر کیا

ہے۔ان دونوں مثنویوں پر میں نے کام کیا ہے۔

چندر بدن کا قصہ آندھرا پردیش کا ہے جو ابراہیم عادل شاہ کے زمانہ میں واقع ہوا۔اس کو کئی شعرا نے نظم کیا ہے۔لیکن دکنی میں سب سے پہلے مرزا محمد مقیم نے لکھا اور اس کو میں مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔

دوسری مثنوی بہرام وگل واندام کے نام سے قطب شاہی دور میں طبعی نے لکھی۔یہ بھی میں ایڈٹ کر کے ''نقوش'' لاہور کے مثنوی نمبر کو دے چکا ہوں۔غالباً مارچ میں شائع ہوگی۔

دونوں مثنویوں کے قصوں میں کہاں تک یکسانیت ہے یہ معلوم کرنے کے لئے میں چاہتا ہوں کہ مجھے آپ ان دونوں مثنویوں کا مختصر ترین خلاصہ عنایت فرمائیں تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آندھرا کا قصہ وہاں کس شکل میں پہنچا۔''

اسی طرح کے خطوط خیال صاحب کے نام بھوپال سے 10 راگست 1976ء کو کوثر جہاں کوثر، حیدر آباد سے بانو طاہرہ سعید مُراد آباد یوپی سے غزالہ صباء نے بھی تحریر کئے ہیں۔نیز جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر عنوان چشتی نے بھی خیال کے نام ایسے ہی مکتوبات تحریر کئے ہیں۔

غزالہ صبا اپنے خط میں رقم طراز ہیں۔

پچھلے دِنوں ''اقبال'' کا خصوصی شمارہ ہفت روزہ ادبی ایڈیشن نظر سے گزرا جو بہت پسند آیا ......نِگارشات قابل ستائش ہیں۔کتابت اور طباعت بے مثال ہے۔مضامین کو آپ نے جس سلیقے اور حسن خوبی سے ترتیب دیا ہے، یہ آپ کے اعلیٰ ذوق اور آپ کے فن کی معراج ہے۔اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے اِن ہنگامی حالات کے پیش نظر جس قدر کامیابی کے ساتھ اِن مشکل ترین مرحلوں کو عبور کیا ہے، یہ آپ کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں''۔

ڈاکٹر عنوان چشتی اپنے مکتوب میں خیال صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ممنون ہوں کہ آپ ازراہِ کرم اپنا ہفتہ وار ایڈیشن پابندی سے بھجواتے ہیں۔اس سے ایک

تو کشمیر کی سیاسی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ دوسرے اِس میں شعروفن کا وافر سرمایہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بجا ہیں مگر مجھے آپ کے سلسلے میں دو باتوں کا خاص طور پر اعتراف کرنا ہے۔ ایک تو آپ کی بے لاگ سیاسی تحریروں کا اور دوسرے آپ کی علمی خدمات کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں میں مقبولیت کا۔ مصنف، ناشر اور قاری کے مثلث میں ہر زاویہ اپنی جگہ اہم ہے مگر مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے ملک کے اچھے فن کاروں کا دِل موہ لیا ہے.................."

خیالؔ صاحب کے ممبئی کے کئی فلمسازوں سے بھی گہرے مراسم رہے ہیں۔ اِن میں دیو آنند، بلراج ساہنی، راج کپور، علی محمد طارق، رامانند ساگر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اِس بات کا ثبوت وہ ڈھیر سارے مکتوبات ہیں جو اِن ہندوستانی فلموں کے مایہ ناز اداکاروں اور ہدایت کاروں نے آپ کے نام تحریر کئے ہیں۔ اِن خطوط میں آنجہانی بلراج ساہنی کا وہ خط بھی شامل ہے جو آپ نے خیال صاحب کے نام جوہو بمبئی سے 17/اپریل 1964ء کو تحریر کیا ہے۔ اِس خط میں شاعر کشمیر مہجورؔ کی شاعری کے حوالے سے ایک دلچسپ اور تاریخی حقیقت کا تذکرہ درج ہے۔

"مجھے آپ کا خط پاکر بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے اس بات کی بھی مسرت ہوگی اگر آپ مہجورؔ پر میرے انگریزی مضمون کا ترجمہ کر کے اسے اپنے ہفت روزہ "وطن" میں شائع کریں گے۔

آپ کو اس بات سے دلچسپی ہوگی کہ مرحوم غلام احمد مہجورؔ کے ساتھ میری دوستی 1934ء سے شروع ہوئی جب میں کالج سے فارغ ہوا تھا۔ جب میں نے مذکورہ مضمون سہ ماہی "وشوا بھارتی" رسالے کو بھیج دیا تو گورو دیو ٹیگور کو پہلے پہل یقین نہیں آیا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ صحیح ہے۔ میں نے اس مقالے کی صحت کے بارے میں پوری یقین دہانی کرادی جب ہی اسے شائع کیا گیا۔ میں نے ٹیگور کو مہجورؔ کا ایڈریس بھی دے دیا اور اس سے ان دونوں کے درمیان ایک حیات بخش خط وکتابت کا آغاز ہوا۔ لیکن میں اس وقت بمبئی سے لندن چلا گیا تھا جہاں میں جنگ عظیم کے دوران بی بی سی کے لئے کام کرتا رہا۔"

راج کپور نے بھی خیالؔ صاحب کے نام اس نے ایک خط میں اخبار ''وطن'' کے حوالے سے توصیفی کلمات تحریر کئے ہیں ۔ 14 / جولائی 1966ء میں لکھے گئے آپ اپنے اس خط میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''کشمیری عوام نے دنیا پر یہ ثابت کردیا ہے کہ تشدد کی شدید آندھیوں میں بھی جمہوریت کے چراغ کو بجھایا نہیں جاسکتا۔ اُنھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی خوبصورت سرزمین سے طاقت اور اتفاق کے ساتھ نفرت کے عفریتوں کو نکال باہر پھینکتے رہے ہیں۔''

خیالؔ صاحب ریاست جموں و کشمیر کے ایک با صلاحیت، ہونہار اور منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ آپ کی اِدارت میں جہاں کئی اخبارات اور جرائد چھ دہائیوں سے شائع ہوتے رہے ہیں وہاں آپ کئی بیرون ملک کے نشریاتی اِداروں کے لئے بھی اپنی صحافتی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ آپ کئی ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور جرائد سے بھی وابستہ رہے ہیں اور اپنی صحافتی خدمات کا لوہا منوا چکے ہیں۔ مقامی طور پر بھی آپ نے اپنی اِدارت میں اردو اور انگریزی کے کئی اخبارات اور جرائد شائع کئے ہیں جن میں وطن، اقبال اور وائس آف کشمیر جیسے اخبارات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اِن اخبارات میں آپ کی صحافتی بالیدگی کو ملکی اور غیر ملکی سطح پر کافی سراہا گیا ہے۔ بے شمار مصروفیات کے باوجود آپ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ہم پیشہ اور ہم عصر دوستوں کے ساتھ قابلِ رشک مراسم قائم رکھنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ آپ کو اپنی صحافتی زندگی کے دوران جن ملکی اور غیر ملکی شخصیات کے ساتھ ذاتی مراسم رہے ہیں وہ سب آپ کی صحافتی قابلیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے آپ کے نام تحریر کئے گئے خطوط میں آپ کی اعلیٰ صحافتی قدروں کی بے پناہ پذیرائی کی ہے۔ آپ کے نام جن ملکی اور غیر ملکی صحافیوں نے گزشتہ چھ دہائیوں کے دوران خطوط لکھے ہیں اُن میں ہفت روزہ کشمیر ڈلہوزی روڈ، راولپنڈی کے تحسین جعفری، راولپنڈی سے ہی غلام رسول طاؤس بانہالی، پرانا قلعہ راولپنڈی سے میر غلام احمد کشفی، پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے سابق وزیر قانون ڈاکٹر سلام الدین

نیاز، بی ٹی روڈ، لکھڑ ضلع گوجروال پاکستان سے شمس کاشمیری، فیض آباد راولپنڈی سے ایڈیٹر کشمیر خواجہ عبدالصمد وانی، لاہور پاکستان سے احمد ندیم قاسمی اور پرانا قلعہ راولپنڈی پاکستان سے مسعود احمد تبسم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن اصحاب میں سے اکثر دوستوں نے خیالؔ صاحب کے نام ڈھیر سارے طویل خطوط لکھے ہیں جن میں اُن کا خیالؔ صاحب کے تئیں بے پناہ مخلصانہ برتاؤ ایک ایک لفظ سے جھلکتا ہے۔

مسعود احمد تبسم 15 ر دسمبر 1964ء کو راولپنڈی سے خیالؔ صاحب کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''آپ کے کلام کے دونوں مجموعے پڑھ کر نہ صرف میں آپ کے فکر وفن کی بلندی کا قائل ہوا بلکہ کشمیری زبان جو مدتوں سے بے کسی کا لبادہ اوڑھے ہے، آپ کی ان لاثانی کاوشوں سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شامل ہونے کے قابل ہو لائق ہے۔ آپ کا اسلوب نگارش، واردات اور کیفیات قلبی کا آئینہ دار ہے۔ شاعری کو آپ نے زلف ورخسار کا چکر نہیں بلکہ انسانی جذبات، احساسات اور آرزوؤں کے اِظہار کا خوبصورت ذریعہ بنایا ہے۔''

خواجہ عبدالصمد وانی ایڈیٹر ''کشمیر'' فیض آباد راولپنڈی سے اپنے خط میں خیالؔ صاحب کو لکھتے ہیں:۔

''نوائے وقت'' اور ''نیشن'' میں آپ کی رپورٹیں اور خبریں دیکھتا ہوں۔ اس شاندار رپورٹنگ کے لئے مبارک باد قبول کریں۔ بلاشبہ آپ ایک تجربہ کار، باصلاحیت اور پیشہ ور صحافی ہیں۔ مجید نظامی صاحب (ایڈیٹر نوائے وقت) اور عارف نظامی صاحب (ایڈیٹر نیشن) سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے اور آپ کا ذکر خیر بھی آتا ہے۔ دونوں آپ کے کام سے مطمئن اور خوش ہیں۔ آپ کی خبروں سے ان دونوں اخبارات کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کا انہیں احساس ہے۔''

خیالؔ صاحب کے نام جو بے شمار خطوط ملکی اور غیر ملکی سر برآوردہ شخصیات نے تحریر کئے ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ بے پناہ اُنسیت اور محبت رکھتے

ہیں اور اُنہیں متواتر مکتوبات لکھنے کے عادی ہیں۔ جن اصحاب نے گزشتہ چھ دہائیوں سے خیالؔ صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں اُن میں خیالؔ صاحب کے تئیں اُن کی والہانہ عقیدت اور زِندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی جھلک بہت ہی نمایاں ہے۔

............●●● ....

............●●●............

● ...... محی الدین زور کشمیری

غلام نبی خیالؔ بحیثیت محقق

''اظہارِ خیال کی روشنی میں''

غلام نبی خیالؔ کے اَدبی سفر کا آغاز 1951ء میں نوعمری سے ہی شروع ہوا، جب ان کی پہلی تصنیف 1959ء (لولُک پرتو، کشمیری شعری مجموعہ) میں منظر عام پر آ گئی۔ تب سے لے کر آج تک یکے بعد دیگرے ان کے متعدد انگریزی، اُردو، کشمیری مضامین کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیق، ترجمہ وتالیف کردہ تیس (30) کتابیں (نظم ونثر میں) انگریزی، اُردو اور کشمیری میں منصۂ شہود پر آ کر دادو تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ خیالؔ صاحب کی تحقیقی کاوشوں کے نمونے ان کی کتابوں میں اکثر وبیشتر ملتے ہیں۔ یہاں پر میں صرف ''اِظہار خیال'' کی روشنی میں خیالؔ صاحب کی تحقیق نگاری کے چند پہلو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

غلام نبی خیالؔ نے ''اِظہار خیال'' میں شامل مختلف ادب پاروں میں زیادہ تر اُن عناصر کی چھان پھٹک کی جن میں ''کشمیریت'' جھلکتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم انہیں اپنے نظریۓ کے تحت تمدّنی محقق کہہ سکتے ہیں۔

سرزمینِ کشمیر سے تعلق رکھنے والے شعرا وادباء کے تئیں فاضل مصنف کا جذبہ والہانہ ہے، اس لئے انھوں نے ان پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اگر اس ریاست سے باہر کے کسی شاعر نے کشمیر کے تئیں کچھ لکھا یا ہمارے کسی شاعر نے دنیا کے کسی بڑے مفکر کی کسی قسم کی تقلید کی ہے، خیالؔ صاحب ان عناصر کی نشاندہی اپنے تنقیدی وتحقیقی مضامین میں ضرور کرتے ہیں۔ یعنی وہ ان عناصر کو

نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، جن کی بدولت ایسی تخلیق وجود میں آئی۔ اس سلسلے کے تحت عبدالسمیع پال، آثر صہبائی کے متعلق ان کا مضمون زیر بحث کتاب میں شامل ہے۔ آثر کشمیری تھے، مگر ان کی پیدائش سیالکوٹ میں ہوئی۔ پھر بھی ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سرکاری نوکری کی حیثیت سے مادر وطن میں گزرا۔ خیاؔل صاحب نے ان کی اُس شاعری کا جائزہ لیا ہے جو آثر نے کشمیر کے تئیں لکھی ہے۔ ہندوپاک کی ادبی تاریخ میں ایسے بھی بہت سے اشخاص ہیں جنھوں نے یہاں کے فلک بوس برف سے ڈھکے پہاڑوں اور سبزہ زاروں اور وادیوں اور آبشاروں سے متاثر ہوکر شاعری کے بیش بہا نمونے تخلیق کیئے۔

تاریخ ادبیاتِ کشمیر میں عبدالاحد آزاد ایک اہم نام ہے، جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق بھی تھے اور اُس زمانے میں اُنہوں نے ''کشمیری زبان اور شاعری'' ترتیب دی، جس وقت یہاں شخصی راج کے خلاف سیاسی جنگ لڑی جارہی تھی۔ یہاں آمدورفت کے وسائل بہت ہی محدود تھے۔ تحقیق کے لیے مواد بھی مطلوبہ مقدار میں دستیاب نہ تھا۔ ان کے متعلق ایک مضمون میں خیاؔل صاحب نے ان کی انقلابی شاعری پر روشنی ڈالی ہے، جس میں انھوں نے آزاؔد کے دور کے بین الاقوامی، ملکی وریاستی سیاسی کوائف بھی بیان کیے ہیں، جن کی وجہ سے آزاؔد نے اس نوعیت کی شاعری کی۔ خیاؔل صاحب لکھتے ہیں:

''آزاؔد نے اس تقسیم کو انسانی اقدار اور بقاء کے لیے ایک کاری ضرب تصور کرلیا۔ چنانچہ اس نے ان خیالات کا اظہار کئی مواقع پر کیا ہے، جن کی رُو سے وہ فرقہ وارانہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی اس واقعہ کو یہ کہہ کر رد کرلیتا ہے کہ ''انسان ایک ہے، دنیا ایک ہے، جس طرح گوشت ناخن کے ساتھ پیوست ہے۔''

چونکہ شاعری کے ساتھ ساتھ آزاؔد کا دوسرا اہم کارنامہ اُن کی تحقیقی کتاب ''کشمیری زبان اور شاعری'' (تین جلدیں) بھی ہے۔ اس کا تجزیاتی مطالعہ خیاؔل صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب پر اب تک اُردو اور کشمیری میں بہت سے مضامین ومقالے لکھے گئے۔

سعادت حسن منٹو اُردو فکشن میں ایک جانا پہچانا نام ہے اور فخر کی بات یہ ہے کہ اس کا رشتہ بھی کشمیر سے تھا۔ ان کا ہم عصر کرشن چندر ان کے بارے میں لکھتا ہے:

''منٹو جواہر لعل اور اقباؔل کی طرح کشمیری پنڈت ہے''

یہاں خیال صاحب نے مہجؔور، منٹو اور بلراج ساہنی پر ایک تحقیقی مقالہ شامل کتاب کیا ہے۔ جس سے اب تک بعض کشمیری محققین کی پیدا کردہ کئی غلط بیانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً منٹو نے شاعر کشمیر مہجؔور پر پاکستان کے ہفت روزہ ''نصرت'' میں جو مضمون شائع کیا ہے اُس میں انھوں نے مہجؔور کی جن نظموں کا حوالہ دیا ہے وہ نظمیں دراصل مہجؔور کی نہیں ہیں۔ البتہ کسی کشمیری نصیر انور نے انہیں اُردو میں نثری روپ دے کر مہجؔور کو وقار بخشنے کے لیے پیش کیا تھا۔ اسی طرح دوسرے اہم واقعے کے بھی ٹھوس ثبوت فراہم کر کے یہ گرہ کشائی کی گئی ہے کہ مہجؔور پر بلراج ساہنی نے بڑی عرق ریزی سے جو فلم بنائی اُس کے ساتھ پھر کیا ہوا اور ساہنی کا کشمیر کے تیئں جذبہ کیا تھا، اس کے بارے میں ساہنی کے جو خطوط مقالے میں شامل کیے گئے ہیں وہ قابل غور ہیں اور کئی کھوکھلے دعوؤں کی قلعی کھل جاتی ہے۔

نوبل انعام یافتہ شاعر وادیب گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور 1915ء میں جگدیش چندر چٹر جی کی دعوت پر کشمیر آئے۔ اپنے قیام اور سیاحتِ کشمیر کے دوران ان کا پروگرام یہاں کیا کیا رہا، اس سارے پروگرام کی جانکاری بھی اس کتاب کے ایک مضمون ''رابندر ناتھ ٹیگور اور کشمیر'' میں فراہم کی گئی ہے اور ساتھ ہی دوران سیاحت کشمیر میں جو نظم ''مانسی'' عنوان کے تحت ٹیگور نے لکھی ہے اُس کے چند اہم حصے بھی آزاد ترجمے کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔

آج اس صبح کی فضا میں اس گلستان کے اندر
شبنم کے قطرے دریا کے کنارے بیدزاروں کو
ہلکی ہلکی دھوپ میں ہلا دیتے اور روشن کرتے ہیں
پھر یہ درخت ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں
اور شاعر کے دل میں ایک ہجوم بن کر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں

یہاں سے جانے کے بعد ٹیگور نے 1916ء میں ''بلاکا'' عنوان کے تحت شعری مجموعہ شائع کیا اور اس میں اُنھوں نے وہ نظمیں بھی شائع کیں جو کشمیر سے متعلق رقم کی تھیں۔

خیاؔل صاحب کلاسیکی اور جدید ادب پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ تخلیقی قوت بھی خدا نے انھیں قابلِ رشک بخشی ہے اور تحقیق وتنقید کے فن میں بھی اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ''اظہارِ خیال'' کے

مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خیالؔ صاحب نے جگہ جگہ حواشی و حوالوں اور اشاریوں کے ساتھ ساتھ تفصیلات سے بھی کام لے لیا ہے جو اُن کے اچھے خاصے تنقیدی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ خیالؔ صاحب کا ہر مضمون اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بالکل نئی نئی باتوں کا پتہ دیتا ہے اور اسی وجہ سے نوجوانوں کے لیے اُن کے مضامین بڑی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ البتہ سابق بیانات جو خیالؔ صاحب کی نئی دریافت کی وجہ سے رد ہوتے جاتے ہیں، تو ایسے بیانات کچھ لوگوں کے لیے تضاد بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں دنیائے ادب میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

خیالؔ صاحب کی انفرادیت یہ ہے کہ اُنھوں نے کشمیری ادب میں مغربی و مشرقی ادبیات سے استفادہ کرنے کو فروغ دے دیا ہے اور تنقید میں نئے پیمانے استعمال کرنے اور نئے نتائج اخذ کرنے کا تقاضا کیا۔ انھوں نے اپنے تنقیدی اور تحقیقی مضامین میں کشمیری کلچر، ثقافت وغیرہ کو فکری اساس کے طور پر استعمال کیا ہے اور کشمیری زبان وادب کی تنقید کو اس آزادی کے ساتھ برتا ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر ان کے ہاں تنقید محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مقصد بھی بن جاتی ہے، جس مقصد کے تحت وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ادب کا ایک اچھا خاصا معیار ہو اور ہم یورپی ادبیات کو اپنے قالب میں ڈھالیں تاکہ ہمارا ادبی ورثہ Non Kashmiri Readers تک پہنچ جائے۔ انھوں نے یورپی ادب پر کشمیری میں مضامین لکھے۔ یونان کے کلاسک ڈرامے میڈیا کو کشمیری میں منتقل کیا اور کشمیری ادبیات کا اُردو اور انگریزی میں ایک تو ترجمہ کیا اور ان زبانوں میں کشمیری ادب پر بہت سے مضامین بھی رقم کیے ہیں۔ وہ تمام مشرقی و مغربی ادب کی تحریکات اور ادبی کاوشوں سے باخبر ہیں، اسی لئے اُن کی فکر میں ادبی صورتحال کا جائزہ لینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے وہ تنگ حلقوں کو توڑ کر وسیع تر پیمانے پر ادب کو پرکھنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ ایک قاری خیالؔ صاحب کے مضامین پڑھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف کئی اُلجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے جس کے لئے وہ تن من اور دھن سے لگاتار اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہاں کے نوجوان ادیبوں کی نئی پود کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتے جاتے ہیں۔

............●●● ....

● ...... رشید کانسپوری

کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک
اور
غلام نبی خیالؔ

غلام نبی خیالؔ جموں وکشمیر ریاست کے قدآور اور کہنہ مشق شاعر، ادیب، محقق اور صحافی ہیں۔
انہوں نے اردو، انگریزی اور کشمیری زبانوں میں دو درجن کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں۔ان ہی
کتابوں میں ایک تصنیف انگریزی میں Progressive Literary Movement in Kashmir
ہے۔310 صفحات پر مشتمل زیرنظر کتاب خیالؔ صاحب نے 2011ء میں شائع کی اور کتاب میں کل
دس مضامین درج ہیں۔

کتاب متذکرہ ساہتیہ اکادمی نئی دلی کی Writers in Residence سکیم کے تحت لکھی گئی۔
پروجیکٹ ھٰذا ساہتیہ اکادمی کی جانب سے تفویض ہونے کے بارے میں خیالؔ صاحب لکھتے ہیں۔

> "When the Akademi approached me in this regard and offered me a project, I felt too glad to accept the proposal and made a choice of mine to I compile a book on Progressive Literatary Movement in Kashmir.The movement which proved a mile stone for our modern literature covering more than half a century.

زیرتبصرہ کتاب کا انتساب یوں تحریر کیا گیا۔

> " I dedicate this book to all those comrades and torch bearers of Progressive Literary Movement in Kashmir who brought about an epoch making change in our literary world but are no more with us today."

کتاب میں درج پہلا مضمون مارکسزم کی پیدائش اور اسکا پھیلاؤ یعنی یہ تحریک کیسے وجود میں آئی اور اس تحریک کے مقاصد اور یہ تحریک ایشیا اور یورپ تک کیوں اور کیسی پھیلی۔ چنانچہ اس تحریک کی پیدائش کے بارے میں خیالؔ رقمطراز ہیں:

The philosophy of marxism was propounded by an economist philosopher of Jewish origin, Karl Marx , during nineteenth century when the over whelming majority of people in Asia, Europe and Africa had been facing all sorts of miseries perptrated against them by the Fascist and Imperialist forces in most parts of the Western, Eastern and African world.

اس طرح خیالؔ صاحب نے کھلے ذہن سے مارکسی تحریک پر روشنی ڈالی اور تمام بلند پایۂ اردو و کشمیری شعراء کے اشعار بطور مثال و نمونہ پیش کیے۔

کتاب میں درج دوسرا مضمون India's War of Independence and Kashmiri Poetry یعنی ہندوستان کی جنگ آزادی اور کشمیری شاعری۔ اس مضمون میں خیالؔ صاحب نے جنگِ آزادی شروع ہونے کی وجوہات و محرکات پر بات کی ہے اور لکھا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل جب ہندوستان میں جنگِ آزادی شروع ہوئی تو اس وقت کشمیر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر موجود تھا۔ 1857ء سے جب آزادی کی تحریک ہندوستان میں شروع ہوئی تب سے 1947ء تک کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ اس مضمون میں تحریر کیے گئے ہیں۔ جہاں خیالؔ صاحب نے ہندوستان اور کشمیر کی صورت حال کی بات کی ہے وہیں یہاں کے شعراً کا ردِ عمل اور ان کے احساسات، جذبات و محسوسات بھی درج کیے ہیں۔

کتاب میں تیسرا مضمون Kashmiri Language and Literature یعنی کشمیری زبان اور ادب ہے۔

اس موضوع پر سر جارج ابراہم گریرسن (1941-1851) سے لے کر سال 2010ء تک کشمیری زبان و ادب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ سیاسی صورتِ حال اور

کشمیری ادب کی ترقی اور اس میں شعرأ کے ذریعے کئے گئے نئے نئے تجربات پر بات کی گئی ہے۔اسی طرح خیاؔل صاحب نے صوفی شاعروں کی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے اور شعرأ کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

خیاؔل صاحب نے زیر نظر کتاب میں چند اردو اور کشمیری شعرأ کی فہرست معہ تصویروں (فوٹو) کے بھی پیش کی ہے جن کی شاعری پر براہ راست ترقی پسند تحریک کا اثرات نمایاں ہے۔اِن میں فیض احمد فیض، ملک راج آنند، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، غلام ربانی تاباں، سعادت حسن منٹو، مجروحؔ سلطانپوری، اسرار الحق مجازؔ، مخدومؔ محی الدین، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، حبیب جالبؔ، ظہیر کشمیری، احمد فرازؔ، علی سردارؔ جعفری، محمد دین تاثیر، اخترؔ الایمان وغیرہ جبکہ کشمیری شعرأ وادباء میں مرزا عارف، غلام احمد مہجور، رحمٰن راہیؔ، عبدالاحد آزادؔ، نور محمد روشؔن، عبدالستار عاصیؔ، دینا ناتھ نادمؔ، تاج بیگم ریزو، حبیب کامران، علی محمد لون، سومناتھ زتشیؔ، غلام نبی عارضؔ، پران کشور، عزیز ہارون، اوتار کرشن رہبر، ٹی این درکندن، غلام رسول سنتوشؔ، امین کاملؔ، اختر محی الدین، مظفر عازم، بنسی نردوش ،ارجن دیو مجبورؔ، عبدالستار رنجور، چمن لال چمن، مکھن لال بے کس، غلام نبی فراق وغیرہ شامل ہیں۔

زیر بحث کتاب میں ایک اہم ہی تخلیقی مضمون Influence of Urdu Progressive Literature on Kashmiri، کشمیری ادب پر اردو ادب کے اثرات ۔ یہ مضمون بہت ہی تحقیقی اور معلوماتی ہے۔خیاؔل صاحب نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ زیر نظر مضمون تحریر کیا ہے۔ مضمون ھٰذا لکھتے وقت خیاؔل صاحب کو درجنوں کتابوں اور اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرنا پڑا ہے جو ایک صبر آزما کام ہے۔

Influence of Soviet Literature on Kashmiri، کشمیری ادب پر سوویت ادب کا اثر

Translation of Progressive and Patriotic Poetry by Some Kashmiri Poets. اور The Present Status of Progressive Writing ہر سہ مضامین تحقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہیں اور تراجم بھی دلچسپ اور عام فہم ہیں۔

آخر پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زیر تبصرہ کتاب نہایت معلوماتی اور تحقیقی ہے۔ کتاب متذکرہ

بطور Reference Book بھی پیش کی سکتی ہے اور ایک دستاویز کے طور پر ادیبوں اور ادب نوازوں کے لئے محفوظ ہوگی۔

کتاب چوں کہ انگریزی میں لکھی گئی ہے لہٰذا اس کا مطالعہ ریاست سے باہر بلکہ پوری دنیا میں کیا جائے گا اور تمام دنیا میں کشمیری ادب کی موجودہ صورتحال متعارف ہوگی۔

............●●● ....

● ...... شفقؔ سوپوری

نذرِ غلام نبی خیالؔ

پیکر اُنس و محبت ہے خیالؔ
شانِ ایثار و مرّوت ہے خیالؔ

ہاتھ میں پرچمِ عرفاں لئے
جہل سے محو بغاوت ہے خیالؔ

قلم اس کا ہے تمدّن کا چراغ
مشعلِ اہلِ ثقافت ہے خیالؔ

لفظ و پیکر کے جواہر میں جڑے
فکر پاروں کی نفاست ہے خیالؔ

نظر آتی ہے اندھیروں میں کرن
تابِ شمشیرِ صحافت ہے خیالؔ

اہلِ کشمیر کے حق میں اے شفقؔ
باعثِ عزّ و سعادت ہے خیالؔ

............●●●............

● ...... جتندر اُدھم پوری

ایک نظم غلام نبی خیالؔ کے نام!

زبانِ اردو پر جس کو گرفت ہے حاصل
وہ اہلِ علم و ہنر و صاحبِ اقبال
نہیں ہے شک کہ وہ لفظوں کا جادوگر ٹھہرا
تمام زندگی گزری ادب کی خدمت میں
ہے اس کی زندگی اخلاقی قدروں کا مرکز
اضافہ اس نے کیا ہے ادب کی عظمت میں
ہمیشہ ساتھ ہیں اس کے قلم بھی، کاغذ بھی
کہ جیسے روح کا ہے گہرا رشتہ جسم کے ساتھ
ہر ایک لمحہ ہے مصروف ادب کی خدمت میں
ہے ایک عمر سے ٹھہرا یہ رشتہ جسم کے ساتھ
بیان سے ہے پرے اس میں جو بھی ہے خوبی
ہے اس کی زندگی شعر و سخن سے وابستہ
میں اس سے بڑھ کے یہاں اور کیا کروں تفسیر
کہ جیسے باغباں ہو اِک چمن سے وابستہ
بھرے ہیں اس کے دل میں کیا وفا اور خلوص

مہیب اندھیروں میں جیسے کوئی چراغ جلے
بغیر جس کے نہیں زندگی ممکن
جو زندگی کی ہے بنیاد غم وہ دل میں ملے
بڑی مثال ہے بے لوث دوستی اس کی
کہ اس کی زندگی ہے وقف دوسروں کے لئے
کٹی ہے زندگی اس کی فقیر کی صورت
کہ اس نے زخم ہمیشہ ہیں دوسروں کے سیئے
ہیں اس میں خوبیاں جو بھی بیاں ہوں کیوں کر
کہ سر بہ سر وہ خلوص و وفا کا پیکر ہے
مثال کوئی نہیں ملتی جس کی دنیا میں
کریں مقابلہ کیا اس کا، سب سے بہتر ہے
جو بات بھی کرے وہ حق پہ ہوتی ہے مبنی
ہر ایک سے ہے الگ اس کی خوبئ کردار
ہے اس کے دل میں محبت جو سب کو حاصل ہے
رہیں گے عمر بھر زندہ جو کام اس نے کیئے
جو دوسروں کے دلوں سے مٹائے ہر غم کو
یہی دعا ہے میری ہر خوشی ہو اس کو نصیب
ہر ایک حال میں ہر غم زدہ کے کام آئے
جہان بھر میں ایسی زندگی ہوا اس کو نصیب

● ...... شفیق اعظمی جونپوری

رعنائی جمال

کشمیر کا فرزندِ ارجمند ہے خیالؔ
تقریر اس کی دلکش و تحریر بے مثال
اس کی غزل میں حافظِ شیراز کا سرور
اس کی نظم میں فیض کی رعنائی جمال
کشمیر اس کی جان ہے، کشمیر اس کا خواب
کشمیر جس کی روح آج بھی ہے پائمال
بتیس کتابوں کے مصنف کی بات ہے
اب بھی قلم ہے جوئے رواں کی حسیں مثال
محمودؔ کی مہجورؔ کی آوازِ بازگشت
وہ ایسا سخن ور ہے کہ ہے صاحب کمال
اللہ سے بس میری دعا ہے یہی شفیقؔ
دائم رہے کشمیر اور کشمیر کا خیالؔ

............●●● ....

● ...... عاقبؔ دلوی

نذرِ خیالؔ

کشمیر کا خیال ہے　　وہ وقت کا کمال ہے
وہ پیکرِ جمال ہے　　وہ وقت کا کمال ہے

غلامؔ ہے نبیؔ کا وہ　　حبیبؔ ہے سبھی کا وہ
یہ نام لازوال ہے　　وہ وقت کا کمال ہے

وہ ہر کسی کا مدح خواں　　ہمیشہ اُس کا پاسباں
خدائے ذوالجلال ہے　　وہ وقت کا کمال ہے

وہ شاعرِ جمیل ہے　　وہ ناقدِ عقیل ہے
ادب کی وہ مثال ہے　　وہ وقت کا کمال ہے

ہمیں خیامؔ دے گیا　　حسیں پیام دے گیا
یہ ایک نیک فال ہے　　وہ وقت کا کمال ہے

...........●●●...........

● ...... غلام نبی خیالؔ

سفرنامہ عراق

(یہ طویل سفرنامہ جس کا صرف خلاصہ یہاں نذرِ قارئین کیا جارہا ہے، اُردو روزنامہ ''اقبال'' سری نگر میں 9/جنوری 1980ء سے لے کر 16/اپریل 1980ء تک 44 اقساط میں شائع ہو چکا ہے۔ادارہ)

زیارت

سرزمینِ عراق کا میرا دورہ ہندوستان سے باہر کسی ملک کا میرا اوّلین سفر تھا۔ جولائی 1979ء میں جب مجھے بغداد جانے کا دعوت نامہ موصول ہوا تو دریائے دجلہ کے کنارے آباد اس تاریخی، افسانوی اور رومانوی شہر کا تصوّر ایک شاعرانہ تخیل کی جلوہ افروزی کے سامان لئے میرے دل و دماغ میں جاگزیں ہوا۔ یہ ایک ایسا رنگین خیال تھا جس کی پیکر تراشی میں ہزاروں سال کی حکایات، روحانیت، مذہب اور انقلابات کے گونا گوں رنگوں کی آمیزش تھی۔

بابل کے باغاتِ مغلقہ، بصرہ کے سندباد، بغداد کے الف لیلوی فسون اور نجفِ اشرف کے مقام اقدس سے کاروانِ خیال گزرا تو کہا یک میری نگاہوں کے سامنے لہریں مارتا ہوا رواں دواں دریائے فرات آگیا۔ جس کے کنارے میدان کربلا میں شہیدِ اعظمؓ نے تشنہ لبی اور بے سروسامانی کے عالمِ کرب و بلا میں رضائے حق کی خاطر عظیم ترین قربانی دے کر ایمان اور انسانیت کی پیاسی دنیا کو اپنے خون سے سیراب کیا تھا۔

تصورات کا دھارا دجلہ وفرات کی ان تھک روانی کے ساتھ بہتا گیا اور دنیائے عرب کی

زرّیں تاریخ اوراسلام کے روشن ابواب نگاہوں کے سامنے وا ہوتے گئے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے بندوں نے یہیں پر اپنی آواز کو بغداد، کوفہ، کربلا اور نجف کے گلی کوچوں میں اس ایمان افروزی اور صداقت شعاری کے ساتھ بلند کیا تھا کہ عراق کے ہر شہر اور قصبے میں موجود قدیم مساجد کے آثار اور مقدس روضوں اور خانقاہوں کے خاموش مگر بلند بالا مینار آج بھی بزبانِ حال اس صدائے حق کا پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے 24 رمئی 1932ء کو بغداد میں اپنے قیام کے دوران ایک نظم کہی تھی:

رات بیت چکی ہے
دن کے اس کونے میں چراغ کی لو گل کردو!
جو دھواں دھار ہو چکا ہے
کیونکہ ہر ایک کی خاطر ایک شاندار صبح
مشرق سے طلوع ہو رہی ہے
اس کا نور ہمیں ایک دوسرے سے آشنا کرے
ہم جو زیارت کے ایک راستے پر گامزن ہیں! (1)

اور میں بھی ایک زیارت کی طرف چل پڑا۔ بابل، بغداد اور نجف کی زیارت۔ الف لیلہ کے اوراق میں پوشیدہ حکایات، حقائق کی تلاش اور میدان کربلا کی تپتی ہوئی مٹی پر بارگارہ خداوندی میں سجدہ ریز ہونے کی آرزو۔ حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی درگاہوں پر دنیائے عرب کے اتحاد اور اسلام کی سربلندی کے لئے دست بدعا ہونے کی تمنا اور جدید عراق کے انقلابی کار ناموں سے آگاہی حاصل کرنے کا شوق۔

45 ہزار فٹ کی بلندی پر

جمعرات 12 رجولائی کو نئی دہلی کے پالم ہوائی اڈے سے نصف شب کے قریب عراقی ایر ویز کا ہرے رنگ میں رنگا ہوا جمبو جٹ دوبئی کے راستے بغداد کی جانب پرواز کے لئے پر تول رہا تھا کہ کسی نامعلوم خطرے کی اطلاع پا کر ڈھائی سو کے قریب مسافروں کے سامان کی دوبارہ جانچ اور شناخت

کروائی گئی جس سے جہاز کی روانگی میں پورے ایک گھنٹہ کی تاخیر ہوئی۔ اس ہنگامے میں ائیر انڈیا سے وابستہ ہندوستانی ملازموں نے مسافروں کے سامان سے بھرے اٹیچی کیسوں، تھیلیوں اور دیگر اشیا کو اس بے دردی سے ادھر ادھر پھینکا کہ کئی لوگوں کی احتجاجی چیخ و پکار ان کے لئے لوری بن گئی یہ "انسان نواز" کام انجام دے کر وہ اونگھتے اور لڑ کھڑاتے اپنی راہ چل دیئے لیکن ڈھائی سو لوگ بیک وقت خدا سے دعائیں مانگنے لگے کہ ان کی چیزیں صحیح سلامت منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ میری یہ دعا ائیر پورٹ کی فضاؤں میں ہی کہیں گم ہوگئی تھی کیوں کہ بعد میں معلوم ہوا کہ میری ایک اضافی عینک کا شیشہ چکنا چور ہو کے اٹیچی کیس کے کونے کونے میں بکھر چکا تھا۔

خدا خدا کر کے اگلے روز یعنی جمعہ کو علی الصباح ایک بج کر پانچ منٹ پر اڑان کا آغاز ہوا۔ مسافر اپنی نشستوں پر جم کے بیٹھ گئے۔ میں نے ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بھارتی ریلوے کے کسی سیکنڈ کلاس ڈبے میں جالندھر، امرتسر، جے پور یا پٹنہ کے آس پاس سفر کر رہا ہوں۔ جہاز کے گوشے گوشے میں چپلیں اور نائٹ سوٹ پہنے پنجابی سکھ، راجستھانی اور بہاری نوجوان شاید ان درہموں اور دیناروں کی کھنکھناہٹ کے تصور میں ڈوبے ہوئے تھے جن سے وہ دوبئ اور بغداد میں اپنی خالی جیبیں بھرنے جا رہے تھے۔ ہندوستان کے وہ نجار، گلکار، مزدور اور قلی تھے جو اپنے وشال ملک کی وسیع و عریض سرزمین میں بے کاری، بے روزگاری اور بھوک کے جہنم سے بھاگ کر عرب ریاستوں کی جنت کی طرف بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ یہ غریب اور نادار لوگ اپنی زندگی کے اس نئے اور انوکھے سفر کو اس قدر سرعت کے ساتھ طے کر کے اپنے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے بے قرار تھے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر کے دل 45 ہزار فٹ کی بلندی پر نو سو نوے کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے والے اس طیارے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دھڑک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بدلتے ہوئے تاثرات اس بات کی بھی گواہی دے رہے تھے کہ جمبو جٹ کی نفاست اور شان اور جوان و حسین عراقی ائیر ہوسٹسوں کی شان دلربائی انہیں مرعوب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے احساسِ کمتری میں مبتلا دل و دماغ پر چرکے بھی لگا رہی ہے۔

اب جہاز رات کی تاریکیوں میں دور سے سنائی دینے والی ایک گھڑ گھڑاہٹ سے اپنے وجود

کا احساس دلاتے ہوئے نہ جانے کن وادیوں، کوہساروں اور گمنام مقامات کے اوپر سے گزر رہا تھا۔
میری پلکیں اس خمار آلود نیند کے بوجھ سے بھاری ہونے لگیں جو دن بھر کے تھکے ماندے کو رات کے
وقت کسی نوابی محل سے شبستان میں الف لیلوی موسیقی کے بعد نصیب ہو سکتی ہے۔ دو بجے کے
قریب لاؤڈ سپیکروں پر پہلے صاف ستھری عربی اور اس کے بعد کھردری انگریزی میں نشر ہونے والی
اس معمولی سی اطلاع نے میرے بے ربط خوابوں کا سلسلہ توڑ دیا کہ اس وقت جہاز کراچی پاکستان کے
اوپر سے پرواز کر رہا ہے۔

صبح کے چار بجے طیارہ دوبئی ہوائی اڈے کو چھو رہا تھا تو ہمیں متحدہ عرب امارات کے اس
مشہور شہر اور تجارتی مرکز کی قطار در قطار شاہراہوں کے دونوں طرف برقی قمقموں کی لاتعداد روشنیاں نظر
آئیں۔ ہوائی اڈہ قریب آیا تو گردو پیش کے تمام مناظر نئی روشنیوں کے نور میں نہا کر مہک اٹھے۔
اس روشنی کی چمک دمک ان مسافروں کے چہروں پر بھی رقص کرنے لگی جو امارات کے مختلف شہروں اور
قصبوں سے لاکھوں کما کر اپنی زندگی کو سنوارنے کی خاطر گھروں سے چل پڑے تھے۔

دوبئی کے ہوائی اڈے پر اترے تو اس قدر تیز لو نے ہمارا استقبال کیا گویا ہر طرف آتشیں
گولے پھٹ پھٹ کر ایک لاوے میں تبدیل ہو رہے ہوں اور یہ لاوا ہمارے وجود کے ہر حصے کو اپنی
لپیٹ میں لے رہا ہے۔ یہاں تقریباً آدھ گھنٹے تک ائیر کنڈیشنڈ اور شاندار ٹرانزٹ لانج میں ستانے کا
موقع مل گیا۔ لانج کے شاپنگ آرکیڈ میں نقرئی روشنیوں میں نہائی ہوئی دکانیں دنیا بھر کی جدید ترین اور
بہترین اشیا سے بھری ہوئی تھیں۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کر دہلی کے چاندنی چوک میں جو جاپانی
ٹرانسسٹر معہ ٹیپ ریکارڈر چار پانچ ہزار روپے میں ملتا ہے۔ اس کی قیمت یہاں کے ڈیوٹی فری شاپ
میں ایک سو ڈالر یعنی آٹھ سو روپے کے برابر ہے۔

طیارہ کی دوبارہ پرواز کے بعد جہاز کے عملے نے سکاچ وسکی اور امریکی سگریٹ بیچنا شروع
کئے۔ سکاچ کی ایک بوتل ساڑھے چار ڈالر یعنی 36 روپے میں فروخت کی جاری تھی اور اس کار خیر کی
بسم اللہ چند عرب مسافروں نے ہی دو چار بوتلوں کی خریداری سے کر لی۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی تو صبح کے سوا سات بج رہے تھے لیکن حیرانی اس بات کی تھی کہ باہر

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور مطلع کے کسی طرف روشنی کی پتلی سی لکیر بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہمارے اپنے حساب سے موسم گرما میں اس وقت سورج طلوع ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا ہوتا ہے۔ ساڑھے سات بجے جب ایک ائیر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ اب ہم لوگ بغداد کے ہوائی اڈے پر اتر رہے ہیں اور اس وقت عراق میں مقامی وقت کے مطابق صبح کے پانچ بجے ہیں تو مجھ پر روز روشن میں عالم تاریکی کا یہ راز کھل گیا۔ میں نے اپنی گھڑی ڈھائی گھنٹے پیچھے کر دی اور تھکاوٹ اور بے خوابی کی کوفت سے لڑ کھڑاتا ہوا طیارے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

بغداد کا یہ بین الاقوامی ہوائی اڈہ ایک بہترین ائیر پورٹ ہے جس کی ظاہری زیبائش اور تزئین کے ساتھ ساتھ اسے وسعت دینے اور دنیا کے بہترین عالمی ہوئی اڈوں میں ایک ممتاز حیثیت بخشنے کی خاطر اس کی ترقیاتی سکیموں پر سلسلۂ عمل روز و شب جاری ہے۔

عراق میں افرادی قوت کی کمی کی وجہ سے ائیر پورٹ پر چوں کہ کوئی قلی موجود نہیں تھا لہٰذا ہم نے اپنا سامان خود ہی ٹرالیوں میں لاد کر باہر تک پہنچایا جہاں عراقی وزارت اطلاعات رعدؔ نام کا عہدیدار ایک تختی ہاتھ میں تھامے ہمارا منتظر تھا۔ رعد نے صرف چند لمحوں میں تمام لوازمات طے کروا کے اُس شاندار سیاہ کار کی طرف ہماری رہنمائی کی جو ہمارے لئے آئی تھی اور پھر گاڑی ہوا سے باتیں کرتے ہوئے شہرِ بغداد کے مرکز کی طرف بھاگنے لگی۔

قدیم ترین انسانی تہذیب کا گہوارہ

بغداد کے عظیم الشان، قابل دید اور پرشکوہ عراقی میوزیم کے خوش پوش اور خوش گفتار گائیڈ نے منجھی ہوئی انگریزی میں مجھ سے کہا ''دنیا کا سب سے پہلا انسان یعنی حضرت آدم اسی سرزمین میں رہائش پذیر تھا اور بائبل میرے اس دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے۔'' اور جب میں نے بائبل کے اوراق کھولے تو وہاں عہد نامہ عتیق میں ''پیدائش'' کے باب دوم میں آٹھویں اور چودھویں آیات کے درمیان لکھا ہے:

''اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ عدن سے ایک دریا باغ کو سیراب کرنے نکلا اور وہاں سے چار ندیوں میں تقسیم ہوا......اور

تیسری ندی کا نام دجلہ ہے......اور چوتھی ندی کا نام فرات"۔(2)

سرزمین عراق میں بے نام زمانوں سے بہنے والے دو ہزار تین سو کلومیٹر لمبے دریائے دجلہ کے بیچ میں واقع جنوبی خطے کے بارے میں ہی روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہیں وہ باغِ عدن تھا جہاں آدم اور حوا رہتے تھے۔ بعد میں اس باغ سے ملحق علاقہ میسوپوٹامیہ (رافدین) کے نام سے موسوم ہوا جو یونانی زبان میں "دو دریاؤں کی درمیانی زمین" کے معنی رکھتا ہے۔

اس طرح عراق قدیم ترین زمانوں سے تہذیب کا وہ منبع رہا ہے جہاں سے شعور اور ثقافت کے سرچشمے پھوٹ کر انسانی سرشت کو سیراب کرتے رہے ہیں۔ التامیم کی محافظت میں پہاڑی سطح مرتفع پر پائے جانے والے پتھر کے زمانے کے ایک لاکھ سال پرانے آثار اس دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں۔

میسوپوٹامیہ میں اوّلین انسان نے پانی، شکار اور مچھلیوں کی بہتات کی بدولت سکونت اختیار کر لی۔ جس کے تہذیبی نشانات آج سے چھ ہزار سال قبل سومیری (Sumerians) لوگوں کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سومیریوں نے شہر آباد کئے جن میں واقع بلند ترین میناروں پر چڑھ کر ان کے مذہبی پیشوا سورج اور چاند تاروں کی گردش کا جائزہ لیتے تھے جس سے علمِ نجوم دنیا میں پہلی بار روشناس ہوا۔ ان کے دور میں نرم اور بھیگی مٹی پر بانس کے قلم سے لکھنے اور پہیے کے استعمال کی ترکیب کا آغاز ایک حیرت انگیز دریافت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ سومیری وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے خلیج عرب کے راستے ہندوستان آ کر تجارت کا سلسلہ قائم کیا۔ سومیریوں نے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کا فن بھی سیکھ لیا تھا اور ان کے مضامین میں نجوم، نقشہ نویسی، ریاضی اور علم الہندسہ شامل تھے۔

اس کے بعد عکاظی (Akkadians) 2371 قبل مسیح سے لے کر 2143 ق م تک اس علاقے کے شمال مغربی خطے میں آباد ہو گئے۔ جنہوں نے سومیریوں کے ساتھ کئی لڑائیوں میں اپنی برتری حاصل کر لی تھی۔ اس قوم کا زمانہ 2350 سے 2159 قبل مسیح تک بتایا جاتا ہے۔ اس زمانے کے ایک بادشاہ سارغون کے بارے میں حکایت ہے کہ وہ ایک کنواری عورت کے بطن سے پیدا ہوا جس نے اسے ایک برتن میں رکھ کر برتن کے ڈھکنے کو اپنی رال سے بند کیا۔ یہ برتن دریائے فرات میں ڈال

دیا گیا اور کھیتوں میں کام کرنے والے ایک شخص کے ہاتھوں لگ گیا۔ اس نے سارغون کو باغبانی کا کام سکھایا اور بعد میں یہی لاولد سارغون عشتار دیوی کی آشیرواد سے بادشاہ بن گیا۔(3)

بابلیوں (Babylonians) نے 1894 سے 1594 ق م یعنی تین سو سال تک حمورابی کی حکومت میں وادی دجلہ وفرات پر اپنا سیاسی اثر قائم کرلیا۔ حمورابی نے اپنی عظیم سلطنت میں سومیر، عکاظ، اسیریا اور شام کا ایک حصہ بھی شامل کرلیا اور شہر بابل کو اپنی فرمان روائی کی حدود یعنی بے بی لونیا (بابُل) کا پایۂ تخت بنایا۔

حمورابی دنیا کا پہلا قانون دان بادشاہ مانا جاتا ہے جس کے وضع کردہ قوانین کی نقل ایک خوبصورت ستون پر عراقی میوزیم میں آج بھی کندہ ہے۔

بابل والوں پر کاشاتیوں (Kassites) نے مشرقی پہاڑوں کی جانب سے حملہ کیا اور وہ 1680 سے 1175 قبل مسیح تک یعنی پورے پانچ سو برس کے لئے بابل پر قابض ہو گئے۔

میسوپوٹامیہ کا اسیریائی (Assyrian) دور (3000 ق م) اس خطے میں فن تعمیر اور زراعت کے فروغ کے لئے ایک اہم ترین ترقیاتی اور تہذیبی زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ ہیروڈوٹس نے اسیریا کو ''اناج پیدا کرنے والا دنیا کا امیر ترین ملک'' قرار دیا ہے۔(4)

بابل کی سلطنت کلدیانی (Chaldeans) شہزادہ بخت نصر دوم (Nebuchadmezzar) کے ہاتھوں پھر ایک نئی شان کے ساتھ قائم ہوئی۔ یہی وہ شہرہ آفاق بادشاہ ہے جس نے شہر بابل کو از سر نو تعمیر کرنے کے ساتھ ساتھ اُن باغات معلقہ کی تعمیر کی جو اس نے خوش گوار آب وہوا کی عادی اپنی ملکہ کے لئے بنائے تھے اور جن کا شمار زمانہ قدیم کے عجائبات میں ہوا کرتا تھا۔ بخت نصر نے شاندار عشتار دروازہ اور شاہراہ جلوس بھی بنوائی اور ان دونوں تاریخی تعمیروں کے در و دیوار رنگین اینٹوں پر کندہ کی ہوئی بیلوں، اژدہوں اور شیروں کی شبیہوں سے سجائے گئے۔ بخت نصر کے دور میں وہ فلک بوس مینار بابل پایۂ تکمیل کو پہنچتے پہنچتے رہ گیا جس کے بارے میں ''عہد نامہ قدیم'' میں درج ہے:

''اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں۔ سُو انہوں

نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک برج بنائیں جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے اور یہاں اپنا نام ثبت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں اور خداوند اس شہر اور برج کو جسے بنی آدم بنانے لگے، دیکھنے کو اترا اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو کچھ بھی جس کا وہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ سکیں۔ پس خداوند نے ان کو وہاں سے تمام روئے زمین میں پراگندہ کیا۔ سو، وہ اس شہر کو بنانے سے باز آئے۔ اس لئے اس کا نام بابل ہوا کیوں کہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا''۔(5)

539 قبل مسیح میں شاہ فارس کورش (Kursh) نے بابل پر قبضہ کر کے اس مثالی سلطنت کی آزادی ختم کر لی۔ اس کے بعد سکندر اعظم نے بھی اپنی ملک گیری کی مہم سر کرتے ہوئے بابُل کو اپنی یلغار سے زیر کر لیا جہاں بعد میں اس کی موت واقع ہوئی۔

بابل پر شاہ فارس کے حملے کے تقریباً بارہ سو سال بعد 637 عیسوی میں حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ نے عرب مسلمانوں کے لشکر جرار کو عراق میں داخل کر کے قادسیہ کے معرکے میں مُلک کو ساسانی راج سے نجات دلائی اور اس طرح سے مشرق وسطیٰ میں پہلی بار اسلامی دور کا سورج طلوع ہو۔(6)

بغداد

اردو کے ممتاز شاعر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ نے جب اپنے محبوب شہر لکھنؤ کے لئے کوئی خوبصورت ترین نام تلاش کیا تو اسے ''ہندوستان کا بغداد'' کہا۔

عرب کا مشہور و معروف شہر بغداد صدیوں سے اُن شاعروں، مصوروں، تاریخ دانوں اور سیاحوں کے پسندیدہ مقامات میں سر فہرست رہا ہے جو برصغیر ہند و پاک کے علاوہ ساری دنیا کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہوں نے عراق کے اس دار الخلافہ کے لئے مدینۃ السلام، دار السلام اور عروس البلاد جیسے القاب وضع کئے ہیں۔

بغداد کی تعمیری تاریخ جس قدر دلچسپ اور شاعرانہ ہے اس کی بربادی کی داستان بھی اتنی ہی افسوس ناک اور رنج دہ ہے۔

عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور نے اس دائرہ نما شہر کی تعمیر دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر 145ھ یعنی 762ء کے موسم بہار میں شروع کروائی۔ مشہور ادیب یاقوت نے بغداد کے بارے میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ شکل میں گول تھا۔ اس کی باہری دو فصیلوں میں مضبوط اور بڑی بڑی اینٹوں کی تہیں لگی ہوئی تھیں اور اس دیوار کی بلندی نوے فٹ تھی جو شہر کے مرکزی حصہ کے اردگرد تعمیر کی گئی تھی۔ ان دیواروں میں چار بلند صدر دروازے باب البصرہ، باب الکوفہ، باب الشام اور باب الخراسان کے نام سے مشہور تھے۔

شہر بغداد کی تکمیل پر اڑتالیس لاکھ تریاسی ہزار درہم صرف ہوئے اور اس کی تعمیر میں کم وبیش دنیا بھر کے ماہرین فنِ تعمیر اور کاری گروں نے حصہ لیا۔

خلیفہ نے بازاروں کو شہر کے اندر لگوائے جانے کے برعکس اُنہیں باب البصرہ کے پاس بنوانے کا حکم دیا تاکہ اصل شہر مختلف قسم کی آلودگی اور عفونت سے صاف و پاک رہے۔

خلیفہ منصور کے بعد دیگر عباسی خلفاء بغداد میں محلات، باغوں، مساجد، قیام گاہوں اور سرائیوں، دانش گاہوں اور دانشوروں کے مراکز میں اضافہ کرتے رہے اور اس طرح سے یہ شہرِ خوباں مشرق کے علوم وفنون، سیاحت اور درس وتدریس اور عجائبات کا ایک اہم ترین مقام بن گیا۔

بغداد پر آٹھویں سے تیرہویں صدی تک 37 خلفائے عباسی حکمران رہے اور یہی اس عروس البلاد کا وہ رنگین اور زریں دور ہے جس کی داستانیں الف لیلہ کے اوراق پر تھرک رہی ہیں۔ اس کے فوراً بعد بغداد پر وہ قیامت ٹوٹی جس کا تصور کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالؔی نے اس طرح سے ماتم کیا:

وہ بلدہ کہ فخر بلاد جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکہ رواں تھا
گڑا جس میں عباسیوں کا نشاں تھا
عراقِ عرب جس سے رشکِ جناں تھا

اڑا لے گئی باد پندار جس کو

بہا لے گئی سیل تا تار جس کو (7)

چنگیز خان کے پوتے ہلاکوں خان نے 656ء یعنی 1258ء میں منگول گھوڑ سواروں کا لشکر اور لاتعداد نیم وحشی خانہ بدوش ساتھ لے کر بغداد پر دھاوا بول دیا۔ اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد تیمور نے پھر بغداد پر چڑھائی کی۔ اس طرح سے ان دو حملہ آوروں کے ہاتھوں بغداد کے لٹ جانے کی جو کہانی ہم تک پہنچی ہے اسے تخریب کاری کا ایک بھیانک ترین عمل کہا جا سکتا ہے۔

ہلاکو خان نے بغداد کو لوٹا اور دو دو ہاتھ سے لوٹا۔

پورے چالیس روز تک اس دارالسلام میں قتل عام ہوتا رہا اور تا تاری حملہ آور لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ان کا مال و متاع نکلواتے رہے اور انہوں نے شہر کا بڑا حصہ نذر آتش کر ڈالا۔ بچوں اور ان لوگوں کو چھوڑ کر جو تہہ خانوں میں گھٹ کر اور نہروں اور تالابوں میں ڈوب کر مرے عام مقتولوں کی تعداد آٹھ لاکھ سے زیادہ تھی۔

ہلاکو نے خلفاء کی قبریں تک کھدواڈالیں اور ان کی ہڈیاں نکلوا کر جلا دیں (8)۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ کو قتل کروا کے اس کی لاش شہر کی فصیل سے لٹکا دی گئی۔ شہر کے کتب خانے اور فن کے نادر نمونے جلا ڈالے اور آب پاشی کے بہترین نظام کو درہم برہم کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق گھوڑوں کے اصطبل اور مویشیوں کے چارہ خانے اینٹوں کے بجائے کتابوں کی جلدوں سے بنائے گئے۔ یہاں تک کہ دریائے دجلہ میں اتنی جلی ہوئی کتابیں پھینکی گئیں کہ اس کے پانی کا رنگ کالا پڑ گیا اور جلی ہوئی کتابوں سے دجلہ پر تین پل بنائے گئے۔

لیکن اس قیامت خیز شہر آشوب نے جہاں ایک آباد اور خوش حال شہر کو وحشی منگولوں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھا وہاں شہر کے تہذیبی فروغ اور تمدنی عروج نے قاتلوں اور لٹیروں کو اس حد تک متاثر اور حیران کر لیا کہ خود ہلاکو خان عربوں کی اس حیرت انگیز ترقی سے، جو اس کی نظروں میں ایک نئی چیز تھی اس قدر تعجب میں آیا کہ وہ اس کا حامی بن گیا۔ (9)

منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی شان و شوکت، حسن و نزاکت اور جاہ و حشمت کا شیرازہ بکھر

جانے کے بعد بغداد پر مصائب اور ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہی رہے اور دارالسلام کے در و دیوار پر اُس بدامنی، بے اطمینانی، بے ثباتی اور افراتفری کی گھناؤنی اور سیاہ رات صدیوں کے طویل عرصے تک چھائی رہی۔

1534ء میں بغداد پر ترکی کے فرمانروا سلیمان نے قبضہ کیا تھا اور پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست تک یہ شہر عثمانیہ راج کے ماتحت رہا۔

1920ء میں عراق، برطانیہ کے زیر اختیار آ گیا اور 1932 میں جبکہ ملک کی غلامی کا دور ظاہری طور پر ختم ہوا۔ اس کا اقتدار اعلیٰ بغداد میں برطانوی سفارت خانے کی عمارت میں منتقل کیا گیا۔

بغداد میں انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک شہری زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی جس کے خدوخال الف لیلہ کی کہانیوں میں نظر آتے ہیں۔ شہر کے لوگ تنگ و تاریک گلیوں اور بوسیدہ مکانات میں رہائش پذیر تھے۔ سقے اپنے مشکیزوں میں دریائے دجلہ سے پانی بھر بھر کر گھر گھر دے آتے تھے اور آمد و رفت کا سلسلہ گھوڑوں سے کھینچتی جانے والی قدیم ساخت کی گاڑیوں پر منحصر تھا۔ بغداد کے شہری بھی اپنی تقدیر پر قانع تھے اور ایک نئی زندگی کا تصور ان کے لئے خواب و خیال کی حیثیت رکھتا تھا۔

بغداد میں تاریخی تحفظات کے مراکز

بغداد میں صرف ہفتہ بھر قیام کرنے کے دوران میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ میں عراق کی روحانی، تاریخی اور مذہبی عظمتوں کا حال بتانے والی تمام زیارت گاہوں، عمارتوں اور دیگر آثار قدیمہ کو پوری طمانیت کے ساتھ دیکھ سکوں۔ پھر بھی فرصت کے محدود لمحات میں ذوقِ طلب اور شوقِ عقیدت جہاں جہاں لے گیا وہاں پل دو پل کے لئے روحانی اور قلبی مسرتوں کا فیضان حاصل کرلیا۔ جن زیارت گاہوں پر حاضری دی ان کا بھی مختصر حال قلم بند کر رہا ہوں۔ پہلے چند اور مقامات کا ذکر کرتا چلوں۔

18/جولائی 1979ء کی رات کو عراق کے وزیر اطلاعات وثقافت مسٹر لطیف نسایف وسیم نے خان مرجان کے ریستوران میں ہمارے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

خان مرجان

خان مرجان کی یہ قدیم ''کاروان سرائے'' بغداد کے گورنر امین الدین مرجان نے

1359 عیسوی میں تعمیر کروائی تھی تا کہ بغداد آنے والے سوداگروں اور مسافروں کے لئے یہ عمارت آرام وقیام کا کام دے سکے۔ یہ دومنزلہ عمارت اینٹوں سے بنی ہوئی ہے جس کی پہلی منزل میں چودہ میٹر اونچے ایک وسیع عریض ہال کے اردگرد 22 اور دوسری منزل میں 23 کمرے ہیں۔ یہ ہال اب ایک ریستوران میں تبدیل ہو گیا ہے جہاں تقریباً ڈیڑھ سو مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ ہال میں دن کو محرابی طاقوں کے روزنوں سے سورج کی کرنیں داخل ہو کر سارے اندرون کو روشن کر دیتی ہیں۔

ریستوران میں بغداد کے روایتی اور قدیم ماحول کی حقیقی عکاسی کئے جانے کی غرض سے یہاں فرش، قالین، چوبی نشستیں، میزیں اور خدمت گاروں کے لباس وغیرہ بھی اسی زمانے سے متعلق ہیں جو شہر کے تاریخی ماضی کا آئینہ دار تھا۔ طعام گاہ میں پڑھے لکھے اور نوجوان خدمت گار لمبے سیاہ چغوں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ جنہیں وشداشہ کہا جاتا ہے اور ان کے سروں پر گول ٹوپیاں طاقیہ کہلاتی ہیں۔ میں نے ایک خدمت گار سے ریستوران کے ڈائس کی طرف اشارہ کر کے پوچھنا چاہا کہ وہ بزرگ قسم کے چار افراد کون ہیں جو مختلف سازوں کا زیر و بم سنوارنے میں مصروف ہیں؟ میری نگاہ تجسس اس لئے بھی فوراً پھڑک اٹھی تھی کہ ان سازوں میں وہ سنطور بھی موجود تھا جس کے ایک سو تاروں کے ہر سُر سے کشمیر کا بچہ بچہ واقف ہے۔ کیوں کہ یہ ساز کشمیری کلاسیکی موسیقی کا سب سے نمایاں اور اہم آلہ موسیقی ہے۔

یہ خوش پوش خدمتگار انگریزی میں میرے سوال کا جواب دینے ہی والا تھا کہ ڈائس سے سنطور پر ضرب پڑنے کی آواز آئی اور اس کے بعد عراقی موسیقی کا وہ سماں بندھ گیا کہ بغداد کی الف لیلوی محفلیں اور ان راہ گیروں اور تاجروں کے شب و روز بے ساختہ یاد آ گئے جو اس سرائے میں قیام کے دوران ساز و نغمہ کی ایسی ہی بزم ہائے شوق سجاتے ہوں گے۔

خان مرجان کی یہ عمارت بغداد میں جہاں تفریح کا ایک مرکز بھی بن گئی ہے وہاں اس کی تاریخی افادیت پل پل اپنا حال بیان کرتی نظر آ رہی ہے۔ غالباً اسی لئے عربی کے شاعر نصار کہانی نے کہا ہے:

خان مرجان شاعری کا مسکن ہے

جس طرح وہ کہیں اور نہیں رہتی ہے

یہ ہماری تاریخ کا خوبصورت حصہ ہے

عراقی میوزیم

عراق کی راجدھانی میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر یہ دنیائے عرب کا شاندار عجائب گھر ہے جہاں وسیع وعریض ہالوں میں وہ کوہ قد مجسمے، اوزار، ہتھیار، دستاویزیں، شبیہات دیو مالائی کرداروں کی تصاویر اور دیگر آثار عراق کی متمول ترین اور قدیم ترین تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی داستان بیان کرتے ہیں جنہیں عراقی سرکار اور عوام نے نہایت شوق، لگن اور محنت سے محفوظ کر کے رکھا ہے۔

یہاں ان گنت صدیوں سے متعلق ان نوادرات کا کوئی شمار نہیں جو قدیم ترین میسوپوٹامیائی دور سے وابستہ ہیں۔ البتہ چھ ہزار سال قبل مسیح کی دیوی ماں کی شبیہہ 720 ق م کی نمرود کی مونالزا، 800 ق م کے اسیریائی دور کا پروں والا انسان نما بیل، 2700 قبل مسیح کے سومیری عہد کا ایک رتھ اور بابل کے عشتار دروازے کا ایک چھوٹا سا حصہ قابلِ دید اور قابلِ داد ہیں۔

عراقی میوزیم میں ملک کی زمانہ قبل تاریخ سے لے کر عہدِ اسلامی تک کے زمانے کے تقریباً ہر نادر نمونے کو حفاظت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے چار گھنٹے اس عجائب گھر میں گزارنے کے بعد بھی مجھے محسوس ہوا کہ سمندر سے ایک پیاسے کو صرف تھوڑی سی شبنم مل سکی ہے۔

عجائب خانہ بغداد

مشہور سیاح ابوالقاسم کہتا ہے۔ ''میں جگہ جگہ گھوما ہوں۔ میں نے سمرقند سے لے کر قیروان اور سراندیپ سے لے کر سرزمین روم تک دیکھی ہے۔ لیکن مجھے کہیں بھی بغداد سے زیادہ بہتر اور دلکش جگہ نظر نہیں آئی۔'' ابوعمرو بن العلاء بھی لکھتا ہے ''جو بغداد میں جیا اور مرا وہ گویا جنت سے جنت میں منتقل ہوا۔''

اسی بغداد کی روایتی اور ماضی قریب کی زندگی کو وہاں کے بغدادی میوزیم میں صورت اور

شبیہہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میوزیم میں شہر کی عوامی اور لوک زندگی کے الگ الگ پہلو مختلف مناظر کی شکل میں موجود ہیں جن میں شیش کباب اور پچتہ یعنی تکتہ بنانے والا، قہوہ خانہ، محفل موسیقی، جولاہا، ملا اور شاگرد اور شادی کی برات کا وہ منظر قابلِ ذکر ہیں جسمیں دولہے سے کیا گیا ہے کہ ''خدا تمہیں دولت اور تمہاری دلہن کو بچے دے''۔

ہم جس روایتی اور مشہور بغداد کا ذکر کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں اسی کی جیتی جاگتی تصویروں کا مخزن یہ منفرد اور اچھوتا عجائب گھر ہے۔

زیارت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

بغداد میں یہ زیارت گاہ پہلے باب الحلبہ کے نام سے مشہور تھی اور اب اسے باب الشیخ کہا جاتا ہے۔ حضرت غوث الاعظم کے روضہ سے قبل یہاں دینیات کی ایک درس گاہ تھی جسے ممتاز فقیہہ ابوسعید المبارک ابن علی المکرّی نے قائم کیا تھا۔ حضرت ابوسعید کا اِنتقال 513ھ یعنی 1119ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس درس گاہ کو از سر نو جاری کر کے اس کی توسیع کی جو 561ھ یعنی 1165ء میں حضرت شیخ کے اِنتقال تک علمِ دین کا ایک اہم مرکز بنی رہی۔

حضرت غوث الاعظمؒ یہیں پر دفن ہیں اور ان کے مزارِ اقدس پر سلجوقی طرز کا ایک مخروطی گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے مشہور بادشاہ سلیمان باشان نے 941ھ یعنی 1508ء میں اس گنبد کو منہدم کروا کے اس کی جگہ ایک نیا اور زیادہ خوبصورت گنبد بنوایا اور زیارت گاہ کی عمارت کو بھی کشادہ کروایا۔

ایک شام جب ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے زیارت غوث الاعظمؒ تک لے جانے اور واپس لانے کے لئے کہا۔ تو اس نے نہایت خندہ پیشانی سے اپنے مقررہ کرایہ میں خود ہی کمی کرنے کی پیش کش کی۔ البتہ ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ ہم اس زیارت گاہ پر اس کے حق میں دعائے خیر کریں گے۔

روضۂ مقدس میں تقریباً آدھ گھنٹے تک محوِ استغراق رہنے اور بارگاہ خداوندی میں عجز و زاری کرنے کے دوران ہم سے کہا گیا کہ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں اور ہمیں اب روضہ سے باہر آنا چاہئیے۔ کیوں کہ اندورنی حصے کو رات بھر کے لئے بند کیا جاتا ہے۔

وہ شام ایک پُر کیف اور سکون بخش شام تھی جس کی پاکیزگی اور تقدّس کے جذبات سے سرشار ہو کر ہم رات گئے ہوٹل واپس لوٹے۔

الکاظمین

کاظمین کی خوبصورت ترین، عالی شان اور مشہور زمانہ زیارت گاہ قصبہ کاظمین میں واقع ہے جہاں اہل تشیعہ کے ساتویں امام موسیٰ الکاظم اور نویں امام محمد تقی دفن ہیں۔

قصبہ کاظمین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں پہلے خلیفہ جعفر بن منصور، خلیفہ امین، خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ، امام ابو یوسفؒ اور امام احمد بن حنبلؒ دفن تھے۔ بعد میں جب امام موسیٰ الکاظم اور ان کا پوتا امام محمد الجواد بھی اسی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے تو ان سبھی قبروں کے اردگرد قصبہ آباد ہوا جسے کاظمین کہتے ہیں جس نام سے یہ زیارت آج موسوم ہے۔

جب ہم اس مسجد میں پہنچے تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی اور روضہ کے لمبے چوڑے صحن میں بے شمار عورتیں، مرد اور بچے دربار حق میں سجدہ ریز ہونے کے تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ صحن جو ضروریات کے مطابق نہایت کشادگی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ شب و روز زائروں کی ٹولیوں سے بھرا رہتا ہے جو ملک اور بیرون ملک کے دور دراز مقامات سے کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لاکر یہاں کئی کئی دن گزارتے ہیں۔ ان میں کثیر تعداد خواتین کی ہوتی ہے جو روضہ کی نقرئی جالی کے سوراخوں میں اسی طرح قفل لگا کے منت مانتی ہیں جس طرح کشمیر کی زیارت گاہوں پر کشمیری خواتین کپڑے کے ٹکڑے یا دھاگے باندھ کر اپنی مرادیں پوری ہونے کی آرزو کرتی ہیں۔ بغداد کی اس مشہور زیارت گاہ کو عقیدت مندوں اور عراقی عوام نے وہ زیب و زینت بخشی ہے کہ انسان کی صناعی اور کاری گری پر عش عش کر اٹھتا ہے۔ روضہ کے گنبد خالص سونے کے پتروں سے سرتاپا ڈھکے ہوئے ہیں اور گنبدوں کے اندرونی حصوں میں (Cut-glass) کے کام سے ایسی دیدہ زیب تزئین کاری کی گئی ہے کہ ہر شام کو شیشے کے لاتعداد ٹکڑوں میں سے سینکڑوں روشنیاں منعکس ہو کر ایک عظیم الشان منظر پیش کرتی ہیں۔ یہاں دروازوں، محرابوں، طاقوں اور جالیوں پر سونے چاندی کا کام کیا گیا ہے اور قرآنی آیات سے تقریباً ہر بالائی حصہ آراستہ و پیراستہ ہے۔

جو شخص بغداد جائے اور اس مسجد میں جا کر وہاں چند لمحے نہ گزارے اسے بہت بڑا بدنصیب کہا جاسکتا ہے۔

مسجد الخلفاء

بغداد کی جمہوریہ سٹریٹ پر واقع اس مسجد کو امام محمد المہدی نے 159 ھ میں تعمیر کروایا تھا۔ بعد میں اس کا وہ حصہ مسجد خلیفہ کے نام سے موسوم ہوا جو دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر باقی رہا۔ تاریخی حوالوں کے مطابق اس مسجد کا تعلق عباسیوں کے ابتدائی دور سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کم وبیش ایک ہزار سال کا عرصہ دیکھا ہے۔ اس مسجد کے وقتاً فوقتاً نام بدلتے رہے ہیں جن کے مطابق یہ مسجد خلیفہ، مسجد سوق الغازی اور مسجد الخلفاء کہلاتی ہے۔

اٹھارویں صدی میں عراق کا دورہ کرنے والے سیاح بنود نے لکھا ہے کہ خلیفہ مستنصر باللہ نے ایک نہایت ہی شاندار مسجد تعمیر کروائی ہے۔ اس نے اس مسجد کے دروازے پر بچشم خود ایک لوح دیکھی جس پر لکھا ہوا تھا کہ "اس مسجد کی تعمیر کا حکم حامرے حاکم اور مولانا امام المستنصر باللہ امیر المومنین نے 633 ھ یعنی 1236ء میں دیا۔ خدا تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ وہ تعلیم الاسلام کو عام کرے اور آیاتِ قرآنی کو دور دور تک پھیلائے۔" (10)

مسجد الخلفاء زمانے کی ستم رانیوں اور آفتوں کا بار بار شکار ہونے کے باوجود آج بھی بغداد پر گزرے ہوئے گزشتہ ایک ہزار سال کے حوادث کی کہانی بزبان حال ہر ایک سے بیان کر رہی ہے۔

مسجد الآصفیہ

اے سلطنتِ عثمانی کے دوران بغداد کے والی داؤد پاشا (1817-1826ء) نے از سر نو تعمیر کروا کے مسجد سے ملحق نمازیوں کے لئے ایک بہت بڑا ہال بھی بنوایا جس کے اوپر دو گنبد اور دو مینار بھی تعمیر کروائے۔ داؤد پاشا کے لقب آصف الدولہ کی مطابقت سے اسے مسجد الاصفیہ کہا جاتا ہے۔

اصل میں بغداد میں دجلہ کے مشرقی کنارے پر مستنصریہ اور شہداء پل کے درمیان واقع یہ مسجد پہلے پہل مستنصریہ دانش گاہ ہی کا ایک حصہ تھی جسے دار القرآن کہا جاتا تھا۔ اس حصے کے نشانات اب معدوم ہو چکے ہیں۔ صرف ایک ہال باقی ہے جو اینٹوں کی خوبصورت کاری گری سے مزیّن ہے۔

شیخ معروف مینار

یہ مینار بغداد کے مغربی حصے میں حضرت شیخ معروف الکرخی کے مزار کا حصہ ہے۔ مینار پر کندہ تحریروں سے واضح ہے کہ یہ عباسی خلیفہ النصیرالدین اللہ کے عہد میں 1215ء میں تعمیر ہوا جسے بغداد میں فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس دوران شہر بغداد کی کئی ایسی زیارت گاہیں اور مساجد رہ گئیں جن تک وقت کی کمی کے باعث رسائی اور باریابی کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔

ان میں خاص طور پر روضہ حضرت ابوحنیفہؒ 1228ء میں خلیفہ مستنصر باللہ کی تعمیر کردہ مسجد قمریہ، مزار شیخ عمر سہروردی، مسجد حیدر خان، الاحمد یہ مسجد، روضہ ست زبیدہ، زمرد خاتون مسجد اور مسجد شہداء شامل ہیں۔

تاریخ اسلام کے عظیم اور اہل دل بزرگوں اور صدق وصفا کے پیکروں کے روضے اور یہ شاندار عبادت گاہیں دیکھنے کی تشنگی آج بھی باقی ہے۔

بغداد کا ایک دِن

میں ہوٹل سے باہر آتا ہوں اور بوٹ پالش کرنے والا بارہ سالہ لڑکا لئیق انگریزی میں خندہ پیشانی سے گڈ مارننگ کہتے ہوئے میرا استقبال کرتا ہے۔ میں بھی جواباً اسے صباح الخیر یعنی صبح کا سلام کہتا ہوں۔ لئیق کو میں ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کم وبیش انگریزی بھی سیکھ لی ہے اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مہینے بھر کتنے پیسے کما لیتا ہے۔ تو اس نے بائیں کلائی پر بندھی خوبصورت الیکٹرانک گھڑی کی طرح دیکھ کر اپنی ماہانہ آمدنی تقریباً ایک سو دینار یعنی ڈھائی ہزار روپے کے قریب بتائی۔

یہ جانتے ہوئے کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں وہ ہندوستانی فلموں میں اپنی بے پناہ دلچسپی کا اظہار کرتا رہا۔ دھرمیندر، ہیما مالنی اور امیتابھ بچن اس کے محبوب بھارتی اداکار ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ شہر کے نو سنیما گھروں میں سے اس وقت تین میں ہندوستانی فلموں شعلے، دیوار اور نیا دور کی نمائش ہورہی ہے۔

میں نے وزارتِ اطلاعات کی کار کے ڈرائیور غازی کو رخصت کیا کیوں کہ میں ایک عام شہری کی نظروں سے بغداد کے بازاروں کو جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔

بغداد کا شمار دنیا کے مشہور اور خوبصورت ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر واقع یہ شہر خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں دریا کے مشرقی کنارے کی جانب بھی پھیل گیا اور اس طرح سے بغداد نئے نئے محلات اور عمارات، مسجدوں اور حماموں اور باغوں اور بازاروں کی تعداد اور شان کے لحاظ سے افسانوی داستانوں کو بھی مات کر گیا۔ ماہرین نے بغداد کو دنیا بھر میں شہری منصوبہ بندی کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ اسی لئے ملک میں یہ کہاوت زبان زد عام ہے کہ عراق کی جس سڑک پر چلو وہ بغداد ہی کو جاتی ہے۔

عباسیوں کے تاریخ ساز سنہری دور کے بعد بغداد کے در بام پر زوال کی تاریکیاں منڈلاتی رہیں جس سے یہ شہر حکومتی تغیرات، سیاسی اختلافات اور عدم استحکام کے مارے مسلسل خانہ جنگی کی آماجگاہ بن گیا۔ اس دوران باہر کے وحشی قبائل بھی وقتاً فوقتاً بغداد کو اپنی یلغاروں کا نشانہ بناتے رہے۔ بالآخر ہلاکو خان اور تیمور لنگ نے اپنے قیامت خیز حملوں سے بربریت کی انتہا کر کے اس شہر کی عظیم الشان تہذیبی اور ثقافتی تاریخ اور میراث کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

غیر ملکی حملہ آوروں کے اس طوفان بدتمیزی سے ایک طرف بغداد کے حسن وخوبصورتی کی تخریب کاری سالہا سال تک جاری رہی لیکن دوسری جانب بغداد کے رہنے والے ہر مرحلے پر اپنی جلیل روایات اور اصل قدروں کے نگہبان بنے رہے۔

جولائی انقلاب کے بعد عراق کے حکام نے بغداد کو صنعت و معیشت اور فن وعلم کا ایک اہم مرکز بنانے کے دوش بدوش اس کی عظمت رفتہ کے بیش بہا سرمایہ کی نگہبانی اور تحفظ کو بھی ایک قومی پروگرام کی طرح تشکیل دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ساڑھے آٹھ سو مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا اور بیس لاکھ افراد سے زیادہ آبادی پر مشتمل یہ شہرِ خوباں آج بھی قدیم وجدید کا حسین ترین سنگم ہے۔ یہاں سرمئی اور پیلے رنگ کی اینٹوں سے تعمیر شدہ فلک بوس عمارتوں کی بغل میں قدیم مساجد اور مینار ایستادہ ہیں۔ یہاں شہر کے جدید حصے کے برعکس بغداد قدیم میں زندگی کا حسن، شرافت اور سادگی کے امتزاج سے مرکب ہے۔ یہاں سڑکوں پر لوگوں کے مغربی لباس، عربی پوشاک، بلیو جینز (Blue Jeans) اور کرد علاقے سے وابستہ ملبوسات ایک گونا گوں منظر کا سماں باندھتے ہیں البتہ مجھے سارے شہر میں کوئی ہپی نظر نہیں

آیا۔ عراقی سرکار نے غالباً اس بے راہ رو مخلوق کے داخلے پر پابندی عائد کردی ہے۔ جو چرس، جاسوسی اور جنسِ ارزاں کے سہارے مشرقی اقدار اور تقدس کو داغدار کرنے میں مصروف ہے۔

قدیم میسوپوٹامیہ اور جدید عراق میں عاشقانِ جلال و جمال کے لئے ریستورانوں، عمارتوں اور تفریح کدوں کے نام بھی انہیں عہد گزشتہ کی رنگینیوں میں واپس لے جاتے ہیں ان میں شاہراہ سعدون پر واقع الف لیلہ نادی لیلی یعنی نائیٹ کلب، علی بابا ہوٹل، قصر بابل اور الہٰ الدین ٹریلوز، السند باد، الفرات ٹوررِازم، العباسی مارکیٹ اور ابونواس سٹریٹ وغیرہ شامل ہیں۔

مجسموں اور یادگاروں میں ابونواس سٹریٹ اور دریائے دجلہ کے مابین الف لیلہ کے دو مرکزی کرداروں شہرزاد اور شہریار کے مجسمے ایک خاص زاوئے سے نصب کئے گئے ہیں جہاں شہرزاد اپنے خاوند کو الف لیلہ ولیلہ یعنی ایک ہزار ایک راتوں سے متعلق ایک ہزار ایک کہانیاں سنارہی ہے۔ سعدون سٹریٹ کے چوک میں نصب شدہ قہرمان کا مجسمہ ایک مشہور فوارہ ہے جس میں مرجینا علی بابا کی کہانی میں ان چالیس چوروں پر ابلتا ہوا تیل ڈال کر انہیں ہلاک کرنے کے عمل میں مصروف ہے جو بڑے بڑے برتنوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اس مجسمے میں مرجینا روایتی لباس پہنے اور اپنی ادھ کھلی چھاتیوں کی نمائش کرتے ہوئے نیچے قطار اندر قطار لگے ہوئے برتنوں میں پانی ڈال رہی ہے اور حکایت، ادا اور روشنی میں ڈوبا ہوا یہ دیدہ زیب نظارہ ہر راہ گیر کے قدم روک لیتا ہے۔

عباسی دور کے مئے پرست اور میخوار درباری شاعر ابونواس کا مجسمہ شاہراہ ابونواس کے کنارے اسی جگہ نصب ہے جہاں اتفاق سے قریب ہی وہ میکدے بھی موجود ہیں جن میں عراقی نوجوان دن بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد ہر شام کو فرید اور اہوز بیر پینے اور ناظم الغزالی کی موسیقی سے محظوظ ہونے کے لئے جوق در جوق آتے ہیں۔

میں اب ایک بس میں سوار ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی ہے کہ ان دومنزلہ بسوں میں کنڈکٹر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مسافر ڈرائیور کے دائیں طرف لگے ہوئے ایک چھوٹے سے صندوق میں پیسے ڈال کر خود ہی ٹکٹ کاٹ لیتے ہیں۔ بسوں میں سواریوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں لادا جاتا بلکہ جتنی نشستیں ہوں اتنی ہی تعداد میں لوگ سوار ہوسکتے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کے سامنے ریزگاری

رکھ دی۔ اس نے تیس فلس اٹھا کر باقی پیسے مجھ کو لوٹا دئے اور مسکراتے ہوئے ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

بغداد کی وسیع و عریض اور صاف وشفاف سڑکوں پر برق رفتاری کے ساتھ دوڑنے والی موٹروں میں اکثر وہ لمبی چوڑی سونے چاندی کی حاشیہ آرائی سے مزّین، جدید ترین اور آرم دہ ایئر کنڈ شنڈ کاریں شامل ہیں جن کے اشتہارات ''لائف'' میگزین کے تقریباً ہر شمارے میں شائع ہوتے ہیں۔

یہاں ٹریفک سڑک کی دائیں جانب چلتا ہے اور کاروں، بسوں اور ٹرکوں کی رفتار بے حد تیز ہوتی ہے لیکن حادثات برائے نام ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں شہری ذمہ داریوں کا زبردست احساس پایا جاتا ہے۔ کوئی راہ گیر شاذونادر ہی غلط سمت میں چلتا نظر آئے گا۔ ہر اہم ترین سڑک پر اور ہر بھرے بازار میں ٹریفک کے زبردست دباؤ کے باوجود ڈرائیور ہارن کا بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ بغداد کے شہری دراصل اس خاموشی اور سکون کے متلاشی ہیں جو آج کل بڑے بڑے شہروں میں ایک خواب کی شکل میں بھی نہیں ملتا کیوں کہ اس شوروشر اور گھما گھمی سے خواب بھی ٹوٹتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں پٹرول کی روز افزوں گرانی جہاں کئی نئے نئے مسائل کو جنم دے رہی ہے وہاں بغداد کے بازاروں میں غالباً تیل ہی ارزاں ترین شے ہے۔ یہاں پٹرول کے ایک لیٹر کی قیمت دس فلس ہے جسے ہندوستانی سکے میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس پیسے کے برابر کہا جاسکتا ہے۔ عراق عرب ریاستوں میں تیل کی پیداوار میں ایک اہم درجہ رکھتا ہے اور یہاں اس قدرتی دولت سے ہر گھر کو متمول بنانے کی خاطر جس طریقے پر منصوبہ بند پالیسیاں اور سکیمیں زیر عمل ہیں وہ عراق کے روشن ترین اقتصادی مستقبل کی واضح نشاں دہی کررہی ہیں۔

میں ایک تاکسی یعنی ٹیکسی لے کر رشید سٹریٹ کی طرف گیا جو شہر کا بارونق تجارتی اور کاروباری بازار ہے۔ یہاں عراقی سپورٹس نام کی فرم کے ہندوستانی مالک مسٹر برہم سروپ سے ملاقات ہوتی ہے جو جالندھر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن گزشتہ پچیس سال سے عراق ہی میں مقیم ہیں۔ بغداد میں ان کا خاطر خواہ اور منافع بخش کاروبار ہے۔ وہ ایک شاندار بنگلے میں رہتے ہیں۔ ایک دو گاڑیوں کے مالک ہیں

اور اب اس روانی سے عربی بولتے ہیں کہ اردو میں بات کرنا ان کے لئے کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔
ان کے گھر پر ہمارے اعزاز میں عشائیہ کی شام بغداد میں پنجاب کی روایتی ضیافتوں اور ان کے اہل
خاندان کی پر خلوص محبت سے بھری ایک یادگار تقریب تھی۔ مسٹر سروپ نے اتراتے ہوئے کہا کہ عراق
میں جو ہزاروں ہندوستانی کام کرتے ہیں انہیں یہاں عزت اور محبت سے دیکھا جاتا ہے۔

میں اب کتابوں اور رسالوں کی دکانوں کے چکر کاٹ رہا ہوں جو اکثر و بیشتر عربی اور کہیں پر
انگریزی اور فرانسیسی مطبوعات سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک کتب فروش کے ہاں میں نے گاندھی اور نہرو
پر عربی میں دو مطبوعات دیکھیں جن میں ان ہندوستانی رہبروں کے سوانح قلم بند کئے گئے ہیں۔

بغداد میں ہر شے کے دام مقرر ہیں اور کسی دکاندار کی طرف سے ایک بھی فلس کی زیادہ وصولی
اسے سیدھے جیل خانے کا راستہ دکھا سکتی ہے۔ عراقی سرکار اپنی اقتصادیات کو مستحکم بنیادوں پر استوار
کرنے کی غرض سے درآمد کی بتدریج حوصلہ شکنی کر رہی ہے جس کی بدولت عراق میں صنعتی اور پیداواری
پروگرام کو خود بخود زبردست ترجیح حاصل ہو رہی ہے۔

میں مختلف بازاروں سے کھجوروں کے پیکٹ، روغنِ زیتون کی ایک بوتل، عطر اور خوشبو کی
شیشیاں اور سومر نام کے عراقی سگریٹوں کا ایک ڈبہ خرید کر ہوٹل کا رخ کرتا ہوں۔

سہ پہر کے ملگجے ماحول میں بغداد کے راستوں، مکانوں اور آسمان کا رنگ ایک سا نظر آ رہا
ہے۔ گویا گرد و غبار کی چادر سی پھیلی ہو اور ایک سرمئی ہالہ افق تا افق بندھا ہوا ہو۔

لئیق مساع الخیر یعنی شام کے سلام سے پھر مجھے خوش آمدید کہتا ہے اس نے تین دینار
کمائے ہیں اور وہ اب اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر گھر جانے کے لئے پر تول رہا ہے۔

کردستان میں 30 گھنٹے

اتوار۔ 15/ جولائی 1979ء۔ بغداد کے اغادیر ہوٹل میں صبح کے ساڑھے چار بجے میرے
کمرے میں فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ہوٹل کی ٹیلی فون اوپریٹر نہایت ہی شائستہ لہجے میں مجھ سے کہتی ہے
کہ میں پانچ بجے تک تیار ہو جاؤں کیوں کہ صحافیوں کی پارٹی شمالی عراق میں اربیل کی محافظت یعنی
Governorate کے دورے پر جا رہی ہے جو کردستان کا دارالخلافہ بھی ہے۔

پورے پانچ بجے ہم لوگ تین شاندار ائیر کنڈیشنڈ بسوں میں کردستان کی طرف روانہ ہوئے اور ہمارے ساتھ وزارت اطلاعات کے افسران اور پروٹوکول ڈویژن کے ذمہ دار اراکین تھے۔

گاڑی جب چمکیلی اور کشادہ سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی بغداد کی شہری حدود سے باہر نکلی تو شاہراہ کے دونوں طرف قدم قدم پر نئی عمارتیں تعمیر ہوتی نظر آئیں جو ایک ریگستانی علاقے کو انسانی بستیوں سے آباد کرنے کی نشان دہی کر رہی تھیں۔ اس تعمیراتی سلسلے میں، میں نے کئی جگہ سرکار کی طرف سے بنائے جانے والے قطار اندر قطار مکانات اور کوارٹر بھی دیکھے جو ایک سرکاری ہم سفر کے بقول لوگوں میں مفت تقسیم کئے جائیں گے۔ چند میل اور مسافت طے کرنے کے بعد کھجور کے بے شمار درختوں نے سڑک کے دائیں بائیں ایک خوب صورت قدرتی نظارہ قائم کیا تھا اور ان باغات سے ملحق اراضی میں ان درختوں کے نئے نئے پودوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

اندرونی طور پر خود مختار علاقے یعنی کردستان میں داخلے کے فوراً بعد اس خوش حالی اور اقتصادی ترقی کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے جو یہاں کے عوام کو حاصل ہے۔ مٹی کے بنے پرانے گھروندوں کی جگہ نئے پختہ مکانات لے رہے ہیں اور تقریباً ہر عمارت کی چھت پر ٹیلی ویژن اینٹینا کی موجودگی اس ترقی کی شہادت دے رہی تھی۔ لوگوں کے بھاری ہجوم ریستورانوں اور دکانوں کی زینت بڑھا رہے تھے اور ہر چھوٹے بڑے بازار میں خوب چہل پہل تھی۔

میں اس وقت بغداد سے چار سو کلو میٹر دور شقلاوہ ہوٹل کی چوتھی منزل کے ایک کمرے کی بالکونی میں بیٹھا آس پاس کے مناظر کا جائزہ لے رہا ہوں۔ مجھے بے خیالی میں ایسا گمان ہو رہا ہے گویا میں کشمیر میں سونہ مرگ یا داچھی گام میں وادی کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

میری حد نظر تک پہاڑوں کا طویل سلسلہ جو کشمیر کے جنگلوں کی طرح سرو دیودار اور صنوبر کے درختوں کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اس علاقے میں تقریباً وہ تمام میوے موجود ہیں جو کشمیر میں اگائے جاتے ہیں ان میں انگور، بادام، اخروٹ، انار، خوبانی، سیب اور ناشپاتی شامل ہیں۔ اناروں کی جلد یہاں سرخ کے برعکس سبز ہوتی ہے۔ ایک خاص درخت جو میں نے کشمیر سے یہاں تک کہیں نہیں دیکھا سفیدہ ہے فرق صرف یہ ہے کہ کشمیر میں سفیدے کا درخت نہایت قد آور اور جسیم ہوتا ہے لیکن کردستان

کے سفیدے کی اونچائی اور تنا کشمیر کے مقابلے میں نصف کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ قدرت کی کاری گری اور کارسازی نہیں تو اور کیا ہے کہ یہاں بھی ان درختوں پر تھرتھراتے اور جھومتے ہوئے سرسبز پتے الٹ پلٹ ہوکر اسی طرح چاندی کی لہروں کی طرح سورج کی شعاعوں کو منعکس کرتے ہیں جس طرح سری نگر کے کسی بھی سفیدوں سے بھرے باغ میں بے مثال نظارہ دیکھنے والے کی نگاہوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔

شام کو شقلاوہ کا بازار دیکھنے چلے تو محبت، زندگی، حسن، اخلاق اور عمل کی ساری رنگینیاں اس چھوٹے سے پہاڑی قصبے کی ڈھلوان سڑکوں پر اور بارونق بازاروں میں خراماں نظر آئیں۔

ہم پیاس کے مارے سڑک کے کنارے واقع ایک ہوٹل میں پانی پینے کی غرض سے گھس گئے تو وہاں کے نوجوان منیجر نے ہمیں نہایت خوش اخلاقی سے ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ اس حسن اخلاق کے عوض ہم نے اسے ان دو محبت ناموں کا ترجمہ کر کے سنایا جو اس کی پاکستانی محبوبہ نے استنبول سے اسے اُردو زبان میں ارسال کیے تھے۔

میں نے چند نوجوان طالب علموں سے امریکی سگریٹ بیچنے والی کسی دکان کا پتہ پوچھا تو وہ سبھی ہنسی خوشی تقریباً دو سو میٹر میرے ہمراہ آئے اور ایک چھوٹی سی فرشی دکان میں داخل ہوکر مجھے مقررہ قیمتوں پر کینٹ (Kent) کے تین پیکٹ دلوائے اور خود ہی میرا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ چل دیئے۔

اس علاقے کے باشندے نہایت ہی زرق برق لباس پہننے کے عادی ہیں۔ مردوں کی شکل و شباہت کشمیری دیہاتوں سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے صرف لباس کا فرق یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ لوگ کرد ہیں کشمیری نہیں۔ کرد عورتوں میں خواتین اور غیر شادی شدہ لڑکیاں برائے نام پردہ کرتی ہیں۔ وہ گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی سرتا بہ پا سیاہ نقاب اوڑھتی ہیں لیکن ان کے گلابی چہرے اور غزالی آنکھیں عام طور پر دیدہ و دل کی حشر سامانیوں کو جگاتی رہتی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ''کرد علاقے میں سیاح آزادیٔ نسواں کی وہ جھلک دیکھتے ہیں جو انہیں معاشرے میں حاصل ہے۔ یہ عورتیں بے نقاب ہوکر گھومتی ہیں۔ بیگانوں کے ساتھ بیباکی سے باتیں کرتی ہیں اور خاوندوں کی غیر حاضری میں اپنے گھروں میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتی ہیں۔'' کردستان کی عورتیں کشمیری صنفِ نازک سے کئی

درجے صحت منداور خوبصورت ہیں۔ان کا شاندار قد، بھرے بھرے اور ادھ کھلے ہونٹ، کشادہ ذقن، ابھرے ہوئے سینے، آبشاروں کی طرح بل کھاتے اور لہراتے ہوئے سیاہ اور گھنیرے بال اور وہ افسوں خیز آنکھیں مسلسل نظر بازی کے باوجود حسرت دیدار کی پیاس کو اور بڑھا دیتی ہیں جن کے بارے میں فیضؔ نے کہا تھا:

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟

رات کو ہوٹل کے لان میں ضلع کے گورنر کی طرف سے ہمارے اعزاز میں عشائیہ کی دعوت دی گئی۔ محفل ناؤونوش شروع ہونے کے ساتھ ہی جب تاروں بھرے آکاش تلے سامنے ڈائس پر بجتے ہوئے بینڈ نے ایک جذبات خیز کردلوگ ناچ کی دھن پر اپنے سر تال کو سنوارا تو تمام عرب صحافیوں کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے اخبار نویس بھی انتہائے شوق میں رقص کرنے لگے اور دو چھوٹی لڑکیوں نے ڈائیس پر ناچ ناچ کر اس حقیقی شادمانی کے خمار کو دوآتشہ بنا دیا۔

موسیقی، مئے کشی، دل نوازی اور عربوں کی روایتی مہمان نوازی کا یہ یادگار جشن رات گئے تک جاری رہا۔

عراق اور کشمیر

عراق اور کشمیر کے درمیان اگرچہ قدیم زمانے کے باہمی تعلقات کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن اس رشتہ داری کا آغاز مذہبی وابستگی کی بنیادوں پر ہوا ہے۔

بجز اس کے ان دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ تعلقات کا براہ راست تذکرہ اس لئے ناپید ہے کہ یہ تعلقات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ کتابوں میں صرف یہ سرسری ذکر موجود ہے کہ ''قدیم زمانے'' میں بغداد اور دمشق سے ایران و کشمیر سے ہو کر مشرق کے شہروں کو مال جایا کرتا تھا اور کشمیری شال عراق کے تمام شہروں میں مقبول و مشہور تھی۔ محمود غزنوی نے کشمیر کو تسخیر کرنے کی جو کوششیں کیں وہ سب ناکام ہوگئیں۔ عرب سیاح البیرونی، جو سلطان غزنوی کے ہمراہ تھا، کشمیریوں کی شجاعت اور سخت برف باری کو محمود غزنوی کی ناکامی کا باعث قرار دیا ہے۔ البیرونی یہ بھی لکھتا ہے کہ اہلِ کشمیر اپنے ملک کے دفاع کے بارے میں بہت فکرمند نظر آتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں عرب فاتحوں کا داخلہ ممکن نہ ہونے کی وجہ سے کشمیر کے حالات وکوائف بھی عرب دنیا کے لئے ایک معمہ ہی بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب جغرافیہ دانوں المسو دی، القزوینی اور الادریسی نے اگرچہ کشمیر کا ذکر کیا بھی ہے لیکن اس میں انہوں نے پنجاب اور سندھ کے علاقے ہی شامل کیئے ہیں۔ وادیٔ کشمیر کے لئے اندرونی کشمیر اور اس سے ملحقہ علاقوں کی خاطر باہری کشمیر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ دسویں صدی عیسوی کا مشہور عراقی جغرافیہ دان ابوالحسن علی بن الحسین المسعودی کہتا ہے کہ کشمیر کا حکمران الرے (راجہ) کہلاتا ہے جو کشمیر کے حکمرانوں کا عام لقب ہے۔ المسعودی نے کشمیر کو پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک قلعہ بند ملک قرار دیا ہے جہاں سوائے ایک راستے کے انسان وحیوان اور کہیں سے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔(11)

اس سے قبل عباسی خلیفہ معتمد کے دور میں ادارۂ مواصلات کے سربراہ ابن خروازبہ (وفات 250ھ) نے سب سے پہلے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''المسالک والمہالک'' میں کشمیر کا ذکر کیا تھا۔ اسی زمانے سے یہ روایت بھی چلی آرہی ہے کہ کشمیر میں جہلم کے دائیں کنارے پر بمبا نامی جو قبیلہ آباد تھا۔ وہ بنوامیہ کی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ بنوامیہ کے کچھ لوگ بدخشان ہجرت کرنے کے بعد چودھویں صدی میں کشمیر آئے۔(12)

حضرت شیخ عبدالقادر شاہ جیلانیؒ نے 561ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ اس کے کوئی سات سو سال بعد کشمیر کے دارالحکومت سری نگر میں خانیار کے مقام پر ان کی زیارت گاہ تعمیر ہوئی جو آج بھی بغداد اور کشمیر کے درمیان ایک روحانی رشتے کا مقدس مرکز ہے۔

اہل تشیعہ کے مقدس ترین مقامات عراق میں ہی واقع ہیں۔ لہٰذا کشمیر سے بھی ہر سال کئی زائرین عراق میں ان مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے جاتے رہتے ہیں جس سے عراق اور کشمیر کے لوگوں کے درمیان مذہبی اور دینی لگاؤ کو صدیوں سے فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانیؒ کشمیر تشریف لائے اور اسلام کی تشہیر اس حسن وخوبی کے ساتھ کی کہ ملک کشمیر کی ہندو اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسے کشمیر اور اسلام کے درمیان پہلے باضابطہ مذہبی اور تاریخی بندھن کا نام دیا جاسکتا ہے۔ سلطان زین العابدین بڈشاہ

(1420-70ھ) نے عراق کے ساتھ بھی کشمیر کے تعلقات کو مذہبی دائرہ کار کے علاوہ ثقافتی اور فنی لحاظ سے وسعت دینے کا صحیح معنوں میں آغاز کیا۔ بڈشاہ علم وفن اور کتابوں کا بڑا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے ایلچی ہند، ترکستان اور ایران کے علاوہ عراق بھی بھیجے تا کہ وہ وہاں سے عربی اور فارسی مسودات خرید کر کے لائیں (13)۔ اسی طرح اگر اسے پتہ چلتا کہ عراق، خراسان یا ترکستان سے کوئی ماہر دستکار کشمیر آیا ہے تو وہ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اپنا فن کشمیریوں کو بھی سکھائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ماہرین کے انکار پر انہیں کشمیر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی گئی جب تک کہ انہوں نے اپنی مہارت سے اہل کشمیر کو آگاہ نہیں کیا۔

بڈشاہ کا دور عراق اور کشمیر کے تمدنی اور ثقافتی رشتے کے لئے سنگ میل تو بن گیا لیکن اس کے بعد صدیوں تک کشمیر کی سیاسی زبوں حالی نے ان بنیادوں کو مسمار کر کے رکھ دیا۔ البتہ سارے کشمیر میں الف لیلہ کی ہمہ گیر مقبولیت نے اس سلسلے کی ثقافتی کڑیاں باندھ کے رکھیں۔ بغداد کے عباسی دور سے وابستہ اس مشہور ترین افسانوی تخلیق کے کردار رفتہ رفتہ کشمیر کی لوک کہانیوں کے بھی کردار بن گئے اور الف لیلہ کے کشمیری ترجمہ نے اسے کشمیر کے ہر گھرانے کے لئے مقامی زبان میں محفوظ کر کے رکھ دیا۔

عرب موسیقی کا کشمیر کی کلاسیکی موسیقی سے تاریخی تعلق کوئی ماہر موسیقی ہی واضح کر سکتا ہے۔ لیکن سنطور اور چند اور دوسرے آلات اس وقت بھی بغداد اور سری نگر میں کلاسیکی موسیقی کے لئے ایک اہم ساز ہیں اور کشمیر کی طرح عراق میں بھی کلاسیکی موسیقی کو ''مقام'' سے پہچانا جاتا ہے جبکہ کشمیری کلاسیکی موسیقی میں ''عراق'' اور ''نوروز عرب'' دو مشہور مقامات کے نام ہیں۔

بغداد میں ایک شام خان مرجان کی عمارت میں ایک استقبالیہ تقریب پر وہاں کی کلاسیکی موسیقی کی محفل میں بیٹھ کر مجھے ایسا گمان ہوا تھا کہ میں سری نگر ہی میں محمد عبداللہ تبت بقال کی صوفیانہ نغمہ سرائی سے محظوظ ہو رہا ہوں۔ اس محفل میں بار بار مجھے کسی کا یہ مقولہ یاد آتا رہا کہ موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی بلکہ یہ کسی بھی زبان میں ہو اسے سمجھنا مشکل نہیں۔

مع السلامتہ

اگر کوئی صحافی یا سیاح یہ دعویٰ کرے کہ وہ عراق جیسے برق رفتاری سے بدلتے ہوئے عرب

ملک اور قدیم وجدید کے امتزاج سے مرتب بغداد جیسے شہر کو پندرہ دن سے بھی کم وقت میں پوری طرح دیکھنے سمجھنے میں کامیاب ہوا ہے تو اسے ایک مبالغہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

عراق کے بارے میں یہ بات اس لئے اور بھی زیادہ برمحل ہے کیوں اس ملک نے ہزاروں سال کی تاریخ وتمدن کو اپنی گود میں پالا ہے۔

اس سفرنامہ کے اختتام سے پہلے میں یہاں اس فطری نظارے کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا جو آج بھی ایک تصوراتی منظر کی طرح کبھی کبھی قوس قزح کے رنگ لئے میری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

یوں تو اگر دیکھا جائے تو فطرت کی کاری گری سے ہر صبح اور ہر شام انفرادی اور مثالی صناعی کا مظہر ہوتی ہے لیکن انسان کی شب وروز کی گہما گہمی اسے قدرت کی ان جلوہ سامانیوں کے حظ کا موقعہ شاذ و نادر ہی فراہم کرتی ہے۔ یہی وہ سبب ہے جس سے میں شاید اس صبح اور اس شام کو کبھی نہ بھول سکوں گا جس کا اب میں تذکرہ کر رہا ہوں۔

23/ جولائی 197ء کو علی الصباح چار بجے ہم بغداد کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے عراقی ایئرویز ہی کے ایک اور جمبو جہاز میں بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت سارا آسمان ان گنت تاروں کی ملگجی روشنی سے بھرا ہوا تھا اور ابھی صبح کاذب کے آثار بھی ناپید تھے۔

طیارہ جب دو گھنٹے تک پرواز کرنے کے بعد دوبئی میں کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے وہاں پہنچنے کو ہی تھا تو یکایک جہاز کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں سے سورج کی شعائیں ہم پر نور کی بارش کرنے لگیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ابھی رات تھی اور ابھی سورج نصب النہار تک آ پہنچا ہے۔ دوبئی سے بمبئی جاتے وقت بحیرۂ عرب کی لہریں سورج کی کرنوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ اور حد نظر تک رنگا رنگ روشنیوں میں نیلے آسمان اور سرمئی سمندر کا سنگم ہو رہا تھا۔ اسی شام کو جب ہم انڈین ایئر لائنز کی ایئر بس میں بمبئی سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں غروب آفتاب کا منظر ہر مسافر کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بن گیا۔ جہاز کے بائیں طرف سورج ایک آتشیں گولے کی طرح بلندیوں سے نیچے کی طرف آ کر رفتہ رفتہ اور لحظہ لحظہ ڈوب رہا تھا۔ یہ نظارہ کوئی پندرہ منٹ تک جاری رہا اور اس دوران خورشید گلنار کی سرخ

شعاعوں سے طیارے کا سارا اندرونی حصہ بھی لالہ احمر کے رنگ میں ڈھل گیا۔

اب میرا عراق کا یہ سفرنامہ ختم ہوتا ہے۔ خدا حافظ اور مع السلامتہ!

حوالہ جات

1۔ عراق۔ دی لینڈ آف عرب ری سرجنس۔ دیوان بریندر ناتھ۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل نئی دہلی۔ 1979ء

2۔ پیدائش۔ باب 2۔ آیات 14-8۔ بائبل سوسائٹی ہند۔ بنگلور۔ 1992ء

3۔ میسوپوٹامیہ یسٹرڈے عراق ٹوڈے۔ سارٹیک۔ میلان۔ اٹلی۔ 1977ء۔ ص 7

4۔ دی ہسٹریز۔ ہیروڈوٹس۔ پنگون کلاسکس۔ مڈل سیکس۔ 1959ء۔ ص 92

5۔ پیدائش۔ باب 11۔ آیات 9-3

6۔ میسوپوٹامیہ یسٹرڈے عراق ٹوڈے۔ ص 6

7۔ مسدس حالی۔ نول کشور پریس۔ لکھنو۔ 1959ء۔ ص 44

8۔ اسلام اور عربی تمدن۔ ترجمہ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ مکتبہ معارف اعظم گڑھ۔ 1952ء۔ ص 349

9۔ تمدن عرب۔ ترجمہ سید علی بلگرامی۔ مکتبہ مفید عام۔ آگرہ۔ 1893۔ ص 175

10۔ عراق ٹوڈے۔ بغداد۔ جلد 3۔ شمارہ 70، 15 / اگست 1979ء۔ ص 20

11۔ انڈو عرب ریلیشنز۔ ایس مقبول احمد۔ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز۔ نئی دہلی۔

12۔ کشمیر انڈر دی سلطانز۔ محب الحسن۔ علی محمد اینڈ سنز سری نگر۔ 1974ء۔ ص 92-90

13۔ بغداد آبزرور۔ بغداد۔ 26 / اپریل 1980ء

..............☆☆☆..............

مشاہیر کے فلک رنگ خطوط

غلام نبی خیالؔ کے نام

O

فاضل مکرّم۔سلامت باشد!

''شیرازہ'' کے تازہ شمارے میں، میں نے آپ کا مقالہ حضرت شیخ صرفی کشمیری پر پڑھا ہے۔ ماشاءاللہ خوب لکھا ہے۔

اس میں ایک بات میرے خصوصی ذوق کی بھی نظر آئی اور وہ یہ کہ آپ نے حضرت شیخ کے ایک شعر کے سلسلے میں مرزا غالبؔ کے نام سے حاشیے میں یہ شعر لکھا ہے:

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے تیرے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

ازراہِ کرم اس شعر کا ماخذ ارسال فرمائیے تا کہ میں اپنے مسوّدے میں اس کا اضافہ کرلوں۔

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔صاحبزادہ سیّد حسن شاہ صاحب سے ملاقات ہوتو میرا اسلام عرض کردیجیۓ گا۔والسلام!

12رفروری 1964ء

مولانا امتیاز علی خان عرشی
رامپور رضا لائبریری۔رام پور۔یوپی

O

برادرم مشفقم۔

آپ کی تصنیف ''اقبال اور تحریک آزادئ کشمیر'' انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ میں نے اسے جہاں جہاں دیکھا ئی معلومات سے بھرپور پایا۔

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے تیرے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

غالبؔ کا نہیں ہے۔ ہاں اس مضمون کو غالبؔ نے فارسی میں لکھا ہے۔

از کشا کشِ ضعفم نکسلد رواں ازتن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

اغلب ہے کہ اردو کا شعر فارسی کا سامنے رکھ کر لکھا گیا ہو۔ غالبؔ کی غزل بیدلؔ کی زمین میں ہے۔ اردو کا شعر کس کا ہے میں نہیں کہہ سکتا لیکن شعر اچھا نہیں۔

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

آپ نے شاید ''سہواً'' دونوں مصرعوں میں میر محفل لکھ دیا ہے۔ یہ غزل اور یہ شعر خسرو کے کسی کلیات میں مجھے نہیں ملا لیکن انداز ایسا ہے کہ خسروؔ یا حافظؔ کا ہو سکتا ہے۔

20 / جون 1997ء — شمس الرحمان فاروقی

''شب خون'' 313۔ رانی منڈی۔ الہٰ آباد۔ یوپی

............●●............

O

محترم ومکرم خیالؔ صاحب۔ سلام مسنون

گرامی نامے مل گئے تھے۔ میں نے آپ کی زیر تکمیل کتاب ''اقبال اور تحریک آزادی کشمیر'' کے لئے چند سطور نذر کردی تھیں۔ ملی ہوں گی۔ خدا کرے آپکے کام کی ہوں۔

کشمیر کے بارے میں اپنی نظمیں آج ہی ایک صاحب کے حوالے کی ہیں۔ دراصل میں گاؤں چلا گیا تھا وہاں علیل ہوگیا اسی لئے تاخیر کا مرتکب ہوا۔ معذرت خواہ ہوں۔

اب انشاء اللہ تین نظمیں آپ تک پہنچ جائیں گی۔ ایک چوتھی نظم بھی ہے، کوشاں ہوں کہ وہ بھی دستیاب ہو جائے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب کی جس ''ادبی بددیانتی'' کا ذکر آپ نے کیا ہے وہ مجھے ''بددیانتی'' کی بجائے ''بے خبری'' لگتی ہے کہ انہوں نے بے خبری میں ''جاوید نامہ'' کے اشعار کے پس منظر کے سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ کو دیکھ لیا۔ میں ان پر بددیانتی کا شبہ اس لئے نہیں کرتا کہ بابری مسجد کے انہدام پر آزاد صاحب نے اپنے اہل وطن کو جس جواں مردی اور دیانت داری سے مخاطب کیا تھا اور ان کے اس بہیمانہ اقدام کی غیر مشروط مذمت کی تھی اس کے حوالے سے میں یہی عرض کروں گا کہ ''جاوید نامہ'' کے سلسلے میں ان سے جو لغزش ہوئی وہ بے خبری میں ہوئی۔

دعا ہے کہ آپ بخیریت ہوں۔

11/اپریل 1996ء

احمد ندیم قاسمی

مجلس ترقی ادب

ا۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

..........●●..........

O

ڈیر مسٹر خیالؔ!

آپ کے خط کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ!

مجھے آپ کے ہفت روزہ ''وطن'' (کشمیری اخبار) کے لئے تہنیتی پیغام بھیج کر خوشی ہو رہی ہے۔ میں اہل کشمیر کو بھی مبارک باد دیتا ہوں جن کی جدوجہد کو میری بھرپور حمایت حاصل ہے۔

میں آپ کے خصوصی ایڈیشن کے لئے (وطن کا امن نمبر جو اگست 1966ء میں شائع ہوا) ''امریکی ضمیر کے نام ایک اپیل'' کے عنوان سے مضمون ارسال کر رہا ہوں جو آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

برٹرینڈ رسل

برٹرینڈ رسل پیس فاؤنڈیشن

30/جولائی 1966ء　　　3-4 شیورس پلیس۔ ہے مارکیٹ لندن۔ انگلینڈ

O

میرے عزیز خیالؔ صاحب۔ اسلام علیکم

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ آپ کشمیری زبان میں ''وطن'' نام کا ایک ہفت روزہ اخبار شروع کر رہے ہیں۔

آپ نے جس تن دہی اور دیانت داری کے ساتھ اس سے قبل آٹھ ماہ تک اخبار ''محاذ'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جو کام کیا وہ بے حد اطمینان بخش ہے۔ ''محاذ'' پر جو ناقابل برداشت مالی بوجھ پڑا اُسے کم کرنے کی غرض سے ہمیں آپ کو اور چند اور اہل کاروں کو ''محاذ'' سے سبکدوش کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

میں آپ کے اس نئے اقدام کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ کشمیری ہماری اپنی مادری زبان ہے اور اسے ترقی اور وسعت دینا ایک قومی خدمت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اس اخبار کے ذریعہ کشمیریوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی اور ملک کی بے لاگ خدمت کریں گے تو یہ اخبار ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے گا۔

خدا تعالیٰ آپ کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے۔ آمین

شیخ محمد عبداللہ۔ صورہ سری نگر

12/اپریل 1965

........●●........

O

محبی و مشفقی۔ تسلیم و نیاز

آپ کا محبت نامہ مورّخہ 6/ مارچ 1961ء مجھے پرسوں ملا۔ ممنون ہوں۔

کلچرل اکادمی کی موجودہ حالت سے بھی آپ کی بدولت مطلع ہوا ہوں۔ سچ پوچھئے اگر آپ میرے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری نہ رکھتے تو میں اس کی سرگرمیوں اور نظم و نسق سے بالکل لاعلم ہوتا۔

لل دید کا کلام زیرِ طبع ہے۔ یہ سن کر مسرت ہوئی۔ پریس سے آنے پر حسبِ وعدہ اس کی، کلامِ پرمانند اور اپنے ترجمۂ رباعیات عمر خیاؔم کی ایک ایک جلد ضرور عنایت کیجئے۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنے دن یہاں ٹھہرنا پڑے۔

ایک خط مرزا صاحب کے نام ملفوف ہے۔ ان کی خدمت میں پیش کیجئے۔ جیسا کہ آپ دیکھ لیں گے میں نے اس میں "تذکرۃ الشعرا" اور "ہمارا ادب" سے متعلق اپنی ناچیز رائے کا اظہار کیا ہے۔ بہتر ہوتا اگر یہ دونوں نسخے حسب ضرورت نظر ثانی کے بعد شائع کرائے جاتے تا کہ اکادمی کے دشمنوں کو حرفِ گیری اور اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔

یہ سن کر بھی بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کا "ترجمۂ رباعیاتِ عمر خیاؔم" چھپ چکا ہے۔ اس کے لئے مبارک باد قبول کیجئے۔ جن چند رباعیات کا ترجمہ آپ کی زبانی سنا تھا مجھے بہت پسند آیا۔ ان میں خیام کی روح بول رہی تھی۔ مجھے اُمید ہے باقی رباعیات کا ترجمہ بھی ایسا ہی شاندار ہوگا۔

آپ کو خاطر خواہ ترقی ملے گی تو مجھے اطمینان حاصل ہوگا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ آپ اکادمی کے دیگر ملازموں کے مقابلے میں اس رعایت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

میں اپنی اہلیہ کی بیماری کے باعث تقریباً گزشتہ ایک ماہ سے پریشان رہا اور اس لئے ابھی تک سری نگر واپس نہ جا سکا۔ اگر اور کوئی خاص امر مانع نہ ہوا تو انشاء اللہ یکم/ اپریل تک وہاں پہنچ کر آپ سے ملاقات ہوگی۔

میری طرف سے مرزا صاحب کی خدمات میں یہ بھی عرض کیجئے کہ میں ان کی کرم فرمائی کا منتظر ہوں۔ کلامِ لل دید کی تیاری اور ترجمے میں جو کام میں نے بڑی محنت سے کیا ہے اور جس کا اعتراف انہوں نے خود فرمایا ہے اس کے پیشِ نظر مجھے امید ہے کہ وہ واجبی اور معقول معاوضہ عطا کر کے مجھے ممنون فرمائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ امید رکھنا بھی انصاف سے بعید نہیں کہ کلامِ پرمانند کے سلسلے میں کام کرنے کے جزوی معاوضہ سے محروم نہیں کیا جاؤں گا۔ آپ یاددہانی کیجئے۔ براہِ راست ان کو لکھنا کاسہ گدائی پیش کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں۔

کلامِ پرمانند کے سلسلے میں آپ نے بھی توشخانی صاحب (پروفیسر سری کنٹھ توشخانی) کے ساتھ مل کر کچھ کام کیا تھا۔ معلوم نہیں کہ آپ کو کچھ ملا تھا یا نہیں۔

اُمید ہے آپ مع جملہ متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔ فقط

پروفیسر طالبؔ کاشمیری

نئی دہلی

12/مارچ 1961ء

O

برادرم خیالؔ صاحب مکرم۔ سال نو مبارک

آپ کے 74ء کے مکتوب کا جواب 75ء میں دے رہا ہوں۔ اس مجرمانہ تاخیر کے لئے شرمندہ ہوں۔ دراصل ہوا یہ کہ نومبر میں جب آپ کا خط ملا تو میں نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے دفتر یعنی شعبہ کی کسی فائل میں رکھ دیا تھا۔ کچھ دن بعد جب جواب دینے کے لئے اسے تلاش کیا تو ہاتھ نہ آیا۔ آخر کل کاغذات کی صفائی کے لئے کچھ پرانی فائلیں دیکھیں تو یہ درِنایاب برآمد ہوا۔ آپ میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا ترجمۂ رباعیاتِ عمر خیامؔ عنقریب فوٹو آفسیٹ سے شائع ہوگا۔ تاشقند میں رباعیات خیام کا ایک عکسی نسخہ میں نے دیکھا تھا۔ جو غالباً ماسکو یا دوشنبہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ سوویت یونین میں خیام کی رباعیات کے کئی قدیم نسخے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ تاشقند یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر اور فارسی ادبیات کے ممتاز اسکالر پروفیسر اسلام شا محمد وف کی طرف رجوع کیجئے۔ موصوف ازبکی زبان میں خیام کی رباعیات کا ترجمہ کر چکے ہیں۔ آپ میرا حوالہ بھی دے سکتے ہیں۔ خط انہیں فارسی میں لکھئے یا پھر انگریزی یا اُردو میں۔

افسوس ہے کہ نغمۂ کشمیر کا صرف ایک ہی نسخہ میرے پاس ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ کسی دوست کی معرفت جلد ہی اس کے کچھ نسخے تاشقند سے منگواؤں۔ جیسے ہی ملیں گے آپ کو بھیج دوں گا۔

کیا موسم سرما میں آپ دلّی کی طرف نہیں آتے؟ اگر دلی آئیں تو شرف ملاقات ضرور بخشیں۔ مکتبہ جامعہ والی ملاقات مجھے یاد ہے۔ اس بے جا تاخیر کے لئے ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔

2/ جنوری 1975ء ڈاکٹر قمر رئیس

C-166۔ وویک وہار۔ دہلی 32

O

پیارے خیال جیتے رہو!

تم نے برادری کی لاج رکھ لی اور پہل کی۔ میں دردِ کمر کے علاوہ باقی ٹھیک ہی ہوں۔ ویسے مکان اور کھانے پینے کی تکلیف تو ہے ہی۔ جانے کب تک دور ہوگی۔ اس وقت سلام مچھلی شہری کے ساتھ رہتا ہوں۔ لیکن خیال اغلب ہے کہ یہ سنگت زیادہ دیر نہیں رہے گی کیوں کہ یہ آدمی دل کا صاف ہونے کے باوجود بعض بری عادتوں کا شکار ہے۔

سہیل (عظیم آبادی) اور حلیم (شمبھو ناتھ بھٹ) کو تمہارے خط دے دیئے۔ تم نے سری نگر سے میرے جانے کے وقت جو تردّد اور پریشانی میرے چہرے پر دیکھی تھی۔ اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ میں اب بھی اس تبادلے کو اپنی شکست تصور کرتا ہوں اور یہ احساس شکست بہت بری چیز ہوتی ہے خیالؔ! بہت ہی ظالم چیز۔

ٹھاکر پونچھی اور طاہرہ (طاہرہ حسن جو ریڈیو سے خبریں پڑھا کرتی تھیں) سے ابھی تک ملاقات نہیں ہونے پائی۔ کل انشاء اللہ ملاقات کا وقت نکالوں گا۔

''پمپوش'' (دہلی کی کشمیری بزم ادب کا رسالہ) پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ بڑا ہی تھرڈ کلاس پرچہ ہے۔ یہ لوگ ادھر بس ڈھول بجانا جانتے ہیں۔ شعر و ادب کی تخلیق ان کے بس کا روگ نہیں۔ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ کلچرل کانفرنس کس قدر عظیم قوتوں کی جماعت ہے۔

تم سب کی یاد آرہی ہے۔

9/ ستمبر 1957ء علی محمد لون

کشمیری یونٹ۔ آل انڈیا ریڈیو۔ نئی دہلی

..........●●..........

O

مکرم جناب خیالؔ صاحب۔ تسلیم

آپ کا خط مل گیا۔ اور ''اقبال'' کے چند پرچے بھی موصول ہوئے۔ بہت بہت شکریہ۔ دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس وقت تک اقبال کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ جس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

کشمیر کے لوگ اپنی تاریخ کے ایک پر آشوب دور سے گزر رہے ہیں۔ انسان کی رہنمائی کے لئے ایسے اخباروں کی ضرورت ہے جو بے خوف ہو کر صحیح راستہ دکھا سکیں۔

آپ نے کئی بار ثابت کر دیا ہے کہ آپ تعصّبات اور غلط اندازوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ''اقبال'' کو چلانے میں آپ ایسے ہی اوصاف کو کام میں لائیں گے اور آپ اس کو کامیاب بنائیں گے۔

پریم ناتھ بزاز

نئی دہلی

25 رفروری 1968ء

O

عزیز خیالؔ!

کچھ عرصہ پہلے تمہارا خط ملا تھا۔ تم نے لکھا تھا کہ دہلی آ کر یہاں چند روز قیام کرو گے لیکن یہ قیام میرے ہاں نہیں بلکہ کہیں اور ہوگا۔ اب تو بہت دن ہوئے۔ پتہ نہیں تم آئے بھی ہو۔ چلے بھی گئے ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا ہے کہ تم ایک ذلیل آدمی ہو۔

تمہیں نہیں معلوم کہ تمہاری بھابی تمہارے یہاں قیام کرنے سے کتنی خوش ہوتی ہے۔ میں کلچرل اکادمی کی میٹنگ میں شرکت کے لئے جموں گیا تھا۔ اکادمی نے مجھے اور کئی اور احباب کو خلعت فاخرہ سے نوازا ہے لیکن میں نے یہ اعزاز لینے سے انکار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کشمیری زبان کو اس کا حق نہ دیا جائے میں تب تک کوئی ایوارڈ یا اعزاز قبول نہیں کروں گا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ

رحمان راہیؔ وغیرہ یہ اعزاز قبول کریں گے۔ پانچ سو روپے اور رفل کا شال بھلا کون چھوڑے گا۔ ممکن ہے کہ امین کاملؔ انکار کر لے۔

صدرِ اکادمی (ریاست کے وزیرِ اعلیٰ غلام محمد صادق) نے بہر حال کلچرل کمپلیکس کے لئے زمین کی منظوری دے دی ہے۔ یہ کمپلیکس ڈل جھیل کے کنارے نہرو پارک سے آگے کی طرف قائم کیا جائے گا۔ یہ ایک مبارک بات ہے۔

میں اس سال بھی اپنی کتاب شائع نہیں کر سکا۔ جہنم میں جائے وہ کاتب جو اس کی کتابت کر رہا ہے۔

میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میری طرف سے اپنے والدین اور سبھی اہل خانہ کو سلام۔ توشہ (بیگم سنتوش) کی طرف سے بھی آداب۔ زندہ رہیں تو ملاقات ہوگی۔ (کشمیری سے ترجمہ)

غلام رسول سنتوش

نئی دہلی

30/مارچ 1971ء

O

خیالؔ صاحب۔ عید مبارک

لیکن اس کے بعد کیا؟ یہ میرا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تین چیزوں کے خوف سے میں آج پورے پندرہ سال سے بھاگ رہا ہوں۔ خدا، موسیقی اور شاعری۔ خیر:

ع ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

مسعود احمد تبسم گزشتہ تین ماہ سے مجھے ''وطن'' کے لئے کچھ لکھنے کی برابر ترغیب دے رہا ہے۔ طاؤس بانہالی کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی ہے لیکن یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میرے پاس ایک بھی غزل یا نظم محفوظ نہیں ہے۔ اس ایٹمی دور میں کیا شاعری کروں؟ جب کہ کبھی کبھی مہجورؔ اور آزادؔ بھی اس لحاظ سے خوش قسمت دکھائی دیتے ہیں کہ میرے جیسے حال زار میں الجھنے کے بجائے اس دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔ ناداری اور جبر تو انسان برداشت کر سکتا ہے مگر بے مقصد بن باس نہیں۔

بہر حال چند روایتی گیت آج سے چند سال پہلے ریڈیو کے لئے ریکارڈ کئے تھے جو ''وطن'' کے لئے پیشِ خدمت ہیں۔ فی الحال اسی پر گزارہ کریں:

آن راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است

بردار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت

13 / اپریل 1965ء — غلام رسول طاؤس بانہالی

راولپنڈی

O

پیارے بھائی آداب!

آپ کا عنایت نامہ 24 / مارچ کا کل کراچی سے واپسی پر ملا۔ جواب میں تاخیر کا یہی سبب ہے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے یاد فرمایا۔

کشمیر کے موضوع پر میں نے بہت نظمیں کہی ہیں۔ ایک زمانے میں ''رخت بہ کاشمر کشا'' کے عنوان سے ان تمام نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا لیکن اس کی اشاعت کی طرف اس لئے توجہ نہیں دے سکا کہ نظمیں ایک ایک دو دو کر کے میرے مختلف مجموعوں میں شامل ہوتی رہیں۔ اس وقت بھی جو تازہ مجموعۂ کلام کراچی میں چھپا ہے اس میں کشمیر کے متعلق ''گلمرگ''، ''ایک تاثر ولر کے کنارے''، ''اے دل بے قرار دیکھ''، ''اے دریائے چناب'' اور ''سیرِ کشمیر کا ایک تاثر'' موجود ہیں۔ مجموعۂ کلام کا نام ''بوئے رمیدہ'' ہے۔ گذشتہ ہفتے کراچی میں اس کی رسم رونمائی ہوئی۔ اس کی ایک جلد میں رجسٹری کے ذریعہ آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دو تین نظمیں اس وقت نقل تیار کرنے کے لئے دے رکھی ہیں۔ وہ بھی ایک دو دن میں آپ کو بھیج دوں گا۔ سر دست اس خط کے ساتھ دو نظمیں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ کو جو نظم اور جتنی نظمیں پسند ہوں آپ اپنی کتاب میں شائع کر سکتے ہیں۔

نیاز مند

جگن ناتھ آزاد

17 / اپریل 1989ء — A-25 گورنمنٹ کوارٹرس

گاندھی نگر جموں

..........●●..........

O

بھائی خیالؔ!

یہ تمہاری نیکی ہے کہ اپنا ہفت روزہ ''وطن'' مجھے برابر ارسال کررہے ہو۔ میں اس پرچے کے لئے بیتابی کے ساتھ انتظار کرتا رہتا ہوں۔ کچھ کارٹون خاص کر ''بول رادھا بول'' بہت ہی اچھے تھے۔ مگر یہ کارٹون دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کارٹون بنانے والے کو نقش بنانے میں زیادہ مہارت حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں اپنے قلم کو مستعدر کھ سکا تو پھر وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ ورنہ انجام تو تمہیں معلوم ہے ہی۔

دل کہتا ہے کہ تمہارے پرچے کے لئے کشمیری میں ایک نظم تحریر کرسکوں۔ مگر طبیعت مائل نہ ہوسکی۔ اگر یہ حال رہا تو اپنی ایک اردو نظم کا ترجمہ ارسال کروں گا جس کا عنوان ہے ''اے اہلِ شہر''۔

تم نے جو ایک ہی شاعر کے کلام کا گوشہ مخصوص رکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس کے ساتھ شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی بھی دیا کرو۔ تمہیں یاد ہوگا کہ رسالہ ''فنون'' پہلے کسی شاعر کے کلام پر ایک جامع تبصرہ اور اس کے بعد اُس کا کلام چھاپتا تھا۔ اس سے قاری کی رہبری ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا تبصرہ صرف وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو تعصب اور جانبداری سے بالاتر ہو۔

آج میں نے یہ خط لکھا تا کہ تمہاری تسلی ہوسکے۔ بتیسی کیوں دکھا رہے ہو؟ میری باتیں تو سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ امین کامل ٹھیک ہے نا؟ غلام نبی فراق کا کلام پڑھا۔ غزل پیاری ہے۔ رحمان راہی اور مظفر عازم کیا زندہ ہیں؟ رشید نازکی کا ایڈریس اگر معلوم ہو تو مجھے بھیج دو۔ حامدی کشمیری کو سلام کہنا۔

کیا وہاں جاڑے نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا ہے یا نہیں۔

میرا خیال ہے کہ چند ماہ تک میری ایک اور تصنیف ''ساغر آرزو'' شائع ہوگی جو تمثیلوں پر مشتمل ہے۔ اسے میں آفسیٹ پر طبع کروا رہا ہوں۔ اُس کے بعد اپنی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''برگِ بہار'' چھاپنے کا خیال ہے۔ یہ دونوں کتابیں سال رواں میں ہی شائع ہوں گی۔

اچھا اب اجازت ہو۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔

17/جنوری 1966ء   قیصر قلندرؔ۔ اندور

..........●●..........

O

برادرم خیالؔ صاحب۔ سلام مسنون

ایک عرصہ کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ کچھ عرصہ سے خط و کتابت کے سلسلے میں بے قاعدگی پیدا ہوئی ہے۔ اس کی وجہ قابلِ فہم ہے۔

''نوائے وقت'' اور ''نیشن'' میں آپ کی رپورٹیں اور خبریں دیکھتا ہوں۔ اس شاندار رپورٹنگ کے لئے مبارکباد قبول کریں۔ بلاشبہ آپ ایک تجربہ کار، باصلاحیت اور پیشہ ور صحافی ہیں۔ مجید نظامی صاحب (ایڈیٹر ''نوائے وقت'') اور عارف نظامی صاحب (ایڈیٹر ''نیشن'') سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے اور آپ کا ذکرِ خیر بھی آتا ہے۔ دونوں آپ کے کام سے مطمئن اور خوش ہیں۔ آپ کی خبروں سے ان دونوں اخبارات کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کا انہیں احساس ہے۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

26/نومبر 1989ء

خواجہ عبدالصمد وانی

ایڈیٹر ''کشیر''، فیض آباد۔ راولپنڈی

O

اسلام علیکم

''بانڈی پورہ میں رات'' نظم ارسال ہے۔ دو مہینے ہو گئے کشمیر سے لوٹے ہوئے لیکن ابھی تک وادی کی مہک سانسوں میں ہے۔ احباب کا خلوص لہو میں رینگتا ہے۔ خدا جانے یہ پیارے لوگ اب کب دیکھنے کو ملیں۔

سفر کے ایک ساتھی مخدوم محی الدین تو چل بسے بھی۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔

5/جولائی 1972ء

عادل منصوری

احمد آباد

............●●............

O

جناب محترم۔السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ مرقومہ 29/اگست ملا تھا۔جواب عرض کرنے میں قدرے دیر ہوئی جس کے لئے معذرت طلب ہوں۔

''لالہ صحرا'' کا پہلا ایڈیشن 1946ء میں طبع ہوا تھا۔کُل ایک ہزار جلدیں تھیں جو تمام اسی سال تقسیم ہو چکی تھیں۔رہی سہی کاپیاں ایک ایک کر کے اس عرصے میں ختم ہو چکی ہیں۔اب یہاں کوئی کاپی ڈھونڈ کر بھی نہیں ملی۔دوسرا ایڈیشن چھپوانے کا خیال تھا لیکن آج تک چھپ نہ سکا۔انشاء اللہ دوسرا ایڈیشن چھپنے پر آپ کی خدمت میں ایک جلد ارسال کی جائے گی۔

آپ کی مہربانی کا بہت بہت شکریہ۔

21/ستمبر 1959ء — رسؔا جاودانی۔بھدرواہ،کشمیر

O

برادرم!

آپ کے کرم سے ''اقبال'' اکثر ملتا ہے۔یک جہتی نمبر آپ نے بھجوایا تھا اور محترمہ رونق جہاں زیدہ مدیرہ ''روشنی'' نے بھی۔

اپنے تاثرات آپ کو اس لئے بھیج رہا ہوں کہ جو لوگ مجھے پسند آتے ہیں ان کی خاطر شکنی مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ان تاثرات میں اگر کوئی بات آپ کو غلط یا ناگوار لگے تو اشارہ کریں۔اگر آپ اسے قابل اشاعت سمجھتے ہیں تو ''اقبال'' میں چھاپ لیں لیکن زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ''روشنی'' میں چھپے۔امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

(بشیر بدؔر صاحب نے ''اقبال'' کے اس خصوصی ایڈیشن پر ایک مبسوط تبصرہ تحریر کیا تھا جسے بعد میں میرے اس ہفت روزہ ''اقبال'' کی 7/جنوری 1974ء کی اشاعت میں شامل کیا گیا۔خیاؔل)

بشیر بدؔر

25/دسمبر 1973ء — شعبۂ اردو۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ

..........●●..........

O

جناب خیالؔ صاحب، تسلیم

آپ کا نامہ موصول ہونے پر مجھے اتنا تعجب ہوا کہ کیا کہوں۔ حق تو یہ ہے کہ میں پل بھر کے لئے ششدر رہ گیا۔ پھر جب ہوش میں آیا تو دل نے محسوس کیا کہ کارواں کو ایک درماندہ راہی کی بھی یاد آئی ہے۔ دیر سے ہی سہی مگر مجھے یاد کرنے پر میری طرف سے شکریہ۔

آپ کا یہ پوچھنا کہ کیا ہمیں کشمیر کے ادب دوست بھائیوں کی یا آپ کی واقفیت حاصل ہے ظاہر کرتا ہے کہ ابھی تک آپ کو مادرِ کشمیر کی گود سے باہر نکلنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا ہے تا کہ آپ کو معلوم ہوتا کہ دور رہ کر تڑپنا کیا ہوتا ہے۔ گستاخی معاف یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہم یہاں دیوانوں کی طرح لوگوں سے پوچھتے رہتے ہیں کہ کشمیر میں تمدنی میراث کی کون رکھوالی کر رہا ہے اور کشمیری زبان کی زلفیں سنوارنے میں کون کون سے احباب محوِ کار ہیں۔

یہاں دہلی میں کشمیری بزم ادب چار سال سے سرگرم عمل ہے۔ ہم نے اب ایک رسالہ ''پمپوش'' جاری کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پہلے پہل یہ دو ماہی جریدہ ہوگا اور تجربہ کامیاب ہونے کی صورت میں اسے ایک ماہنامہ کی شکل دی جائے گی۔ اوّلین شمارہ اگست میں منظر عام پر آئے گا۔ عرض یہ ہے کہ اپنا تازہ کلام اس میں اشاعت کے لئے ارسال کریں۔

بزم کے سیکرٹری، بشمبر ناتھ کول اور ٹھاکر پونچھی سلام کہتے ہیں۔

رسالہ ''بیسویں صدی'' نئی دہلی میں سب سے پہلے آپ کی کشمیری غزل شائع ہونے کے لئے مبارک باد۔

9/جون 1957ء

شمبھو ناتھ بھٹ حلیم کاشمیری

آل انڈیا ریڈیو۔ کشمیر یونٹ۔ نئی دہلی

O

شاذ نواز!

آپ کا نامہ التفات پہنچا۔ جلو میں ہزار ہا خوشگوار یادیں لئے آپ کی صورت و سیرت کے کئی عکس ابھر گئے۔ یہ آپ نے کیا کہا کہ میں نے آپ کو بھلا دیا ہے۔ اگر خط و کتابت ہی بنیاد دوستی ہے تو مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کو اب تک بھلائے رکھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تعلقات و مراسم کی نیو دل میں پڑتی ہے اور یہ وہ زمین ہے جس کی مٹی ہمیشہ نم رہتی ہے۔

ماہنامہ ''بیسویں صدی'' میں آپ کی خوبصورت نظم کا ترجمہ پڑھا تھا۔ کاش میں آپ کی زبان بھی سمجھ سکتا۔ کشمیری میں اس کا لطف کچھ اور ہوگا۔

ادھر میں نے جو کچھ کہا تھا ان تمام تخلیقات کی نکاسی ہوگئی ہے۔ میری نظمیں ان دنوں پاکستان کے رسائل میں نکلتی ہیں اس لئے کہ انڈیا میں اب کوئی جاندار رسالہ (میری نظر میں) نہیں رہا۔

نیا دور، شعور، افکار، ادب لطیف، مہر نیم روز، نئی تحریریں اور دوسرے پاکستانی رسائل آپ کی نظر سے گزرتے ہوں تو میری تازہ نظمیں آپ نے دیکھی ہوں گی۔

مخمور صاحب (مخمور جالندھری) کے تازہ مکتوب سے اطلاع ملی ہے کہ ''شاہراہ'' اپنے نئے سفر کا آغاز کر رہا ہے۔ ان کی فرمائش کی تکمیل میں اپنی تین ناتمام غزلیں بھجوادی ہیں۔ جنہیں آپ عنقریب دیکھ سکیں گے۔ ویسے کوئی تازہ چیز ہو جائے تو آپ کی نذر کروں گا۔

شاذ تمکنت

یکم جولائی 1957ء　　　687۔ معظم پورہ۔ حیدرآباد دکن

............●●............

محترمی خیالؔ صاحب آداب

نوازش نامہ ملا۔ خدا کرے نیا سال آپ کے لئے بھی مبارک ثابت ہو۔ آپ کی نیک تمناؤں کا مشکور ہوں۔

آپ کی غزلیں میری نظر سے گزر رہی ہیں۔ دوستوں میں آپ کا ذکر آتا رہتا ہے۔ آپ کا

رباعیاتِ عمر خیاّم کا منظوم ترجمہ دیکھنا یقیناً پسند کروں گا۔ کیا آپ ''بیسویں صدی'' کو پہلی قسط روانہ کر چکے ہیں؟

''راہی'' کے تازہ شمارے میں میری ایک کہانی ''چتا'' شائع ہوئی ہے۔ اُس کے متعلق کیا خیال ہے۔ اس کہانی کا یا میری دوسری کہانیوں کا کشمیری میں ترجمہ ہوسکتا ہے؟ اس سلسلے میں آپ کے جواب کا اِنتظار کروں گا۔

نیز یہ بھی لکھئے کہ کشمیر سے اُردو کے کون کون سے پرچے شائع ہوتے ہیں۔ ان کے پتے بھی لکھئے گا۔ اگر آپ کا ان کے ساتھ کوئی سلسلہ ہوتو پرچے بھی بھجوائے گا۔

''مادرِوطن'' کو بھی کوئی کشمیری نظم معہ ترجمہ ارسال فرمائیے۔

رام لعل ۔لکھنؤ 8رجنوری 1958ء

O

جناب خیاؔل!

آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ یعنی زندگی میں پہلا Love Letter لکھا۔ عشق کی تاریخ میں یہ اہم واقعہ ہے۔

آپ کی پیش کش پہ میرا یہ وہم ایک بار پھر پختہ ہوگیا کہ میں بھی عوام کے چاہنے والوں میں ہوں۔ لیکن حضور! ان کم بخت ڈاکٹروں سے کیا سلوک کیا جائے جنہوں نے میرا مزید چاہا جانا مشکل بنا دیا ہے۔ ایک اعصابی مرض میں مبتلا رہنے کے بعد انہوں نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ حضرت اب تک بہت کچھ لکھ چکے۔ ذرا رک جاؤ۔ ورنہ......؟

اور خیاؔل صاحب۔ یہ خوفناک ''؟'' خدمت میں پیش ہے۔ بحال ہوجاؤں تو......لیکن دوست !بحالی تک اگر''اقبال'' کے درشن ہوتے رہیں تو میں چاہے قریب نہ آوٴں آپ کی قربت تو رہے گی۔

فکر تونسوی 24راپریل 1972ء

روزنامہ ملاپ

A-8۔ بہادر شاہ ظفر مارگ۔ نئی دہلی

............●●............

O

محترم خیال صاحب!

نوازش شکم باسلامت۔!!

تقریباً ایک ماہ سے ''اقبال'' برابر موصول ہورہا ہے۔ بربنائے علالت شکریہ نامہ ارسال نہ کرسکا۔تاخیر کی معافی چاہوں گا۔

پرچہ اچھا ہے۔خصوصاً آپ کے واشگاف اداریے مولانا ظفر علی خان کی یاد دلاتے ہیں۔

کوئی اگر مجھے اُردو جرنلسٹوں کی تحریری ساخت و پرداخت، سیاسی شکل وشمائل اور ادبی نوک پلک کے بارے میں دریافت کرے تو بخدا غیر جانب دارانہ اعتبار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ببانگ دہل کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں شورش کاشمیری اور ہندوستان میں غلام نبی خیاؔل اس میدان میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔نہ صرف یہ بلکہ ان دونوں کے سروں پر الگ الگ صحافتی انشا پردازی کا تاجِ خلافت رکھ دیا جائے تو کسی بھی نکتہ نظر سے بے جا نہ ہوگا۔''اقبال'' کا شعری صفحہ بہت کمزور ہے۔عادلؔ منصوری کے علاوہ اب تک جتنے بھی شعرا کو پڑھا سب کے سب روایتی نظر آئے۔کیا کشمیر میں اسی قسم کا ادب پسند کیا جاتا ہے۔ان باتوں کے لئے تو ہمارے یوپی کے ادبی پسماندگان یعنی دقیانوسی شاعر ہی کافی ہیں۔باوجود اس کے یہاں ایک لٹریری طبقہ ایسا بھی ہے جو مذکورہ شاعری کو پست درجہ تو نہیں البتہ گل، بلبل، ہجر و وصال، رقیب، کشتی، طوفان اور اسی قبیل کی دوسری حرکتوں سے تیار کردہ صوری و معنوی حلول مرکب کو نہ تو ابتذال سمجھتا ہے نہ معیوب۔بلکہ آؤٹ آف ڈیٹ ضرور سمجھتا ہے۔

آپ بالکل جدید قسم کی غزلیں اور نظمیں شائع کیا کیجئے جیسا کہ الہ آباد سے نکلنے والے ''شب خون''، لکھنؤ کے ''کتاب''، بمبئی کے ''شاعر''، دہلی کے ''تحریک'' اور ''سطور'' میں ہوتی ہیں تا کہ آپ کے قارئین کو صحت بخش ادبی حیاتین تو ملیں۔

''پراگاش'' اور ''زنجورہ ہُند ساز'' آپ نے کون سی زبان میں لکھی ہیں۔فارسی میں یا کشمیری میں۔''رباعیاتِ عمر خیاؔم'' اور ''بوطیقا'' کا ترجمہ کس بھاشا میں کیا گیا ہے۔رہی آپ کی حالیہ تصنیف ''گاشرِ منار'' کی بات تو اس میں آپ نے جہاں ہوؔمر، ورجلؔ، کالیداسؔ، امرالقیسؔ، ڈانٹے، حافظ،

شیکسپیئرؔ، گوئٹےؔ، پشکنؔ، اقبالؔ اور ٹیگور پر تحقیقی مقالات شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس کے ساتھ ساتھ ملاغنی کاشمیری ملک الشعرأالہند اور اورنگ زیب کی فن کارانہ بصیرت پر ایک بھرپور مقالہ ہوتا اور انڈین شیکسپیئرؔ آغا حشر کاشمیری پر بھی۔ لیکن اب تو ''گاشری مُنار'' طباعت کے شکنجے میں پھنس چکی ہے۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

سلامت علی مہدیؔ کا خط دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو امرالقیسؔ کی تصویر کی ضرورت ہے۔ میں فی الحال وعدہ تو نہیں کرتا البتہ چھ ماہ بعد اگر ہو سکا تو یقیناً جناب والا کی خدمت میں ارسال کر دی جائے گی۔ میں نے یہاں کے اخبار فروشوں سے ''اقبال'' کے سلسلہ میں گفت و شنید کی ہے۔ جلد ہی ان میں سے کسی کا خط آپ کو موصول ہوگا۔ نیز میرٹھ سے نکلنے والے ماہنامہ ''روشی'' میں ''اقبال'' کا پبلسٹی اشتہار دے دیا ہے۔ ماہ اگست سے شائع ہونے لگے گا۔ ''قومی یک جہتی نمبر'' کے واسطے عنقریب ایک نظم اور ایک افسانہ بھیج رہا ہوں۔ فقط والسلام۔

28/اگست 1972ء　　　　احمد کاشمیری

365۔ خیر نگر بازار۔ میرٹھ یوپی

O

محبّ مکرم سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ اس عزت افزائی کے لئے شکر گزار ہوں۔

ابھی دو ہفتہ پہلے میں نے دو کشمیری نوجوانوں کو اس موضوع پر (اقبال اور تحریک آزادی کشمیر) تحقیق کرنے کی درخواست کی تھی۔ اچھا ہوا کہ آپ یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ مطلوبہ میگزین تو نظر سے نہیں گزرا۔ ہاں غالباً 1904ء میں فوقؔ صاحب نے مضمون شائع کر لیا تھا۔ وہ رسالہ اب تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہاں پورا مضمون کتابوں میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اقبال کی حیات و شاعری پر یہ پہلا مضمون ہے۔

باقی تفصیلات پر اتنے دور رہ کر کیسے گفتگو ہو سکتی ہے۔ یا تو آپ دہلی آئیں یا میں کشمیر حاضر

ہو جاؤں تو مواد و مسائل پر کھل کر گفتگو ہو سکتی ہے۔

میری تیسری کتاب علامہ اقبال پر حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ آپ کے مطالعہ کے لئے ارسال ہے اور براہ کرم اپنے موٴقر اخبار میں اس پر تبصرہ فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

28/اکتوبر 1976ء ڈاکٹر عبدالحق

شعبہ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

O

پیارے خیال صاحب!

میں آپ کے خط کے لئے آپ کا مشکور ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کشمیر میں میری نئی فلم ''پریم پجاری'' کے بارے میں جو افواہیں پھیلائی گئی ہیں۔ آپ نے میری توجہ اُس کی طرف مبذول کی ہے۔ اس سلسلے میں، میں زوردار لہجہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس فلم میں کسی بھی جگہ مسلمانوں کو بُرے طور پر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ فلم کے موضوع کے پیشِ نظر اس کے اختتام پر ہند پاک جنگ دکھائی گئی ہے جو کہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے میں نے یہ فلم اُن ہندوستانی ناظرین کے لئے تیار کی ہے جن میں تمام فرقوں، ذات پات اور مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ ہندوستان میں صدیوں سے ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے آئے ہیں اور رہ رہے ہیں جس سے ہندوستان کے سیکولر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ میرا دل ذاتی طور پر مسلمان فرقہ کے لئے بے حد احترام، محبت اور دوستی کے جذبات سے سرشار ہے اور ان مسلمانوں میں سے کئی میرے بہترین دوست ہیں۔ میرے ہاتھوں ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ایسی فلم بناؤں جس سے میرے مسلمان بھائیوں کے جذبات و احساسات مجروح ہو جائیں۔ اس حقیقت ہی کے پیشِ نظر کہ سنسر بورڈ نے فلم کو پاس کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فلم میں اس قسم کے قابلِ اعتراض مناظر بالکل موجود نہیں ہیں۔ چہ جائے کہ ایسی باتیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

میں دوستی، امن اور عدم تشدد میں یقین رکھتا ہوں۔ اور یہی کچھ میں نے ''پریم پجاری'' میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ میری فلم کو وسیع نقطہ نظر سے دیکھتے وقت فہم و فراست کا بول بولا ہوگا۔ بہترین خواہشات کے ساتھ۔

20/اپریل 1970ء دیو آنند

2۔ آیریس پارک۔ ہومو۔ بمبئی

............●●............

O

مکرمی خیال صاحب! تسلیم۔

آپ کا مکتوب گرامی محررہ 7/مئی 1985ء مجھے مل گیا تھا۔ جلدی جواب اس لئے تحریر نہ کر سکا کہ براہِ راست خط و کتابت ''چشم عیب بین'' سے محفوظ نہیں ہوتی۔

اب ایک بہائی کانفرنس میں شرکت کے لئے نیپال جا رہا ہوں اور یہ خط بھی وہیں سے پوسٹ کروں گا۔ وہاں میرا قیام 22/جون تک رہے گا۔ وہاں سے بنگلہ دیش کا سفر کر کے جولائی کے وسط تک واپس آ جاؤں گا۔

آپ کا تعاون مدت سے ہے۔ جس زمانہ میں (72-1968) ایران میں میرا قیام تھا۔ ایک فارسی مضمون میں رباعیاتِ خیام کے حوالے سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ میرا سابقہ عریضہ آپ کو مل گیا ہے۔

''اقبال اور کشمیر'' اقبال اکیڈیمی لاہور نے شائع کی تھی میرے پاس تو کوئی نسخہ نہیں ورنہ ضرور ارسال خدمت کرتا۔ آپ براہِ راست اکیڈیمی سے رابطہ قائم کر کے معلوم کیجئے گا۔

عزیزم مسعود کشفی آپ کو اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بہت اچھے اور وفادار آدمی ہیں۔ اگر مجوزہ کتاب کے لئے کسی تعاون کی ضرورت ہو تو ضرور لکھئے۔

کشمیر میں میرے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ''جلوۂ کشمیر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ دہلی سے لاہور اور پنجہ اکثر لوگ آتے رہتے ہیں۔ کسی سے منگوا لیجئے گا۔ اگر سفر درپیش نہ ہوتا تو میں کسی طرح حاصل کر کے ضرور ارسال کرتا۔

کیا برادرم مخلص وجدانی کا مواد بھی آپ کو مل گیا؟ اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

ڈاکٹر صابر آفاقی

7/جون 1985ء

523۔ دار الکمال لوور پلیٹ
مظفر آباد۔ آزاد کشمیر

..........●●..........

O

برادرِعزیز جناب غلام نبی خیالؔ صاحب

السلام علیکم

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا مارچ 1985ء کا ارسال کردہ خط ملا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ جلدی آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ انہی دنوں سری نگر سے ایک صاحب شفیق الاسلام سلیمی لاہور آئے تھے جو غالباً اپریل میں واپس گئے ہوں گے۔ ان کے ہاتھ میں نے اپنی کتاب کی چند جلدیں بھجوائی تھیں جن میں سے ایک انہوں نے آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھی پتہ نہیں کہ آپ کو ملی یا نہیں۔

اس کے بعد پچھلے ماہ 6 / جولائی کو میری اس کتاب کی تعارفی تقریب مظفر آباد میں ہوئی وہاں پر ایک صاحب جو آپ کو جانتے بھی تھے ملے، جو دوسرے دن واپس سری نگر جا رہے تھے۔ ایک کتاب اپنے دستخط سے آپ کے نام ان کے ہاتھ ارسال کی تھی۔ خدا کرے کہ آپ کو مل گئی ہو۔

خواجہ عبدالصمد وانی کے ہفت روزہ ''کشیر'' میں آپ کا فوٹو اور پیغام بھی پڑھا تھا۔ آپ کی علمی اور ادبی کاوشوں سے اگر ہم بھی مستفید ہو سکیں تو ہمارے لئے بہت بڑا انعام ہوگا۔

2 / اگست 1985ء

شمس کاشمیری

جی ٹی روڈ۔ گکھڑ۔ ضلع گوجرانوالہ۔ پاکستان

O

مکرمی خیالؔ صاحب، آدابِ عرض

قبلہ کشفی صاحب جو میرے والد بھی ہیں اور اُستاد بھی، کے نام آپ کے خطوط کو پڑھ کر پہلے ہی آپ کی فنی صلاحیتوں اور شخصیت سے متاثر تھا کہ زہے نصیب آپ کے کلام کے دو مجموعے ''پراگاش'' اور ''زنجورہ ہُند ساز'' دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اُن کے مطالعہ کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ جرأت کر کے اس ابھرتے ہوئے ستارے کو خط لکھوں۔ گو کہ میں ابھی زندگی کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہوں مگر اتنی استعداد خدا نے ضرور ودیعت کی ہے کہ مادرِ وطن کے فرزندوں کو پہچانوں اور ان کی تخلیقات سے پیار کروں۔ آبِ ڈل کے موتی دُرِ یک دانہ ہیں اس لئے ہم جہاں کہیں بھی ہوں ان کی چمک دمک سے فن کی دنیا کو منور کرتے رہیں گے۔

آپ کے کلام کے دونوں مجموعے پڑھ کر نہ صرف میں آپ کے فکر وفن کی بلندی کا قائل ہوا بلکہ کشمیری زبان جو مدتوں سے بے کسی کا لبادہ اوڑھے ہے۔آپ کی ان لاثانی کاوشوں سے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شامل ہونے کے قابل ہوگئی ہے۔آپ کا اسلوب نگارش، واردات اور کیفیات قلبی کا آئینہ دار ہے۔شاعری کو آپ نے زلف ورخسار کا چکر نہیں بلکہ انسانی جذبات، احساسات اور آرزوؤں کے اِظہار کا خوبصورت ذریعہ بنایا ہے۔ پھر یہ بات بھی پسندیدہ ہے کہ ان دو مجموعوں کی بدولت ہماری شاعری کو نئے میدان اور نئے رجحانات ہاتھ آئے ہیں۔فی زمانہ وہی زبان اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ جسے ابھرنے اور آگے بڑھنے کی قوت حاصل ہو۔ جیسے کہ آپ نے کشمیری زبان کو نوازا ہے۔ مختصر آپ کے دونوں مجموعے صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے لاثانی شاہکار ہیں۔ میں ان کی مدد سے آپ کی شاعری کے بارے میں آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھل کے لئے ایک غنائیہ لکھ رہا ہوں۔ اپنے ایک مضمون ''کشمیری شاعری میں جدید رجحانات'' میں بھی آپ کا اور ان دونوں مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔

میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ ہماری زبان کا دامن فن وادب کے پاروں سے مالا مال رہے۔اس سلسلے میں غریب الوطن ہونے کے باوجود میں نے نظم ونثر میں کشمیری زبان کی ترقی کے لئے اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی لیکن لوح وقلم کی پرورش تو نسلوں کی قربانی سے ہی ہوتی ہے۔ بہرحال ہم متحرک رہے تو کامیابی حاصل ہی ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی میں اپنی ایک نظم کا اُردو ترجمہ بھیج رہا ہوں۔ یہ ترجمہ جناب عبدالعزیز فطرتؔ نے کیا ہے اور گزشتہ دنوں 5 دسمبر کو آزاد کشمیر ریڈیو سے نشر بھی ہوا۔اُمید ہے کہ آپ اسے مؤقر جریدہ ''محاذ'' کے کسی قریبی شمارے میں جگہ دیں گے۔ مجھے اگرچہ آپ سے کوئی تعارف نہیں لیکن میں ادبی رشتوں کو پیش نظر رکھ کر اُمید کرتا ہوں کہ آپ میرے خط کا جواب ضرور دیں گے۔ جناب شیخ صاحب اور مادرِ مہربان (بیگم شیخ محمد عبداللہ) نے مجھے پالا ہے اور قبلہ مسعودی صاحب کی مجھ پر ہمیشہ نظر عنایت رہی ہے۔ میں آج کل اباجی کے ساتھ ریڈیو ہی میں کام کررہا ہوں۔ اگر ہوسکے تو میرا مودبانہ سلام قبلہ شیخ صاحب، مسعودی صاحب اور مجاہد صاحب تک پہنچائے گا۔

مسعود احمد تبسم

15/دسمبر 1964ء

T/782 پرانا قلعہ۔راولپنڈی۔پاکستان

O

مکرمی ومحترمی جناب خیالؔ صاحب تسلیمات!

''آج کل'' کے مئی 1977 کے شمارے میں مرحوم غنی کشمیری کے سوانح حیات اور کلام کے بارے میں آپ کا مضمونِ لا مثال پڑھا۔ مغلیہ سلطنت کے لاتعداد ستاروں میں ایک اور بلند روشن ستارے کا تعارف کروا کر آپ نے اردو اور فارسی ادب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مرحوم مرزا غالبؔ کی مانند جناب غنیؔ کاشمیری کا خوددارانہ کردار قابلِ تعریف ہے۔ اپنی موت سے قبل مرحوم کا مذکورہ شعر اس کے حق گو ہونے کا ثبوت ہے۔:

ہم چو آتش روشن از من بُود ہر شمعِ مزار
من کہ مردم کس چراغے بر سر خاکم نہ سوخت

واہ واہ! کیا بلند پایہ خیال ہے۔

یہ تو ہر زمانہ میں ہوا ہے کہ شاعر یا افسانہ نویس کی قدر اس کی اپنی زندگی میں نہیں ہوئی۔ غالبؔ اور دیگر لاتعداد شعرا اس کے ضامن ہیں۔ لیکن بعد فنا جو حقیقت ہوتی ہے اُس کا اِظہار تو ہو ہی جاتا ہے اور زمانہ پھر بھرپور عزت وقدر کرتا ہے۔

بہرحال آپ اس کاوش کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ اور بھی خوشی کا مقام ہے کہ آپ روزانہ ''اقبال'' کے ایڈیٹر کے طور پر سرفراز ہیں اور اس طرح اُردو کی خدمت میں مشغول ہیں۔ موقعہ مِلے تو ''اقبال'' کا کوئی ادبی شمارہ یا سنڈے ایڈیشن بھجوانے کی مہربانی کریں۔ نیز خیریت۔

20رمئی 1977ء　　　　جمال قائمی

1/55 سدرشن پارک۔ نئی دہلی 110015

............●●............

O

برادرِ محترم خیالؔ صاحب

سلام مسنون۔ ممنون ہوں کہ آپ ازراہ کرم اپنا ہفتہ وار ایڈیشن پابندی سے بھجواتے ہیں۔ اس سے ایک تو کشمیر کی سیاسی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ دوسرے اس میں شعروفن کا وافر سرمایہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بجا ہیں مگر مجھے آپ کے سلسلے میں دو باتوں کا خاص طور پر اعتراف کرنا ہے۔ ایک تو آپ کی بے لاگ سیاسی تحریروں کا اور دوسرے آپ کی علمی خدمات کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں میں مقبولیت کا۔ مصنف، ناشر اور قاری کے مثلث میں ہر زاویہ اپنی جگہ اہم ہے مگر مجھے یہ دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے ملک کے اچھے فن کاروں کا دل موہ لیا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اقبال کے سلسلے میں دو ایک تجویزیں ہیں۔ برائے غور وفکر لکھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اس میں اعلیٰ مگر مختصر تنقیدی مضامین شائع فرمایئے۔ ایسے مضامین جو گروہ بند ادبی سیاست سے بالاتر ہوں اور قارئین کو ادب وفن کی صحیح سمت وسفر سے متعارف کرسکیں۔ دوسرے نئے شعری تجربوں کو زیادہ جگہ دیجئے۔ آپ کے حلقے میں بہت سے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جنہیں آپ اسی طرح چیزیں لکھنے پر آمادہ کرسکتے ہیں۔

گزشتہ دنوں دہلی میں اقبال سمینار ہوا۔ پاکستان کے علاوہ روس اور یورپ سے بھی اردو کے دانش وروں اور عالموں نے شرکت کی تھی۔ آپ نے دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں پاکستانی ادیبوں کے استقبال کی خبر شائع کرکے ایک نیک کام کیا۔ اس طرح کی خبریں شائع ہوتی رہیں تو بہت اچھا ہے۔

اقبال سمینار میں پاکستان سے جو پانچ ادیب آئے تھے ان میں غالباً چار ہندوستانی ہی تھے۔ کیا قیامت ہے کہ انسان اپنے گھر میں اجنبی اور مہمان بن کر آتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تعلق بریلی سے، ڈاکٹر جمیل جالبی کا سہارن پور سے اور ڈاکٹر عالیہ بھی یہیں کی ہیں۔ کاش دونوں ملکوں کے درمیان غیریت کا احساس ختم ہو اور ایک دوسرے کو اپنا سمجھیں۔ اُردو ایک ایسا کلچر ہے جس کی ہندوستانی اور پاکستانی میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ اردو اردو ہے اور بنیادی طور پر ایک مکمل اور مربوط کلچر ہے۔

غالب اکیڈیمی دہلی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی خدمات پر روشنی ڈالنے والوں میں پروفیسر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر خلیق انجم، رشید خان اور ڈاکٹر عبدالحق تھے۔ انوآر رضوی صاحب بے حد پیاری اور کاٹ دار نثر لکھتے ہیں اگر وہ اس جلسہ کی رپورتاژ لکھ دیں تو قارئین اقبال کے لئے ایک دلچسپ اور مفید تحریر ہوگی۔

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

14/اکتوبر 1977ء — ڈاکٹر عنوان چشتی

ریڈر شعبۂ اردو۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

O

جناب خیاؔل! سلام شوق

یقین کیجئے مجھے بار بار آپ کا خیال آرہا تھا اور میں ارادہ کر رہی تھی کہ کچھ نثری تخلیق بھی روانہ کروں کہ اتنے میں آپ کا دلنواز مکتوب ملا۔ عجب حُسن اتفاق ہے! میں نے بہت سارے افسانے بھی لکھے ہیں اور ادب لطیف کی قسم کے "پارے" بھی، نثری تقریریں بھی بہت لکھ چکی ہوں۔ لیکن میرے نام کے ساتھ شاعری کا لیبل ایسا لگ گیا ہے کہ نثر کی نوبت ہی نہیں آرہی ہے۔ اگرچہ میں نے ادبی محفلوں میں افسانے اور مضامین بھی سنائے ہیں جو پسند بھی کئے گئے اور شائع بھی ہوئے۔ لیکن "کلام" ہی کی فرمائش کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔

آپ حیدر آباد آئیں تو آپ کی راہوں میں ہماری پلکیں بچھی رہیں گی۔ آپ کا مقام نہ صرف میرا حقیر سا مختصر مکان ہوگا بلکہ سب کا دل بھی "خانہ تست" کا مصداق ہوگا۔ ایسی خوشیاں ہمیں بہت کم میسر ہوتی ہیں۔

کئی مرتبہ چاہا کہ تجدیدِ دید کشمیر کروں۔ قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ دل میں ہے کہ کشمیر جاؤں تو مختلف موسموں کے رنگ دیکھوں۔ لڑکپن میں گئی تھی تو گرمیاں تھیں۔ سنِ شعور میں سفرِ کشمیر میسر ہوا تو نومبر کا مہینہ تھا۔ خزاں کے رنگ نے میرا دل موہ لیا۔ آج تک میرے ذہن پر وہ مناظر چھائے ہوئے ہیں۔ مجھے شدید جاڑا اور موسمِ بہار دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے کبھی بھی کشمیر کو ایک سیّاح کی نظر

سے نہیں دیکھا ہے۔ میری نظر پیار کرنے والے کی نظر تھی۔ ایسا پیار جس میں بڑی عجیب سی وابستگی پنہاں تھی۔ نا قابلِ بیان احساسِ قربت۔ شاید کسی جنم میں کشمیر سے میرا گہرا رابطہ تھا!!

خدمت گرامی میں ''اقبال'' کے لئے کچھ ارسال ہے۔ ''اقبال'' کی ترقیاں قابلِ فخر ہیں۔ بڑا منفرد انداز ہے۔ روزنامہ ہو جانے سے آپ کا کام بہت بڑھ گیا ہوگا۔ میری آرزو ہے کہ ''اقبال'' کا سالنامہ نمبر تزک و احتشام کے ساتھ شائع ہو جس میں ہند و پاک کے ادیبوں کی شرکت رہے۔ ہفتہ وار ایڈیشن اور بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ میں اقبال کی خدمت کرنا اپنی سعادت تصور کرتی ہوں۔

عرصہ ہوا کشمیر کے تعلق سے ''اقبال'' میں میری ایک نظم شائع ہوئی تھی ع

صبح ہے صبح دلکشا شام ہے شام دلنواز

میں نے اس میں سے دو شعر نکال دیئے تھے آج میں آپ کو وہ شعر لکھ رہی ہوں جو میرے گہرے جذبات اور کشمیر سے لگاؤ کے آئینہ دار ہیں۔

جس زمانے میں کشمیر اور کشمیریوں میں سخت بے چینی تھی۔ اس سے متاثر ہو کر لکھا تھا:

جس پہ نہ تو نظر کرے کیوں نہ چلے وہ کارواں
اپنے کرم کی بھیک دے ماہ عجم شہ حجاز
مسلم کاشمیر کو گھیرے ہوئے ہیں تلخیاں
وادیٔ کاشمیر پر ایک نگاہِ کارساز!

خط آپ سے ملاقات کا موقع فراہم کرے تو بہت کچھ زبانی کہنا ہے۔ بہر حال اگر قلمے کچھ خدمت کر سکوں تو باعث سکون و مسرت ہوگا۔

30/ستمبر 1977ء

بانو طاہرہ سعید
گرین ویو۔ شانتی نگر۔ حیدر آباد

..........●●..........

O

محترم بھائی صاحب   آداب

آپ کا بے حد پیار میں معطر خط ملا۔ اس کا جواب تو یہ ہونا چاہیئے کہ مجھے فوراً کشمیر آ کر حقیقت کو گلے لگا لینا چاہیئے۔ جانے آپ کب بمبئی آئیں۔ آپ ہی کوئی سبیل نکالئے کہ ہم لوگ کشمیر پہنچیں۔

آپ کی خدمت میں واجدہ (رفیقہ حیات واجدہ تبسم) کی کتابیں ''آیا بسنت سکھی'' اور ''کیسے کاٹوں رین اندھری'' بھجوا رہا ہوں۔ جو بھی کتاب آئے آپ کو بھجواتا رہوں گا۔

آپ کا تبصرہ اور آپ کے اشتہارات سب نظر سے گذرے۔ آپ کا تبصرہ یہاں ''اردو ٹائمز'' میں شائع ہو رہا ہے اور اسے حیدر آباد کے اخبار میں بھی بھجوا رہا ہوں۔ آپ نے صحیح معنوں میں واجدہ تبسم کے فن کو پرکھ کر کشادہ دلی کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ حالانکہ اکثریت یہاں کے نقادوں اور ادیبوں کی آپ کی ہم خیال ہے مگر کسی میں یہ اخلاقی جرأت نہیں جس کا مظاہرہ آپ نے کیا ہے۔ اپنے بلند پایۂ ادیب ہونے کا ہی نہیں بلکہ بے باک صحافی ہونے کا آپ نے پورا ثبوت دیا۔

واجدہ کی کتابیں حالانکہ مہنگی ہیں مگر مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر کتاب ایک ماہ میں ایک ہزار بک گئی۔

بھائی صاحب! آپ نے جس پیار سے ہمیں یاد کیا ہے اسی نے یہ ہمت دلائی ہے کہ آپ کو ذرا سی تکلیف دی جائے۔ ہوا یہ کہ پچھلے دنوں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے واجدہ کی کتاب ''آیا بسنت سکھی'' اسکول، کالج اور لائبریری کے لئے تمام جموں اور کشمیر میں منظور کر لی اور وزارت تعلیم کو خط لکھا مگر ابھی تک آرڈر نہیں آیا۔ ان کے خط کی ایک نقل آپ کو بھجوا رہا ہوں اگر آپ اس کام کو عجلت سے کروا دیں تو واجدہ کی دو کتابیں جلد ہی مارکیٹ میں آ جائیں۔ بچے کی بیماری کی وجہ سے یہ تیسرا مہینہ اسپتال میں چل رہا ہے۔

امید ہے کہ آپ اس کام میں دلچسپی لیں گے۔

میری جانب سے تمام متعلقین کو بہت سلام

12 رفروری 1977ء   اشفاق احمد

ریلوے بلاک 131، فلیٹ نمبر 10

سانتا کروز۔ بمبئی 54

............●●............

O

محترمی خیالؔ صاحب

السلام علیکم۔ مدتوں کے بعد آپ کا والا نامہ ملا۔ اس اثناء میں غالباً آپ نے ''اقبال'' کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی جاری کیا ہے وہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ایک دفعہ اس سلسلے میں کچھ مواد طلب فرمایا تھا۔ جس کے جواب میں میں نے تیس روپے کی کتابیں رجسٹری کر کے بھیجی تھیں جو آپ کو نہ مل سکیں۔ اس وقت میرے پاس کوئی اس قسم کا مواد موجودہ نہیں۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

اُمید ہے کہ آپ کبھی کبھی اپنے دوستوں کے حالات سے مطلع فرمائیں گے۔ شیخ صاحب کی سوانح عمری چھپ گئی تو ایک کاپی مجھے بھی بھیج دیں۔ کشمیری لٹریچر کے سلسلہ میں جتنا مطبوعہ مواد آپ ارسال کر سکیں بھیج کر شکریہ کا موقعہ دیں۔ خصوصاً شعرا کرام اور اُن کی تخلیقات کے بارے میں جو مواد کشمیر کی اکادمی نے شائع کیا ہے۔ میرے لائق کوئی کارِ خدمت ہو تو مطلع فرمایا کریں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔

19/مارچ 1970ء

میر غلام احمد کشفی

T/782۔ پرانا قلعہ۔ راولپنڈی

O

مجی و محترمی غلام نبی صاحب! تسلیمات!

یہ بہت ممکن ہے کہ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں مگر آپ کی علمی ذات کا غائبانہ تعارف مجھے حاصل ہے اور اسی ''تعلق'' کے تحت یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں ان دنوں اپنے اُردو ماہ نامے ''گگن'' کا ''مذاہب عالم نمبر'' ترتیب دے رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے ہندوپاک کے بہت سے عالموں کا قلمی تعاون حاصل ہو چکا ہے۔ آپ سے بھی گزارش ہے کہ آپ اپنے قلمی تعاون سے اس دستاویزی نمبر کی افادیت میں اضافہ فرمائیے۔

آپ عالم ہیں۔ اس لئے آپ کو موضوع کا پابند بنانا گستاخی ہوگی لیکن آپ کی سہولیت کے

لئے تھوڑی سی نشان دہی ضروری کردوں۔

(۱) اردو صحافت میں مذہب کو کس حد تک دخل رہا ہے اور کیا مذہب کی بنیاد پر صحافت کو کامیاب بنانا درست ہے؟

(۲) خطۂ کشمیر، جموں اور لداخ کے پیروں، فقیروں، صوفیوں، سنتوں اور بھگتوں کا تفصیلی تعارف ایک مضمون کی صورت میں۔

اب آپ سے مندرجہ بالا موضوع میں سے کسی ایک پر یا دونوں پر ایک ایک سیر حاصل اور معلوماتی مضمون کی درخواست ہے۔ آپ کا ایک مضمون عام رسالے کے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس صفحوں تک طویل ہونا چاہیئے۔ براہِ کرم اپنی تخلیق کے ساتھ چند سطروں میں اپنا تعارف اور اپنا تازہ ایک فوٹو بھی ضرور مرحمت فرمائیے۔

آپ کا یہ کرم اگر دسمبر کے آخری ہفتے یا جنوری کے پہلے ہفتے تک ہو جائے تو میں نہ صرف شکر گزار ہوں گا بلکہ آپ کے اس تعاون کے لئے احسان مند بھی۔ اپنی نیک آرزوؤں اور شُبھ کامناؤں کے ساتھ۔

10 / دسمبر 1980ء　　　　شمس کنول

مدیر ''گگن''-169-A/5487- کنم دار نگر نمبر ایک

دکھرولی شرق۔ بمبئی 83

O

گل اقبال تو دائم شگفتہ

بچشم دشمنانت خار بادا

مکرمی خیالؔ صاحب۔ سلامت ورحمت

دو ہفتے گذر گئے کہ غیر متوقع طور پر آپ کا نیا شاہکار ''اقبال'' نظر نواز ہوا آپ کی یاد فرمائی قابلِ داد ہے۔ ''اقبال'' آپ کے شاداب دماغ کا ایک حسین خیال ہے جو آپ کی نئی تمناؤں کا کاغذی پیرہن بھی ہے اور پیکرِ تصویر بھی۔

''اقبال'' نے ریاست کے اُردو ہفتہ وار اخبارات میں ایک اور کا اضافہ کر کے اردو زبان و ادب کے پرستار کے لئے مقام مسرت پیدا کرلیا ہے۔ اس مسرت سے میں نے اپنا بھی حصہ پایا لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ''اقبال'' پر نگاہ پڑتے ہی مجھے ''وطن'' یاد آیا اور دل سے ہوک اٹھنے لگی۔ مسرت کی جو کیفیت پیدا ہوئی تھی اُس کی جگہ رنج وقلق نے لے لی، بہت دیر تک ''وطن'' بند ہونے کا حسرت ناک انجام مجھے تڑپاتا رہا اور پھر میں سوچنے لگا کہ آپ کے دوستوں اور نامور کشمیری ادیبوں اور شاعروں نے ''وطن'' کو ہر قیمت پر زندہ رکھنے کے لئے آپ کو اپنی ہر ممکن معاونت کا یقین دلایا تھا تو پھر وہ اس المناک انجام سے دوچار کیوں ہوا؟ ظاہر ہے کہ اگر اتنا زوردار وعدہ دینے والے یہ حضرات اپنا وعدہ وفا کرتے تو نہ ''وطن'' جوان مرگ ہوجاتا اور نہ ''اقبال'' کے پہلے ہی شمارے میں آپ کا قلم یہ رقت انگیز اداریہ اُگل دیتا۔ اداریہ آپ نے اس شعر سے شروع کیا ہے:

من از بیگانگاں ہر گز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

لیکن اس سے وہ مضمون و مفہوم نہیں ٹپکتا جو جلے دل کے ساتھ آپ نے اپنے اداریہ کے حروف والفاظ میں سمودیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس فارسی شعر کے بجائے اُردو کا یہ شعر زیادہ موزون تھا:

پلٹا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

یہ شعر آپ کی قابلِ رحم پوزیشن کا بھی آئینہ دار ہے اور آپ کے دوستوں کی ''وطن'' تراشی کا بھی۔ کشمیری زبان کا میں بھی ایک ناچیز خادم ہوں۔ ''وطن'' نکالنے سے پہلے یا اس کے بعد میں نے کبھی آپ کو ''وطن'' کی معاونت کا وعدہ نہیں دیا اور نہ کبھی اس موضوع پر کہیں کوئی تقریر داغ دی۔ لیکن اس کے باوجود آپ مجھے اپنے وطن دشمنوں یا غدارانِ وطن میں شامل کر سکتے۔ کہئے غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟

بہر حال مجھے وطن کی بے وقت موت کا جتنا افسوس ہے۔ اس سے زیادہ یہ یقین ہے کہ اگر آپ کمر باندھیں تو اسے حیاتِ نو بھی بخش سکتے ہیں۔ پھر وہ حضرات بھی آپ کی مدد ضرور کریں گے جو

اپنی گردن پر ''وطن'' کا خون لئے بیٹھے ہیں۔

''اقبال'' کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے آپ نے جو تاویل پیش کی ہے اُس نے خود بخود ایک آئینے کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں اقبالیاتی تصورات وعقائد کی تصویر صاف نظر آ رہی ہے۔ یہ ان ہی تصورات وعقائد کی نفسیاتی کارفرمائی ہے کہ آپ نے اخبار کا نام ''اقبال'' تجویز کر لیا ہے۔ خدا کرے کہ آپ کے ذہن وقلم سے آپ کے اخبار تک ہر چیز پر اقبال اپنی تمام صوری اور معنوی خوبیوں سمیت پرتو فگن رہے تا کہ اقبال کے شیدائی دل سے آپ کے ''اقبال'' کے طلب گار رہیں۔ اور پھر کون بدنصیب ہے وہ جو اقبال کا شیدائی اور طلب گار نہ ہو؟

خط طویل ہو گیا۔ بس صرف یہی ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ ''اقبال'' نکالنے سے پہلے آپ نے ''وطن'' کا تجربہ ضرور سامنے رکھا ہوگا۔ تازہ دم تحریر مجھے صرف ''اقبال'' کا یہی ایک پرچہ ملا یعنی پہلا شمارہ۔ میرے نام اخبار جاری کیجئے اور باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے رہیئے۔

22راگست 1968ء　　　　تنہا انصاری

دلنہ بارہ مولہ۔ کشمیر

مناجات

مضطرب دل صبر کا خواہاں یہ دل
جس پہ زخموں کے کئی نشتر چلے
درد کا درماں، کوئی درماں بھی ہے؟

اس زمانے نے ہمارے سامنے
رنگ کیا بدلے ہیں ہم دیکھا کئے
آخرش اپنی بصارت کھوگئی

رات اندوہناک جنگل کی یہ رات
کالے کالے کوہساروں میں اسیر
روشنی کیا اب نہ پھر دیکھیں گے ہم؟

اک کنواں بے نور ہے پیش نظر
کل یہاں ہوگا کوئی چاہِ عمیق

یہ ہمارا ایک کمرہ جو سدا ویران ہے
بارہا اس میں لکھے سورج کے گیت

کنجِ زنداں کی طرح تیرہ ہے آج
کیسے پہچانیں وہ گیسوئے حبیب
کس طرح دیکھیں ادائے دلبری
ہمدمو! کوئی چراغاں تو کرو
دل جلاؤ! شمع کی حاجت نہیں

شعلے برساتی ہوئی کل دھوپ تھی
میں تو تھا تاریک کمرے میں اسیر
بیتتے ہیں جیسے نابینا کے دن

بے نہایت تیرگی میں پُر فشاں
لے چلے تھے کس طرف کیا یاد ہے؟
بس فقط احساس کچھ اتنا سا ہے
آگ کے شعلوں پہ پڑتے تھے قدم
نیم بسمل پیاس کے مارے طیور
نیم جاں تھے سوختہ تھے بال و پر
آگ برساتی تھی ہر موجِ ہوا

بس فقط اتنا مجھے اب یاد ہے
اُس جگہ پر تھا خزاں دیدہ شجر
'ایلیٹ' کی نظم پھر کس نے پڑھی؟
" آگ کے پتھر ہیں چٹانیں ہیں منہ کھولے ہوئے

ایک قطرہ آب کا ناپید اس صحرا میں ہے
کس قدر سنگلاخ ہے دھرتی، ٹھہر جائیں ، چلیں؟
کاش اک چھوٹا سا چشمہ اس جگہ ہوتا رواں
ہم بھی تو ستا ہی لیتے دو گھڑی تھک ہار کر
تشنگی اپنی مٹاتے اور لیتے اپنی رہ"!
یاد ہے اتنا ہی کل کا واقعہ

پھر وہی کمرہ وہی سنسان جگہ
پردہ داری میں مگن ہے تیرگی
نیند آنکھوں میں سمٹ کر آگئی
اب تو سوجانے کا وقت آ بھی گیا
کاش مل جاتا سکونِ دل مجھے!

جاگتا ہے دل میں دردِ بے امان
ایک پل اس کو قرار آجائے ہے
دل کو مل جائے سرورِ یک نفس

پڑھ رہا تھا شوق سے انجیل ابھی
"ایک دن کی بات ہے جب
نیند ابراہیم پر طاری ہوئی
نیند نے کچھ ایسا جادو کر دیا
تیرگی میں شب سے پہلے کھو گیا

پھر خداوندِ جہاں نے یہ کہا
سن لے براہیم تیری نسل ہوگی تیرہ بخت
چار صدیوں تک رہے گی وہ غلام"[2]
اب تو میرا وقت خفتن ڈھل چکا
نیند بھی آنکھوں میں جل کر رہ گئی
میرے بس کی بات ہوتی چیختا
چیختا، چلاتا ، روتا خونِ دل
دو جہاں کے رب سے کرتا التجا
ربِّ اعلیٰ بخش دے میری خطا
مجھ سے نادانستہ گر سرزد ہوئی
فکر کے گہرے سمندر سے نکال!
اے خدا انگشتِ خامہ تھام لے
رہبری تا منزلِ مقصود کر
دیکھتا ہوں نیلگوں جھیلوں کے خواب
پھر نہ ٹکرائیں نگاہوں سے سراب
اے خدا ، اے کردگارِ عالمین
بخش دے مجبور بندے کی خطا!

............●● ....

[1] : ٹی، ایس، ایلیٹ کی نظم The Waste Land کے کچھ اشعار تحریف وترمیم کے ساتھ۔

[2] : عہدنامہ عتیق: پیدائش 13---14:15

کشمیر

وہ مشرق میں مشعل سی جلنے لگی
فضائے بہاراں مچلنے لگی
ڈھلی پھر حقیقت میں بادِ بہار
چلی سوئے کشمیر بادِ بہار
نشاطوں میں رقصاں نشاطؔ بہار
کھلے شالاماروں میں پھر لالہ زار
وتستاؔ کی لہروں میں چاندی گھلے
شکاروں کے ڈلؔ جھیل میں پر کھلے
سمن زار پر خیمہ زن یہ چنار
سپیدوں کے سائے میں وہ بید زار
چناروں کی چھاؤں میں یاروں کی بات
نگیںؔ کے کنارے نگاروں کی بات
کھلی چاندنی زعفراں زار میں
کوئی زَونؔ پھر لٹ گئی پیار میں

میرے ساتھیا آج کیا بات ہے
پہل کر پہلگامؔ کی رات ہے

چلی آئے پیاسی جوانی یہاں
تو پتھر پلاتے ہیں پانی یہاں
زباں پر ثنا ، ہاتھ میں جام ہو
اسی طرح گلمرگؔ میں شام ہو
خیابانِ اچھ بلؔ کی آواز سن
بیابانِ لولابؔ کا ساز سن
نوائے فقیرانِ بے حال ہے
دعائے سحر گاہِ اقبالؔ ہے
یہ تشہیر کشمیر بر حق نہ ہو
یہیں پر کہیں حسن مطلق نہ ہو

میرے ساقیا دل مچلنے لگے
"ہمالہؔ کے چشمے ابلنے لگے"

(ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، جون 1978ء)

کشمیر کا پری محل

(پری محل وادیٔ کشمیر کی مشہور ڈل جھیل کے جنوب مشرق میں زبرون کی پہاڑی پر چشمۂ شاہی کے نزدیک واقع ہے۔

زمانۂ قدیم میں یہاں چند کھنڈرات تھے۔ایک مقامی روایت کے مطابق ایک جادوگر اپنے سحر کے زور سے ہندوستان کی شہزادیوں کو نیند میں اغوا کر کے انہی کھنڈروں میں قید کیا کرتا تھا۔ بالآخر ایک عقلمند شہزادی نے مشہور کشمیری درخت چنار کا ایک پتا اپنے باپ کے پاس لے جا کر اُسے یہ اشارہ دیا کہ جادو کی پناہ گاہ کشمیر میں ہے۔ ہند کے سبھی راجاؤں نے جادوگر پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔

مغل شہنشاہ شاہجہاں کے بیٹے داراشکوہ نے یہاں اپنے ممتاز کشمیری معلم ملا آخون شاہ کشمیری کے تدریسی اور تحقیقی سلسلہ کی خاطر ایک شاندار عمارت تعمیر کروائی جس کا نام شہزادے نے اپنی بیگم نادرہ عرف پری بانو کے نام پر پری محل رکھ دیا۔اس میں ایک رصدگاہ بھی قائم کی گئی۔اس طرح سے یہ محل رفتہ رفتہ حسن، فن، حکمت، فلسفہ، موسیقی اور کمالاتِ مجازی کا ایک مرکز بن گیا۔

پریوں کا یہ محل کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن چند سال قبل سرکاری سطح پر اس کی تھوڑی بہت مرمت کر کے اس پر نیا رنگ و روغن چڑھایا گیا ہے۔

اسی محل میں ایک چاندنی رات کو چند لمحے گزارنے کے بعد یہ نظم موزون ہوئی ہے۔خیالؔ)

پری محل سے وہ آئی صدا ابھی ابھی
کہ علم و فن کے گلستاں یہاں کھلے تھے کبھی
کبھی یہ صبح جگمگا رہی تھی خوابوں سے
کبھی یہ رات درخشاں تھی ماہتابوں سے

وہ روز و شب تھے کہ عکاس ماہ و کوکب تھے

کہ وردِ حق تھا زبانوں پہ جام بر لب تھے

یہیں پہ جلوہ نما تھا خیالِ آخوں شاہ

جلال سطوت شاہی کمالِ آخوں شاہ

یہ زینہ جس پہ اگا ہے یہ سبزہ و زنگار

یہاں ہیں ثبت ابھی نقش پا نگاروں کے

وہ طاق نیم شکستہ وہ بام تیرہ و تار

وہاں جلوس نکلتے تھے چاندتاروں کے

یہیں پہ حکمت و فن کے چراغ جلتے تھے

یہیں پہ عاشقانِ غم کے دل بہلتے تھے

یہیں پہ ساز کی لے پر گلاب جھومے تھے

یہیں پہ نور کے پردوں میں خواب جھومے تھے

پری محل سے وہ آئی صدا ابھی ابھی

کہ حسن و فن کے گلستاں یہاں کھلے تھے کبھی

..........●● ....

امن اور زندگی

میں صبح وشام منزلوں کو پھاندتا چلا گیا
کبھی نشیب کا سفر کیا، کبھی فراز کا
کبھی فلک کو چھو لیا
کبھی زمین کی تہوں میں ڈوبنے کی فکر کی
خیالؔ کا خیال تھا کہ سرحدِ نظر تو مل ہی جائے گی

مگر یہ زندگی اور اس کی وسعتیں بھی دیکھ لو
نہ اس کی ابتدا کہیں، نہ اس کی انتہا کہیں
کہ جیسے ایک جوئبار تیز گام و تیز رو
نہ جانے آئی ہے کہاں سے اور رواں ہے کس طرف؟
رُکے نہیں میرے قدم اور میں دیکھتا چلا گیا
یہ زندگی کی وسعتیں
نئے نئے فسانے اور نئی نئی حقیقتیں

سحر کا وقتِ ناز ہے
وہاں پہ مرغ زار میں ہیں فاختائیں نغمہ زن
ہے چشمِ نرگسِ حسین سرمہ سے بھری ہوئی

چمن کی شاخ شاخ پر بہار کا شباب ہے
روش روش کو اوس نے نگار خانہ کر دیا
کہ شاید ایک لالہ رخ چمن میں آئے سیر کو
میں دیکھتا رہا حیات کے یہ روپ و رنگ

ڈھلی فضا میں دوپہر کو اُس چنار کے تلے
سنائی دے رہی ہیں دو دلوں کی تیز دھڑکنیں
جو دیکھتے ہیں ایک دوسرے کو گھور گھور کے
اور ڈوبتے ہیں پیار کے طلسم خواب زار میں
قسم وہ کھا رہا ہے اے میری حیات میری جاں
میں تیرا ہوں تو میری ہے نہ ہوں گے ہم کبھی جدا
اور ان کے صبیح رخ پہ سرخیاں سی چھا گئیں
یہ دیکھ کر میری نظر مہک اٹھی
اور میں نے زندگی کو اک دوام کی دعائیں دیں

میں دیکھتا چلا گیا
غروب ہونے کو ہے آفتاب اب
وسیع ڈل کے اُس شکستہ پل کے سائے میں ابھی
وہ اک مچھیرا جال پھینک کر لگائے آس تھا
نظر جمی تھی اس کی سطح آب پر
وہ چونک سا پڑا ہے بس ابھی ابھی
اب اس کے زرد چہرے پر مچل رہی ہے زندگی

خدا کا شکر بار بار کر رہا ہے وہ ادا
اگرچہ سارے دن کا ہے حصول یہ
چلو بھی کل کا دن تو کٹ ہی جائے گا
وہ گونجنے لگا ہے ایک نغمۂ طرب فزا
اور زور زور سے وہ کھے رہا ہے اپنی ناؤ کو

اُبھر رہا ہے ماہتاب، تارے جگمگا اٹھے
صحن میں جمع ہو گئی ہیں مہ وشاں، سمن براں
وہ بج رہی ہیں پائلیں کھنک رہی ہیں چوڑیاں
یہ گونجتے ہیں نغمہ ہائے عشق نو
اشاروں ہی اشاروں میں سلام ہے، پیام ہے
سہیلی! آ کہ گیت گائیں مدھ بھرے
میرا سجن گیا ہے آج تیل بَل
میں ساری رین جاگ جاگ اس کی راہ دیکھ لوں
وہ آئے گا اور مجھ کو اپنے سینے سے لگائے گا

میں دیکھتا چلا گیا، میں سوچتا چلا گیا
وہ دشمنانِ زندگی
وہ چاہتے ہیں جو شکستِ زندگی
جو دم زدن میں لوٹتے ہیں باغ کی بہار کو
جو تیرگی کی نذر کرنا چاہتے ہیں نور کو
دلوں کی دھڑکنوں کے پہرہ دار وہ
جو چاہتے ہیں زندگی کے راستے ہوں بے نشاں

میں سوچتا چلا گیا، میں سوچتا چلا گیا

کہ ان کی سوچ بھی ہے مردہ فکر اور کچھ نہیں

ابھی حسیں ہے شالہ مار سایۂ چنار میں

طیور ڈل کی بولیاں جواں ہیں مست ہیں ابھی

شگفتہ تیل بل کو چھین لے گا کون؟

سحر ہے دوست آج بھی اجالے کی

کبوتروں کے جوڑے آج بھی ہیں ان فضاؤں میں

کسان کی کلائیوں کو کون موڑ سکتا ہے

رفوگروں کی سوئیاں کھلا رہی ہیں پھول شال پر ابھی

چراغ جھونپڑی میں ضوفگن ابھی اسی طرح

اور عورتوں کے چرخوں کی صدا ابھی بلند ہے

کنواریوں کے دل میں شوق آج بھی ہیں موج زن

یہ سوچ اب فقط ہے ایک وہم اور کچھ نہیں

یہ زندگی امر ہے، یہ حیات لازوال ہے۔

خلش

یاد کیوں آتے ہیں پھر وہ روز شب
وہ سہانے دن تو کب کے کھوچکے
گردشِ دوراں پہ قرباں ہوگئے
ہائے وہ دن جب تیرا ہمراز تھا
اک خیال دل گرفتہ دل بدست
نقش پا سے پوچھتا تھا جا بہ جا
منزلِ الفت کا رہ رہ کے پتا

یاد آتی ہیں حسیں صبحیں تجھے؟
جو میرے گلنار بوسوں کے طفیل
کوثریں لب سے کھل اٹھتی تھی صدا
میرے نغمے سنتے سنتے رات بھر
تیری نیندیں جھ سے ہوتی تھیں وداع
تو کہا کرتی بصد شوق و سرور
میرا سپنا تھا ترا سپنا ترا
قربت احساس سے مدہوش ہوں

وہ حسیں صبحیں تجھے کیا یاد ہیں؟
بستیوں سے دور لوگوں سے جدا
خواب الفت کے چناروں کے تلے
دیکھتے رہتے تھے دلکش چھاؤں میں

سینۂ شفاف پر رکھتا تھا سر
کاکلوں کے عقب میں عارض کے پھول
مجھ پہ کرتے نکہتوں کی بارشیں
مور چھل کرتیں وہ شب گوں کاکلیں
یاد ہے جلتا ہوا کوئی وہ دن؟

شام کے سایوں کی کھل جاتی ردا
وصل کی شب دھیرے سے آتی قریب
دھیرے دھیرے رات ہوتی نغمہ سنج

چودھویں کا چاند ہوتا نور پاش
راہ لیتے تھے کسی گلزار کی
چاندنی گلگشت کرتی ساتھ ساتھ
اور بلائیں ریشمی ملبوس کی
لے رہی ہوتی بہ ناز و تمکنت

آنکھ لڑتی بارہا تاروں سے پھر
مسکرا اٹھتے تمناؤں کے پھول
وہ حسیں راتیں تجھے کیا یاد ہیں؟

وہ گزشتہ روز و شب یاد آ گئے
شادماں فرحاں غزل خواں روز و شب
آہ لیکن دل نشیں دھوکا، مدام
زندگی کی راہ میں کھاتا ہے دل
تھی صدائے سازِ صبحِ آرزو
یا بہارِ تازہ کی موجِ صبا
آج کیوں یاد آ گئے وہ روز و شب؟
تو نے کیوں مغموم پھر مجھ کو کیا؟

..........●● ....

ایک سال

گزشتہ سال اسی روز اپنے دل دھڑکے
روش روش پہ مسرت کے پھول خنداں تھے
دلوں پہ اوس محبت کی تم نے چھڑکی تھی
سیاہیِ شبِ ہجراں کا داغ دھویا تھا
یہی وہ دن ہے کہ وعدوں کے جام کھنکے تھے
یہی وہ دن ہے کہ باندھا تھا تم نے عہدِ وفا
تمہاری یاد مگر آج دل کو چیر گئی

لکھے تھے گیت جو الفت کے اک برس پہلے
چھنک اٹھی تھی امنگوں کی مرمریں پائل
مہک اٹھا تھا تمنا کی نزہتوں کا شباب
کیا تھا تم نے بصد ناز پیار کا اقرار
حدیث دردِ وفا اتنی جلد بھول گئے؟
میری عروسِ تمنا میری رفیقِ سفر
تمہارے چہرے سے شاداب ہیں میری نظریں
بدن کہ نور کی کرنوں کا سیم گوں پیکر
رخِ صبیح و نگاہِ خمار آلودہ

تم آج بھی میری راتوں کی تیرہ بختی میں
سجا رہی ہوا میدوں کے خواب زاروں کو
میں سوچتا ہوں کہ یہ میرا دامنِ صد چاک
تہی ہوا بھی مگر ہاں کبھی تہی نہ ہوا

گئے برس میرے سینے میں دھڑکنوں کی ترنگ
ہزار بار نہیں تم نے لاکھ بار سنی
دلِ حزیں کہ رچی جس میں آرزو کی خلش
تمہاری یادوں کی رعنائیاں سمیٹے رہا
یہی وہ دل ہے کہ اب آرزو کا مدفن ہے
امنگ زخم رسیدہ تو زخم ہیں صد چاک

میں سینچتا ہی رہا خونِ دل سے باغِ خیال
خزاں کے ہجر میں بھی آرزوئے صبحِ وصال
تمہارے پیار بھرے خط میں دیکھتا ہی رہا
جگر کے داغ، نظر کی امنگ، دل کی خلش
بہت ہی محو تھا ان آتشیں فسانوں میں
تمہاری یاد مگر آج دل کو چیر گئی

..........●● ....

تمہارے نام!

جو تو اداس رہے چاندنی بھی مرجھائے
جو حسنِ ناز پہ اترا کے تو گزر جائے
تو موجِ نور اندھیروں میں رہ بنانے لگے
جو آنکھ نم ہو تیری تو بسنت لوٹ چلے
جو تو ہنسے تو بہاروں میں زندگی آئے

ترے سکوت سے ڈوبیں حیات کی نبضیں
تو لب ہلائے تو کلیاں کھلیں چٹانوں میں
رکیں گے وقت کے پاؤں جو دور ہو کے رہو
قدم اٹھاؤ تو آساں ہو زندگی کا سفر

نویدِ صبح تیرے گیسوؤں کی رات میں ہے
ترے ہی روئے منور کی دھج ہے سونے میں
میں سوچتا ہوں کہ کس نام سے پکاروں تجھے
تو اک الاؤ ہے جس میں ہے اوس کی ٹھنڈک

............●● ....

استقبال

(ایک سانیٹ)

میری محبوبہ میری دنیا میں جب تو آگئی
محفلِ دل میں یکایک بج اُٹھے سازوں کے تار
گلستان کو چھوڑ کر تو جانبِ صحرا گئی
تیری دُنیا میں بہاریں میری دنیا خارزار

میری دنیا میں مصائب سختیاں دشواریاں
سوزِ غم ہے اضطراب درد ہے میری حیات
تیری دنیا حسن و مستی، نغمگی، گل کاریاں
پھول ہو کر تُو نے دلدل ہی کو سمجھا کائنات

جب میری جانب اُٹھی تیری محبت کی نظر
آرزو میری، تیرے صدقے ہوئی دیوانہ وار
تو نے بہر آزمائش مجھ پر اک ڈالی نظر
اور میں پہلے ہی تجھ پر کر چکا تھا دل نثار

رُخ سے اب دھو لے غبارِ غم ملا مجھ سے نظر
رات ڈھل جائے گی اور مہکے گی پھولوں کی سحر

شمع اور شاعر

گلنار شفق تو راکھ ہوئی اب رات کے پردوں میں لپٹا
اُس کوہ کی چوٹی کے پیچھے پھر دن کا سورج ڈوب گیا
پھر ہولے ہولے دن ڈوبا اور جاگے رات کے افسانے
اب کس سے کہوں شب کا قصہ، اب کون اس غم کو پہچانے
اشجار بھی ہیں خاموش کھڑے، شاخوں پر پنچھی سوئے ہیں
خلوت نے پر پھیلائے ہیں، سائے بھی کھوئے کھوئے ہیں
وہ تختِ سلیماںؔ کے اوپر بس ایک چراغ سا جلتا ہے
جیسے کوئی غول صحرائی رہ گیر کو دیکھ مچلتا ہے
یہ کوہ بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہو سڑک پر لاش پڑی
یہ چاندنی پیلی پیلی ہے، بے نور ہے یہ تاروں کی جھڑی
سازوں کے لب ہیں سر بہ مہر، آواز بھی ہے بے صوت و زباں
اس وحشت ناک سیہ شب میں ہر جذبۂ دل ہے نوحہ کناں
وہ جھاڑیوں کے اس جھرمٹ میں سہمی سی ہوائیں بیٹھی ہیں
اس صحن میں بید کی ٹہنی پر پتوں کی صدائیں اینٹھی ہیں
پھر وقت کے پاؤں رک سے گئے آنکھوں میں نیند کا نام نہیں
تنہائی پوچھے رہ رہ کر، اس رات کا کیا انجام نہیں؟

وہی بے چینی ،وہی محرومی، زخموں سے کراہیں اٹھتی ہیں

ہو دردِ جگر کی چارہ گری ہر طرف نگاہیں اٹھتی ہیں

اے شمع! تجھ پر جاں قرباں، کیا نور کی دولت پائی ہے

اس قفس کے عالمِ ہجر میں بھی تو وصل کا مژدہ لائی ہے

ہاں تیرے لئے بھی شام ڈھلے قسمت میں یوں ہی جلنا ہے

اپنے پروانوں کی خاطر رو رو کے تجھ کو پگھلنا ہے

یہ رنگ جہاں بھی دیکھتا جا پر سوزِ دروں سے دور نہ ہو

بے دم احساسوں کے مارے مغموم نہ ہو مجبور نہ ہو

جو درد تمہاری سرشت میں ہے، وہی دکھ میرا بھی ہمدم ہے

تیری بھی تاک میں آندھی ہے اور میرا عدو بھی عالم ہے

نزدیک تو آ زنداں کی شمع! میں ایک کہانی سناؤں تجھے

یہ حکایت سنگ اور سر کی ہے پھر بھی تھوڑی سی بتاؤں تجھے

فرہادوں کی قسمت ہے وہی ،بس جوئے شیر ہی لاتے ہیں

نمرود بنے ہے شاہ جہاں ،سقراط کو زہر پلاتے ہیں

اُس خام کے ہاتھ میں جام چلے یہ عاشق تلخابہ پی لے

اُس قبرستان میں پھول کھلیں ، یہ گلشن اک ویرانہ بنے

کتنے ہی نورانی چہرے ،مٹی میں مل کر خاک ہوئے

کتنے ہی ہنستے بستے گھر لمحوں کے اندر خاک ہوئے

کتنی ہی ڈولیاں بابل کے آنگن میں پڑی ہیں برسوں سے

بے نام سفر کی امیدیں راہوں میں کھڑی ہیں برسوں سے

وہاں خوشیوں کے ہنگامے ہیں، یہاں رنج والم کے نالے ہیں
سورج ڈوبے تو ابھرے یہ رنگ بھی کیسے نرالے ہیں
مرنے کی بات مسلم، ہے میں سچ سے کیوں منہ موڑوں بھلا
ہاں بات فقط اتنی سی ہے، مر کے بھی کوئی زندہ ہے سدا
کوئی موت کا سن کے لرزتا ہے، کوئی نغمہ گا کر مرتا ہے
چیونٹی کی موت ہے بس اڑنا، پروانہ رقص بھی کرتا ہے
اک نظر تو میری طرف اٹھا، مر مر کے میں بھی جیتا ہوں
اک جامِ عشق کے لب چھو کر امرت میں پیار کا پیتا ہوں
آنکھیں دے کرتارے سمٹے اشکوں کے عوض شبنم لے لی
پستی میں اور بلندی پر ہر غم سے خوشی ہر دم لے لی
اس بزم میں روشن کرتا رہا معصوم تمناؤں کے دیئے
چپ چاپ جگر پر زخم سہے اس محفل میں شکوے نہ کئے
اے شمع تجھے وہ کون سا غم پھر یاد آیا تو گریاں ہے
ہر حال میں تجھ کو جلنا ہے، جو شمع ہے وہ سوزاں ہے
میں نے بھی اشک بہائے جو دامن پر گر کر آب ہوئے
پر دل کے غم دل میں رکھے جو آہوں سے سیراب ہوئے
گر عشق ہوا محبوس تو کیا دل کے نغمے آزاد تو ہیں
نظریں ہیں نظر بند آج اگر رنگیں جلوے آزاد تو ہیں
دل کا بلبل بے چین ہوا جب باغ و بہار کی بات چلی
جیسے مجنوں تھا نجد نشیں اور لیلیٰ کی بارات چلی

میں آج بھی اُس کے خوابوں سے راتوں کو منور کرتا ہوں
میں آج بھی اُس کی یاد لئے گل کی مانند نکھرتا ہوں

شبِ چاردہم جس کے صدقے روشن ہے میرا یار ہے وہ
کوثر میں دھلی چاندی جیسا جس کا تن ہے میرا یار ہے وہ

اُس سرو قد کی بات چلے جو ارمانوں کا سہارا ہے
اُس چشم غزال کی بات کرو مدہوشی جس کا اشارا ہے

اس ہجر کا درد بھی سہنا ہے، سہنے کے سوا چارہ کیا ہے؟
جو مر بھی گئے پھر بھی زندہ رہنے کے سوا چارہ کیا ہے

امیدوں کا جو خون ہوا امیدوں کا ماتم کیوں ہو
گلِ لالہ داغ سجائے ہے لالے کو داغ کا غم کیوں ہو

جہاں زم زمِ وصل کی مستی ہو، وہاں دوری کا بھی سراب سہی
جہاں راحتِ جان کے قصے ہوں وہاں درد کا پیچ و تاب سہی

میں نے بھی نور کی آشا میں اپنا ہی خون جلایا ہے
جب ہوس جوانی کی ابھری تو بچپن کو بھی لٹایا ہے

جب خون جگر ارزان ہو، الالے میں رنگ سجایا ہے
جب دل ٹوٹا اسے جوڑ دیا ایسے ہی وقت بتایا ہے

تجھ پر بھی پیہم بیتی ہے یہ لمبی حکایت رہنے دے
یہ حوادث کا اک ماتم ہے اب اس سے شکایت رہنے دے

ہاں یہ تو کہوں غم عشق ہوا تو ساری خوشیاں بے معنی
جب غم کے پھول ہی کھلے خوشیوں کی کلیاں بے معنی

یہ حیات جو ہے بس ایسی ہے گویا بہار کی بادِ صبا
گویا دھڑکن ہر اک دل کی گویا وہ یار ہے جلوہ نما
یہ حیات جو ہے ہاں ایسی ہے اک زہر بھرا ہو جام یہاں
سر رہ اک لاش پڑی ہو یہاں اس زنداں کی ہو شام یہاں
اب چھوڑ یہ ذکرِ درد و الم اب تجھ سے یہی میں کہتا ہوں
تیرا بھی مقدر ہے جلنا اور میں بھی جلتا رہتا ہوں

............●● ....

بھیانک راستہ

یہ بھیانک راستہ
رہ رہ کے رکتے ہیں قدم ہر موڑ پر
کوہ کی چوٹی پہ ہر پل
لکہّ ہائے ابر کی شکلیں بدل جاتی ہیں
پل پل بار بار

اور پھر راونؔ کے سر پر سینگ ہوتے ہیں عیاں
رامؔ اک حجرے کے اندر ہے عبادت میں مگن
شیر وہ جھپٹا ہرن پر
کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے گم سم اژدہا
اور درختوں پر مچایا طائروں نے شور وغل

ایکؔ مردِ پیر کی نظروں میں جلوے طور کے
مصر کے بے اعتقادوں کے لئے دست بستہ وہ
خیر وبرکت کی دعائیں مانگتا ہے بار بار
خشم گیں ہے لشکرِ فرعونؔ کا ہر اک سپاہ
یہ بھیانک رہ کہ رُکتے ہیں قدم ہر موڑ پر

یہ بھیانک راستہ چھایا اندھیرا چارسو
ژالہ باری کی یہ ٹپ ٹپ اور بجلی کی کڑک
چیڑ کے اشجار کی چیخ و پکار
دیوداروں کی قطاریں گر رہی ہیں ٹوٹ کر

دور سے وہ بہہ رہا ہے آگ کا دریا اُدھر
اور چرواہا کوئی چلّا رہا ہے زور سے
اور وہ اک جھونپڑی کا سارا ملبہ
ڈھ گیا ہے ایک نالے میں اُدھر
ہو رہا ہے رام سیتا کا ملن
دیکھ وہ سونے کی لنکا جل رہی ہے
پار اترا ہے وہ موسیٰ
اور چھلکا ہے کناروں سے پرے دریائے نیل

..........●● ....

جنّتِ ارضی کی جنت

(ڈل جھیل میں رہنے والی پانچ سالہ جنّت اِن دنوں کڑاکے کی سردی میں ڈل کی صفائی کی مہم میں جٹی نظر آرہی ہے۔ وہ اپنی چھوٹی سی ناؤ میں ڈل کے پانی کو اُس آلودگی سے پاک کرنے کی مہم میں محو ہے جو ماحول کے تئیں ہماری اجتماعی بے حسی اور عاقبت نا اندیشی کی وجہ سے آبِ زلال کے اس بیش بہا ذخیرے میں پیدا ہوئی ہے۔ جنت کی اس معصومانہ لگن، شوق اور جذبے سے متاثر ہو کر میں نظم کی شکل میں یہ چند اشعار قلم بند کر کے اس باشعور دخترِ کشمیر کی نذر کرتا ہوں۔ خیالؔ)

ڈل کی روپہلی لہروں پر ہے چھوٹی سی اک ناؤ میں بیٹھی
پانچ سال کی جنّت اپنے ننھے مُنے ہاتھوں سے
جھیل کے آلودہ پانی کو
آئینے کی اُجلی صورت دیتی ہے
اور پھر گا گا کر کہتی ہے:
گدلے ڈل کو دھو دھو کر نہلاؤں گی
اور دوبارہ اس کو آبِ زلال بناؤں گی
میں ہوں جنت
یہ ڈل میری جنت ہے
ڈل ہی میری جنت ہے
جنت کی اس لگن کو دیکھا

جنت سے جنت کو ملنے حویں آئیں

آسمان سے پریاں اتریں

اور جنت کو گلے لگا کر

لہک لہک کر نغمہ چھیڑا

''خون آلود وطن کا تو ہے نکھرا چہرہ

اور یہ ڈل تیری جنت ہے

ڈل ہی تیری جنت ہے''

............●● ....

چاندنی

محلے کی گلی میں اک مکاں سے شور سا اٹھا
سنا اک گھر کی بیٹی کو اٹھا کر لے گیا کوئی
جواں تھی چاندنی، تھا نام اس کا، چاند جیسی تھی

اور اس کے بھائی '' سورج '' پر تو گویا آسمان ٹوٹا
بہن کا لاڈلا تھا اور بہن میں روح تھی اس کی
کسی سے کچھ نہ بولا اور بہن کی کھوج میں نکلا

پھر اگلی رات کو جب '' چاندنی'' بستی میں لوٹ آئی
زباں خاموش تھی آنکھیں بجھی تھیں بال بکھرے تھے
بدن تھا چُور اس کا اور قدم بھی لڑکھڑاتے تھے
محلے میں عجب عالم تھا غم بھی تھا خوشی بھی تھی
کوئی خوش تھا کہ لوٹ آئی کوئی کہتا تھا کیوں آئی
خدایا! عاصیوں کے سب گناہوں کا عفو کرنا
خدایا! عصمتوں کے چاک پردوں کا رفو کرنا

محلے میں جو آئی '' چاندنی '' تو رات بھی نکھری
مگر '' سورج '' دوبارہ لوٹ کے واپس نہیں آیا

............●● ....

تحفۂ درویش

غلام نبی خیالؔ کے منتخب مضامین

● ...... غلام نبی خیالؔ

کشمیر: سنسکرت شعریات کا مخزن

(آنند وردھن، ابھینو گپت، کھیمیندر، سوم دیو، کلہن اور بلہن کے تناظر میں)

ہندوستان کی سب سے بڑی اور قدیم کلاسیکی زبان سنسکرت کو اس لحاظ سے ایک خاص فوقیت حاصل ہے کہ اس زبان کے ذریعے ہندو دھرم کے سبھی مذہبی اور عقیدتی صحیفے عوام تک پہنچے جن میں وید، اوپنشد، مہابھارت، رامائن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسے آکاش وانی یعنی آوازِ فلک بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دیوی دیوتاؤں کی بھی زبان رہی ہے۔

کشمیر کے خطہ ارضی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی مٹی نے سنسکرت کے عدیم المثال شاعروں، ادیبوں، ماہرین لسانیات و جمالیات، مورخوں، محققوں، موسیقاروں، ڈراما نویسوں، طبیبوں، قانون سازوں، مذہبی علماء اور سیاست دانوں کو جنم دیا جن کے علمی تبحر نے دور ونزدیک پہنچ کر ان میں سے ہر ایک کو عالمی سطح پر نابغہ روزگار کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔

کشمیر میں بالخصوص بودھوں اور ہندوؤں کے ادوار حکومت میں سنسکرت کے جن ممتاز فلسفیوں، تاریخ نویسوں، تحقیق کے ماہرین اور علمائے دہر نے اپنے علم وفن کے جوہر دکھائے اُن میں آنند وردھن، ابھینو گپت، کھیمیندر، سوم دیو (بارہویں صدی)، کلہن اور بلہن شامل ہیں جن کے جزوی حالات زندگی بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہیں سے علم بلاغت، منطق، فلسفہ اور دیگر مختلف علوم کی تحقیق وتوضیح کا آغاز ہوا۔

کشمیر میں تحریر کردہ سنسکرت کے قدیم ترین صحیفے ''نیلہ مت پوران'' کے مطابق سرزمینِ کشمیر

پہلے پہل ستی سر نام کی ایک جھیل تھی جس میں جلد بھو نامی راکھشس رہتا تھا۔ وہ ہر صبح کنارے پر آ کر مقامی آبادی میں سے کئی انسانوں کو پانی کے اندر گھسیٹ کر انہیں نگل جاتا تھا۔ اس عذاب سے نجات پانے کی خاطر انھوں نے ایک خدا دوست کشیپ ریشی سے فریاد کی کہ وہ انھیں اس بلا سے آزاد کرے۔ کشیپ ایک ہزار سال تک عبادت کرتا رہا۔ پھر اسے آسمانی آواز کے ذریعے ہدایت ملی کہ وہ وادی کے شمال میں بارہ مولہ قصبے کے پاس پہاڑ میں اپنے آہنی ترشول سے سرنگ نکال کر وہیں سے پانی کے نکاس کو ممکن بنائے۔ کشیپ کے اس اقدام سے جھیل کا سارا پانی شمال مغرب کے میدانی علاقوں کی جانب بہہ نکلا اور ''جلد بھو'' سطح آب پر نمودار ہوا لیکن جب اسے کشیپ نے قتل کرنا چاہا تو وہ بھاگتا ہوا دور ایک جگہ پہنچا اور وہیں پر زیر زمین چھپ گیا۔ دریں اثناء کشیپ کی حامی ایک دیوی نے مینا کا روپ دھار کر اپنی چونچ میں ایک کنکر لے کر جلد بھو پر پھینک دیا جس سے یہ دیو زمین میں دھنس کر ہلاک ہو گیا۔ اس کنکر کی جگہ ایک پہاڑی نمودار ہوئی جسے ہاری پربت یعنی مینا کا پربت کہتے ہیں۔ یہاں کشمیری پنڈتوں کا ایک مقدس مندر ہے جہاں آج بھی ہر روز علی الصباح کشمیری ہندو پوجا کی خاطر کئی سیڑھیاں چڑھ کر عبادت کرتے ہیں۔ اسے مقامی طور پر شارِکا دیوی مندر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کشیپ ریشی کے نام پر ہی اس خطے کا نام کشمیر پڑ گیا۔

اس دیو مالائی حکایت کو یہاں اس مقصد سے بیان کیا گیا تا کہ یہ بات ذہن نشین ہو سکے کہ کشمیر کے علم و آگہی کے ان اساتذہ نے بھی سنسکرت کو ایک دیو مالائی زبان کی حیثیت میں اپنایا کہ ان کی تخلیقات کو بھی صحیفوں کی طرح مخصوص عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا اور پرکھا جائے۔ ورنہ وہ مروجہ زبانوں پالی اور پراکرت کو ہی ترجیح دیتے۔

کشمیر کی سرزمین ایک مرکزِ علم و ادب بننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان بھر سے یہاں اہالیانِ فن اور اصحاب دانش جوق در جوق آئے کیونکہ انھوں نے اس خطے کی قدرتی خوبصورتی کے قصے ذوق و شوق سے سنے تھے جن کی رو سے کشمیر عبادت الٰہی کے لئے نہایت ہی پرسکون اور اطمینان بخش جگہ تھی جہاں فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں اور دلکش باغوں اور بوستانوں کے آس پاس بقول علامہ

اقبال: ''من خدارا دیدم آں جا بے حجاب''۔ ملک کے تپتے صحراؤں اور حدت بھرے میدانی علاقوں کے برعکس انھیں کشمیر کی شاداب اور شگفتہ وادی میں روحانی طمانیت نصیب ہوئی جس کی بدولت انھوں نے اپنے فکری استدلال کے سہارے ادب لطیف کی وہ انمول قندیلیں روشن کیں جن کے نور سے ہند بھر کے دانشوروں اور طالبانِ علم کے اذہان منور ہو گئے۔

جب اشوکِ اعظم (304-232 BC) کے دور میں بدھ مت کشمیر میں وارد ہوا تو اس دھرم کے پیروکاروں نے جو تصانیف تخلیق کیں وہ پالی زبان کے برعکس سنسکرت ہی میں تحریر کی گئیں حالانکہ ہندوستان بھر میں پالی ہی بودھوں کی مسلمہ زبان کی حیثیت میں عوام الناس میں رائج تھی۔ اس زبان میں اگر کچھ کتابیں لکھی گئی ہوں تو اب نہ ان کے آثار ملتے ہیں اور نہ ہی ان کا تذکرہ، لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آسکتی کہ بدھ مت کے اصلی صحائف کے ساتھ پالی یہاں نہ پہنچی ہو۔ (1)

کشمیر چودھویں صدی عیسوی تک سنسکرت کے علماء وفضلاء کا مخصوص علاقہ رہا ہے۔ جارج گریرسن کہتا ہے کہ: ''تقریباً دو ہزار سال تک کشمیر سنسکرت کے علوم کا مرکزِ فیضان رہا جہاں تاریخ، شاعری، حکایات اور فلسفہ کی جولانیاں اہل فکر کی رہبری کرتی رہیں۔'' روایت ہے کہ اس دوران کشمیری خواتین بھی عام طور پر سنسکرت اور ایک اور قدیم زبان پراکرت ہی میں ایک دوسرے سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔ سنسکرت ان دنوں سارے کشمیر میں اتنی عام فہم تھی کہ اسلام کے کشمیر میں آنے کے بعد بھی قبرستانوں میں سنگ ہائے مزار پر کتبے اسی زبان میں کندہ کئے گئے۔

اس طرح سے ہندوستان کی ملی جلی ثقافت اور تاریخی میراث میں کشمیر ہی کے سنسکرت عالموں نے اپنی فکر انگیز تخلیقات سے ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے علمی تبحر کا چرچا نہ صرف ہند بلکہ وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا تک پہنچا۔ اشوک اور کنشک کے ادوار حکومت میں مہایان بودھ فلسفے کی تعلیمات مقامی راہبوں، لاماؤں اور رضا کاروں کے ہزاروں میل کے سفر کی بدولت چین، کوریا، جاپان اور تبت تک پھیل گئیں۔

کشمیر کے سنسکرت قلم کاروں نے بالخصوص شاعری کے میدان میں اپنا کمال دکھایا کیونکہ کشمیر

کے فطری حسن نے انہیں اس نازک صنفِ فن کی طرف راغب کیا۔ کشمیر کے حیات بخش سبزہ زار، گنگناتے ہوئے روپہلے آبشار، مخملیں چراگاہیں، صاف و شفاف جھیلیں ان کی سخن گوئی کو جلا بخشتی رہیں مگراس کے ساتھ ہی انھوں نے ملک کی ثقافتی دنیا کو ڈراما، رزمیہ، نغمہ، انشائیہ، افسانہ اور تدوین و ترتیب کے حوالے سے بھی شاندار ادبی سرمائے سے مالا مال کیا۔ اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ کشمیر سنسکرت شعریات مخزن رہا ہے۔ یہاں پر ہم سنسکرت کے نابغۂ روزگار شخصیات کا تذکرہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ سنسکرت کے قدآور عالموں اور شاعروں نے کس طرح اپنے کمال اور جمال سے سنسکرت ادبیات میں گوہر آبدار تخلیقات کو بڑی فنکاری سے ساری دنیا کے سامنے لایا ہے۔

آنندوردھن (820-890)

کشمیر میں سنسکرت کی ادبیات اور ثقافت کا دور دورہ آج سے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال قبل مقامی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر حاوی رہا۔ اس دوران سنسکرت نے یہاں ایسے عظیم المرتبت علماء وفضلاء پیدا کیے جنھوں نے اپنی فکر اور قلم سے دنیائے تمدن کو آباد کیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے لاتعداد اصحاب علم و دانش اپنی تخلیقات اور تحریریں کشمیری ماہرین ہی کو نظر ثانی کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ٹی این رینہ کے بقول: ''چنانچہ گیارھویں صدی میں ابوریحان البیرونی نے بھی اپنی چند تصانیف ترتیب دیں اور انھیں کشمیری عالموں کے پاس بھیجا تاکہ ان سے شرفِ قبولیت حاصل ہو''۔(2)

آنندوردھن اسی زمانے کا ایک منفرد قلم کار تھا جسے ادبی دنیا میں فنِ بلاغت کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی مشہور کتاب ''دھنیہ لوک'' میں فصاحت و بلاغت کے علم پر ماہرانہ انداز میں مبسوط اور جامع بحث کرنے کی بِنا ڈالی ہے۔ ٹی، این، رینہ ہی لکھتا ہے کہ: ''آنندوردھن کا نام سنسکرت علم و ادب کے اُس شعبے کے ساتھ قریبی طور وابستہ ہے جسے النکار شاستر کہا جاتا ہے۔ بہرحال ہم اسے عام اصطلاح میں فنِ بلاغت کہہ سکتے ہیں۔ ملک بھر میں اس فن کے سولہ سرکردہ استادوں اور عالموں میں سے چودہ کا تعلق کشمیر سے رہا ہے''۔(3)

عنبر بہرائچی ہندو دیومالا کے پس منظر میں آنندوردھن کے فلسفے کی یوں تشریح کرتا ہے: ''قدیم

ہندو اساطیر میں خدائے مطلق کی تین صفات یعنی خلاقی، ربوبیت اور قوّتِ فنا کی تجسیم تین دیوتاؤں یعنی برہما، وشنو اور مہیش میں کی گئی۔ یوں قدیم ہندو مذہبی تصورات میں بھی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے عقیدے کو اس شکل میں قبول کیا گیا۔ وشنو جی نے خود اپنی خواہش سے نرسنگھ کا روپ اختیار کر کے کشپُ اور اس کے راکششوں کو مار کر سیدھے سادے عام لوگوں کو ان کے مظالم سے نجات دلائی تھی"۔ یہاں نرسنگھ روپ والے بھگوان وشنو کے خوبصورت ناخنوں کو ہلال کی خوبصورتی پر فوقیت دیتے ہوئے انھیں غم زدہ اور پریشان حال انسانوں کے غموں کو کاٹنے والا بتایا گیا ہے۔ نیز دھونیہ لوک کی شرح کرنے والوں اور اس کے قارئین کی حفاظت کرنے والا بتایا گیا ہے۔(5) یہاں پر ناخنوں سے غموں کو کاٹنے والے بتانا ترکیبی لحاظ سے غیر مانوس اظہارِ بیان لگتا ہے۔

آنند وردھن کی تحریروں میں جمالیاتی حسیت کی توضیح وتشریح موجود ہے مگر اس اظہارِ بیان سے بھی اس نے جمالیات کو جنس زدہ بنا دیا ہے اور ایسا اُس نے اپنے پیش رؤں یا ہم عصروں کی تقلید کرتے ہوئے کیا ہے جن کے یہاں جنسی جبلت کا غلبہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دیگر سنسکرت علما اور فضلا کی طرح آنند وردھن کے اعصاب پر بھی ایک یا دوسرے روپ میں عورت ہی سوار رہی ہے۔ اپنی اس تخیلاتی اُپج کو اظہار کی شکل دیتے وقت وہ اس طرح کے تمثیلی اسلوب کا سہارا لے کر لغوی اور مجازی معنی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کی ایک حکایت میں ایک پنڈت سے کہا جاتا ہے: ''پنڈت جی مہاراج! گوداوری دریا کے کنارے رہنے والے پاگل شیر نے آج اُس کتے کو مار ڈالا ہے۔ اب آپ آزاد ہو کر گھومئے پھرئے۔ گوداوری کے کنارے کوئی خوبصورت جگہ کسی نوجوان عورت کے اپنے عاشق سے ملنے کا مقام ہے۔ اس جگہ کی خوبصورتی کے سبب ایک مذہبی پنڈت جی شام کی عبادت کے لیے ادھر آجاتے ہیں حالانکہ ادھر رہنے سے ظاہر ہے کہ اس سے اس بدکردار عورت کے کام میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتی ہے کہ وہ پنڈت جی ادھر نہ آئیں۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سیدھے انھیں منع نہیں کر سکتی اس لیے وہ اس مقام پر ایک خونخوار شیر کی موجودگی کی اطلاع دے کر سادھو مہاراج کو ڈراتے ہوئے وہاں آنے

سے روکتی ہے۔ وہ سادھومہاراج کو اطلاع دے رہی ہے اور کہتی ہے کہ سادھومہاراج! وہ کتا جو آپ کو روز تنگ کیا کرتا تھا اُسے گوداوری کے کنارے جھاڑیوں میں رہنے والے شیر نے مار ڈالا ہے۔ یعنی روز آپ کے گھومنے پھرنے میں رکاوٹ ڈالنے والے کتے کے مرجانے سے آپ کے راستے کے رکاوٹ ختم ہوگئی ہے اور اب آپ بے خوف ہو کر گھومیں پھریں۔ وہ بدکردار عورت جانتی ہے کہ سادھو مہاراج کتے سے ڈر جاتے ہیں۔ جب انھیں یہ معلوم ہوگا کتے کو شیر نے مار ڈالا ہے اور وہ شیر یہیں جھاڑیوں میں رہتا ہے تو وہ یقیناً ادھر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اسی لیے وہ سادھومہاراج کو بے خوف ہو کر گھومنے پھرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ لیکن بین السطور وہ یہ بتانا چاہتی ہے کہ ادھر بھول کر بھی قدم نہ رکھنا ورنہ آپ کی خیر نہیں۔

اس کے لغوی معنی مثبت ہے کہ وہ سادھو کو ممکنہ خطرے سے آگاہ کرتی ہے لیکن مجازی معنی مختلف ہیں کہ اس کے عاشق کے ساتھ اس کی بدکاری کا راستہ کھلا رہے اور وہاں کوئی دوسرا قدم رکھنے کی جرات نہ کرسکے۔

اسی طرح آنند وردھن ایک اور جگہ یہ کہانی سناتا ہے: ''کوئی راہ گیر رات میں کہیں پر آرام کرنا چاہتا ہے۔ دفعتاً اُس کی نظر کسی نوجوان عورت پر پڑتی ہے جس کا خاوند کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ راہ گیر اس عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس سے تنہائی میں وصل کا خواہاں ہے۔ یہ نوجوان عورت بھی راہگیر کی خواہش سمجھ لیتی ہے اور وہ اس سے جسمانی ملاپ سے پہلے کہے دیتی ہے: ''اے مسافر! دن میں تم میری اور میری ساس کی سونے کی جگہیں دیکھ کے رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میرے بجائے میری ساس کے بستر میں گھس جاؤ اور صبح جب اٹھو گے تو رُسوا ہو جاؤ گے''۔

آنند وردھن پر قلم اٹھانے سے پہلے تحقیق کے حوالے سے جو مواد انگریزی یا اردو میں مطلوب تھا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُس کی اپنی تخلیقات ''دھنیہ لوک'' کے سوا اس کی کوئی اور تصنیف موجود نہیں۔ ان پر اگر کسی محقق نے خامہ فرسائی کی بھی ہے تو وہ تحریریں بھی سنسکرت ہی میں ہیں جن سے ہم واقف نہیں۔ البتہ دھنیہ لوک کا اردو میں تجزیہ عنبر بہرائچی نے اسی (80) صفحات پر

مشتمل ایک کتابچے میں کیا ہے جس میں بھی انھوں نے چند سنسکرت عالموں کی تحریروں سے ہی استفادہ کیا ہے کیونکہ عنبر سنسکرت جانتے ہیں لیکن یہاں دیکھنے میں آیا ہے کہ انھوں نے کئی جگہ سنسکرت کے الفاظ اور تراکیب کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ انھیں جوں کا توں رکھا ہے۔کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بھی سنسکرت سے پوری طرح واقف نہیں تھے؟ آنندوردھن کی شخصیت اور فن کو پرکھنے میں یہ کتابچہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔تاہم اس سے ہم نے کہیں کہیں کم وبیش استفادہ کیا ہے۔

ابھینو گپت (950-1020)

ابھینو گپت کشمیر میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جس نے کئی علماء،صوفی اور ماہرین جمالیات پیدا کئے تھے۔ابھینو گپت نے پندرہ اساتذہ سے فلسفہ اور فن میں خاطر خواہ تربیت حاصل کی۔ اس نے اپنی ستر سالہ زندگی میں پینتیس تصانیف تخلیق کیں جن میں سب سے ضخیم اور سب سے مشہور ''تانترلوک'' ہے جسے تمام فلسفیانہ علوم کی اینسائیکلوپیڈیا کہا جاسکتا ہے۔اس میں بالخصوص کشمیر کے شیو فلسفے کی توضیح وتشریح بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔اس بے بہا تصنیف کا صرف اطالوی زبان میں ایک ترجمہ موجود ہے جسے رانیرونولی(Raniero Gnoli) نے کیا تھا اور جس کا دوسرا ایڈیشن 1999ء میں شائع ہوا۔اسی کتاب کے انتیسویں باب کو جان آر دوپوچے (Dupuche) نے انگریزی میں منتقل کیا۔تانترلوک کا اگرچہ کوئی انگریزی ترجمہ دستیاب نہیں لیکن شیومت کے ایک سرکردہ کشمیری عالم سوامی لکشمن جُو نے اس کی تلخیص کی جسے اس نے اپنی انگریزی تخلیق Kashmir Shaivism- The Secret Supreme میں شامل کیا۔

ابھینو گپت ساری عمر بودھ مت سے متاثر رہا۔ابھینو گپت اُس کا اصلی نام نہیں تھا بلکہ یہ لقب اسے اپنے ایک گمنام استاد نے دیا تھا جسے اس کی شخصیت میں صلاحیت اور قوت کے جوہر نظر آئے تھے۔کشمیری مورخ پریم ناتھ بزاز کی رائے میں ''ابھینو گپت شیو فلسفے کا عظیم ترین مبلغ اور سربرآوردہ ادبی نقاد تھا جس کی مشہور عالم تصنیف تانترلوک کو بجا طور پر وحدت الوجود کی بہترین تشریح کہا جاسکتا ہے۔اس یادگاری تخلیق میں 5,800 بند تھے اور اسے سنتیس ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔(6)

ابھینو گپت کی ماں ایک یوگنی تھی اور اس کے بیٹے کے بارے میں خدا دوست اہل دل نے پیشین گوئی کی تھی کہ اسے رحمِ مادر ہی میں بھگوان شیو کی شکل وصورت عطا کی گئی تھی۔ ابھینو گپت کی والدہ کا اس وقت انتقال ہوا جب وہ صرف دو سال کا تھا۔ چونکہ اسے ماں کے ساتھ بے حد جذباتی وابستگی تھی لہٰذا اس نے اس صدمے کے بعد دُنیوی معاملات کو تیاگ کر روحانیت کی دنیا میں اپنے آپ کو مستغرق کیا۔ والد نرسم گپت نے بھی شریکِ حیات کی جدائی کے بعد ایک سادھو کی زندگی کا رنگ اختیار کیا۔ ابھینو گپت اپنے باپ ہی کو اپنا پہلا گورو مانتا ہے جس کی بدولت اسے گرامر، دلیل اور ادب کے شعبوں میں ابتدائی تربیت حاصل ہوئی۔ ابھینو گپت تمام عمر غیر شادہ شدہ رہا۔ اس کے بقول اسے روحانی نجات اس کے سب سے زیادہ چہیتے استاد شمبھوناتھ کی نگہداشت میں ہی نصیب ہوسکی۔

اسے مذہبی علوم، جمالیات، فلسفہ اور تنقید کی اصناف پر یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ جمالیات کے موضوع پر اس کی تصانیف ''ابھینو بھارتی'' اور ''لوچنا'' خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ خود ابھینو گپت نے بنارس میں اپنی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے ایک شاگرد ممٹا چاری نے بھی اپنے فن سے جمالیات اور شعریات میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ابھینو گپت کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت تھی۔ وہ ان سے اکثر کہتا: ''تم شہد کی مکھیوں کی طرح کام کرو جو کئی پھولوں سے رس حاصل کر کے اس سے اپنا شہد تیار کر لیتی ہیں اور یہ کہ صرف عظیم اساتذہ سے ہی تربیت حاصل کرو پھر جو کچھ تم نے سیکھا ہو اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ''۔ (7)

ابھینو گپت کے حلیہ، رہن سہن، روزمرہ اور دیگر مصروفیات کے بارے میں جنوبی ہند کے دکن دیس سے آئے ہوئے ایک طالبِ آگہی کرشن بجوا نے اپنی ایک کتاب میں، جو اَب ناپید ہے، گپت کی زندگی کے دلچسپ واقعات پیش کیے ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کہ: ''ابھینو گپت جی انگور کے باغ میں منڈپ پر، جس کا فرش سنگِ بلور کا تھا اور جس کے ارد گرد مختلف پھولوں کی کیاریاں دھوپ اور دیپ کی خوشبو سے مہک رہی تھیں، قیمتی موتیوں کے جالر سے سجے ہوئے شامیانے کے نیچے آسن جمائے بیٹھے تھے۔ اس جگہ چندن کی خوشبو چاروں اور پھیل رہی تھی۔ مزید کہتا ہے کہ: ''محفلِ ادب جمی ہوئی

تھی۔ ساز و آہنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اُن کے سامنے ان کے مشہور شاگرد کھیم راج وغیرہ زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے تھے۔ ابھینو اپنی زبانِ مبارک سے فرماتے جاتے تھے اور شاگرد اِن ارشادات کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ ابھینو گپت جی کی دونوں طرف دو عورتیں کھڑی تھیں۔ ایک عورت کے ایک ہاتھ میں شیورس کا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں کنول کا پھول تھا۔ دوسری عورت کے ایک ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور دوسرے ہاتھ میں انار کا پھل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابھینو گپت کی آنکھیں خمار اور مستی سے سرشار تھیں۔ ان کے ماتھے پر بھسم کا تلک اور کانوں میں رُودر کے دانے آویزاں ہوتے تھے۔ ان کی لمبی داڑھی سینے پر لٹک رہی تھی۔ سر لمبی جٹاؤوں سے بھرا تھا۔ رنگ گورا تھا۔ یکھش دھوپ یعنی ایک قسم کی بوٹی کا رس گلے پر ملنے سے ان کا کنٹھ نیلے رنگ کا ہو گیا تھا۔ وہ جنیو یعنی زنار بھی ڈالے تھے۔ سفید ریشم کا فقیری چولا پہنے تھے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں مالا یعنی تسبیح لٹک رہی تھی۔ بائیں ہاتھ سے سریلی تان میں ستار بجایا کرتے تھے"۔(8) ابھینو گپت کے اس روزمرہ سے قطع نظر ان کی عالمانہ خدمات اور فلسفے کی عمیق دنیا میں غوطہ خوری کے بعد ان کی عطا کی ہوئی دین انہیں کشمیر کے ممتاز سنسکرت عالموں اور فاضلوں میں ایک ارفع مقام عطا کرتی ہے۔

ابھینو گپت کی وفات کے بارے میں دینا ناتھ شاستری ہی کا کہنا ہے کہ: "وہ ایک دن اپنے بارہ سو شاگردوں سمیت ذاتِ عالی پرم شیو کی صفات گاتے گاتے وسطی کشمیر کے دیہات من گام کے نزدیک بھیرو غار کے دہانے تک پہنچے اور نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو کر ذات حق سے واصل ہوئے(9)

ابھینو گپت شاعری، موسیقی دینیات، درس و تدریس، تنقید، فلسفہ اور مذہبیات کا نابغہ روزگار عالم و فاضل تھا۔ اگرچہ اس نے تین درجن کے قریب تصانیف قلم بند کی ہیں لیکن آج یہ بیش بہا سرمایہ کہیں موجود نہیں ہے۔ اس کے پسندیدہ موضوعات میں مذہبی رسومات، عقیدتی منظومات، فلسفیانہ نکتے اور فلسفۂ جمالیات خاص طور قابل ذکر ہیں۔

شیومت کی رو سے بھگوان شیو اور پاروتی میں جسمانی اور روحانی قوت (شکتی) مکمل طور پر

موجود ہے۔اسی شکتی کو اگر کوئی بھی بندۂ خدا اپنی روحانی صلاحیتوں سے بروئے کار لا سکے تو وہ روحانیت کی اُس منزل کو پالیتا ہے جہاں اسے اپنے اندر ہی یہ شکتی بھی حاصل ہوتی ہے اور وہ بھگوان کو اپنے من میں واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔ابھینو گپت کا عقیدہ ہے کہ رحمتِ الٰہی سے سرشار عابدوں کو کوئی چیزوں یعنی پتھر، لوہا، سونا وغیرہ سے بنائی گئی مورتیوں کی پوجا ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔البتہ دنیا کی لذت پا کر بھی انسان نجات حاصل کرنے کے اہل ہوسکتا ہے جس کی خاطر اسے گوشہ نشینی اور ترکِ دنیا اختیار کرنے یا دنیاداری سے کنارہ کش ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔مختصراً یہ کہ ابھینو گپت نے انسان کو نیکی کی راہ پر چلتے ہوئے دین کے ساتھ دنیا کو بھی اپنانے کا درس دیا ہے۔اُس کے فلسفۂ حیات کا لبِ لباب یہی کچھ ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے مفکروں، منطقیوں اور فلسفہ دانوں کے لئے جو مقام اصحاب دانش وبینش کی نظروں میں طے پایا ہے اُس میں ابھینو گپت کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ اس کا ہم پلہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔اس لحاظ سے دنیا کے اس عظیم مفکر پر سارے ہندوستان اور خاص کر کشمیر کو فخر حاصل ہے۔

کھیمیندر (1065-990)

کھیمیندر سرزمین کشمیر میں پیدا ہوا۔اپنے وطن مالوف سے اُسے اس قدر محبت تھی کہ ایک جگہ اس شاعرِ اعظم نے اپنی ایک نظم میں وطن کا موازنہ فردوس بریں سے کرتے ہوئے کہا کہ خدا کی جنت کی ساری رعنائیاں بھی حسن کشمیر کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔یہ کلام یوں ہے:

کشمیر منڈل نے، جو بہتری کرنے والے ممالک میں سرفہرست ہے\
اور جو علماء سے آباد اور دل نشین ہے\
اسی نے اِندر دیوتا کا غرور خاک میں ملا دیا\
سورگ کو یہ گمان تھا\
کہ بس وہی ہر طرح کے لطف، عشرت اور دیوتاؤں سے آباد ہے

لیکن قدرت کی شفا بخش نعمتوں
اور دولت سے مالا مال ملکوں میں سرفہرست ہوکر
اور کشمیری عالموں کی روایات سے بھرپور
کشمیر منڈل نے سورگ کے اس گھمنڈ کو پاش پاش کر دیا۔

ان اشعار سے کالیداس کا وہ کلام یاد آجاتا ہے جس میں اس نے بھی اپنے وطن اُجین کو جنت کا ایک حصہ کہا ہے اور جسے اُجین کے رہنے والوں نے اپنے ثواب سے بھرے اعمال کے معاوضے کی شکل میں حاصل کیا ہے۔ بہر حال اس وقت ہمارا موضوع کھیمیندر کی ممتاز ادبی، فنی اور عالمانہ شخصیت ہی ہے۔

سنسکرت کے سرکردہ تحقیق کار برج موہن چترویدی کہتے ہیں: ''کشمیر کی خوبصورتی اور نعمتوں اور عورتوں کے حسن کا تذکرہ بلہن اور کلہن نے بھی اپنی تخلیقات میں کیا ہے مگر کھیمیندر کا اس نوع کا تذکرہ خود بخود اور براہ راست دوسروں کو مات دیتا ہے۔ وتستا (جہلم) دریا کا ذکر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کی جائے پیدائش اسی دریا کے کنارے کسی جگہ تھی۔ اگرچہ اس نے اپنے جنم کے حوالے سے کسی جگہ کی نشان دہی نہیں کی ہے البتہ گمان غالب یہ ہے کہ کھیمیندر نے خانگی زندگی کو خیر باد کہہ کے اپنے آخری ایام ترپیور پہاڑی کی چوٹی پر گذارے ہیں۔ وہیں پر اس نے دش اوتار چرت تخلیق کی۔ اس کے آخری اشلوک میں شاعر نے اس کے انتقال کی طرف اشارہ کیا ہے جو اعداد کے مطابق 1065 بنتا ہے''۔(10)

کھیمیندر کا سال ولادت 990ء کے آس پاس مانا جاتا ہے جبکہ اُس نے 1065 عیسوی میں انتقال کیا۔ اس نے ایک خوشحال گھرانے میں دسویں صدی کے اخیر پر جنم لیا۔ اس کے والد کا نام پرکاشیندرا اور دادا سندھو تھا۔ اس وقت کشمیر میں جو علوم رائج تھے کھیمیندر نے ان سبھی کا بغور مطالعہ کیا اور اس طرح وہ ریاضی، علم نجوم، فلکیات، طب، جراحی، سیاست، فحاشیات، شیومت اور بودھ مذہب کا نابغہ روزگار دانشور بن گیا۔ اس کے مشاغل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اسے نغمات اور خوبصورت

شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے کھیمیندر کے بارے میں مزید تفصیلات بہم کی ہیں۔ کھیمیندر کے بارے میں جسے وہ کشمیر میں سنسکرت شاعروں کا تاج کہتے ہیں، صوفی لکھتے ہیں: ''وہ سری نگر میں ڈل جھیل کے کنارے اس جگہ پیدا ہوا جہاں آج نشاط باغ ہے۔اس کا باپ پرکاشیندر ایک امیر اور پڑھا لکھا شخص تھا جو شیومت کا زبردست پیروکار اور ابھنیو گپت کا شاگرد تھا جس نے کشمیر میں شیوازم کی بنیاد کو استوار کیا۔ کھیمیندر اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے ایک تھا۔اس نے کئی اساتذہ کے ہاں شیومت کا علم حاصل کیا جن میں گنگاکؔ سب سے قابل تھا۔پچیس سال کی عمر میں کھیمیندر نے شادی کی۔اس کے یہاں سومیندر نام کا بیٹا پیدا ہوا۔راجہ اننت نے کھیمیندر کو شہزادے کلاؔچ کی تربیت کرنے پر مامور کیا''۔(11)

کشمیری مورّخ محمد دین فوق نے اگر چہ راجہ اننت کے بارے میں مفصل اطلاعات فراہم کی ہیں تاہم وہ کھیمیندر کے بارے میں خاموش ہیں۔راج اننت دیو اپنی کم فہمی اور نادانی کی وجہ سے سارا اقتدار اپنے لالچی اور ہوس پرست مصاحبوں کے ہاتھوں میں دے گیا جو علی الاعلان عوام کو دن دہاڑے لوٹنے لگے اور ملک میں ایک طرح کی خانہ جنگی پھیلنے لگے۔فوق لکھتا ہے کہ: ''اننت دیو نے جالندھر کے راجہ کی چھوٹی لڑکی شری متی سے شادی کر لی تو اس رانی کا قدم کشمیر کے لئے مبارک ثابت ہوا۔شری متی نہ صرف حسن ظاہری میں بے نظیر تھی بلکہ زیورِ علم وادب اور فہم وفراست میں بھی اس سے بھی بڑھ کر آراستہ پیراستہ یگانۂ دہر خیال کی جاتی تھی۔اس نے بڑی حکمت عملی سے بے سمجھ راجہ کو راہ راست پر لایا اور وہ بھی خواب خرگوش سے جاگ کر عدل وانصاف اور رعیت پروری کی طرف متوجہ ہوا''۔(12)

ابھینو گپت کے اس شاگرد نے جو دَین کشمیری ادبیات کو عطا کی وہ عدیم المثال ہے۔دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ کھیمیندر سماجی طنز ومزاح کا موجد بن گیا۔اس لحاظ سے آٹھ ابواب پر مشتمل اس کی تخلیق '' سمے ماترکا'' روزمرہ کے گھومتے پھرتے حکیموں، بھکارنوں، دکاندار لڑکیوں، سادھوؤں، چوروں اور سماج کے دیگر نچلے پائے کے طبقات کی زندگی کے دلچسپ اور ظریفانہ بیانیہ کی ایک نادر مثال ہے۔

کھیمیندر کی تخلیقات میں رامائن منجری، بھارت منجری، برہت کتھا منجری، نرم مالا اور سمے ماتر کا خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کی ایک اور قابلِ ذکر تخلیق ''اوچتیہ وچار چرچا'' کو ادبی تنقید کی دنیا میں ایک بے بدل کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ کھیمیندر کے تخلیقی کارناموں کی تعداد چالیس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ کچھ تحقیق کاروں نے یہ تعداد چونتیس بتائی ہے۔ اُس پر مہاریشی ویاس کا اثر نمایاں جسے وہ اپنا استاد مانتا تھا۔ اس نے جس صنف ادب میں کمال حاصل کیا تھا وہ ہے طنز و مزاح جو بظاہر اس کا محبوب موضوع رہا ہے۔ شاریکا منشی نے ان الفاظ میں کھیمیندر کے فن اور علمیت پر روشنی ڈالی ہے: ''وہ انت راجہ کے دور میں ادبیات کا نابغۂ روزگار تھا۔ اس کی تخلیقات کا تعلق مختلف موضوعات سے ہے جن میں اوتاروں کی زندگی کا حسن سلوک، فنِ خطابت اور اس کے دور کے سماجی اور اقتصادی مسائل شامل ہیں۔ اس نے کلاسیکی مسودات کی تلخیص کی، سنسکرت کے حروف تہجی، وزن اور اعراب پر مفصل بحث کا آغاز کیا اور نئے شاعروں کی سرپرستی کرتے ہوئے کھیمیندر نے انھیں ایک ضابطہ عمل دیا جسے سارے ملک کے نوآموز شاعروں نے بسر و چشم قبول کیا''۔ (13)

تجزیہ کاروں کے بقول کھیمیندر پر گوتم بدھ کا گہرا اثر تھا جس سے متاثر ہو کر اس نے بدھ کی زندگی کے حالات قلم بند کیے۔ کھیمیندر کا یہ قول بہت حد تک گوتم بدھ ہی کے فلسفے کی عکاسی کرتا ہے:

''کچھ لوگ مال و دولت کی وجہ سے مغرور ہیں لیکن انھیں اچھی صفات کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ ایک برتن اگر چہ پانی سے لبالب بھرا ہوتا ہے لیکن جب اس کی رسی ٹوٹ جاتی ہے تو وہ دھم سے کنویں میں گر جاتا ہے''۔

کھیمیندر نے اپنی تخلیقات میں وطن مالوف کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں قلم بند کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کشمیر کو پونچھ، راجوری وغیرہ سے ملانے والی مغل روڈ کو کھیمیندر نے نمک کی سڑک کا نام دیا ہے کیونکہ صدیوں تک اسی راستے سے پنجاب کی کانوں سے نمک کشمیر میں لایا جاتا تھا۔ اس عہد ساز دانشور کے زمانے میں کشمیر اُون کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جب شمالی کشمیر کا قصبہ پٹن اس تجارت کے فروغ کی خاطر بھیڑوں اور مویشیوں کی بہت بڑی منڈی بن چکا تھا، کھیمیندر نے اس صنعت کا تفصیلی

ذکر ''نرمامالا'' اور ''سمے ماترکا'' میں کیا ہے۔(14)

کھیمیندر کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔اس کی یہ بھی وجہ ہے کہ اس نے خاص کر جو مزاحیہ اور طنزیہ کتابیں لکھیں ان میں اس نے آسان اسلوب میں اپنے تیکھے خیالات کا اظہار کیا۔اس کے ڈراموں کی تعداد تین بتائی جاتی ہے۔للت رتن مالا، برہت کتھا سے لی گئی ایک کہانی پر مبنی ہے۔کنک جانکی کا پس منظر رامائن کا ایک باب ہے اور چترا بھارت بھی مہابھارت کے ایک قصے سے ماخوذ ہے۔

کھیمیندر کی ادبی فن کاری اور علمی مہارت کے بارے میں انیسویں صدی تک بہت کم معلومات مہیا تھیں۔1871ء میں اس کی گم شدہ کتابوں میں سے پہلی تخلیق کا پتہ چلا۔پھر کم از کم اٹھارہ دیگر تخلیقات بھی دریافت ہوئیں۔

کھیمیندر نے اپنی ''نرمامالا'' میں، جو راجہ اننت کے عہد میں لکھی گئی، انھی کائستھوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے سرکاری عہدوں کا ناجائز استعمال کر کے عوام کی نجی زندگی میں دخل اندازی کرتے ہیں اور ان کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس ناقابل قبول طریق کار نے کائستھوں کو لوگوں کی نظروں میں قابل نفرین بنایا ہے۔اُکالا نام کے بادشاہ نے تو ان کے اقتدار کو کچلنے کی غرض سے کئی اقدام کیے لیکن اس کے بعد اس طبقے نے پھر سر اٹھایا اور اپنی طاقت کو مجتمع کر کے از سر نو عام انسانوں کو ستانا شروع کیا۔

بڈشاہ کی علم دوستی کے پیش نظر یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس کے عہد میں کشمیر کے بلند مرتبہ سنسکرت عالموں اور قلم کاروں کی تحریروں سے بھی چیدہ چیدہ فن پارے فارسی میں منتقل کیے گئے ہوں کیونکہ اُس وقت فارسی درباری زبان تھی اور ہر سطح پر اس کی آبیاری بھی کی جاتی تھی۔اگر ایسا ہے تو زمانے کی دست برد نے ہم سے یہ عظیم سرمایہ بھی چھین لیا ہے۔

کھیمیندر کی اصناف سخن میں طنز و مزاح کو زیادہ فوقیت حاصل ہے کیونکہ وہ اس فن کی تخلیق میں یدطولیٰ رکھتا تھا۔لیکن اس نے اپنے دور کی خاص کر طوائفوں اور بدقماش عورتوں کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر اسے نقادوں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے کیونکہ ایسی تحریروں میں فحش نگاری کا عنصر

نمایاں ہے اور وہ بھی کھیمیندر نے بازاری زبان کا استعمال کر کے ورطہ تحریر میں لایا ہے۔ مثلاً:

☆......''اس کی گفتار میں شہد کی مٹھاس، دل میں خنجر، ایک طوائف کلہاڑی کی تیز دھار جیسی ہوتی ہے جو دم زدن میں اپنے یاروں کو برباد کر سکتی ہے''۔

☆......''اگر چہ وہ ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے، وہ اپنا چہرہ خوبصورت بناتی رہتی ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتی ہے کہ وہ سولہ سالہ دوشیزہ ہے، غالباً اس نے کوؤں کے ساتھ امرت پیا ہوگا''

☆......''وہ ایک عقاب کی طرح اپنے شوہر کو ٹالتی ہے اور دوسرے درخت سے حظ لیتی ہے جو اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ وہ فطرتاً ایک بدفطرت مخلوق ہے۔ وہ ایک ناگن کی طرح ہے اور کسی کی وفادار نہیں ہو سکتی''۔

☆......''اس کے کئی دل، کئی زبانیں، کئی ہاتھ اور مردوں کو پھسلانے کے کئی گُر آتے ہیں۔ اس میں صداقت نام کی کوئی بات نہیں اور ایک طوائف کو پہچاننا ممکن نہیں''۔

کھیمیندر نے اپنے ارد گرد رہنے والے عام انسانوں کو اپنے موضوعات میں ترجیح دی ہے جن کی خامیوں اور خوبیوں کو اس نے بعینہ اپنے قلم میں مقید کر لیا ہے۔ ان خامیوں کی نشان دہی بجائے خود ان دنوں ایک انقلابی قدم تھی جب تقریر بازوں نے ہر شعبہ حیات کے لیے خود ساختہ معیار قائم کیے تھے۔ کھیمیندر نے نہ صرف ایسی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کی بلکہ اس نے خود سماج کے لیے ایسے اقدار متعین کیے جو عوام پرور تھے۔ ''اس نے ادب میں ترقی پسند خیالات کو اُس وقت پوری طرح ابھارا جب زندگی کی قدریں آمرانہ احکام کے تحت کچلی جا رہی تھیں۔ اس طرح کھیمیندر کی شخصیت میں قاری کو مصلح اور شاعر کا امتزاج صاف نظر آتا ہے''۔(15)

مجموعی طور پر کھیمیندر کو مورخوں اور تجزیہ کاروں نے کشمیر میں فنونِ لطیفہ کی دنیا میں طنز و مزاح کا بے مثال خالق اور بے تاج شہنشاہ مانا ہے۔

سوم دیو (بارہویں صدی)

ہندوستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں کہانیاں سنانے کا شوق ایک فن کی صورت اختیار کر چکا

ہے۔ ہند میں ہی پارس کے باشندوں نے یہ فن سیکھ لیا اور اسے عربستان کی سرحدوں کے اندر تک پہنچایا۔ مشرقِ وسطیٰ سے داستان گوئی نے قسطنطنیہ اور وینس کی وادی تک کا سفر کیا اور پھر یہ انگلستان اور فرانس تک جا پہنچی۔ اگرچہ ان کہانیوں نے ہر ملک میں وہاں کی مقامی زندگی اور حالات کی جزئیات کو اپنے اندر سمولیا، لیکن ان میں جو ہندوستانیت کا امتزاج تھا، وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔

ہندوستان میں یہ بے شمار کہانیاں سالہا سال تک سینہ بہ سینہ کہی اور سنی گئیں اور بعد میں سب سے پہلے گناڈیہ نے انھیں ایک مقامی بولی پشاچی میں جمع کرلیا اور اپنے مجموعے کا نام برہت کتھار کھا جو اب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک کشمیری شاعر پنڈت سوم دیو نے اس گنجِ گم گشتہ کی باقی ماندہ امارت سے استفادہ کر کے گیارہویں صدی عیسوی میں ''کتھا سرت ساگر' کے نام سے ایک ضخیم کتاب قلم بند کرلی، جس میں اس نے لوک کہانیوں کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا۔ روایت ہے کہ سوم دیو کی کتھا سرت ساگر دُنیا کی اوّلین لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ تھا جس میں اس کشمیری قلم کار نے لاکھوں اشعار پر مبنی ہزاروں کشمیری لوک کہانیوں کی شیرازہ بندی کی تھی۔ حاکمِ وقت نے سوم دیو کی جمع کردہ کہانیوں کے اسلوب پر تنقید کی جس سے دل برداشتہ ہو کر سوم دیو نے اپنی کہانیوں کے اس بہت بڑے ذخیرے کو نذرِ آتش کر دیا۔ بعد میں اس حادثہ سے جو کچھ بچایا گیا، اُسے پھر دوسرے ہاتھوں نے از سرِ نو مرتب کر کے کتھا سرت ساگر کو مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچایا اور بعد میں اسی صورت حال میں اس کی اشاعت ہوئی۔

موجودہ کتھا اٹھارہ جلدوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نثری حصے کے علاوہ بائیس ہزار اشعار درج ہیں۔ ان میں تین سو پچاس سے زیادہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا حجم ہومر کی الیاڈ اور اوڈیسی دونوں کو ملا کر بھی ان سے دوگنا بن جاتا ہے۔ ایک تاریخ دان کے مطابق اس کا سالِ تحریر 1150ء بتایا گیا ہے۔ یہ عرصہ کھمیندر کے بعد کا تیس سال کا عرصہ بتایا جاتا ہے۔

سوم دیو کشمیر کے راجہ اننت کا درباری شاعر تھا۔ اُس کی کتھا سرت ساگر کو دنیا میں کہانیوں کی

سب سے ضخیم کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں جو ابواب ہیں اُنہیں لمبکھ بھی کہا جاتا ہے، جنہیں پھر ترنگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتھاسرت ساگر میں مہم جوئی، شہزادوں کی زندگی، شہروں، سیاسی سازشوں، لڑائیوں، جادو اور دغابازیوں اور چالبازیوں، حیوانوں، پرندوں، سادھوؤں، جواریوں اور طوائفوں کی داستانوں کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ الغرض یہ کہانیاں زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتی ہیں۔

کتھاسرت ساگر کی بنیاد اگرچہ فرضی طور پر برہت کتھا ہی پر رکھی گئی ہے لیکن برہت کتھا یا تو ایک فرضی تخلیق ہے یا وہ زمانے کے ہاتھوں ضائع ہو چکی ہے۔ سوم دیو کی کتاب لوک ادب کے نہایت قریب ہے، لیکن اس نے اپنی فنی صلاحیتوں اور زبان و بیان پر خاصا عبور رکھنے کی بدولت اسے ایک نادر و یکتا تخلیق کا درجہ دیا ہے۔ اس دور میں اس قدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی کہانیوں کی اور کوئی کتاب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

کتھاسرت ساگر بیانیہ شاعری پر مبنی ہے، جسے آسان مگر شستہ نظم میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں کئی کہانیاں ہیں لیکن سوم دیو نے مرکزی داستان کی جزئیات کو اوّل تا آخر برقرار رکھا ہے۔ ان کہانیوں میں مزاح کے دوش بدوش غم کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ شار کا منشی کی زبان میں ''ان کہانیوں میں شاندار معیار اور دل نشین اندازِ بیان موجود ہے'' (16)۔ لوک ادب تحریر کرنے والوں نے دنیا بھر میں ان کہانیوں سے استفادہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

اس قسم کی تخلیقات میں کم و بیش ایک ہی طرح کے دیو مالائی اور انسانی موضوعات پر داستانیں قلم بند کی جاتی تھیں۔ جس طرح پورانوں میں شامل کہانیوں کا تعلق جادو، موسیقی، سماجی رشتوں، مذہبی سرگرمیوں، شجاعت اور جنگ و جدل اور دیوتاؤں اور انسانوں کے تئیں محبت کے اظہار کے ساتھ ہے، اُسی طرح سوم دیو کی کتاب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کہانیاں دراصل بھگوان شیو نے پاروتی کو سنائی تھیں۔ پھر یہ کہانیاں پشپادت نے کان لگا کر سن لیں جس نے بعد میں گناڈیہ کے نام سے جنم لیا۔ اُسے شہنشاہ سالی واہر کے دربار میں ایک معزز درباری مقرر کیا گیا اور یہیں پر گناڈیہ نے یہ کہانیاں بارِ دگر پشاچی بولی میں ورطہ تحریر میں لائیں۔ واسو بھاگ نے ان میں سے کئی کہانیاں اخذ کر کے

انھیں پنچ تنتر نامی کہانیوں کے ایک اور مجموعہ میں شامل کرلیا۔ واسو بھاگ کی کہانیوں کا تذکرہ جاپانی، لاؤس اور سیامی کہانیوں کے مجموعوں میں بھی ملتا ہے۔

یہ پنچ تنتر کی کہانیاں جنھیں بعد میں وشنوشرما نے اپنی زبان و بیان میں مرتب کرلیا بجائے خود ایک فسانہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جس کا نام امرشکتی تھا۔ اس کے تین مجہول بیٹے تھے۔ امرشکتی نے عالمِ بے بسی میں اپنے درباریوں سے کہا کہ مجھے ان احمقوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی راستہ دکھاؤ۔ ان میں ایک نہایت عقل مند درباری تھا جس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شہزادوں کو مذہبی تعلیم نہیں دی جانی چاہیے، بلکہ انھیں فہم و فراست کے علم کی روشنی سے منوّر کیا جانا چاہیے۔ اس درباری نے بادشاہ سے کہا کہ اس کام کو وشنوشرما نام کا ایک دانشور ہی انجام دے سکتا ہے۔ وشنوشرما کو طلب کیا گیا اور پھر اُس نے چھ ماہ کے اندر پنچ تنتر مرتب کر کے نافہم شہزادوں کو اسے غور سے پڑھنے اور اس میں درج کہانیوں کے مثبت پہلوؤں کو ذہن نشین کرنے کی ہدایت کی۔ امرشکتی کو یقین نہیں آتا تھا کہ محض ایک کتاب تین جاہل نوجوانوں کی اس طرح ذہنی رہنمائی کر کے انھیں عقل سالم اور دانش کامل سے مالا مال کرسکتی ہے۔

پنچ تنتر کی کہانیاں چرند و پرند کے اردگرد گھومتی ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ مشہورِ عام کہانی بھی شامل ہے جس میں ایک بار مگرمچھ نے ایک بندر سے دوستی گانٹھ لی اور وہ اسے ایک لذیذ میوہ کھلاتا رہا۔ ایک دن مگرمچھ نے یہی میوہ اپنی بیوی کو کھلایا تو اسے اس کی لذت اس قدر بھا گئی کہ جب اسے پتہ چلا کہ بندر روز یہی میوہ کھاتا ہے تو اُسے خیال آیا کہ پھر بندر کا کلیجہ میوہ چکھ چکھ کے بے حد لذیذ بن چکا ہوگا۔ اُس نے مگرمچھ سے فرمائش کی کہ وہ اسے بندر کا کلیجہ نکال کے کھلا دے ورنہ وہ خودکشی کرے گی۔ مگرمچھ نے چاروناچار اس فرمائش کو پورا کرنے کی غرض سے ایک روز بندر سے کہا کہ وہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو جائے تاکہ مگرمچھ اسے گہرے تالاب کی سیر کرا سکے۔ جب یہ دونوں تالاب کے بیچوں بیچ پہنچے تو مگرمچھ نے اسے اپنی بیوی کی خواہش کے بارے میں بتا کر کہا کہ میں تمھیں اسی جگہ میں ڈبو کر تمہارا کلیجہ نکال کر اُسے کھلا دوں گا۔ ہوشیار بندر نے اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی تو اس نے مگرمچھ

سے کہا، ''بھائی تم تو میرے جگری دوست ہو، میرا کلیجہ کیا میری جان بھی تمہاری بیوی کے لیے حاضر ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ میں اپنا کلیجہ اُسی درخت پر چھوڑ آیا ہوں جس پر میں رہتا ہوں، اگر تم نے پہلے بتایا ہوتا تو میں اُسے ساتھ لے کر آجاتا'' مگر مچھ نے اس پر بھروسہ کیا اور اسے واپس کنارے کی طرف لے جانے لگا۔ بندر نے فوراً کنارے پر چھلانگ لگائی اور درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچائی۔ اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک خونخوار اور انجانے شخص پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

کتھا سرت ساگر میں شہزادہ نرواہن دت چھبیس بیویوں کو جیت کر جادوگروں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں ایک کہانی کے اندر ایک اور کہانی کا خاکہ شامل ہے جس کی وجہ سے اس میں الف لیلیٰ جیسی دلچسپی اور انہماک کا عالم موجود ہے۔

کتھا سرت ساگر کی اوّلین کہانیوں میں وہ داستان بے حد دلچسپ ہے جس میں واراروچی نام کا ایک شخص گھر سے باہر جاتا ہے تو کئی معزز ہستیاں اس کی خوبصورت بیوی اُپا کوشا پر ڈورے ڈالتی ہیں۔ اُپا کوشا ان سبھی عاشقوں کو یہ پیغام بھیجتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص وقفے کے بعد اُس کے شبستان میں آئے اور اپنی جنسی خواہش پوری کر لے۔

اس طرح اپا کوشا چالاکی سے ہر ایک نام نہاد عاشق کو مادر زاد ننگا کر کے چراغ کے دھوئیں کی کالک اُس کے منہ پر ملتی ہے اور انھیں اسی حالت میں الگ الگ الماریوں میں بند کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہیرانے گپتا نام کا ایک سوداگر بھی وہاں آ کے اُس رقم کی واپسی سے بہ آواز بلند انکار کرتا ہے جو اُس نے واراروچی سے اُدھار لی تھی۔ واراروچی کی واپسی پر اپا گوشا الماریوں کو کھول کر ان بد کردار مردوں سے یہ گواہی بھی دلواتی ہے کہ ہیرانے گپتا نے بہ بانگِ دہل قرض لوٹانے سے انکار کیا۔ واراروچی خود صاحبِ اختیار تھا، لہٰذا اُس کے حکم سے ان سبھی مردوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں اور انھیں سزائیں بھی دی گئیں۔ کہانی نگار کے بقول اس کہانی کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی بھی شخص غلط کاری سے خوش حال نہیں ہوسکتا۔

سوم دیو شیو کا پجاری ایک برہمن تھا۔ اُس کا اصلی نام سوم تھا اور دیو اُس نے برہمن ہونے کے

حوالے سے اپنے نام کے ساتھ جوڑا تھا۔ این ایم پینزر کے خیال میں کتھاسرت ساگر 1156ء کے آس پاس یا اُس کے اڑھائی سو سال بعد تخلیق کی گئی ہوگی۔

کتھاسرت ساگر کا پہلا انگریزی ترجمہ سی ایچ ٹانے نے کیا جو 1880ء میں شائع ہوا۔ اس ترجمہ کے بارے میں جیمز میلنسن کا کہنا ہے کہ ''یہ اس قدر واضح اور برمحل ہے کہ اسے پڑھ کر ہر کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اس کتاب کو پھر سے زیرِ ترجمہ لانے کی کیا ضرورت ہے'' (17)۔ جیمز میلنسن نے خود بھی کتھاسرت ساگر کا ترجمہ کیا ہے۔ بعد میں اس عدیم المثال تخلیق نے این ایم پینزر کو بے حد متاثر کیا اور اس نے بھی 1927ء میں دس ضخیم جلدوں میں Ocean of Stories کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔

کلہن (1089-1107ء)

آج سے ایک ہزار سال قبل تک کشمیر کی تاریخ کے اوراق پر مطلوبہ مواد کی عدم موجودگی اور واقعات کا شیرازہ بکھرنے کی بنا پر ناشناسی کی گرد جمی ہوئی تھی اور اہلِ کشمیر اپنے ماضی سے قطعی نابلد تھے۔ اس لحاظ سے کلہن پنڈت کو ہندوستان کا اوّلین مورخ اور سرکردہ شاعر کہا جاسکتا ہے جس نے گیارھویں صدی عیسوی میں ''راج ترنگنی'' کے نام سے پہلی باضابطہ تاریخ رقم کی جو کئی دیگر سنسکرت تاریخ دانوں کے برعکس زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ کر ہم تک آ پہنچی ہے۔

اس طرح سے کلہن کو کشمیر کی تاریخ میں وہی درجہ حاصل ہے جو قدیم یونان میں وہاں کے پہلے تاریخ نویس ہیروڈوٹس کو The Histories لکھنے کے لیے دیا گیا ہے جس نے ساری دنیا میں یونان کے ازمنہ قدیم کی تاریخ سب سے پہلے قلم بند کرنے کا سہرا اپنے سر باندھا ہے۔

کلہن کا باپ چنپک، راجہ ہرش (1089-1107) کے دور میں دوار پتی یا سرحدی گذرگاہوں کا کمانداز تھا۔ کلہن نے بچپن میں ہی اپنے ملک کشمیر کے بارے میں دلچسپ واقعات اور حالات سنے تھے اور اس کے دل میں یہ خواہش بار بار جاگتی تھی کہ وہ خود ہی ان حالات اور ماضی کے کوائف کو قلم بند کرے۔ راج ترنگنی کی شروعات ان حالات سے ہوئیں جو کلہن نے سنے تھے لیکن جن کی تواریخی اعتبار سے کوئی سند موجود نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے بھی ہیروڈوٹس کے اس قول کے مطابق سنی سنائی حکایات کو ورطۂ

تحریر میں لایا کہ "تاریخ افسانوی ادب کے سوا اور کچھ نہیں"۔

جب راجہ سسل (1127) کی وفات کے بعد جے سمہا نے حکومت سنبھالی تو کلہن کو درباری شاعر بنایا گیا۔ اس طرح اسے راج ترنگنی مکمل کرنے کا موافق ماحول میسر ہوا۔

ایک روایت کے مطابق کلہن نے اس کے علاوہ 'جے سمہا بھودایا' عنوان کی ایک طویل نظم بھی لکھی جس میں اس نے اپنے مربی اور سرپرست بادشاہ جے سمہا کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کتاب کا مسودہ اگرچہ محفوظ نہیں رہ سکا ہے لیکن اس کے چند ابیات 'رتنا کتھاسرسم یویوکایا' میں نقل کیے گئے ہیں۔

اگرچہ کلہن اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا ہے لیکن حقائق اور تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا برہمن تھا۔ اُس کی علمی صلاحیتوں کا اظہار راج ترنگنی میں اسی اعلیٰ پائے کے انداز میں ہوتا ہے جو عالم و فاضل کشمیری پنڈت برہمنوں کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ برہمنوں کے تئیں اس نے اپنی تاریخ میں ہمدردی اور یک جہتی کا جو بھرپور مظاہرہ کیا ہے اُس سے بھی اس کے ایک صالح برہمن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں جونراج نے بھی تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دیا ہے جب وہ اپنی ودتیا راج ترنگنی' میں کلہن کو 'دوجا' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ کلہن شِو کا پرستار تھا اور اس لئے اس نے راج ترنگنی کے ہر حصے کی ابتدا میں بھگوان شِو اور اس کی رفیقہ گوری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

راج ترنگنی کے بارے میں خوش قسمتی سے کلہن نے خود واضح طور پر کہا ہے کہ اس نے یہ کتاب لوکا کے عہد کے 4242 ویں سال یعنی 49-1148ء عیسوی میں لکھنی شروع کی اور اگلے سال اسے مکمل کیا۔

کلہن نے بنیادی طور پر راج ترنگنی شاردا رسم الخط میں لکھی اور اسے ساتھ ہی دیوناگری خط نقل میں کیا گیا لیکن اس وقت کے خطاط یا نقل نویس ان دونوں رسوم خط سے پوری طرح واقف نہیں تھے لہٰذا 'راج ترنگنی' کے اوّلین مسودات میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

راج ترنگنی کا شاردا میں تحریر کردہ قدیم ترین مسودہ غالباً کشمیر سرکار کے تحقیقی کتب خانے میں موجود ہے۔ دوسرا مسوّدہ جسے پنڈت گنہ کاک نے تیار کیا تھا اور جس پر پنڈت صاحب رام نے حواشی تحریر کیے تھے، خدا جانے موجود ہے بھی یا نہیں؟

راج ترنگنی کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کلہن نے کشمیر کی وادی میں تقریباً ہر جگہ بغور دیکھی ہے۔ اس لیے وہ نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ یہاں کے مقامات، قصبوں اور دیہاتوں کے نام لیتا ہے اور مقامی حالات و واقعات کے بارے میں اپنے شاعرانہ بیان کو تکرار کے ساتھ دوہراتا ہے۔ وہ سرزمین کشمیر کی مدح سرائی یوں کرتا ہے:

> "یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کے لوگ زیادہ تر دوسری دنیا یعنی آخرت کا خوف کھاتے ہیں۔ جہاں زمستان کے دنوں میں گرم حمام موجود ہوتے ہیں۔ جہاں دریاؤں کے کناروں پر بیٹھنے کی آرام دہ جگہیں ہیں۔ جہاں ندی نالوں میں نجس حیوانات دکھائی نہیں دیتے اور وہ کسی بھی قسم کے خطرات سے پاک ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہاں کے باشندے گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکتے، سورج کی تمازت والی کرنیں گرمی کے دنوں میں بھی اپنے اندر ایک حلاوت اور ٹھنڈک رکھتی ہیں۔ اونچے اونچے رہائشی مکان، زعفران، یخ جیسا ٹھنڈا پانی، انگور اور اس طرح کی نعمتیں جو جنت الفردوس میں بھی مہیا نہیں ہو سکتیں"۔

راج ترنگنی آٹھ ابواب یا ترنگوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ گونند خاندان کے راجاؤں، مقامی حکمرانوں، اشوک اور اس کے جانشینوں کا حال بیان کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں اُن کشمیری حکمرانوں کے قصے درج ہیں جن کا گونند خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تیسرے باب میں گونند خاندان کی بحالی کا ذکر اور کئی حاکموں کا حال درج ہے جن میں پرورسین کو تاریخی طور پر موجود شخصیت کی حیثیت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ چوتھی ترنگ میں کارکوٹ خاندان کی تاج پوشی کا ذکر ہے۔ کارکوٹ خاندان کے راجگان کو اُتپلا حاکموں نے تخت سے سبک دوش کر دیا جس کے کوائف راج ترنگنی کے پانچویں حصے میں درج ہیں۔ کتاب کے چھٹے باب میں ویرادیو اور ابھنیو کے وارثوں کا حال بیان ہوا ہے۔ ساتویں کتاب کا آغاز لوہارا سلطنت کے راجہ سام گرام راجہ کی تاج پوشی اور اس کا اختتام ہرش کی وفات سے ہوتا ہے۔ آٹھویں ترنگ، جو ساری کتاب کے تقریباً نصف حصے کے برابر ہے، لوہارو خاندان کی بحال شدہ حکمرانی اور اُکالا سسل اور سسل کے بیٹے جے سمہا

کے احوال پر مبنی ہے۔

کلہن نے راج ترنگنی لکھنے کی غرض سے قلم اٹھاتے وقت ہی اپنے ہم عصر اور ماقبل شاعروں اور وقائع نگاروں کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب کے بارے میں اعتذار کے لہجے میں کہا ہے کہ: ''میری غرض وغایت کو ذہن نشین کیے بغیر میری اس تصنیف کو محض اس لیے بالائے طاق نہ رکھیں کہ اس موضوع پر میرے پیش رو بھی خامہ فرسائی کر چکے ہیں''۔

یہ اظہار کلہن کی متانت اور حق گوئی کی دلالت کرتا ہے۔ پرتھوی ناتھ پشپ نے اس اعتذار کے پسِ منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ کلہن سے پیشتر چند ایک کشمیریوں نے تاریخ لکھنے کی سعی بھی کی تھی لیکن ان کی تصانیف کا کینواس محدود اور پیش کش سطحی تھی۔ ویسے بھی کلہن نے اپنے جن پانچ پیش رو تواریخ نویسوں یعنی سرورت، کھیمیندر، ہیلا راج، پدم مہر اور چھیولاکر کا ذکر کیا ہے ان میں سے کسی کی کوئی تصنیف ہم تک نہیں پہنچی ہے۔

کلہن کی دیانت داری دیکھئے کہ کھلے بندوں اپنے پیش رَوں کے تئیں احسان مندی کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔ ''میری غرض وغایت سنے بغیر میری اس تصنیف سے محض اس لیے منہ نہ موڑئے گا کہ اس موضوع پر میرے پیش رو قلم اٹھا چکے ہیں''۔ (18)

کشمیر میں اگرچہ سنسکرت زبان میں تذکرہ نویسوں اور وقائع نگاروں کی کوئی کمی نظر نہیں آتی مگر ان کی نگارشات کو جدید میزانیہ کے لحاظ سے تاریخ نویسی کی کسوٹی پر پرکھنا غالباً مناسب نہیں ہوگا کیونکہ یہ سبھی قلم کار اپنے اپنے عہد کے تاریخ نویس نہیں بلکہ یادداشتیں قلم بند کرنے والے لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ تاریخ نویسی کا کوئی واضح اور ٹھوس تصور موجود نہیں تھا۔ ایسی تخلیقات میں مبالغہ آمیزی اور رنگ سازی کے مناظر ضرور شامل ہوں گے۔ یونان کے کئی یادداشت نگاروں کا بھی یہی حال ہے اور کلہن کی راج ترنگنی کو بھی تاریخ نویسی کے مقررہ ضوابط کی رُو سے تاریخ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ حالانکہ کلہن نے خود اپنی اس کاویہ یعنی طویل نظم کو ''بادشاہوں کا دریا'' کا نام دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیر کے سنسکرت نگاروں کا تعلق ہے کلہن اُن سبھی میں بہر حال افضل ترین مقام کا مالک ہے اور

تذکرہ نویسی میں اس کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

کلہن کی زندگی کے بارے میں وضاحت کے ساتھ تفصیلات کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے البتہ اس ضمن میں چند حوالے جونراج کے یہاں موجود ہیں جو کلہن کے تین سو سال بعد منظر عام پر آئے۔ لیکن اس خودستائی کے عمل سے دور رہنے کے باوجود کلہن کا نام زندہ رہا اور اس کی ادبی حیثیت میں بھی کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔

کلہن کی تاریخ نویسی کے سلسلے کو جونراج نے تسلسل بخشا جس کے بیان کردہ حالات اگرچہ واضح اور مثبت ہیں مگر اس کے یہاں کلہن جیسے عظیم فن کار کا عظیم تخیل نظر نہیں آتا۔

کلہن کا زمانہ کشمیر کا دورِ ابتلا تھا جس میں غیر یقینی صورتِ حال، بے راہ روی، بدکرداری اور تذبذب کا غیر انسانی ماحول ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے الفاظ میں: ''یہ سازشوں اور قتل و غارت کا زمانہ تھا جس میں بھائیوں اور قرابت داروں کے ساتھ مخاصمت اور دشمنی کا بازار گرم تھا۔ وزراء اور امراء اقتدار کی سرکشی میں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان تھے۔ بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ ایک راجہ جو اُچل کا جانشین راڈھا عرف سانکا کہلایا جاتا تھا، صرف ایک رات کو چند گھنٹوں تک ہی اپنا تخت سنبھال سکا۔ اُس کے چچیرے بھائی سالہا کو فقط آٹھ ماہ تک راج کرنا نصیب ہوسکا۔ بادشاہ ایک یا دوسرے کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں بن کے رہ گئے تھے۔ ملک میں کوئی قانون یا قانون کی پاسداری نہیں تھی۔ حکمران بے تحاشا شراب پیتے تھے اور اُن کے وزیر اور مشیر جاہل اور ظالم تھے جنھیں اپنی مادرِ وطن سے ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہیں تھا۔ مسخرے اہم عہدوں پر فائز کیے گئے تھے اور انھوں نے وزارت کی کرسیوں پر بھی قبضہ جمالیا تھا۔ بزدل اور احمق نوجوان کمانڈر بنائے گئے تھے''۔

بارہویں صدی کے اوائل میں اہلِ کشمیر نے اس امید پر ووپادیو کو اپنا راجہ چن لیا کہ وہ اس بے ہنگم صورتحال میں کوئی بہتری لائے گا، لیکن اُس نے بھی اپنی احمقانہ حرکتوں سے اپنے حامیوں کی توہین کر کے انھیں مایوس کر دیا۔ اسے پتھروں اور بھاری بھرکم چٹانیں دیکھ کر عجیب سی ذہنی تسکین ہوتی تھی اور اس نے اپنے وزراء کو یہ احمقانہ حکم دیا کہ وہ حیوانوں کا دودھ پلا کر چھوٹے چھوٹے پتھروں کو

بڑی چٹانوں میں تبدیل کر دیں(19)۔

ان تاریخی حالات سے ظاہر ہے کہ کلہن جیسا حساس مؤرخ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس نے راج ترنگنی میں یہ حالات پیدا کرنے والوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے، لیکن اس شہر آشوب میں اس نے ایسے واقعات بھی درج کیے ہیں جو واقعاتی طور پر اور اعداد و شمار کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتے، بلکہ یہ آج ہمیں ناقابلِ اعتبار نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں پر ایسے دو واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

کلہن کہتا ہے کہ ''شاندار بادشاہ اشوک نے سرینگر شہر کی بنیاد ڈالی جس میں مال و دولت سے بھرپور چھیانوے (96) لاکھ گھر تعمیر کیے گئے''۔ کیا یہ بیان بحث طلب نہیں ہے کہ ہزار سال قبل سرینگر شہر میں چھیانوے لاکھ مکانات تعمیر کیے گئے جن میں ظاہر ہے کروڑوں لوگ رہتے ہوں گے جب کہ موجودہ شہر سرینگر کی کل آبادی تیس لاکھ کے قریب ہی بتائی جاتی ہے۔

اسی طرح کلہن نے مہرکل راجا کے وقت کا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب اُس نے چندر کوہل کی صفائی کا کام شروع کرنا چاہا تو اس کے بیچوں بیچ موجود ایک چٹان نے اس میں رُکاوٹ ڈالی۔ راجا نے اس رُکاوٹ کو دور کرنے کے لیے تپسیا کی اور دیوتاؤں نے خواب میں آکر اس سے کہا کہ اس چٹان کے اندر ایک پاکباز ذی جان رہتا ہے اور اسے صرف ایک باکردار اور باعصمت عورت ہی ہٹا سکتی ہے۔ راجا یہ سن کر فوراً حرکت میں آ گیا اور اس نے پہلے اونچے خاندانوں کی خواتین کو پتھر ہٹانے کا حکم دیا، لیکن اسے یہ دیکھ کر نہایت دُکھ ہوا کہ ان میں سے کوئی یہ کام سرانجام نہیں دے سکی، جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے ملک میں کوئی عورت اپنی عصمت لٹائے بغیر نہیں جی رہی تھی۔ بعد میں ایک کمہارن چندراوتی کے ہاتھوں یہ چٹان فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ایک ناراض اور دل برداشت راجا نے تین کروڑ عورتوں کو مع اُن کے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے تہہ تیغ کروا ڈالا۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس وقت کشمیر کی آبادی کا ایک حصہ تین کروڑ خواتین اور اُن کے کروڑوں رشتہ داروں پر مشتمل تھا، یقین نہیں آتا۔

کلہن نے چونکہ اپنے وطن مالوف کشمیر کی زندگی کے ہر پہلو کا نہایت باریک بینی سے بھرپور

مطالعہ کیا تھا لہٰذا وہ یہاں کے واقعات اور کوائف کا تفصیلی ذکر کرتا ہے جن میں اس ملک کا جان لیوا زمستان، سیلاب اور برفانی طوفان وغیرہ کا حال شامل ہے۔

راج ترنگنی کے جو تراجم وقتاً فوقتاً دوسری زبانوں میں کیے گئے اُن کی تفصیل سوم ناتھ در نے آرسی پنڈت کے ترجمہ سے نقل کر کے یوں درج کی ہے:

''راج ترنگنی کے ایک حصے کا پہلا ترجمہ سلطان زین العابدین (1420-1470) کے حکم سے فارسی میں کیا گیا اور اس کا نام ''بحرالاسمار'' یا ''کہانیوں کا سمندر'' رکھا گیا (20)۔ شہنشاہ اکبر نے جب کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تو 1594ء میں عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ وہ اس ترجمہ کو مکمل کرلے۔ ابوالفضل نے اپنی تصنیف ''آئین اکبری'' میں کشمیر کی اس قدیم تاریخ کا خلاصہ شامل کرلیا اور اس کے لئے کلہن کو ماخذ قرار دیا۔ شہنشاہ جہاں گیر کے عہد حکومت میں ملک حیدر نے 1617ء میں راج ترنگنی کا مختصر ایڈیشن فارسی میں پیش کیا۔ فرانسس برنیر (1665) نے اپنی کتاب ''بہشتِ ہند'' میں راج ترنگنی کے اس ترجمہ کا حوالہ دیا جو حیدر ملک نے کیا تھا۔ اسی طرح ایک صدی بعد پادری ٹائی فن تھالر نے اس کا مختصر خلاصہ کیا' راج ترنگنی کا بہتر متنی مواد ''مور کرافٹ'' کو حاصل ہوا تھا۔ مور کرافٹ 1823ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اجازت سے سرینگر آیا اور اس نے قدیم شاردا نسخے سے دیوناگری مسوّدہ تیار کرلیا۔ یہی مسودہ راج ترنگنی کے اُس ایڈیشن کی بنیاد بن گیا جو 1835ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر اہتمام کلکتہ سے شائع ہوا۔

اس دوران ڈاکٹر ہوریس ہے مین ولسن نے کشمیر کی ہندو تاریخ پر اپنے اُس انشایئے کی اشاعت سے شہرت حاصل کی تھی جس میں راج ترنگنی کے پہلے چھ ابواب کی تنقیدی تلخیص شامل کی گئی تھی۔ اس نے پہلی بار یورپی مورخین کو کلہن کی اس اہم تصنیف سے متعارف کیا۔

اصل سنسکرت متن پر مبنی راج ترنگنی کا پہلا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی کے اہتمام سے 1852ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ کار اے ٹرویر نام کا ایک فرانسیسی ادیب تھا جو کلکتہ سنسکرت کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا، یوگیش چندر دت کا ترجمہ ''راجگان کشمیر'' کلہن پنڈت کی سنسکرت تصنیف راج

ترنگنی کا ترجمہ کلکتہ میں 1879ء اور 1887ء کے درمیانی عرصہ میں شائع ہوا (21)۔

اُنیسویں صدی کے اخیر پر پنڈت دُرگا پرشاد نے بھی راج ترنگنی کا اپنا ایڈیشن سامنے لایا جسے بمبئ کے نرنائے پریس نے طبع کیا تھا۔اس کے بعد آریل سٹاین نے 1900ء میں اس کتاب کا انگریزی نثر میں ترجمہ کیا۔اسی طرح اُردو میں مکمل ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ نے دو جلدوں میں کیا جسے چنار پبلشنگ ہاؤس نامی ایک غیر معروف اشاعتی ادارے نے سرینگر سے شائع کیا۔اس پر تاریخ اشاعت درج کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

جواہر لال نہرو نے راج ترنگنی کے رنجیت سیتا رام پنڈت کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں اس کشمیری مؤرخ کے فن، اظہار فن اور واقعات وحالات کی تصویر کشی کے بارے میں اس طویل اقتباس میں کہا ہے کہ ''یہ تاریخ بھی ہے اور ایک نظم بھی۔ حالانکہ شاعری اور تاریخ کا سنگم معیوب ہے، خصوصاً ترجمہ میں اس طرح کے امتزاج سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ہم شاعری کی لَے اور موسیقی کا استحسان نہیں کرسکتے اور وہ بھی کلہن کی اس زبان کو جو اعلیٰ، عمدہ اور مترنّم ہے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی داستان ہے اور اکثر وبیشتر یہ خوشگوار داستان نہیں ہے کیونکہ یہاں درباری سازشوں، قتل وغارت، بغاوت، خانہ جنگی اور ظلم واستبداد کی بہتات ہے۔ یہ آمریت اور فوجی ظلم وجبر کی داستان ہے۔ یہ عوام کی نہیں بلکہ راجاؤں اور شاہی خاندانوں اور اشراف کی داستان ہے۔ پھر بھی کلہن کی یہ تصنیف راجاؤں کی مصروفیات کے بیانِ محض سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ سیاسی، سماجی اور کسی حد تک معاشی معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہاں ہم قرونِ وسطیٰ کا زرّہ بکتر دیکھتے ہیں۔ چمکتے اسلحہ سے لیس جاگیردار بہادروں کو دیکھتے ہیں۔ سازشوں اور جنگوں کو دیکھتے ہیں۔ خواتین پردے کے پیچھے ہی نہیں بلکہ کونسلوں اور میدانوں اور لیڈروں اور سپاہیوں کی حیثیت سے بھی بہت اہم کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بعض موقعوں پر ہم انسانی رشتوں اور محبت ونفرت، عقیدت اور ہمدردی سے انسانی محسوسات کے قریبی منظر دیکھتے ہیں۔ ہم سُیا کی تکنیکی کارگزاریوں اور آبپاشی کے طریقہ کار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دور دراز ملکوں میں للتادتیہ کی جنگی فتوحات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میگواہن کی اُن قابل ستائش کوششوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اُس

نے عدم تشدد کو پھیلانے کے لیے کیں اور جس کے لئے وہ معرکہ آرائیاں بھی کرتا رہا۔ مندروں اور وہاروں کی تعمیر اور بداعتقادوں کی تخریب، نیز اُن کی جائیداد کی قرقی کا نظارہ بھی دیکھتے ہیں اور پھر یہاں قحط بھی پڑتے ہیں، سیلاب بھی آتے ہیں اور آگ کی وارداتیں بھی رونما ہوتی ہیں جن کی باعث آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ لقمہ اجل بن جاتا ہے اور جو بچ جاتے ہیں وہ مصیبت کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

کلہن، کشمیر کو ایک ایسا ملک قرار دیتا ہے جو بغاوت میں لطف محسوس کرتا ہے، لیکن ان بغاوتوں اور انقلابوں کو فوجی حکمران اور مہم جو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں'' (22)۔

نہرو کے ان خیالات کے تناظر میں کلہن نے ملکِ کشمیر کے بارے میں جو یہ لافانی خیال ظاہر کیا ہے اُس کا مفہوم رنگ بدل بدل کے وقت وقت پر اہل کشمیر کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''کشمیر ایک ایسا ملک ہے جسے فوج کے ذریعہ نہیں بلکہ پیار اور روحانی شفقتوں کی بدولت ہی جیتا جاسکتا ہے''۔

بِلہن (گیارہویں صدی عیسوی)

کشمیر میں بودھوں اور ہندوؤں کے ادوار اقتدار میں، جو اشوک اعظم کے دور میں تیسری صدی قبل مسیح سے چودھویں صدی عیسوی تک جاری رہا، سنسکرت علم و ادب اور فنون لطیفہ کے دوسرے شعبوں میں ایسے نابغۂ روزگار اہالیانِ فکر و دانش پیدا ہوئے جنھوں نے سارے ہندوستان میں اپنی دھاک بٹھا دی اور ان دیوتاؤں کی زبان میں ہر صنف میں ایسے شاہ کار تخلیق کیے جو آج ہندوستان کے کلاسیکی ادبیات میں اعلیٰ و ارفع مقام رکھتے ہیں۔

کشمیر کو پہلے پہل ''شاردا دیش'' بھی کہتے تھے۔ بلہن پنڈت نے اس ملک کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا ہے'' شاعری اور زعفران شاردا کی دو ایسی خوبصورت اشیاء ہیں جو میں نے کہیں اور نہیں دیکھیں''۔(23)

پی این کاوٹھیکر لکھتا ہے کہ: ''کشمیر ادبی دنیا کی مایہ ناز شخصیات سے بھرا پڑا ہے اور اگر ان کی دین کو نظر انداز کیا جائے تو کوئی ادبی تجزیہ مکمل نہیں کہلائے گا۔ کشمیر کے سرکردہ قلم کار اس ملک کے

ہمالائی پہاڑوں، وتستا (دریائے جہلم)، چمکیلے تالابوں اور خوبصورت مرد و زن کو، دیکھ کر فیضان حاصل کرتے تھے"۔(24)

بلہن (گیارہویں صدی عیسوی) کی جائے پیدائش اگر چہ اس کا محبوب کشمیر ہی تھا لیکن وہ بیرون کشمیر سالہا سال تک سفر میں رہا۔ راجہ ہرش (1089-1101) کے دور میں وہ کشمیر سے سفر پر روانہ ہوا اور شمالی ہندوستان میں متھرا، قنوج، الہٰ آباد، کاشی اور ایودھیا میں قیام کرنے کے بعد مغرب میں سوراشٹر پہنچا۔ اس کے بعد وہ جنوبی ہند میں اس تاریخی جگہ پر پہنچا جہاں سری رام نے اپنے مصاحبوں کے لنکا پہنچنے اور وہاں راون کو شکست دینے کی خاطر پتھروں کا پل باندھا تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ: "راجہ کلش کے دور حکومت میں بلہن کشمیر چھوڑ کر کرناٹک دیش کے راجہ پرماڑی کے پاس چلا گیا تھا۔ وہاں راجہ نے اسے اپنے یہاں ملک الشعرا کے منصب سے نوازا۔ یہ بھی حکایت ہے کہ اس راجہ کے حکم سے صرف بلہن ہی کو پہاڑوں پر سفر کرتے وقت ہاتھی پر سوار ہونے کی اجازت تھی اور بس وہی ایک سر پر شاہی چھتری رکھنے کا مجاز تھا۔ ان عنایات کے باوجود بلہن اس کرم فرمائی کو راجہ ہرش کے دربار کی شان اور احترام کے برعکس نہایت کم تر تصور کرتا تھا"۔(25)

بلہن کو ان سفری کارکردگیوں کی بنا پر ملک میں ثقافتی یک جہتی کا علم بردار کہا جاتا ہے۔ وہ اگر ایک راجہ کا درباری شاعر بنایا گیا مگر اس نے کسی دوسرے راجہ کی مخالفت میں ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لایا۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں مختلف راجوں کے درمیان مخاصمت اور دشمنی کا دور دورہ تھا اور درباری شعرا اور دانشور اپنے مربیوں کی حمایت میں مخالف فریق پر کیچڑ اچھالنا بھی ایک فرضِ منصبی تصوّر کرتے تھے۔ بلہن اس سیاسی آلودگی سے اپنا دل و دماغ آلودہ کرنے سے ہمیشہ باز رہا اور اس طرح سماج اور اقتدار کے ایوانوں میں اُس کی عزت و توقیر بڑھتی گئی۔

بلہن کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ سفر میں تھا تو گجرات میں ایک علاقے کے بادشاہ ورسیمہا اور اس کی رانی ستارا کی بیٹی ششی کلا سے ملا۔ جب ششی کلا جوان ہوئی تو اس کے والدین کو اس کی تعلیم و تربیت کی فکر لاحق ہوئی۔ دریں اثنا انھیں معلوم ہوا کہ بلہن نام کا ایک ممتاز کشمیری شاعر اور عالم

گجرات میں موجود ہے۔ اس نے فوراً بلہن سے رابطہ کر کے اسے دربار میں بلایا اور شہزادی کا اتالیق مقرر کیا۔ اس دوران دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور بالآخر انھوں نے خفیہ طور پر گندھارواطریقے سے شادی کر لی اور ایک دوسرے کی صحبت میں ہنسی خوشی دن گزارتے گئے۔ آخر یہ راز کھل ہی گیا اور بادشاہ کے خاص اہل کاروں نے اسے یہ خبر سنا کر اسے بے حد دکھی کر دیا۔ بادشاہ نے اس اقدام کو اس حد تک دل آزار اور قابل ملامت سمجھا کہ اس نے بلہن کو فوراً پھانسی پر چڑھانے کا حکم دیا۔ جب بلہن کو تختۂ دار تک لے جایا گیا تو اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی اور یہ بھی کہ وہ اپنے محبوب دیوتا کا نام لے۔ بلہن موت سے نہیں ڈرتا تھا لہٰذا اس نے ایک عالم سرمستی میں ایک شعر پڑھا جس کے معنی یوں ہیں:

مجھے اگر کچھ یاد ہے

تو وہ بس جانِ حیات ششی کلا ہے

بادشاہ کو جب اس عشق کی شدت کا احساس ہوا تو اس نے بلہن کی سزائے موت منسوخ کر کے ششی کلا سے باضابطہ اس کی شادی کروائی اور داماد کو دولت، دیہات، ہاتھی، گھوڑے اور تحفے تحائف دئے۔ بلہن نے بعد میں ششی کلا کے ساتھ ہوئے تمام واقعات کو واضح طور پر بیان کرنے کی خاطر پچاس بندوں پر ایک مختصر شعری مجموعہ تخلیق کیا۔ جس کا ترجمہ کئی یورپی زبانوں میں ہوا جن میں فرانسیسی بھی شامل ہے (30)

بلہن اور اس کے عشق کی کہانی کو دوسری جگہ یامنی پوران تلک نامی شہزادی سے منسوب کیا گیا ہے جس کے لیے جب راجہ نے بلہن کو اس کا استاد مقرر کیا تو اس جوان اور حسین جوڑے کو جسمانی طور الگ رکھنے کے لیے راجہ نے یہ چال چلی کہ اپنے بیٹی کو کوڑھ کی مریض اور بلہن کو اندھا جتلا کر ان کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا تا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آتش عشق میں سلگ نہ جائیں۔ ایک شب بلہن یوں گنگنانے لگا:

کنول کے پھول کی زندگی ضائع ہی ہوگی

اگر اس نے چودھویں کا چاند نہ دیکھا ہو

شہزادی، جو پردے کے پیچھے نہاں تھی، یہ سن کر حیران رہ گئی کہ اس کا معلم چاند کو دیکھ سکتا تھا۔

اس نے فوراً یہ کہہ کر شعر کو مکمل کیا:

چاند کی زندگی بھی بے کار ہے

اگر اُس نے کنول کے پھول کو چھوا نہ ہو

دونوں نے یہ شعر سن کر پردہ ہٹایا اور پھر وہ ایک دوسرے کے عشق میں محو اور مگن ہو گئے۔ کئی تنقید نگاروں نے یہاں یہ سوال پوچھا ہے کہ نویں سے کم از کم بارہویں تک کشمیر میں سنسکرت کا احیاء اور ترویج بامِ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ بنارس میں سنسکرت کی تعلیم دینے والے اداروں میں یہ سلسلہ چلا آرہا تھا اور غالباً اب بھی اس کا عمل جاری ہے کہ جب کوئی شاستری وہاں سے فارغ التحصیل ہوتا تو کشمیر کی طرف تین بار جھک کر یہاں کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ اس حوالے سے بلہن کے باہری علاقوں میں جانے کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ وہ تعلیم پانے کے لیے نہیں بلکہ تعلیم دینے کی غرض سے سفر کرتا رہا۔ مثال کے طور پر کرناٹک کے راجہ وکرم نے اُسے شاہی شاعر مقرر کیا اور سنسکرت زبان پر اس کی غیر معمولی قدرت اور مہارت سے متاثر ہو کر اسے 'ودیا پتی' یعنی علم وفن کے مالک کا خطاب دیا۔ بلہن نے اپنے خاندان اور وطن، کشمیر، کے بارے میں اپنی خود نوشت سوانح حیات ''وکرمانک دیو چرتر'' میں خود ہی اپنا تعارف کرایا ہے۔ یہ دراصل چالوکیہ راجوں کے حالات پر مبنی ایک بیانیہ بھی ہے جو بلہن نے 1085 میں تحریر کیا۔ ڈاکٹر ٹی، این، گنجو نے اس تخلیق سے یہ دلچسپ اقتباس نقل کیا ہے جسے پڑھ کر قارئین بھی محظوظ ہوں گے: ''پرورسین پور (سری نگر) میں تعلیم کے فروغ کی خاطر بے شمار مرکز اور مدرسے ہیں۔ ان میں پڑھنے والی نازک لڑکیوں کی کردھنیا کام دیو کے پیچھے پڑے ہوئے بھگوان شنکر کو بھی ڈراتی ہیں۔ اس شہر کے دریا وتستا کے کنارے بنے ہوئے اونچے مکانوں کی کھڑکیوں پر علم وادب کا مباحثہ خوب ہوتا ہے۔ اس کو سن کر دیوتا ان پر پھول برساتے ہیں۔ کشمیر میں ودیا کی دیوی سرسوتی خود ہی مدھومتی ندی کے روپ میں رہتی ہے۔ کشمیر کے ادب کی عظمت کا بیان کہاں

تک کیا جائے کیونکہ کُم کُم، کیسر اور شاعری آپس میں سگے بھائی ہیں اور سوائے کشمیر کے دونوں ساتھ ساتھ کہیں نہیں اُگتے"۔

"پرورسین پل کے بیچوں بیچ بہتی وتستا ندی کے دونوں کناروں پر حسین دوشیزاؤں کو دیکھتا کہ پانی کے سنان کوٹھوں (کشمیری: سرانہ کٹھُ یعنی نہانے کا کمرہ) میں اپنی چھاتیوں پر لپے ہوئے چندن اور کیسر کو دھوتی ہیں۔ یہاں کی عورتیں جاڑے میں ناؤ کی بنی ہوئی نہانے کی کوٹھریوں میں نہا کر اپنے جسم کو گرمانے کے لیے کیسر کا لیپ چڑھا کر بکریوں کے اون کے رؤوں سے بنے کستوری خوشبو والے توس یعنی پشمینہ کے شال اوڑھتی ہیں۔ یہاں کے لوگ ناچنے گانے کے بڑے شوقین ہیں، راجہ کشمیم گپت کے کشیم گوری شنکر مندر کے دالانوں میں حسین اور نازک اداؤں والی دوشیزائیں روز ہی جمع ہوتی ہیں۔ ان کے رقص کو دیکھ کر جنت کی حوریں بھی بھونچکی رہ جاتی ہیں"۔(27)

بلہن کی سوانح حیات میں پہلی بار کسی سنسکرت قلم کار کی داستان زندگی کا بیان ہے۔ اس کے کئی ہم عصروں نے اس طرف توجہ نہیں دی ہے جس کی وجہ سے اس دور کے تاریخی واقعات پر گم نامی کا پردہ پڑ چکا ہے۔ کلہن کے برعکس جس نے اپنی تاریخ میں زیادہ تر راجوں مہاراجوں کی نجی زندگیوں، جنسی بے راہ رویوں اور عیاشیوں ہی کی داستانوں سے اپنی راج ترنگنی کو آراستہ کیا ہے، بلہن نے اہلِ کشمیر پر یہ احسان تو کیا ہے کہ انھیں ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس بیانیہ کی بدولت قاری کو گزرے ہوئے کشمیر کے سماجی، ثقافتی اور دیگر حالات زندگی کے گونا گوں پہلوؤں سے بہت حد تک آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔

بلہن نے سنسکرت میں جو نغمے لکھے وہ اس نے "چورا پنچ شکا" نامی پچاس بندوں پر مشتمل مجموعے میں مرتب کیے۔ اس تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں تخیل کی بلندی، فن کارانہ کمال اور تغزل کی کارفرمائی نے اسے ایک پُر اثر مجموعہ شعر بنا دیا ہے۔ یہ وہی مجموعہ کلام ہے جو بلہن نے اس وقت قید خانے میں لکھا جب بادشاہِ وقت نے اسے شہزادی کے ساتھ خفیہ عشق بازی کی پاداش میں سزائے موت سنائی تھی۔

بلہن کی ایک اور تصنیف ''کرن سندری'' ایک ڈراما ہے جو چانکیہ خاندان کے بھیم دیو کے بیٹے کرن راج اور راج کماری کی داستان عشق ہے جسے شاعر نے رومانوی نغمات سے بھی آراستہ کیا ہے۔

تجزیہ کاروں اور ماہرینِ فن کی رُو سے بلہن کی خودنوشت سوانح ایک بہترین تصنیف ہے جس پر کوئی اختلافِ رائے موجود نہیں۔ اس میں وہ اپنی ذات کے بارے میں اٹھارہویں بند میں کشمیر کی راجدھانی کا ذکر کر کے پھر کشمیر کے راجوں کی تفصیلات اور بعد میں اپنے آباواجداد کی کہانی بیان کرتا ہے۔ بلہن نے یہاں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن مقدس دریا گنگا کے کنارے گزارنا چاہتا ہے۔

بلہن نے اس کتاب میں گہری عقیدت اور بھرپور محبت کے ساتھ پرورپور کے شہر کا ذکر کیا ہے جسے اب پامپور کہتے ہیں اور جو دریائے وتستا کے کنارے واقع ہے، جہاں انگور کے باغات تھے اور موسم گرما میں سورج کی معتدل اور خوش کن شعاعیں چمک اٹھتی تھیں۔ اس کے بقول سنسکرت کے بڑے بڑے عالم یہیں پر رہتے تھے گویا یہ ان کے لیے تقدس کی جگہ تھی جنھوں نے گورو برہس پتی کو علومیات میں پیچھے چھوڑا تھا۔ یہ شہر دیوی سرسوتی کے مسکن کیلاش پربت کے سائے میں موجود تھا۔ بلہن یہاں پر یہ بھی بتاتا ہے کہ اس شہر کے لوگ کس قدر علم و دانش سے مالا مال تھے کہ ہر گھرانے میں سنسکرت اُتنی ہی آسانی سے بولی جاتی تھی جتنی کہ وہ اپنی مادری زبان کا استعمال کرتے تھے۔ (28)

بلہن کی دیگر تصانیف میں ایک مہا کاویہ، ایک ناٹک وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بلہن کو ازمنہ وسطیٰ کے عظیم شعرا میں گنا جاتا ہے جب کشمیر سارے ہندوستان میں سنسکرت ادبیات اور خاص کر شعریات کا سب سے بڑا گہوارہ تھا اور کے کلاسیکی سرمائے میں بلہن پنڈت نے اپنے قلم کی موشگافیوں سے خاطر خواہ اضافہ کیا جس کی بنا پر وہ ہزار سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہندوستاں کے برگزیدہ سنسکرت لکھاریوں کی صفِ اول میں اپنے مرتبہ پر شان اور آن سے براجمان ہے۔

.........☆☆☆.........

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں اردو، پہلا حصہ، عبدالقادر سروری، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1981ء ص 105-104

(2) مشاہیر نمبر۔ کلچرل اکادیمی، سری نگر، 1976، ص269

(3) ایضاً ص268
(4) ایضاً ص4-3
(5) یہ کلام پڑھ کر کشمیری شاعر رسول میر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے:

یم قبہ سینکی ڈیشہ ونین دُبہ پھران دل
انارِ شیرین کونہ دو پستان دپان چھی

(6) سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر، کشمیر پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی، 1954ء، ص29
(7) تانترا اور کشمیر کے ابھینو گپت کی تعلیمات: فلسفہ اور روحانیت۔لنڈا جانسن، یوگا انٹرنیشنل، جنوری 2004
(8) ابھینو گپت، پنڈت دینا ناتھ شاستری، مشاہیر نمبر، ہمارا ادب، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1976ء، ص137-136
(9) ایضاً ص137
(10) کھیمیندر، برج موہن چترویدی، ترجمہ چمن لال رینہ، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، 1989ء، ص45-44
(11) کشمیر، کیپٹل پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، 1996، جلد اول ص60
(12) تاریخ کشمیر، فرید بک ڈیپو نئی دہلی، 2011 ص261-260
(13) آن دی امپارٹنس آف کلچرل ہیری ٹیج، وتستا۔
(14) اے ہسٹری آف کشمیر، پرتھوی ناتھ کول بامزئی، میٹروپالٹن بک کمپنی، نئی دہلی، 1962ء، ص226
(15) کے، این، دھر، گلمپسز آف کشمیری کلچر، ویویکا نند کیندر، کنیا کماری، جون 1984ء
(16) آن دِی امپارٹنس آف کشمیری کلچرل ہیری ٹیج، وتستا ویب سائٹ
(17) وتستا سالنامہ، کشمیر سبھا کلکتہ۔جلد 32، 99-1998ء
(18) ہمارا ادب، مشاہیر نمبر 77-1976ء، کلچرل اکادمی سرینگر 1978ء، ص430 تا 431
(19) سٹرگل فار فریڈم اِن کشمیر، پریم ناتھ بزاز، کشمیر پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی 1953ء؛ ص40 تا 41
(20) دورِ بڈشاہی کا نامکمل ترجمہ راج ترنگنی اور اُس وقت کے ایسے دیگر تراجم کا اب کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔
(21) کلہن، سوم ناتھ در، ترجمہ مجید مضمر، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، 1992ء؛ ص10 تا 12
(22) راج ترنگنی یعنی بادشاہوں کے دربار کی عظیم داستان، ترجمہ رنجیت سیتارام پنڈت، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1977ء
(23) بلہن، پی این کاوتھیکر، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، 1995ء، ص1
(24) ایضاً
(25) راج ترنگنی
(26) بلہن کے بارے میں یہ کہانی کاوتھیکر نے بیان کی ہے، ص(44-43) لیکن بلہن کا ایک جرمن مترجم جارج بہلر اس داستان کو محض ایک مفروضہ قرار دے کر کہتا ہے کہ ایسا محض شاعر کی زندگی میں رنگ آمیزی کی خاطر کہا گیا ہے۔ (خیالؔ)
(27) ہمارا ادب، مشاہیر نمبر، 77-1976، کلچرل اکیڈیمی، سری نگر، 1978، 263
(28) یہاں پر بلہن نے مادری بولی کی نشان دہی نہیں کی ہے کہ کیا وہ کشمیری تھی یا کوئی اور زبان جواب ناپید ہو چکی ہے۔

...........●●● ....

دنیائے ادب کی دس عظیم کتابیں

جان کیننگ (John Canning) نے عظیم کتاب کی یہ تشریح کی ہے کہ وہ ادبی لحاظ سے غیر معمولی طور پر معیاری ہو۔اس میں علم کے شعبہ جات کے ساتھ شاندار فکروذہن کی آ گہی کا اظہار ہو اور روحانیت کے فقید المثال ادراک پر مبنی ہو۔

دنیا بھر میں جن کتابوں کو عظیم کہا جاتا ہے اُن میں مذہبی صحائف کو اوّلین حیثیت حاصل ہے۔ اہلِ اسلام کے نزدیک دنیا کی سب سے عظیم بلکہ عظیم ترین کتاب الہامی صحیفہ قرآن پاک ہے۔اسی طرح دیگر مذاہب کے پیروکار اپنی الہامی کتب کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے ہیں جو اُن کا حق بجانب عقیدہ ہے۔

ادبیات کے تعلق سے چند ہی تصانیف کو عظیم کہلائے جانے کا افتخار حاصل ہوسکا ہے۔ان کے انتخاب میں بھی اختلافات کی گنجائش موجود ہے، لیکن یہاں بھی انتخاب کرنے والے کی ذاتی پسند و ناپسند ہی کو ملحوظ نظر رکھا جاسکتا ہے۔اسی امر کے پیش نظر اس مقالے میں چند ایسی کتب کو زیر بحث لایا گیا ہے جو میری نظروں میں بہت بڑی عظمت کی حامل ہیں۔اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس زمرے میں مکالماتِ افلاطون ، مادام بواری، مارکس کی کیپٹل، یولسز، ڈاکٹر ژواگو، دیوان حافظ، پیراڈائز لاسٹ، گڈارتھ، شیکسپیئر کے ڈرامے اور کئی اور لاجواب کتب کو بآسانی شامل کیا جاسکتا ہے۔مگر یہ مقالہ محض میری ذاتی پسند کا ماحصل ہے اور اختصار کے پیش نظر اس میں بھی صرف دس کتابوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ا۔ ہومر کی ایلیاڈ

ہومر (9th Century BC) قدیم یونان کا سب سے مشہور شاعر تھا جس کی پیدائش دنیا کے اوّلین مورخ ہیروڈوٹس کے مطابق 850 قبل مسیح میں ہوئی۔ ہومر نے ایلیاڈ Iliad جیسا شاندار رزمیہ

تخلیق کر کے دنیائے سخن گوئی میں ایک ایسی جگہ بنالی کہ تین ہزار سال گزرنے کے باوجود آج تک اس مرتبے کو کوئی اور نہیں پہنچ سکا ہے۔ البتہ رینان کی یہ پیش گوئی کہ "ایک ہزار سال کے بعد دنیا کی ساری کتابیں ڈھول چاٹتی ہوں گی اور اگر کوئی باقی رہے گا تو وہ ہے ہومر" اس کی اپنی صوابدید کی عکاسی کرتی تھی۔

سماجیات کے تناظر میں کہا جاتا ہے کہ فتنہ وفسادات کی جڑ "ز" حرف سے ہی متعلق ہوتی ہے یعنی زر، زن اور زمین۔ ایلیاڈ کی کہانی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا مرکزی کردار بھی ایک خوبصورت عورت ہیلن ہی ہے جو دو ممالک یعنی یونان اور ٹرائے کے درمیان دس سالہ خون ریز جنگ کا باعث بنی۔ اس جنگ کے نتیجے میں ٹرائے کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

ٹرائے کا اصلی نام ایلیم تھا۔ اسی مناسبت سے ہومر نے اپنی کتاب کا نام ایلیاڈ رکھا۔ ہومر قدیم یونان کا ایک نابینا گوّیا تھا جو گھر گھر جا کر یونان کی حکایاتی داستانیں اور سینہ بہ سینہ چلنے والی دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں سنا سنا کر لوگوں سے کچھ پیسے کما کر اپنا گزر بسر کر لیتا تھا۔ وہ رباب جیسا ایک آلۂ موسیقی بجا کر بھی عام لوگوں کے دل بہلاتا تھا۔

ایلیاڈ کا قصہ قدیم یونان کی دیو مالائی حکایات پر مشتمل ہے جس میں انسان ان ہی دیوتاؤں کو خدائیت کا درجہ دے کر ان ہی کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔

ایلیاڈ میں یونان اور ٹرائے کے درمیان بارہویں صدی قبل مسیح میں لڑی گئی اُس جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے جو دس سال تک جاری رہی اور جس نے ہزاروں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ شاعر نے بہر حال اس جنگ کے دسویں سال یعنی 1184 قبل مسیح کا حال اپنے رزمیہ میں اس لیے نظم کیا ہے کہ اگر وہ اس جنگ کے سارے عرصے پر محیط واقعات کو قلم بند کرتا تو داستان کی چاشنی اور اثر انگیزی متاثر ہو جاتی۔

ہومر نے جن لوگوں کے لیے ایلیاڈ لکھی وہ اس کے تمام واقعات سے واقف تھے، لیکن شاعر نے جس انداز میں ان کی شیرازہ بندی کی اُس نے ہومر کو یونانِ قدیم کا سب سے مقبول اور محبوب سخن گو بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ دارا نے اپنی جنگی مہمات کے دوران لوٹ کا جو مال جمع کیا تھا اُس میں سے اُسے ایک چھوٹا سا صندوق بہت پسند آیا۔ مصاحبوں سے پوچھا کہ اس میں کون سی چیز رکھی جائے؟ ساتھیوں

نے الگ الگ مشورے دیے جن میں سے کوئی بھی اس کی پسند کا نہیں تھا اور پھر وہ خود ہی اخیر پر بولا،
''میں اس میں ہومر کی ایلیاڈ رکھوں گا''۔

۲۔ کالی داس کی شکنتلا

کالی داس کب اور کہاں پیدا ہوا؟ اس کے بارے میں متضاد آرا پیش کی گئی ہیں۔ اس کی جائے پیدائش کے سلسلے میں مالوا میں مندسور، اجین اور کشمیر کے نام زیرِ تذکرہ ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کہتے ہیں ''میں نے بھی کہیں پڑھا ہے کہ وہ کشمیر میں پیدا ہوا'' دلی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر پنڈت لچھمی دھر شاستری نے انگریزی میں ''کالی داس کی جائے پیدائش'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی جو 1926ء میں شائع ہوئی۔ اس میں پروفیسر شاستری نے کالی داس کو کشمیری ثابت کرنے کی خاطر یہ دلائل پیش کیے ہیں:

(1) وہ کشمیر کے دھان کے کھیتوں اور باغات کا جذباتی انداز میں ذکر کرتا ہے۔

(2) اس نے زعفران کے پھولوں کا ہو بہو نقشہ پیش کیا ہے جو صرف کشمیر کی پیداوار ہے اور جس کے بارے میں کسی اور غیر کشمیری نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ دورِ گذشتہ میں کشمیری عورتیں اپنے سینوں پر زعفران کے نشان ثبت کرتی تھیں۔ اس کا ذکر بھی کالی داس نے کیا ہے۔

(3) جس خوبصورتی سے اُس نے دیودار کے جنگلوں، مرگوں، جھیلوں، شیروں کی گپھاؤں، پہاڑوں اور نافہ غزال کی تصویر کشی کی ہے وہ ایک کشمیری فن کار ہی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔

(4) شکنتلا ڈرامے میں ستی سر نامی ایک بہت بڑی جھیل سے کشمیر کا وجود عمل میں لانے کا کالی داس نے حوالہ بھی دیا ہے اور یہ کہ اس نے کشمیر کے حوالے سے اپنی جانبداری کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے۔

(5) میگھ دُوت نظم پڑھ کر بھی یہ احساس ذہن میں جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ کشمیری الاصل تھا۔ بدقسمتی سے مزید مطالعے اور تجزیے کے لیے انگریزی میں تحریر کردہ پروفیسر شاستری کی یہ کتاب he TBirthplace of Kalidasa بسیار کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکی۔

چند تحقیق کاروں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کالی داس کشمیر ہی میں لار کے دیہات کے قریب منہ گام میں پیدا ہوا۔ البتہ اپریل 1964ء میں اُجین سے سات میل دور کالی داس نام کے محلے میں ایک لمبا کتبہ دریافت ہوا جس پر یہ عبارت کندہ تھی کہ کالی داس بکرماجیت کے دور میں اُجین میں پیدا ہوا اور وہیں پر اُس کی پرورش ہوئی۔ کتبے پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کالی داس اُجین ہی میں چورانوے سال کی عمر پاکر فوت ہوا۔

کالی داس کے بارے میں کئی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ ابتدائے شباب میں بھی حد درجہ ابلہ اور نافہم شخص تھا۔ لیکن بعد میں کالی دیوی نے اس پر مہربان ہو کر اسے علم اور آگہی کے رموز سے واقف کیا اور اسی تناسب سے اس کا نام کالی داس یعنی کالی ماتا کا غلام پڑ گیا۔ کالی داس کی موت کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ ایک بار لنکا میں کمار داس کا مہمان تھا کہ اسی دوران ایک رقاصہ نے اسے قتل کیا۔ مزید تفصیل یوں ہے کہ اس قتالہ نے کالی داس کے سامنے یہ مصرعہ پڑھا:

کنول کے پھول پر کنول کا ہونا سنا ہے پر دیکھا نہیں

اور سبھی حاضرین سے کہا کہ وہ اس پر گرہ لگائیں۔ کئی سخن وروں نے کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ بالآخر کالی داس نے اس حسینہ سے مخاطب ہو کر کہا:

اے نازنین! تمہارے پھول سے چہرے پر کس طرح دونوں سج رہے ہیں؟

رقاصہ بے حد خوش ہوئی مگر اس اندیشے سے کہ کسی کو پتہ نہ لگے کہ یہ مصرعہ اُس کا نہیں ہے، اس نے کالی داس کو قتل کر ڈالا، لیکن اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔

کالی داس نے جو ڈرامے اور طویل نظمیں لکھیں اور جو ہم تک پہنچ سکیں اُن میں شکنتلا، میگھ دوت، کمار سمبھو، رگھو مش، رتو سنگھار، مالویکا گنی متر اور وکرم اُروشی شامل ہیں۔ شکنتلا کالی داس کی تمام تخلیقات میں ایک ایسا شاہکار ہے جس نے اس کی شہرت کو دور دور تک پہنچایا اور اس کے نام کو بقائے دوام بخشا۔ شکنتلا کی کہانی بھی ہندو دیو مالا سے ماخوذ ہے۔ یہ کہانی مختصراً یوں ہے کہ راجہ دشینت نے ایک جنگل میں ایک خوبصورت عورت شکنتلا کو دیکھا جو وہاں ماں باپ کو چھوڑ کر کنو ریشی کے پاس دن گزار رہی تھی۔ دشینت نے فوراً شکنتلا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی جو فوراً منظور ہوئی، کیونکہ شکنتلا خود

بھی اس کے عشق میں کھوگئی تھی۔ دونوں نے گاندھرو رسم کے مطابق شادی کی اور دشینت شکنتلا کو دربار میں بلانے کا وعدہ کر کے اور اسے یادگار کے طور پر ایک انگوٹھی دے کر واپس چلا گیا۔ دریں اثنا شکنتلا نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ شکنتلا دشینت کے دربار میں پہنچی تا کہ راجہ اُس کے بیٹے یعنی دشینت ہی کے بیٹے کو تخت نشین بنا دے۔ دشینت شکنتلا کو سرے سے ہی بھول چکا تھا اور اس نے اسے پہچاننے سے سراسر انکار کیا۔ شکنتلا نے ثبوت کے طور پر دشینت کی دی ہوئی انگوٹھی اُسے دکھانی چاہی، لیکن یہ دیکھ کر اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ انگوٹھی غائب تھی۔ دراصل یہ انگوٹھی شکنتلا کی انگلی سے نہاتے وقت دریا میں گر گئی تھی۔ شاہی محل میں دشینت اور شکنتلا کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ ایک مچھیرا حاضر ہوا، اُس نے انگوٹھی پیش کرتے ہوئے راجہ سے کہا کہ یہ اُسے ایک مچھلی کا پیٹ چیرتے وقت ہاتھ لگی ہے۔ راجہ نے انگوٹھی اور شکنتلا دونوں کو پہچان لیا اور محل میں اُسے رانی بنا کر اور بیٹے کو تخت کا جانشین قرار دے کر خدا کے حضور سر بسجود ہوا۔

کالی داس نے تمام ہم عصر سنسکرت نگاروں اور اس سے پہلے کے تخلیق کاروں پر اس لحاظ سے سبقت حاصل کی ہے کہ وہ اپنے مصور قلم سے باریک ترنکتوں اور ایسی چیزوں کی شاندار تصویر کشی کرتا ہے جن پر دوسروں کی نظر نہ پڑی ہو۔ وہ فطرت کے الگ الگ رنگوں کی جادوگری میں محو ہو جاتا ہے اور پھر اس وجدانی کیفیت کو اپنے قلم کی مصوری سے مزین کرتا ہے۔ اس کے مشہور ترجمہ کار آرتھر ڈبلیو رائڈر نے اسی لیے کہا ہے کہ کالی داس کا مقام نہ صرف اناکریون، ہوریس اور شیلے کے ہم پلہ ہے بلکہ وہ سوفوکلیز، ورجل اور ملٹن کا بھی ہم نشین ہے، اور جرمن شاعر اور ڈراما نویس گوئٹے نے اپنے اشعار کالی داس کو نذر کیے ہیں:

تم خواہ بہار کے خوبصورت پھولوں کا ذکر کرو!
یا خزاں کے رس بھرے میووں کا
یا اُن اشیا کا جو روح کو وجد میں لاتی ہیں
اسے آرام پہنچاتی ہیں اور شادماں کرتی ہیں
یا تم ہر اُس شے کو ایک ہی نام دو

جو زمین و آسمان میں موجود ہے
اس کا بس ایک ہی نام ہوگا۔ شکنتلا
بس یہی کافی ہے

۳۔ ورجل کی اینیڈ

ورجل 70 قبل مسیح لاطینی شاعروں کا ملک الشعرا تھا۔ اس کی اینیڈ Aeneid کو اطالوی ادبیات میں ایک الہامی صحیفے کا رتبہ حاصل ہے۔

ورجل 15 ر اکتوبر 70 قبل مسیح کو اطالیہ کے مانتوا مقام پر پیدا ہوا اور وہ عمر میں آگسٹس سے سات سال بڑا تھا۔ ورجل کی جوانی کے دنوں میں جولیس سیزر روم کا بادشاہ تھا جس نے ورجل کو اپنے دربار میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس کی کوئی مصدقہ وجہ اگرچہ معلوم نہیں لیکن یہ اغلب ہے کہ ورجل سیزر سے عمر میں تیس سال چھوٹا تھا اور بادشاہِ وقت نے اسی لیے اسے دربار شاہی میں بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھا۔ اڑتالیس قبل مسیح میں جولیس سیزر کے خلاف بغاوت ہوئی اور مارچ 44 قبل مسیح میں اسے دردناک طریقے سے قتل کیا گیا۔ ورجل کے مداح شہنشاہ آگسٹس نے اس بے انصافی کی تلافی کی جب اس نے ورجل کو درباری شاعر کی جگہ کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ اینیڈ کو ایک عظیم قومی ورثے کی شکل میں دور دور تک شہرت بخشوانے کا بھی اعلان کیا گیا۔

سیزر یعنی قیصر روم کے دل دہلانے قتل کے بعد روم کی حالت بے حد دگرگوں ہوئی اور ملک زوال پذیر ہونے کی دہلیز تک جا پہنچا۔ عوام کے دل و دماغ میں فکری خلفشار، ذہنی ہیجان اور مایوسی نے گھر کر لیا تھا اور اس پریشان کن صورت حال نے آگسٹس کو بھی ملول کر دیا۔ اس کے مغموم دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی شاعر کے قلم سے ایک ایسا شاہکار تخلیق کروایا جائے جسے پڑھ کر ہزیمت زدہ رومیوں کے حوصلوں کے بجھتے ہوئے چراغ پھر سے روشن ہوں۔ یہ مقصد پورا کرنے کے لیے اس نے ورجل ہی کو منتخب کیا جو اُس کا منظور نظر تھا اور ورجل ہی کے قلم سے تخلیق شدہ یہ عظیم رزم نامہ اسے روم کی ذہنی نجات کا مظہر دکھائی دیا۔ اینیڈ کو مکمل کرنے میں ورجل کو سالہا سال لگے۔ کبھی کبھی وہ ایک دن میں صرف ایک شعر موزوں کر پاتا تھا۔

اینیڈ اصل میں وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں ہومر کی ایلیاڈ کا اختتام ہوتا ہے۔ ورجل کے رزمیہ میں تباہ شدہ ٹرائے کا ایک نڈر سپاہی اینیاس جان بچا کے روم سے اپنی جنگی مہمات پر نکلتا ہے۔ ورجل نے اینیاس کے انھی کارناموں کے تانے بانے سے روم کی عظمت رفتہ کو بحال کر کے اسے حیات جاودانی بخشنے کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اگر یہاں پر ہومر کی ایلیاڈ اور ورجل کی اینیڈ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ جہاں ہومر نے اپنے رزمیہ میں ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جو پڑھنے سے زیادہ سننے سے تعلق رکھتا ہے، وہاں اس کے برعکس جب ورجل نے اپنا ادبی شاہکار تخلیق کرنے کا بیڑا اُٹھایا تو اس کی نظروں میں روم کے اعلیٰ درجے کے لوگ اور پڑھے لکھے قاری تھے۔ اس طرز تحریر نے اگرچہ اینیڈ کو ادبی معیار کے لحاظ سے مقابلتاً بہتر شکل دی ہے لیکن مقبولیت میں ایلیاڈ دوسری ہر تخلیق یا تصنیف پر سبقت لے جاتی ہے۔

اطالوی شاعر ڈانٹے (Dante) نے اپنے فکری رہنما ورجل کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

تم وہی ورجل ہو، گرجتا ہوا چشمہ شیرین
جہاں سے کلام کے دھارے اُبلتے ہیں
جو لہریں مارتے ہیں
تم تو وہی ورجل ہو
جو دوسرے شاعروں کے لیے روشنی کا مینار ہے
تم میرے استاد اور پیارے سخن گو ہو

۴۔ فردوسی کا شاہنامہ

شاہنامہ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی (940-1020) پارس کی وہ قدیم داستان ہے جو فارسی زبان میں دنیا کا طویل ترین رزمیہ کہلاتا ہے۔ ''بادشاہوں کی کتاب'' نامی پچاس ہزار ابیات پر مبنی یہ شعری کارنامہ فردوسی نے اپنی عمر کے تیس سے زیادہ سال میں قلم بند کرلیا تھا۔ لیکن اُسے کیا ملا، وہ بجائے خود ایک دردناک واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہنامہ بادشاہِ وقت محمود غزنوی (971-1030) کے دور میں تخلیق ہوا جب غزنوی نے فردوسی کو دربار میں بلا کر پارس کی شان رفتہ کو نظم کرنے کی درخواست

اس کے سامنے رکھی اور خود یہ پیش کش بھی کی کہ وہ شاعر کو ایک ایک شعر کے عوض ایک ایک اشرفی عطا کرے گا۔ تو فردوسی نے تیس سال تک خون پسینہ ایک کر کے اور آنکھوں کا خون جلا کر بالآخر شاہنامہ مکمل کر ہی لیا۔ یہ عظیم الشان شاہکار فردوسی نے 977ء اور 1010ء کے درمیان مکمل کر لیا اور اسے کئی ممالک یعنی پارس، افغانستان، تاجکستان اور ساری فارسی دان دنیا میں قومی رزمیہ قرار دیا گیا:

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

(میں نے ان تیس برسوں میں بہت تکلیف اُٹھائی، لیکن اسی فارسی (شاہنامہ) سے عجم کو دوبارہ زندہ کر لیا)

فردوسی خوشی خوشی اپنے عظیم کارنامے کا مسودہ لے کر دربارِ شاہی میں چلا گیا، جہاں یہ سن کر اُس کے دل کو زبردست ٹھیس لگی کہ بادشاہ اپنے وعدے سے مکر گیا تھا اور وہ ایک شعر کے لیے ایک اشرفی دینے سے منکر ہوا۔ فردوسی عالم مجبوری میں خاموشی سے دربار سے نکلا۔ بادشاہ اس کے بعد اُس اضطراب میں مبتلا ہوا کہ اُس نے فردوسی کے ساتھ سراسر بے انصافی کی ہے۔ اس نے ایک قاصد کے ہاتھوں ساری کی ساری رقم فردوسی کے ہاں روانہ کی۔ قاصد جب شاعر کے گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔

مشرق میں فارسی زبان نے ادبیات عالیہ کو کئی عدیم المثال شہہ پاروں سے مالا مال کیا ہے جن میں مثنوی رومی، دیوانِ حافظ، گلستان اور بوستان، رباعیات عمر خیام وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان میں شاہنامہ اس وجہ سے ایک منفرد فن پارہ مانا جاتا ہے کہ اس میں فردوسی نے قدیم ایران کو ادبی، ثقافتی اور تاریخی لحاظ سے ساری دنیا کے کینواس پر نمایاں کیا ہے۔

شاہنامہ میں بہت حد تک ایران کے دیو مالائی اور کسی حد تک اس کے قدیم تاریخی ماضی کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں دنیا کے آغاز سے لے کر ہم عصر تاریخ کے کئی حکایاتی اور حقیقی واقعات کا بیان ہے جن سے وابستہ کردار رُستم، سہراب، شہرزاد، پرویز، اردشیر، شہریار، سہراب، نوشیرواں، سام، نریمان آج بھی ہمارے معاشرے میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

عام اتفاق ہے کہ ایران میں فردوسی کے درجے کا کوئی شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ صرف انوریؔ اُن شعراء میں ہے، جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

رزمیہ شاعری کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کی یہ رائے ہے: ''رزمیہ شاعری کے کمال کی چند شرائط ہیں۔ واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو، لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور و شور اور پُر رعب طریقے سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں، معرکہ جنگ کے تمام ساز و سامان اور آلات و اسلحۂ جنگ تفصیل سے بیان کیے جائیں، سالار فوج اور مشہور بہادر کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤ پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں۔ شاعری کے انواع میں رزمیہ شاعری بہترین انواع ہے۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اُس کا کارنامہ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہا بھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جاسکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے''۔

۵۔ ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی

ڈانٹے (1321 تا 1265 ق م) عیسوی سنہ کے 1263 سال بیت چکے تھے اور چوسٹھواں سال اگست کے مہینے تک پہنچا تھا کہ اٹلی کے شہر فلورنس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ لوگ ششدر ہو کر رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے آسمان پر ایک ایسا دُم دار ستارہ دیکھا جس نے دم زدن میں آکاش سے لے کر زمین تک ایسی روشنی پھیلائی کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ تابناک ہوا۔ عوام نے قیاس آرائیاں کیں کہ کچھ بُرا پیش آنے والا ہے، مگر بزرگوں نے یہ بشارت دی کہ اس شہر میں ایک بہت بڑا شخص جنم لے گا۔ چند ماہ بعد یعنی 1265 میں مئی کے اخیر میں ڈانٹے پیدا ہوا۔ اس کا نام ڈانٹے الیگھیر ی رکھا گیا مگر بعد میں وہ ڈانٹے ہی کے نام سے مشہور رہا۔ ڈانٹے جب نو سال کی عمر کو پہنچا تو وہ ایک محفل میں سات سالہ بیٹرس پر عاشق ہوا جو بعد میں اس کے خوابوں کی ملکہ اور خیالوں کی تحریک بن گئی۔ نو سال بعد اس نے ملاقات کا بیان ایک تخلیق 'لاوتا نووا' میں ان الفاظ میں قلم بند کیا، ''اُس دن وہ بہترین رنگ کا پوشاک پہن کر آئی تھی، لاجوردی رنگ کا ہلکا اور بے حد دل نشین۔ سچ پوچھو تو کہوں کہ اُس لمحے میرے روم روم میں اس شدت سے تھرتھراہٹ پیدا ہوئی کہ میرے جسم کے ہلکی نبض بھی

ملنے لگی اور اسی گھبراہٹ کے عالم میں میری زبان سے یہ الفاظ نکلے:

دیکھو! اُس آقا کو جو میری طرف آرہا ہے

وہی میرا حاکم بن جائے گا۔

ڈانٹے اور بیٹرس کا یہ عشق چند سال تک قائم رہنے کے بعد اُس وقت منطقی نتیجے کو پہنچا جب بیٹرس کی شادی شہر کے ایک رئیس سے ہوئی۔

فلورنس میں جب اقتدار کے پجاریوں نے سفید اور کالے کے نام پر خانہ جنگی اور افراتفری کا بازار گرام کیا تو ڈانٹے شہر سے دور ایک پُرسکون جگہ پر رہائش پذیر ہوا، لیکن اس کی غیر حاضری میں کالے لوگوں نے اس پر مقدمہ چلایا اور یہ سزا تجویز ہوئی کہ اسے پھانسی دی جائے یا اگر وہ واپس آیا تو اسے زندہ جلایا جائے۔ یہ سزا بہر حال عمل میں نہیں لائی جاسکی، کیونکہ جب ڈانٹے کو اس کا پتہ چل گیا تو اس نے دوبارہ فلورنس کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا۔ جلاوطنی کے دوران ہی ڈانٹے کو ڈواین کامیڈی Divine Comedy لکھنے کا خیال آیا۔ جس نے بعد میں اُسے اٹلی کے ملک الشعراء کا درجہ بخشا۔

ڈواین کامیڈی تین حصوں یعنی جہنم، اعراف اور جنت پر مشتمل ہے۔ یہ شاہکار ڈانٹے کے تصوراتی سفر پر مبنی ہے جس میں وہ ان تینوں مابعد حیات جگہوں کا سفر اختیار کرتا ہے اور اس سفر کے دوران ایسی بے شمار تاریخی ہستیوں کے ساتھ ملاقات کر کے یا ان پر اپنی تنقیدی یا توصیفی رائے ظاہر کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اس سارے سفر میں ڈانٹے کا رہبر ورجل ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کے نقاد ڈانٹے کی یادداشت پر حیران ہیں کہ اس کے ذہن میں اتنے نام موجود تھے۔ ڈواین کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد ٹی ایس ایلیٹ نے کہا کہ ''نئی دنیا کو صرف دو ہستیوں نے آپس میں بانٹا ہے اور وہ ہیں ڈانٹے اور شیکسپیئر، تیسرا کوئی ان کا شریک نہیں''۔

ڈانٹے اپنے ایک مراسلے میں ڈواین کامیڈی کے تعلق سے لکھتا ہے کہ ''اس کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں رہنے والوں کو دکھوں اور مصائب کی حالت سے نکال کر مسرت اور سرور کے عالم میں سرفراز کیا جائے''، حقیقت بھی یہی ہے کہ ڈانٹے کی وفات کے فوراً بعد یہ تخلیق سارے روم میں گھر گھر پڑھی جانے لگی اور اسے قومی وراثت کا درجہ نصیب ہوا۔ کٹر عیسائیوں نے تو اسے ایک مذہبی صحیفے کا درجہ دیا،

کیونکہ اس میں عیسائیت کی زوردار تبلیغ کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے تئیں ہتک آمیز زبان سے کام لیا گیا تھا۔ کارلائل نے بھی ان مداحوں کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا کہ "ڈواین کامیڈی جیسی مقدس کتاب لکھ کر ڈانٹے نے قوم میں روحانیت اور نیک اعمال کی بہترین صفات پیدا کیں"۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب ڈانٹے واپس وطن لوٹا تو وہاں کی خواتین نے سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہا "دیکھو! یہ وہی ہے جو دوسری دنیا میں چلا گیا تھا اور وہاں سے مُردوں کی خبر لے کر آیا ہے"۔

اکیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد ڈانٹے نے اپنی جائے پیدائش سے دور راوینا کے شہر میں آخری سانس لی۔ ڈانٹے کی وفات کے پانچ سو سال بعد لارڈ بائرن اُس کی قبر پر گیا اور وہی بائرن جو اپنی زندگی میں زندوں کے سامنے بھی نہیں کھلا تھا اُس کے مقبرے کے سامنے جھک کر ایک نومولود بچے کی طرح زار زار رونے لگا۔

۶۔ شیکسپیئر کا ہیملٹ

ولیم شیکسپیئر (1464 تا 1616ء) دنیا کا عظیم ترین ڈراما نگار مانا جاتا ہے۔ اس کے سنتیس ڈراموں میں ہیملٹ کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی جسے اس برطانوی شاعر کے بے مثال المیہ شاہکار کا رُتبہ حاصل ہوا۔

شیکسپیئر کی شخصیت دنیا میں گوناگوں کمالات کے ساتھ متعارف ہوئی۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں تھا جس نے ڈراموں میں بھی بہترین سخن گوئی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے ڈرامے کئی قدیم ممالک کی تاریخی، ثقافتی اور حکایاتی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

کئی نقادوں کا خیال ہے کہ اسی خداداد صلاحیت کی بنا پر اس فنکار پر غالباً سب سے زیادہ تعداد میں کتابیں اور تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھے گئے۔ علامہ اقبال نے اس طرح اس رازدانِ اسرارِ فطرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

شیکسپیئر کی پیدائش اگر چہ انگلستان کے شہر سٹراٹ فورڈ میں ہوئی لیکن لندن منتقل ہونے کے بعد اس کی ادبی اور فنی صلاحیتیں نکھر آئیں جب اس کی ملاقات کئی ادیبوں اور ڈرامانویسوں کے ساتھ ہوئی، جن میں ایڈمنڈ سپنسر، ٹھامس گرین، جارج چیپمین، کرسٹوفر مارلو، بین جانسن اور فلیچر شامل تھے۔ یہاں ان فنکاروں کی وساطت سے اور ان کی صحبت میں وہ 1484 تک ایک اچھا ڈرامانگار بن چکا تھا۔ اپنی عمر کے تئیسویں سال یعنی 1487 میں ملکہ برطانیہ الزبیتھ نے اسے دربار میں اداکاری کرنے کی دعوت دی۔ ملکہ اس کے فن اور اس کی اُبھرتی ہوئی صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوئی اور شیکسپیئر کو مناسب انعام سے نوازا۔ ملکہ کا شکریہ شاعر نے اپنے ڈرامے ''وسط گرما کی شب کا خواب'' میں کیا ہے۔

لندن میں بیس سال گزارنے کے بعد شیکسپیئر 1607ء میں واپس سٹراٹ فورڈ آیا۔ اس دوران وہ دور ونزدیک مشہور ہو چکا تھا اور مالی لحاظ سے بھی آسودہ حال ہو چکا تھا۔ لندن میں اس کی صحت بگڑ گئی تھی اور پھر دنیائے فن وادب کا یہ لافانی معما 23 ر اپریل 1616ء کو خالق حقیقی سے جاملا۔

شیکسپیئر نے کل سنتیس (37) ڈرامے لکھے، جنھیں المیہ، بزمیہ، رومانوی اور تاریخی اصنافِ ادب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ ان سبھی میں اسے ہیملٹ کے لیے سب سے زیادہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ پانچ سو سال گزرنے کے باوجود یہ ڈرامہ آج بھی دنیا بھر کے سٹیج پر اور تھیٹروں میں کھیلا اور پسند کیا جاتا ہے۔

ہیملٹ مختصراً ایک بے رحم اور خودغرض بھائی کی کہانی ہے جس نے تخت وتاج کا مالک بننے کی خاطر اپنے فرشتہ صفت بھائی کو قتل کیا۔ اُس کی بیوی کو پھسلا کر اس کے ساتھ شادی کرلی اور پھر بادشاہت پر قبضہ جمالیا۔ مقتول بادشاہ کی مضطرب روح اپنے بیٹے ہیملٹ کو اس جرم کا بدلہ لینے کی تاکید کرتی ہے۔ ظالم بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوتی ہے تو وہ ہیملٹ کی محبوبہ اوفیلیا کے بھائی لائرٹیز کو ہیملٹ کے خلاف ورغلا کر ان دونوں کے مابین لڑائی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لڑائی میں ہیملٹ زہر بھری تلوار کی ضرب سے مرجاتا ہے اور جان دیتے ہوئے اپنے بدبخت چچا کی بھی جان لیتا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں کا خام مواد یونانی، لاطینی، برطانوی، دیومالا اور تاریخ اور بائبل سے ماخوذ ہے جسے شیکسپیئر نے اپنے فنکارانہ کمال سے نئے معنی اور نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

۷۔ گوئٹے کا فاؤسٹ

عیسوی سن کے 1749 ویں سال میں 28 راگست کی دوپہر ڈھل رہی تھی کہ جرمنی کے شہر فرانکفورٹ میں اٹھارہ سالہ ایلزبیتھ کے یہاں ایک بے حس سا بچہ پیدا ہوا۔اس کا بدن نیلا پڑ چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مر چکا ہے۔ بقول ٹامس مان، ''یہ ایسی کیفیت تھی کہ جیسے یہ نومولود ماں کی گود سے نکل کر سیدھا زمین کی گود میں چلا جائے گا'' لیکن اس کے روئی کے گالے جیسے جسم میں رفتہ رفتہ حرکت ہونے لگی۔ بعد میں ٹامس مان نے اسی بچے کے بارے میں کہا''کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ادبی شخصیت کی بلندی اور شان کن سرحدوں چھو کولے گی''۔

یہ تھا یوہان وولف گانگ وان گوئٹے جو وقت گزرنے کے ساتھ نہ صرف سرزمینِ المانیہ کا بلکہ سارے یورپ کا ایک ممتاز اور عدیم المثال شاعر، ڈراما نگار، فلسفہ دان، انشا پرداز اور ناول نویس بن گیا اور ان فنون لطیفہ میں اس نے اپنے فنی کمال کے موتی بکھیرے۔ یہ ساری خصوصیات اس میں اس وجہ سے سمٹ کر آئی تھیں کہ اس کا تاریخ اور تہذیبوں کا مطالعہ وسیع تھا۔

گوئٹے کے سبھی ادبی کارناموں میں اُس کا لافانی شاہکار فاؤسٹ سرفہرست ہے۔اس تخلیق میں شاعر نے فاؤسٹ کے کردار کو نیکی اور بدی کی دیرینہ لڑائی کے حوالے سے بے حد پُراسرار انداز میں پیش کیا ہے۔

فاؤسٹ اپنی ہوسناک زندگی کے لیے ہر طرح کی سرشاریاں اور شادمانیاں حاصل کرنے کو دیوانگی کی حد تک بے قرار ہے اور اپنی ان دُنیوی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ شیطان کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے جس پر وہ اپنے خون سے دستخط کرتا ہے۔لیکن آخر کار فتح الوہی صداقت اور ابدی انسانیت ہی کی ہوتی ہے۔علامہ اقبال ان الفاظ میں اس ڈرامے کی تعریف و تحسین کرتے ہیں،''اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم فاؤسٹ اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونام کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آسکتا''۔

مولوی عبدالقیوم خان باقی بھی، جنھوں نے فاؤسٹ کا منظوم اُردو ترجمہ کیا ہے، کم وبیش

اقبال ہی کی تائید کرتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ ''فاؤسٹ میں قدرت کی دو متضاد قوتوں کی کشمکش ہے جس کی ایک حد شیطان اور دوسری حد انسان ہے۔ اس کشمکش میں قدرت دنیا کی سب سے بڑی نیکی یعنی عشق کے ذریعے مداخلت کرتی ہے''۔

گوئٹے نے بیاسی سال کی لمبی عمر پائی۔ فاؤسٹ کا کردار اس دوران سالہا سال تک اس کے تحت الشعور میں کروٹیں لیتا رہا۔ جب وہ بیس سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے اس ڈرامے کے پہلے حصے کا آغاز کیا اور اسے اکیاون سال کے بعد مکمل کیا۔

فاؤسٹ کی کہانی دراصل جرمنی کا ایک تخیلاتی قصہ پارینہ ہے جو سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔ اگرچہ سالہا سال تک لوگوں کے پاس گزرتی ہوئی یہ کہانی متن اور معنی کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً کئی تبدیلیوں سے گزرتی رہی لیکن اس کے مرکزی کردار فاؤسٹ کے ساتھ عوام کی دلچسپی میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سولہویں صدی میں اسے کرسٹوفر مارلو نے انگریزی زبان میں ڈھالا جو مقامی طور پر بہت مشہور ہوا۔

گوئٹے کے نہایت دلچسپ اور تذبذب سے بھرپور ڈرامے کی کہانی کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

گوئٹے ایک مضطرب اور ذہنی طور پر بے قابو افسانوی کردار کا نام ہے جس نے تمام رائج الوقت علوم اور فنون کی مکمل آگاہی حاصل کی ہے۔ اس کے باوجود وہ تشنہ کام اور نامکمل وجود ہی رہا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کی پیاسی روح پر جنسی وحشت کا غلبہ تھا اور وہ اس جسمانی خواہش کو ہر قیمت پر اور ہر طرح سے مسلسل پورا کرنے کے لیے ہمیشہ مضطرب رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی دُنیوی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اس نے اپنی روح شیطان کے ہاتھ میں گرور کھ دی۔ کہانی یوں ہے:

گوئٹے اپنے کمرے میں بیٹھا ہے اور ہزار طرح کے افکار میں گھرا ہوا ہے۔ دریں اثنا ایک روح کمرے میں داخل ہوتی ہے جس کے ساتھ گوئٹے کی تلخ کلامی کے بعد روح وہاں سے غائب ہوجاتی ہے۔ اگلے روز گوئٹے اُلجھنوں و پریشانیوں سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ ابھی وہ زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگانا ہی چاہتا ہے کہ باہر سے ایسٹر کا گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ

خودکشی کا ارادہ ترک کرتا ہے کہ اس کے بعد ایک کتا اُس کا پیچھا کرتا ہے جو اپنی شکل بدل کر شیطان کی صورت میں گوئٹے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس نے گوئٹے کی دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ وہ اس ہوس پرست شاعر کو ہر طرح کی لذتوں سے محفوظ کرنے کی یقین دہانی کر کے اس کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ معاہدہ کی رو سے گوئٹے جو چاہے وہ اسے ملے گا۔ البتہ اگر وہ کسی بھی موقعے پر وقت کی طرف مخاطب ہو کر اس سے کہے، ''اے وقت کے خوبصورت لمحے! ذرا ٹھہر!'' تو شیطان اُسی وقت آ کر اس کی روح قبض کرے گا اور اسے جہنم کی گہرائیوں میں دھکیل دے گا۔ گوئٹے نے شیطان ہی کے بہکاوے سے آتش کدۂ عشق کے دہکتے انگاروں کو بجھانے کے لیے اپنی محبوبہ ماگریٹے کو ہوس کا شکار بنایا اور جب وہ حاملہ ہوئی تو سماج میں مطعون ہونے کے ڈر سے اس نے اپنے نوزائیدہ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس جرم کی پاداش میں اُسے جیل جانا پڑا جہاں وہ زندگی کی ویرانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر بیٹھی۔ دنیا کی تمام خوشیوں، لذتوں اور مرادوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد ایک دن گوئٹے ایک بے حد خوبصورت شام کا دلکش نظارہ دیکھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے:

''اے دور بھاگتے ہوئے لمحے، ذرا ٹھہر!''

شیطان فوراً اُس پر جھپٹ کر اس کی جان لینا چاہتا ہے مگر اُسی لمحے خدا شیطان سے یہ کہہ کر گوئٹے کو اپنے پاس بلاتا ہے کہ یہ حسین لمحہ تم نے نہیں بلکہ میں نے اسے دیا تھا اور اس طرح اس کی روح پر میرا ہی حق رہا۔ شیطان! تم ہار گئے!!

مجھے لگتا ہے کہ گوئٹے کے تذکرے کو ہائنے کے اس اقتباس پر ختم کیا جائے کہ ''گوئٹے ایک آتشیں روح ہے جو ایک عقاب کی طرح اپنے پروں کو پھیلاتی ہوئی نامعلوم بلندیوں کی طرف دور دور تک اُڑتی ہی چلی جا رہی ہے، اُڑتی ہی چلی جا رہی ہے''۔

۸۔ دیوان غالب

دیوان مرزا اسد اللہ خان غالبؔ (1796ء تا 1869ء) کو اُردو شاعری کی آبرو مانا جاتا ہے۔ اس زبان کے اولین شاعر محمد قلی قطب شاہ سے لے کر عہد جدید تک اُردو کی دنیائے سخن کی شاندار عمارت اس کے چار ستونوں پر مستحکم ہے، جن میں میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کے نام لیے

جاسکتے ہیں۔ان کے علاوہ اگر چہ کئی اور سینکڑوں شعراء نے سالہا سال تک اُردو شاعری کی آبیاری کی مگر روشنی کے ان چار میناروں کے نور سے سبھی کی آنکھیں خیرہ ہوتی رہیں۔ شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ ادبِ اُردو'' کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے غالب کو آسمان شاعری کا سب سے درخشندہ تارا، اُستاد کامل اور فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔

غالبؔ نے اُس وقت آنکھ کھولی جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی۔ اُن ہی دنوں انگریزوں نے مغلوں کو شکست دے کر 1857ء کی بغاوت کے ساتھ ہی مل کر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو بزورِ بازو اپنی نو آبادی بنانے کے لیے ہزاروں فرزندانِ وطن کا خون بہایا اور بڑی بے رحمی سے لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا۔ غالب بھی اس شہر آشوب سے غافل نہ رہا اور اُس نے اس بیرونی جارحیت کے خلاف اپنے محسوسات کو زبان دی۔

غالب کو ایک بداعمال کہلائے جانے پر فخر تھا۔ اسے ایک بار جوا کھیلنے کی پاداش میں جیل جانا پڑا۔ مغلوں کے دربار میں اسے مردِ خواتین کہا جاتا ہے۔ ایک بار جب اس کے سامنے کسی نے خدا دوست شاعر شیخ صہبائی کے کلام کی تعریف کی تو غالب بولا ''صہبائی کیسے شاعر ہوسکتا ہے؟ اس نے کبھی شراب کا حظ نہیں اُٹھایا۔ نہ ہی اُس نے جوا کھیلا، نہ ہی اُسے عاشقوں نے چپلوں سے پیٹا اور نہ ہی اُسے کبھی جیل جانا پڑا۔''

غالب کی وفات 15 رفروری 1869ء کو دہلی میں ہوئی۔

1850ء میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے غالب کو دبیر الملک اور نجم الدولہ کے اعزازات سے نوازا۔ مغل دربار میں غالب کو شاہی مورخ کی جگہ بھی دی گئی۔

غالب نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ اسے اگر چہ اپنی فارسی سخن گوئی پر ناز تھا مگر دنیائے ادب نے اُسے فقط ایک عظیم اُردو شاعر ہی کی حیثیت میں جانا اور پہچانا۔ وہ خود کہتا ہے:

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

غالب نے جس منفرد انداز میں اپنے گھر کی، دنیا بھر کی اور قلب ونظر کی باتوں کو خاص طور پر اپنی غزلیات کا موضوع بنایا ہے وہ اسی کا خاصہ ہوسکتا ہے۔ وہ ماحول میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اس کے ردعمل میں روانی، تغزل، ترنم اور معنی آفرینی سے بھرپور اشعار تخلیق کرتا ہے جو دم زدن میں ہر ایک کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ اچھی شاعری کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ سننے والے قارئین اسے یاد رکھ سکیں۔ غالب کی شاعری کو یہ وصف بھرپور طریقے سے نصیب ہوا ہے کہ اس کے جتنے اشعار لوگوں کو زبانی یاد ہیں اُتنی خوش بختی کسی اور اُردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔

غالب پر قلم اُٹھایا جائے تو لاتعداد کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور اس کے اشعار کا انتخاب بھی مشکل ہے۔ میں یہاں اپنی پسند کے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں جو اس تحریر کا اختتام بھی ہوگا۔ ان اشعار کو منتخب کرتے وقت یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ان میں غالب کی خیال آرائیوں کی کسی حد تک عکاسی کی جائے:

☆.....نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

☆.....تھا خواب میں خیال کو دل سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

☆.....آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

☆.....دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

☆.....تماشا کرائے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

☆.....سب کہاں کچھ لالۂ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

☆......قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

☆...... بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

☆......ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
دگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

☆......کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

۹۔ ٹالسٹائی کا وار اینڈ پیس

''جنگ اور امن'' روس کے سب سے بڑے ادیب لیو ٹالسٹائی (1828 تا 1910ء) کے اُس افسانوی شاہکار کا نام ہے جسے دنیا کا طویل ترین ناول کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ٹالسٹائی نے خود اسے نہ تو ناول کہا ہے، نہ ہی نظم اور نہ اسے تاریخ کی صنف بتایا ہے بلکہ وہ اپنے دوسرے ناول ''اینا کرینینا'' کو اپنا صحیح ناول قرار دیتا ہے۔ اس دعویٰ کے حق میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ ''روس کا بہترین ادب بھی معیار کے مطلوبہ تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے''

''جنگ اور امن'' کی کہانی کا تانا بانا ٹالسٹائی نے روس پر فرانس کے حملے اور زار کی حکومت پر نپولین کے قبضے کے مابعد اثرات سے بُنا ہے۔ اس کی پوری کہانی اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ اسے ایک مضمون میں سمیٹنا مشکل ہے۔ ''جنگ اور امن'' ناول پہلے مکمل متن کے ساتھ 1869ء میں منظر عام پر آیا۔ امریکی جریدے نیوز ویک نے 2009ء میں اسے سو بہترین کتابوں کی فہرست میں اوّلین مقام پر رکھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ٹالسٹائی کی بیوی صوفیہ ٹالسٹائی نے اس کے سات مسودوں کو نقل کرنے کا صبر آزما کام کیا اور اس کے بعد ہی اسے قابلِ اشاعت قرار دیا گیا۔

ناول کا محل وقوع ٹالسٹائی سے کوئی ساٹھ سال قبل کا ہے جسے مصنف نے ''ہمارے آبا و اجداد کا زمانہ'' کہا ہے۔ ٹالسٹائی نے اس تخلیق کے لیے دستاویزی مواد جمع کرنے کی غرض سے اُن لوگوں سے

بات کی جو 1812ء میں روس پر فرانس کے حملے کے دوران بقید حیات تھے۔ ناول میں اگرچہ کئی فرضی اداکاروں کا ذکر ہے البتہ ان میں سے کم از کم ایک سو ساٹھ ایسے ہیں جو درحقیقت موجود تھے۔

''جنگ اور امن'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی غیر معمولی طوالت کے باوجود قارئین نے اسے ذوق وشوق سے پڑھا اور روس کے علاوہ جرمنی اور فرانس میں بھی اس کی مانگ روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ جنگ اور امن کے کشمیری ترجمہ کار مظفر عازم کے بقول: ''ٹالسٹائی کے فن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخیل کی پرواز سے زیادہ زندگی کی حقیقت کے مشاہدے کو اپنے مواد کی شکل میں استعمال کرتا ہے، وہ زندگی کے نقوش کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ اس کی اندرونی کیفیت کے خدوخال کو پرکھنے کا کام بھی بیک وقت کرتا ہے۔ اس سے اسے اپنی تخلیقات کے کرداروں کی نفسیاتی اور فکری سوچ کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی آگاہی کا مظاہرہ ٹالسٹائی ''جنگ اور امن'' میں اس طرح کرتا ہے کہ جنگ کی تباہیوں کے باوجود ایک عام گھرانہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کسی قسم کا خلل داخل ہونے نہیں دیتا اور جہاں باہر سے آتش وآہن کا خونین بازار گرم تھا یہ گھرانہ اپنی مصروفیات میں مگن تھا اور اس طرح سے فلسفیانہ نظریے سے امن ہی بالآخر جنگ پر فتح حاصل کرتا ہے۔ جان گالزوردی کا کہنا بجا ہے کہ ''کسی بھی زمانے میں لکھے گئے ناولوں میں جنگ اور امن سب سے اوپر براجمان ہے''۔

۱۰۔ اقبال کا پیامِ مشرق

''پیامِ مشرق'' اُردو کے سب سے متنوع اور ہمہ جہت شاعر علامہ اقبال (1877ء تا 1938ء) کی ساری تصانیف میں اہم ترین اور عظیم ترین مجموعہ کلام ہے۔

جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے جب عمر کے آخری ایام میں مغرب کی مادہ پرستی اور انسانی اقدار کے تنزل سے بیزار ہو چکا تھا اور وہ اپنے درماندہ وجود کو کسی مختلف ماحول میں منتقل کر کے سکون، اطمینان اور آسودگی قلب کے دن گزارنے کا خواہاں تھا، اسی ذہنی اضطرار اور جذباتی ہیجان کے عالم میں اس نے یہ قطعہ لکھا:

North and West and South are breaking,
Thrones are bursting, kingdoms shaking;
Flee then, to the essential East,
Where on Patriarch's air you'll feast.

اُن ہی دنوں یعنی 1812ء میں جوزف وان ہیمر پر گستال نے حافظ شیرازی کے فارسی دیوان کا جرمن زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کے مطالعے نے گوئٹے کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اسے اس مشرقی دیوان میں خیال اور فلسفے کی نئی دنیا جلوہ گر دکھائی دی۔ حافظ کا گہرا اثر قبول کرنے کے بعد اس نے کئی ایسی منظوم تخلیقات کو جنم دیا جن کے خالق کے بارے میں گمان ہوتا تھا کہ وہ مشرق ہی میں پیدا ہوا ہے۔ گوئٹے نے اسی اثر کے تحت ''دیوان مغربی'' لکھا جس میں کئی اسماء اور نظموں کے عنوانات بھی عربی یا فارسی زبانوں میں ہی درج ہیں۔ مثال کے طور پر ساقی، زلیخا، ہجرہ، پارسی نامہ، مغنی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ اور خلد نامہ اس میں شامل ہیں۔

موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے کہا جائے گا کہ یورپی ریاست جرمنی سے گوئٹے کے اس مختلف رنگ اور آہنگ کے دیوان کا مشرقی ادبیات کو ایک بیش بہا تحفہ اقبال کے سب سے اہم اور معتبر فارسی مجموعہ کلام پیامِ مشرق کی صورت میں حاصل ہوا، جس کی تصنیف کے محرکات کو اقبال نے خود بیان کرتے ہوئے گوئٹے کی مشرق نوازی کے پس منظر کو اس طرح واضح کیا ہے، ''پیام مشرق کا مدعا جو مغربی دیوان کے سو سال بعد لکھا گیا، زیادہ تر اُن اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جس کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال بیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں جو ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قوم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں منتقل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے جسے قرآن نے ان اللّٰہ یغیر مابقوم حتیٰ یغیر واما بانفسھمخ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش ہے“

اقبال ”پیام مشرق“ کے سرورق پر خود اسے ”در جوابِ شاعر المانوی گوئٹے“ کہتا ہے۔ جہاں اسرائیل کا مشہور شاعر ہائینے کہتا ہے کہ ”یہ مجموعہ عقیدت کا ایک گلدستہ ہے جسے مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے“ وہاں گوئٹے کے ایک سوانح نگار بیل سوشکی حافظ اور گوئٹے کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”بلبل شیراز کے نغموں میں گوئٹے کو اپنی تصویر نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کی روح نے حافظ کے پیکر میں رہتے ہوئے مشرقی سرزمین میں زندگی گزاردی ہے۔ وہی زمینی مسرت، وہی آسمانی محبت، وہی سادگی اور بردباری، وہی جوش اور حرارت، وہی مشرب کی عظمت اور شان، وہی کشادہ دلی اور وہی پابندیوں اور رسوم ورواج سے آزادی۔ مختصری کہ اسے کئی لحاظ سے حافظ کا ہم رنگ پایا جاتا ہے۔ حافظ کی طرح گوئٹے بھی لسان الغیب اور ترجمانِ اسرار ہے۔ دونوں نے اپنے دور کے امیر وغریب کو متاثر کیا۔ دونوں نے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو بھی متاثر کیا اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں اپنی پرانی ترنم ریزی کو جاری رکھتے ہوئے طبیعت کے اطمینان اور سکون پر غالب رہے“

ایک جگہ اقبال گوئٹے کو اپنے محبوب شاعر غالب کا ہم پلہ دیکھ کر اس سے کہتا ہے:

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

گوئٹے کی تعریف وتحسین میں اقبال کا ایک اور شعر:

صبا بہ گلشن ویمر سلامِ ما برسان کہ چشم نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

اسی طرح اقبال نے گوئٹے کی عظمت کو مولانا رومی کی زبان سے بھی تسلیم کیا ہے، جب گوئٹے جنت میں مولانا رومی کو حکیم فاؤسٹ کا قصہ سناتا ہے تو رومی اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

فکر تو در کنج دل خلوت گزید ایں جہان کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدہ ئی در صدف تعمیر گوہر دیدہ ئی

چند یادگار ملاقاتیں

یہ 1957ء کی بات ہے کہ سری نگر میں سیاحوں کے استقبالیہ مرکز کے وسیع و عریض ہال میں منعقدہ کُل ہند مشاعرے کی محفل جمی تھی۔ ''تاریخ اردو ادب'' کے تحقیق کار مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مسندِ صدارت پر تشریف فرما تھے۔ مشاعرے میں ایک دلکش مترنم آواز میں یہ غزل ماحول کو مسحور کر رہی تھی:

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم، خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

یہ تھے حضرت علی سکندر جگر مرادآبادی جو اقامتِ نماز کی طرح سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اپنے منفرد اور مخصوص ترنم میں غزل سرا تھے۔ ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ اُن دنوں کشمیر میں جشنِ کشمیر کی دھوم تھی اور ہر ہفتے ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب بخشی صاحب نے جگر صاحب کو کشمیر آنے کی دعوت دی اور انھیں ریل کے سفر کی پیش کش کی تو جگر صاحب نے جواب دیا کہ وہ صرف ہوائی جہاز سے ہی سفر کر سکتے ہیں۔ پھر بخشی صاحب نے اپنی دریادلی کا ظاہرہ کرتے یہ پیش کش کی کہ ''اگر آپ سارا کشمیر مانگیں تو میں خوشی خوشی پیش کروں گا''۔

جگر صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں تو دیکھا کہ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتے تھے اور اگر بات ادب کی ہو تو کھل کر اظہار خیال کرتے تھے۔ اسی طرح وہ کبھی عجیب سے اطوار کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ایک بار ریڈیو سرینگر کے دفتر میں وہ اپنی ایک غزل نقل کرنے لگے تو وہاں کے ایک اہل کار پروفیسر جیالال کول نے احتراماً ان کے ہاتھ میں تختی تھمانے کی کوشش کی۔ جگر نے فوراً اسے زور سے کھینچ

لیااور غزل رقم کرلی۔ یہ غزل اُسی دن جگر صاحب کو ریڈیو کے لیے صدا بند کرنی تھی:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے

غالباً یہ خوبصورت غزل ابھی اس نشریاتی ادارے کے متعلقہ شعبے میں محفوظ ہوگی۔ اُن دنوں کشمیر میں جشنِ کشمیر کا خوب چرچا تھا اور حکومت کی طرف سے مسلسل طور پر کل ہند مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ انھی دنوں میں مجھے جگر مرادآبادی، اسرارالحق مجاز، شاذ تمکنت، انور صابری، فراق گورکھپوری، مخدوم محی الدین وغیرہ سے بھی ملاقی ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔

اسی استقبالیہ مرکز میں مجھے سکندر علی وجد کو پہلی بار سننے کا موقعہ ملا۔ جب انھوں نے اپنی مشہور غزل مترنم آواز میں چھیڑی:

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

تو اس پُرسوز کلام سے محفل میں ایک سماں بندھ گیا۔ اس کے بعد وجد صاحب نے چند دن سری نگر میں قیام کیا اور اسی دوران ان سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ نہایت وضع دار شخص تھے اور ہر بات تول تول کر کرتے تا کہ گفتگو میں صحیح اسلوب اور زبان کا استعمال ہو۔ غالباً اس سنجیدگی اور غیر رسمی طرز کلام سے گریز کے پس پردہ یہ حقیقت بھی کارفرما تھی کہ وہ پدم شری ہونے کے ساتھ راجیہ سبھا کے رکن بھی رہے۔ ان کے ایک مجموعہ کلام ''اوراقِ مصور'' کا اجرا خود جواہر لال نہرو نے کیا اور وہ اخیر پر سیشن جج کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ بہر حال جب بھی وہ ملے تو یار دوستوں نے ہر وقت ان سے ان کی وہ شہرہ آفاق نظم سنانے کی فرمائش کی جو انھوں نے اجنتا کے غاروں پر لکھی تھی اور جس کا یہ مصرعہ آج بھی ذہن میں بار بار گونجتا رہتا ہے:

جہاں پیتے رہے اہلِ ہنر خونِ جگر برسوں

وجد صاحب 16 جنوری 1983 کو انتقال کر گئے اور غالباً انھوں نے یہ بات اپنے ہی لئے کہی تھی:

جانے والے کبھی نہیں آتے

......☆......

فراق گورکھپوری کے لیے سرکار نے سری نگر کے استقبالیہ مرکز ہی میں ایک کمرہ مخصوص رکھا تھا جہاں ہم نوجوان پہروں تک ان کے پاس بیٹھ کران سے ادب اور خاص کر مغربی ادبیات کے بارے میں عالمانہ خیالات سے مستفید ہوتے تھے۔ مغربی ادب پر انھیں خاصا عبور حاصل تھا۔ وہ عام طور پر بستر پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ کراپنی بصیرت افروز باتوں سے ہمیں مستفید کرتے۔ کئی بار انھوں نے ہماری فرمائش پر اپنے دلچسپ اشعار سنائے۔

ان مشاعروں میں ایک شاعر انور صابری کو بلاناغہ بلایا جاتا تھا کیونکہ وہ علی العموم حاکم وقت کی قصیدہ خوانی یا مدح سرائی تک ہی اپنی شاعری محدود رکھتے تھے جس سے ان کے کلام کو محض تک بندی ہی کہا جاسکتا ہے۔ جسامت کے لحاظ سے ڈھیل ڈول والے انور صابری کے بارے میں انھی دنوں کسی دل جلے نے یہ شعران کے لیے موزون کیا:

جگر سے، جوش سے، مخمور سے واقف ہے میخانہ

یہ انور صابری کس..............کا نام ہے ساقی!

......☆......

انور صاحب سے جب بھی اتفاقیہ ملاقات ہو جاتی تو وہ صرف اور صرف بخشی غلام محمد کی ستائش کرتے کہ سننے والے کو اس میں حد درجے کی چاپلوسی اور ذاتی مصلحتوں پر مبنی مدح سرائی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس پس منظر میں میں نے ان سے زیادہ ملنے جلنے کو کبھی ترجیح نہیں دی۔

بخشی صاحب کے بعد غلام محمد صادق وزیر اعلی بنے تو نیاز حیدر نام کا ایک نام نہاد ترقی پسند اردو شاعر یہاں آیا اور آتے ہی حاکم اعلی کو شیشے میں اتارا اور ان کی سرکاری خاطر داری کے خوب مزے لیے۔ نیاز حیدر بلا کا مئے نوش تھا اور یہ شغل رات دن ان کے ہوش وحواس پر حاوی رہتا۔ اس طرح نیاز صاحب کی رندانہ مستیوں کی وجہ سے صادق صاحب کے نام پر بھی حرف آنے لگا۔ بالآخر تنگ آکر صادق صاحب نے انھیں ایک دن بس میں بٹھا کر کاما گاٹا مارو نگر میں کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی دعوت کے بہانے کشمیر سے میلوں دور نہ جانے کس جگہ چھوڑ دیا۔ نیاز صاحب کے ساتھ ہماری چند ملاقاتیں ہالی وڈ ریسٹورنٹ میں ہی ہوتی رہیں اور ہم نے محسوس کیا کہ ان کی شخصیت میں ہمیں کاسہ

گدائی ہاتھ میں لئے ایک مفت خور سے زیادہ کچھ اور نظر نہیں آیا۔ نیاز حیدر کو کشمیر کو خیر باد کرنے پر اس لئے بھی مجبور کیا گیا کہ جب وہ میخانوں میں بلا کی شراب نوشی کرتے تو عموماً خود بل کی ادائیگی کرنے کے بر عکس اس پر یہ لکھتے: "CM to pay"۔ جب وزیر اعلیٰ تک یہ پریشان کن بات پہنچی تو انھوں نے انور صاحب کو کشمیر بدر کروایا اور راحت کی سانس لی۔ اردو کی دنیائے سخن میں آج نیاز حیدر ایک ورقِ گم گشتہ ہے۔

یہ 1955ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ میں اس وقت ریڈیو کشمیر میں ملازم تھا کہ ایک دن اسرار الحق مجاز وہاں آئے اور پنی چند غزلیں ریکارڈ کروائیں۔ میں اس عمل کے دوران برابر موجود رہا۔ وہ سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں قیام پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے وہاں بھی گیا۔ چونکہ میں عمر میں ان سے چھوٹا تھا لہٰذا انھوں نے مجھے درخور اعتنا نہیں سمجھا البتہ وہ دیر تک اپنی زندگی اور شاعری سے متعلق کھل کر باتیں سناتے رہے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ میں صرف اپنی مادری زبان کشمیری میں ہی شاعری کرتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ تاکید کی کہ ایک شاعر کو صرف اپنی مادری زبان ہی میں سخن گوئی کرنی چاہئے جس میں وہ اپنے محسوسات اور جذبات کا بہترین انداز میں اظہار کرسکتا ہے۔

1946ء میں کشمیر میں تحریک آزادی مہاراجہ ہری سنگھ کے شخصی راج کے خلاف شروع ہوئی جس نے دیکھتے دیکھتے ایک عوامی بغاوت کا رنگ اختیار کرلیا۔ اس سے متاثر ہو کر اور اہل کشمیر کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجاز نے بھی کشمیر پر ایک یادگار نظم لکھی جس میں انھوں نے کشمیر کے روشن اور تابناک مستقبل کی بشارت دی:

اک شرارہ جھلملایا اور فضا میں کھوگیا
اک شرارہ جانب خلد جواں آیا تو کیا
کوئی طوفاں آئے اک کوہ گراں ہے اس طرف
کوئی طوفاں بر سر کوہِ گراں آیا تو کیا
دست و بازو میں صلابت آچکی فولاد کی
اب مقابل اک حریف نیم جاں آیا تو کیا

خود حقیقت پر پڑے باطل کا سایہ تابہ کے
مہر عالم تاب کے آگے دھواں آیا تو کیا
دیر کی عظمت بھی ہے آخر مسلم ہم نفس
دیر کی محراب تک شور اذاں آیا تو کیا
چند بنیادی عناصر مایل پیکار ہیں
اک نئے کشمیر کی تشکیل کے آثار ہیں

ایک شام کو سری نگر کے پولوگراونڈ کی اُس عمارت کے وسیع وعریض صحن میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں اُس وقت ریڈیو کا سٹوڈیو تھا۔اس مشاعرے میں مجاز بھی شریک تھے۔سامعین میں کئی وزراء کے ساتھ ایک ادب شناس وزیر داخلہ درگا پرشاد در بھی موجود تھا۔

جب مجاز کی باری آئی تو انھوں نے پہلے ایک خوبصورت غزل پڑھی اور اسکے بعد سامعین کی فرمائش پر اپنی شہرہ آفاق نظم ''آوارہ'' اپنے کمزور جسم کو لہلہاتے ہوئے سنائی۔ در صاحب کی فرمائش پر یہ نظم سنانے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔اس طرح سے مجاز نے اس مشاعرے کو لوٹ لیا۔مجاز کے واپس لکھنوَ لوٹنے کے بعد ہی اس کی افسوس ناک موت کی خبر آئی جب اسے 5/دسمبر 1955 کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات کی صبح میخانے کے باہر مردنی کی حالت میں پایا گیا۔اس طرح سے ہندوستان میں اردو ادب کی رومانی فضاؤں کا یہ شہزادہ اپنے عقابی پروں پر اڑتا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا:

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

برادرم شبیب رضوی نے مجاز کے انتقال سے متعلق یہ تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔''اُس رات لکھنو کے لال باغ علاقے میں مجاز جلال ملیح آبادی اور ایک شخص کے ساتھ مدن بار میں محوے نوشی تھا۔رات کو قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں ترقی پسند کانفرنس کی طرف سے ایک مشاعرہ ہوا جس میں مجاز نے یہ غزل پڑھی:

میری بادہ پرستی پر نہ جاؤ
جوانی کو سہارا مل گیا ہے

مشاعرے کے بعد بھی مجاز اپنے دوساتھیوں کے ہمراہ پیتا رہا۔ان کے جانے کے بعد وہ وہیں
بیٹھا اور پھر علی الصباح وہ تقریباً مردے کی حالت میں پایا گیا۔اسے گولا گنج کے ہسپتال میں داخل کیا گیا
جہاں وہ دماغ کی نس پھٹنے سے چار بجے بعد دوپہر وفات پا گیا"۔

1947ء میں جب کشمیر پر پاکستان کی طرف سے حملہ ہوا تو یہاں کے سیاسی رہنماؤں، ادیبوں
اور دانشوروں نے قومی کلچرل فرنٹ کا قیام عمل میں لایا۔اس محاذ کا مقصد ادیبوں، شاعروں اور قلم
کاروں کو ایک جگہ پر جمع کر کے ان میں وطن پرستی اور قوم نوازی کے جذبات کو ازسرِ نو اجاگر کرنا
تھا۔فرنٹ کے زیراہتمام 1948ء کے موسم بہار میں انقلابی ترانوں اور حب الوطنی پر مبنی نظموں کا ایک
مختصر مجموعہ "گائے جا کشمیر" کے عنوان سے شائع ہوا اور اس میں اردو اور کشمیری زبانوں کی تخلیقات
شامل کی گئیں۔

......☆......

مخدوم محی الدین کے ایک جوشیلے گیت کی ہمہ گیر مقبولیت اور عوامی دل پذیری کے پیش نظر ریاست کے
مشہور مفکر اور سیاست دان مولانا محمد سعید مسعودی نے مخدوم کی اجازت سے اور اس نغمہ کو کشمیر کے
حالات کا عکاس بنانے کی غرض سے اس کے ایک دو بندوں میں چند الفاظ تبدیل کیے اور اس طرح
نظم، جو اس مجموعہ میں "آزادی کا ترانہ" کے نام سے چھاپی گئی، ریاستی عوام کے احساسات اور جذبات
کی ترجمان بن گئی۔نظم کے اشعار میں تبدیلی کے بعد اس میں کشمیر کی جنگِ آزادی کا ذکر یوں کیا گیا:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی	آزادی کے پرچم کے تلے
کشمیر کے رہنے والوں کی	محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی	دہقانوں کی، مزدوروں کی
جموں کشمیر ہمارا ہے	پورب، پچھم، اتر، دکھن
ہم لداخی، ہم کشمیری	ہم جموی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن	آہن پیکر، فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

مخدوم کئی بار کشمیر آئے لیکن اس آمد و رفت کا تعلق زیادہ تر ادبی مناظروں، مباحثوں اور مشاعروں میں ان کی شرکت تک ہی محدود رہا۔

وہ زمانہ کشمیر کی سیاست میں اتھل پتھل کا زمانہ تھا۔ مخدوم بہر حال یہاں کی عوامی خواہشات اور جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے خاموشی سے کام کرتے رہے اور اس دوران ان کی طویل ملاقاتیں سرکردہ مقامی سیاست دانوں سے برابر ہوتی رہیں۔

28/جون 1969ء کو میری ایک بہت بڑی خواہش پوری ہوئی کہ میں مخدوم صاحب سے ملاقی ہوا۔ اُس دن ریاستی کلچرل اکادمی نے ملک بھر سے آئے ہوئے اردو شعراء کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا تھا۔ فراق گورکھپوری اور سجاد ظہیر کے ساتھ ساتھ مخدوم بھی اس بزم کی زینت بنے تھے۔ جنگ آزادی کے آتش بار سپاہی اور جذبہ عشقِ آزادی سے سرشار اس شریف عاشق کو میں بار بار دیکھتا رہا اور اس کی طرف نگاہیں پیہم مرکوز کر کے اس کے ذاتی خدوخال کی تصویر کشی کی کوششوں میں مگن ہوا۔ فراق شاعری میں فلسفۂ جدیدیت پر خیال آرائی کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر سوویت یونین میں پیدا شدہ نئے اور محرک شاعرانہ رجحانات کے بارے میں محو گفتگو تھے اور مخدوم متانت اور سنجیدگی کا ایک پیکر بنے خاموشی سے یہ ساری باتیں سن رہے تھے۔

اُسی شام کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مخدوم رات گئے تک ایک محفل ناؤ ونوش میں اس طرح پھنسے رہے کہ انھیں کھانا بھی نہیں مل سکا۔ رات گئے جب انھیں بھوک ستانے لگی تو شاذ تمکنت اور وحید اختر کو لے کر ہم سری نگر کے ایک ہوٹل میں پیٹ کی آگ بجھانے گئے۔ مخدوم مجھ سے پہلی بار گلدستۂ تبسم کی طرح ملے اور میرے دل و دماغ میں ابدی مہک چھوڑ گئے۔ اُس رات کوئی دو گھنٹے تک مجھے مخدوم سے پہلی اور آخری بار باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ وہ بولنا کم چاہتے تھے شاید اس وجہ سے بھی کہ نیند کا خمار اب ان کی جہاں دیدہ اور تھکی ہوئی آنکھوں پر اپنے ڈورے ڈال رہا تھا۔ اپنی قیام گاہ کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور بولے، خیال صاحب! اگر یہاں پھر نہیں ملے تو حیدر آباد ضرور آیئے، وہاں جی بھر کے باتیں کریں گے۔ لیکن اُن سے جدا ہوتے وقت میرا دل زبان حال سے کہہ رہا تھا:

آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے

ابھی دو ہی مہینے گذرے تھے کہ 25 راگست کو دلی میں مخدوم کے انتقال کی خبر آئی۔ مخدوم سے میری ملاقات کے سارے نقوش میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور مجھے ان ہی کا یہ مصرعہ یاد آیا:

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا

مخدوم کو اگلے روز حیدرآباد دکن میں درگاہ شاہ خاموش میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا

سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

یہ 1960ء کے آس پاس کی بات ہے جب سری نگر میں ریزیڈنسی روڈ پر کیپری کے نام سے ایک مۓ خانہ آباد تھا۔ مشہور فلمی اداکار اور ترقی پسند دانشور بلراج ساہنی جب بھی کشمیر آتے تو اسی میکدے میں اکثر وقت دیکھے جاتے یا اُن کی بیٹھک واسطی رام کی فرنیچر کی وہ دکان ہوتی جو لیمبرٹ گلی کی نکڑ پر واقع تھی اور جہاں واسطی رام اپنی پنجابی برادری کے احباب کے ساتھ دن بھر گپیں ہانکتے رہتے۔ بلراج ساہنی بھی اسی دکان پر دنیا بھر کی باتیں سنتے اور سناتے۔ میں وہاں سے روز گذرتا اور اسی دوران ساہنی صاحب کے ساتھ میری گہری دوستی ہوگئی۔ پھر ہم تقریباً ہر روز ملتے اور ایک دن انھوں نے مجھ پر یہ بات آشکارا کی کہ وہ اپنے محبوب کشمیری شاعر غلام احمد مہجور پر ایک فلم بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اُن کا یہ دورہ کشمیر اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس فلم میں جو اردو اور کشمیری زبانوں میں تیار کی جائے گی ان کا بیٹا اجے ساہنی (جو بعد میں پریکھشت ساہنی کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور ہوا) مہجور کا کردار ادا کریں گے اور کلکتہ کے مشہور ہدایت کار پربھات مکرجی کو اس کی ہدایت سونپی گئی ہے۔ اجے ساہنی اس وقت ماسکو کے ایک فلم اِنسٹی ٹیوٹ میں فنِ اداکاری سیکھ رہے تھے۔ ساہنی صاحب نے دبے لہجے میں مجھے بتایا کہ انھیں خانوادۂ مہجور خاص کر ان کا بیٹا محمد امین ابن مہجور بے حد تنگ کر رہا ہے۔ اس کے بعد بلراج ساہنی

یہاں سے گویا غائب ہی ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسے بے جا نکتہ چینی اور مخالفت سے بے حد صدمہ پہنچا اور جب کوئی ہفتے بعد مجھے بمبئی سے 28 راگست 1966ء کو انگریزی میں لکھا ہوا ان کا مراسلہ ملا تو معاملے کی گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ ان کے کئی خطوط میں سے ایک خط کا یہ اقتباس اس مسلے پر روشنی ڈالتا ہے:

''ڈیر خیال!

آج مجھے ایک دوست کی وساطت سے سری نگر کے ہفت روزہ ''آئینہ'' کا ایک تراشہ ملا ہے جس میں چند پریشان کن باتیں لکھی گئی ہیں۔ میرے لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ مہجور کے گھر کے لوگ میری لاعلمی میں اس فلم کی مخالفت کا بازار گرم کریں گے۔

''جس طریقہ پر یہ فلم بن رہی ہے اور کچھ تیار شدہ مواد میں نے دیکھا ہے میں اس کی بنا پر میں بلاشبہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ فلم ہند کے ساتھ ساتھ بیرونی مارکیٹ میں بھی کامیابی حاصل کرے گی۔ کیا اس صورتِ حال میں کوئی ذی ہوش شخص مجھے یا پربھات کو الزام دے سکتا ہے کہ ہم کشمیر یا مہجور کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں؟'' (اس خط کا اصل میرے پاس محفوظ ہے۔ خیالؔ)

فلم جب تیار ہوئی تو اس کا پریمیر سری نگر کے ریگل سینما میں ہوا جس میں ریاست کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق بھی موجود تھے۔ البتہ فلم کے کشمیری version کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ اسے کن الماریوں میں دیمک کی نذر کیا گیا۔

بلراج ساہنی سے میری خط و کتابت ان کے آخری دم تک جاری رہی۔ کیا شاندار شخص تھا۔

......☆......

احمد ندیم قاسمی کے ساتھ میری پہلی ملاقات جنوری 1990ء میں لاہور میں ان کے کام کاج کے دفتر مجلس ترقی ادب لاہور میں ہوئی جس کا اہتمام میرے بہت ہی پیارے دوست کشمیر نژاد کلیم اختر نے کیا تھا۔ کلیم اختر اُس وقت روزنامہ ''مشرق'' کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ کئی اخباروں میں ادبی اور سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے۔

جب ہم کلب روڈ پر واقع قاسمی صاحب کے دفتر میں پہنچے تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کے ایک انبار میں گویا اپنے آپ کو ڈبو کر کام میں لگے تھے۔ انھوں نے سدا بہار تبسم کے ساتھ میرا استقبال کیا اور ساتھ ہی بیٹھی ان کی صاحبزادی منصورہ احمد نے والہانہ خوش آمدید کے پھول ہم پر نچھاور کئے۔ قاسمی صاحب کی بغل میں دفتر کے کونے میں پڑی ایک کرسی پر قتیل شفائی پہلے ہی براجمان تھے۔ انھوں نے جب یہ سنا کہ میں بھارتی کشمیر سے آیا ہوں تو انھوں نے اپنے خاص پٹھانی انداز میں مجھے گلے لگا کر اپنی محبت اور شفقت کا ظہار کیا۔ یہ محفل دیر تک چلی اور زیادہ تر گفتگو کشمیر کے مسلے کے گرد ہی گھومتی رہی۔ قتیل صاحب نے فخریہ لہجے میں کہا کہ تیس چالیس سال قبل جو نظم انھوں نے آزادیٔ کشمیر کے حق میں لکھی تھی وہ شعری تخلیق اب بھی انہیں پیاری ہے۔

خوش رو منصورہ احمد نے، جو خود بھی اردو کی شاعرہ تھی، مجھے قاسمی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے معتبر جریدے ''فنون'' کے ایک دو شمارے پیش کیے اور یہ اصرار کیا کہ میں کشمیر سے اس رسالے کے لیے اپنی کوئی تحریر ارسال کروں۔ اس ملاقات کا اختتام ایک گروپ فوٹو پر ہوا جس میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، کلیم اختر اور میں شامل ہیں اور جو آج بھی میرے ذاتی تصویر خانے کی زیب و زینت ہے۔

اس ملاقات کے دوران جب میں نے قاسمی صاحب سے پاکستان میں اردو ادب کے حوالے سے چند سوالات کیے تو انھوں نے جواباً کہا کہ پاکستان میں ادب کو کسی بھی فہرست کے اخیر پر ہی رکھا جاتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں بھی اردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔

20 رنومبر 1997ء کو جب میں احمد ندیم قاسمی کو کوئی اطلاع دیۓ بغیر اُن کے دفتر میں گھس گیا تو ان کے کشادہ چہرے پر وہی مسکراہٹ اور تازگی پھیل گئی جس کا وہ ایک پیکر تھے۔ کمرے میں چند لوگ مٹھائیاں بانٹ رہے تھے اور معلوم ہوا کہ اس دن قاسمی صاحب کی اکیاسویں سالگرہ تھی۔ وہ خود اس شادمانی سے بے خبر اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے لیکن وقفے وقفے کے ساتھ اپنی پر وقار مسکراہٹ لے کر اپنے احباب اور قدردانوں کی طرف حوصلہ افزا نگاہ بھی ڈالتے تھے۔

جب میں نے ان سے درخواست کہ وہ میری اردو تصنیف ''کاروان خیال'' کے لیے پیش نامہ

لکھنے کی عنایت کریں تو جو کچھ انہوں نے لکھا اس کا پہلا جملہ یوں ہے:

''غلام نبی خیال کی اس تصنیف کی مثال ایک چمن زار کی ہے جس میں ان تمام رنگوں کے پھول کھل رہے ہیں جو اب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آئے ہیں''۔

اس سے قبل اُسی سال 22 ستمبر کو جب مجھے قاسمی صاحب کی معیت میں ان کے دفتر میں بیٹھے ہوئے گھنٹے گذر چکے تھے۔ میں نے ان سے رخصت مانگی۔ وہ کھڑے ہو کر پھر ایک بار مجھ سے گلے ملے اور منصورہ سے کہا۔ ''میری کتابیں خیالؔ صاحب کی نذر کرو''۔ قاسمی صاحب نے اپنا مجموعہ کلام ''بسیط'' اور افسانوں کا مجموعہ ''کوہ پیما'' مجھے عنایت کیے اور ان پر اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔

''عزیزم غلام نبی خیال کی نذر''۔ یہ مشفقانہ تحریر میرے لئے ایک تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ بابا احمد ندیم قاسمی کے ساتھ وہ میری آخری ملاقات تھی۔ اُن کے بارے میں بہر حال یہی کہا جاسکتا ہے:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

......☆......

دنیائے ادب کی جن شخصیات کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے وہ سبھی میرے بزرگ اور قابل صد احترام شخصیات تھیں۔ البتہ اگر اردو دنیا کے کسی بھی پختہ مشق سخن ور کے ساتھ میرا رشتہ انتہائی غیر رسمی رہا، وہ تھے شاذ تمکنت۔

شاذ تمکنت بھی کشمیر آئے اور بار بار آئے۔ جب بھی آئے سب سے پہلے مجھی سے ملے اور یہ ملاقاتیں گہری دوستی میں تبدیل ہوئیں۔ میری نظروں میں شاذ ایک عدیم المثال اور اثر انگیز شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں نفاست مضمون، سرتازگی اسلوب، معنی آفرینی اور رومانوی فکر کی جلوہ سامانیاں موجود تھیں جو انھیں کئی اور شاعروں سے ممیّز کرتی تھیں۔ انھی دنوں جب میری شادی ہوئی تو میں نے انھیں ایک خط میں اس کی خبر دی۔ جواباً انھوں نے غالباً اسی کار خیر کی تقریب کے حوالے سے یہ چھوٹی سی نظم لکھی اور مجھے بھیج دی:

واکرو کاسنی گل پوش دریچے جاناں

چاپ کرنوں کی چلی آتی ہے دھیرے دھیرے

تم بھی پردہ نہ کرو میں بھی تکلف نہ کروں

چاند چپ چاپ چلا آئے گا آ جانے دو

جانے کیا کہتا ہے دیکھو تو سفیرِ شب تاب

کیسے کھل اٹھتے ہیں اس کے لب و عارض کے گلاب

کیا دعا دیتا ہے اس دولت یکجائی پر!

شاذ کے کئی پیارے خطوط ابھی میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ کرسمس 1960ء کے دن ایک خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کشمیر کے دوران قیام میں تمہاری محبتیں کچھ ایسی رحمت آفرین ثابت ہوئیں کہ دل پر آج تک ایک نقش ہے اور یہ لوح تمہاری انگلیوں کے لمس سے آج بھی زرنگار محسوس ہوتی ہے۔ میں نے تمہارا اور تمہارے خلوص کا ذکر بار بار تمہاری بھابی سے بھی کیا۔ اب انھیں بھی تم سے ملنے کا اشتیاق ہو چلا ہے''۔

یہ سالم خط اور نظم میری تصنیف ''کاروانِ خیال'' میں شامل ہیں۔

............●●● ....

یارانِ وطن جو چلے گئے

(اس مقالاتی سلسلے میں اُن چند کشمیری قلم کاروں اور صحافیوں پر سوانحی اور تحقیقی مضامین شامل کئے گئے ہیں جو 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں ''عوامی راج'' کے بعد پاکستان یا پاکستانی کشمیر کی طرف ہجرت کر گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ یہ احباب اب ہم میں موجود نہیں البتہ انھوں نے یہاں کے سرکاری استبداد سے تنگ آ کر جلاوطنی اختیار کی اور پھر وطن سے دور دنیا کو خیر باد کہہ کر چلے گئے۔خیالؔ)

☆...... غلام رسول طاؤسؔ بانہالی

طاؤسؔ بانہالی سے میرا غائبانہ رابطہ کم و بیش چالیس سال پر محیط رہا۔اس کے بعد جب میں 1986ء میں پہلی بار پاکستان گیا تو وہاں میرا قیام سرزمین کشمیر کے ایک مخلص اور دوست نواز صحافی اور دانشور مرحوم خواجہ عبدالصمد وانی کی قیام گاہ واقع راولپنڈی میں رہا۔

وانی صاحب کا گھر اہل دانش اور اصحابِ بینش بالخصوص اہلِ کشمیر کی آماجگاہ تھا۔وہیں پر طاؤسؔ صاحب سے دوبدو میری ملاقات ہوئی اور میں نے پہلی ہی ملاقات میں انھیں ایک بیباک، لااُبال، مست قلندر اور ابدی مسکراہٹوں میں لپٹے ہوئے شاعر کے روپ میں دیکھا۔

راولپنڈی ہی میں انھوں نے مجھے ایک تصویر عنایت کی جس میں ان کے ساتھ مسعود کشفی بھی ہیں۔اس تصویر کی پشت پر طاؤس نے یہ شعر رقم کرتے ہوئے یہ تحفہ مجھے بخشا اور کہا کہ غالباً میرے جانے کے بعد یہ شبیہ اور یہ شعر آپ کو میری یاد دلاتے رہیں۔یہ شعر یوں ہے:

گُلستانوں آبشاروں لالہ زاروں کا خیال
دل نے تو پل پل کیا ہجرت کے ماروں کا خیال

1947ء کے بعد نومولود پاکستان اپنے وجود کے کھنڈرات سے حیاتِ نو کی جزئیات کو چُن چُن کر اپنی نئی ساخت کو تشکیل دے رہا تھا اور وہاں معاشی طور پر خاص طور دانشوروں اور قلم کاروں کے لیے روزگار کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ یہ ملک بہت حد تک اور سالہا سال تک سیاسی نظام کو استحکام بخشنے ہی کی طرف متوجہ رہا اور اس طرح سے وہاں کی معیشت بھی دھیرے دھیرے آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

وادیٔ کشمیر سے منقسم کشمیر کی سرحد کے اُس پار ہجرت کرنے کا فیصلہ خاص طور پر اُن لوگوں نے کیا جو ریاستی حکومت کی سیاست کاری سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اور سرکاری عتاب کے خدشات سے خوفزدہ ہو کر انھوں نے اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہنے میں ہی اپنی خیریت سمجھی۔

اس وقت آزاد کشمیر جسے کشمیر پر قبائلی حملے کے نتیجے میں مہاراجہ ہری سنگھ کی سلطنت سے بزورِ بازو چھین کر ریاست سے الگ کیا گیا تھا، ایک ایسا پہاڑی علاقہ تھا جس کی آبادی کا اکثر حصہ پہاڑی اور گوجری قبیلے کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ کشمیری مہاجرین کو یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا ہوگا کہ ریاست کے اُس پار والے کشمیر میں کشمیری زبان بولنے والا شاذ و نادر ہی کوئی بندۂ خدا موجود تھا۔ اس نو آباد خطے میں نہ تو ترقی کی کوئی منصوبہ بندی شروع ہوئی تھی اور نہ ہی وہاں پر کشمیری مہاجروں کے لیے خاطر خواہ رہائش، روزگار اور معاشی آسودگی کی کوئی صورت موجود تھی۔

بہر حال جب یہ یارانِ وطن مظفر آباد پہنچے جو اُس علاقے کا صدر مقام تھا تو پہلے پہل انھیں بے پناہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ ان میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کے لیے اُس وقت باعزت روزگار کے دروازے کھل گئے۔ جب وہاں ایک سرکاری نشریاتی ادارہ آزاد کشمیر ریڈیو کے نام سے قائم کیا گیا۔ احمد شمیم، طاؤس بانہالی، آزر عسکری، تحسین جعفری، مسعود کشفی، جی ایم مفتی، مظفر پنجابی اور کئی دوسرے کشمیری دانشور اسی ادارے کی بدولت اپنی شناخت کو برقرار رکھ سکے اگرچہ کئی اور اصحاب نے صحافت کا پیشہ اپنانا ہی مقصد حیات بنایا جن میں میر عبدالعزیز، عبدالصمد وانی اور روزنامہ آفتاب سری نگر کے مدیر ثناء اللہ بٹ مرحوم کے برادر محمد صدیق بٹ نمایاں طور پر شامل ہیں۔

طاؤس بانہالی وادیٔ کشمیر کے فلک بوس برفانی پہاڑوں میں گھرے قصبہ بانہال میں موضع

کسکوٹ میں 28 نومبر 1933ء کو پیدا ہوئے ان کے والد خواجہ احمد خان اس موضع کے زمیندار تھے۔ بقول عبدالقادر سروری طاؤس کے والد بھی بڑے بذلہ سنج تھے اور قصہ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔علاوہ ازیں طاؤس کے چھوٹے بھائی کو بھی شعر وسخن سے لگاؤ تھا۔(1)

طاؤس 1947ء میں پاکستان چلے گئے۔ اس سے قبل انھوں نے 1945ء میں ایک غنائیہ ''وقت کا لٹیرا'' لکھا تھا جس پر اربابِ حل وعقد نے ان کی سرزنش بھی کی تھی۔1961ء میں وہ ریڈیو پاکستان میں مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور دو سال بعد انھوں نے پاکستان ہی میں اردو میں ایم۔اے کا امتحان پاس کرلیا۔

اپنے یوم انتقال یعنی 20 ستمبر 2000ء تک طاؤس اپنے وطن سے دوری کا رونا روتے رہے۔غلام احمد نازؔ کولگامی نے علامہ اقبال کی اسرارِ خودی کا جو منظوم کشمیری ترجمہ کیا ہے اور جسے اقبال اکادمی پاکستان نے 1969ء میں شائع کیا اس کے پیش نامے میں بھی طاؤسؔ کو گھر سے دور ہونے کا کرب ستاتا ہے اور وہ مہجورؔ، رسول میر اور آزادؔ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اقبالؔ کا یہ شعر بھی گنگناتے ہیں:

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم

اسی طرح تحسین جعفری کے کشمیری مجموعہ کلام ''پوشہ تھر'' کے پیش لفظ میں بھی اس غمِ وطن کی نوحہ خوانی یوں کرتے ہیں: ''ہجرت کا سلسلہ چالیس سال گذرنے کے باوجود آج بھی جاری ہے جس کا ثمر غالباً یہی دردِ مشترک ہے جو گوجری شاعر رانا فضل حسین، احمد شمیم اور ان درجنوں شاعروں کو لاحق ہے جو ہجرت کا یہ دُکھ سہہ سہہ کر جی رہے ہیں۔ بقولِ غلام نبی خیالؔ صاحب:

کأشر زبو چھم تالس لجمڑ ونہ کس پر مس کو تاہ چوم
وَتہِ وَتہِ پھیرتھ بیہ گرہِ سمہ ہوتمہِ گرہِ کتہِ ین کالی میتو

کشمیر سے دوری کی وجہ سے احمد شمیم دومیل کے پل پر دریا (جہلم) کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور رانا فضل حسین کو منگلا جھیل میں ویری ناگ کا حسن جلوہ بار نظر آیا۔

یہی مصیبت کے دن ہم غریب الوطنوں کے لیے سالہا سال سے اس طرح سے مقرر ہو کر گذرتے گئے کہ شاید ہم بھی کسی روز اپنے گھر کو لوٹیں:

باگہِ طاوسہ ہردہ یاوُن آم
شراونس دردہ نے کرم آباد (2)

طاؤسؔ کی تخلیقات میں حضرت شیخ نورالدین نورانی کے تقریباً پانچ سو اشلوکوں اور منظومات کا منظوم اردو ترجمہ اور کشمیر کی لوک کہانیوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ترجمہ شیخ ''ریشی نامہ'' کے عنوان سے لوک ورثہ قومی ادارہ اسلام آباد کی طرف سے دسمبر 1980ء میں شائع ہوا۔ طاؤس نے کلام شیخ العالم کے کس نسخے سے ترجمہ کا کام سرانجام دیا ہے اس سلسلے میں وہ خود بھی پُر یقین نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہاں یہ عالم ہے کہ ہم آج تک للہ عارفہ اور نندہ ریش کے ایسے کلیات بھی مرتب نہیں کر پائے جن کا متن صحیح ترین یا صحت کے قریب ہو۔ ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ کلامِ شیخ کے ان اجزاء کی اشاعت اور تشہیر کا کچھ سامان کیا جائے جو کم از کم عام فہم اور قابلِ اعتماد ہوں'' (3)

اس ترجمہ سے چند مثالیں یہاں تبرکاً پیش کی جاتی ہیں:

میں نے پڑھا توحید کا کلمہ　　میں نے پایا رازِ حیات
موجود اس کو وجود میں پایا　　ہر سو دیکھا جلوۂ ذات

☆

یہاں بھی میرا تُو ہی تُو اور وہاں بھی میرا تُو
میں خاکی تُو میری مٹی کو کردے گلزار
میں نے سب کچھ چھوڑ کے تیرا دامن تھام لیا
میں مٹی میں خاک، مگر چاہوں تیرا دیدار

☆

میرا جیون مری جوانی جیسے پھول انار کا ہو
میری جوانی کب چاہے گی ایندھن اس انگار کا ہو
میرے دست و بازو اپنے کیے کا پھل جب پائیں گے
کیا اس وقت کروں کیا حاصل میری چیخ و پکار کا ہو

☆

پل بھر میں شبنم کے موتی   پل میں پوہ کا پالا تھا
پل میں اماوس رات اندھیری   پل میں نُور کا ہالا تھا

طاؔوس نے کشمیر کی لوک کہانیوں کو بھی اردو میں ڈھالا ہے اور یہ ترجمہ بھی لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد کی طرف سے حسنِ اہتمام کے ساتھ 1987ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ بظاہر یہ ترجمہ طاؔوس نے جے ہنٹن نولز کی مشہور کتاب ''فوک ٹیلز آف کشمیر'' سے استفادہ کر کے ہی کیا ہوگا لیکن کہانیوں کے عنوانات اور اُن کی داستانوں سے طاؤس نولز سے کوسوں دور اور الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ طاؔوس نے کشمیر کی لوک کہانیوں کے کئی نسخے زیرِ نظر رکھ کر اپنا مجموعہ مرتب کیا ہے جس کی طرف وہ خود بھی ان الفاظ میں نشان دہی کرتے ہیں'' اردو میں ترجمہ کرتے وقت اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ اصل کشمیری لوک کہانیوں کا لہجہ برقرار رہے۔ اور وادیٔ کشمیر کے ہر علاقے اور ہر مزاج کی کہانیوں کا ایک نمائندہ انتخاب مرتب کیا جائے۔''(4)

طاؤس کا صرف نولز کی کہانیوں ہی کا ترجمہ نہ کرنا اس حقیقت سے بھی تقویت پاتا ہے کہ جہاں طاؔوس ''ہر علاقے اور ہر مزاج'' کی بات کرتے ہیں وہاں نولؔز کی کہانیوں کا خطۂ بیانیہ کشمیر کے دو تین اضلاع پر ہی حاوی ہے۔ مترجم کو چاہیئے تھا کہ وہ نولز کی طرح ان وسائل اور ذرائع کا بھی حوالہ دیتے جن سے انھوں نے عوامی کہانیوں کا ذخیرہ جمع کیا تھا لیکن طاؤس نے ایسا نہ کر کے قاری کے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا ہے۔ البتہ جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں کہا گیا ہے اس میں شامل بیشتر کہانیاں حاتم تیلی کی کہانیوں ہی کا ترجمہ ہیں۔

طاؤس کا طبع زاد نمونۂ کلام یوں ہے:

راہ و رسمِ کُہن کی بات چلی   قیس اور کوہکن کی بات چلی
اک تبسم کناں کلی چٹکی   پھر کسی گل بدن کی بات چلی
یاد آتے رہے وہ دیوانے   جب بھی دار و رسن کی بات چلی
جلتی یادوں کی جگمگاہٹ ہے   ہائے کس انجمن کی بات چلی
کُنجِ غربت میں یوں رہے طاؤس   دھڑکنوں کے وطن کی بات چلی

طاؔوس نے حبہ خاتون کے ایک گیت کا بھی گیت ہی کے مخصوص اسلوب میں ترجمہ کیا ہے جسے

یہاں دوہرا کر محفوظ کیا جاتا ہے:

کچھ سندر الہڑ کرنیں
اُتریں گھر آنگن میں
آکاش سے پریاں اُتریں

زمزم کے پانی میں
نہلا کر پھر جابیٹھیں
اُتریں گھر آنگن میں

رُوپک مایا کودھُن میں
بہروپی اُلجھائیں
ان لہروں سے بھی الجھیں
اتریں گھر آنگن میں

جب آنکھ کھُلے جوبن میں
سسرال کے دن آئیں
خوابوں میں ڈوبی آنکھیں
اُتریں گھر آنگن میں

☆......فتح محمد خاں آزرؔ عسکری

آزرؔ، تبتِ خورد یعنی بلتستان میں اسکردو کے مقام پر 1912ء میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت اسکردو میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ آزرؔ نے بلتی اور فارسی والدین سے سیکھی اور پھر کشمیر اور جموں میں زندگی گذارنے کے دوران پنجابی، کشمیری اور اردو زبانیں سیکھ لیں۔

1948ء میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں پہلے پہل فارسی میں شاعری کی لیکن بعد میں مزاحیہ انداز میں سخن گوئی کا شغف اختیار کیا'' اردو شاعری کا آغاز 1932ء میں ہی کیا تھا۔ کچھ منظومات کی

اصلاح استاد محترم حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری نے فرمائی ہے اور باقی تمام عرصہ حضرت ڈاکٹر بشیر محمد میاں قیس شیروانی مرحوم کے اخلاق کریمانہ اور روابط برادرانہ سے مستفید ہوتا رہا۔'' آگے کہتے ہیں'' میرا خمیر جنتِ کشمیر کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ (1976ء میں) پیسنٹھ سال گذر چکے ہیں 1948ء میں جنت سے نکالا گیا۔ آج کل مظفر آباد آزاد کشمیر میں زندگی کے دن پورے کرر ہا ہوں۔ کہاں جاؤں گا:

تاحدِ نظر جادۂ ویرانِ عدم ہے

اس راہ میں لاہور نہ پنڈی نہ پشاور (5)

''کشتِ زعفران'' آزر کا اردو مجموعۂ کلام ہے جو 1976ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں شاعر کا سارا مزاحیہ کلام یک جا ہوکر منظرِ عام پر آیا ہے۔

آزؔر عسکری نے ہمارے خیال میں اپنے لئے مزاحیہ شاعری کو اپنا موضوع سخن بنانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ان کی اس شاعری میں انھوں نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں سماج، سیاست اور زندگی کے دیگر شعبوں کی کمزور نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک قابلِ توجہ اردو شاعری کا سرمایہ پیش کیا ہے جو انھیں دیگر ممتاز پاکستانی مزاح گو شاعروں سید ضمیر جعفری اور انور مسعودؔ کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ آزؔر نے حاجی لق لق کی مشہور نظم ''بہشت بریں'' کی جو تضمین کی ہے وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کا صرف ایک بند پیش ہے:

وہاں پر نہ ہوگی نہ پستی بلندی

نہ کام آئے گی اپنی کچھ ہوش مندی

نہ جرأت کسی کو کرے بات گندی

نہ بندی نہ بندہ نہ منصوبہ بندی

عصا ہاتھ میں لے کے ٹہلا کریں گے

بہشت بریں لے کے ہم کیا کریں گے

آزر عسکری نے صحافت کے میدان میں بھی اپنا حصہ ادا کیا۔ وہ کئی سال تک ہفت روزہ ''کشمیر'' چلاتے رہے۔ ان کی غنی کشمیری پر تحقیق مبینہ طور پر ایک منفرد انداز کی محققانہ کوشش ہے اگرچہ اس کے بارے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔

آزر، مارچ 1983ء کو مظفر آباد میں انتقال کر گئے اور وہ وہی پر مدفون ہیں۔

صابر آفاقی نے آزر کی مزاحیہ شاعری پر مختصر الفاظ میں یوں اپنی رائے ظاہر کی ہے:

''آزر نے انسان اور انسان کے کاموں کو ہمیشہ غیر سنجیدہ نظر سے دیکھا ہے بلکہ تمسخر اڑایا ہے اور اسی میں اس کے فن کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو طنزیہ شاعری میں آزر کا مرتبہ وہی ہے جو فارسی میں عبید زاکانی اور اردو میں اکبر الہ آبادی کا ہے''۔ (6)

بقول حبیب کیفوی ''آزر جس شعری مجلس میں کلام سناتے ہیں اُس میں قہقہوں کے فوارے پھوٹ پڑتے ہیں لیکن جب اہلِ فکر ان کے کلام پر غور کرتے ہیں تو انھیں مزاح اور طنز کے پردے میں معاشرے کے روگ اور رستے ہوئے ناسور دکھائی دیتے ہیں۔'' (7)

حفیظ جالندھری اور قیس شیروانی کے علاوہ آزر نے جن اساتذۂ اردو کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں کہ ''اس سلسلے میں مزید جن بزرگوں سے رابطہ رہا ہے ان میں نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی، تاثیر مرحوم اور سید وحید الدین بیخود دہلوی سرِ فہرست ہیں۔ (8)

آزر عسکری کا ذریعۂ روزگار گھڑی سازی کا کام تھا۔ معاشی طور پر وہ کبھی آسودہ حال نہیں رہے اور عمر کے آخری ایام میں کمزور بینائی کی وجہ سے نوشت و خواند کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو گیا۔ غریب الوطن ہو کر وہ پاکستان میں سیالکوٹ، لائل پور اور لاہور میں مقیم رہے۔ بالآخر انھیں مظفر آباد ہی کی مٹی نصیب ہوئی۔

آزر کی نظم ''نذرِ فیض'' کے یہ چند اشعار دیکھیں:

سرِ رہ گذر وہ دکھا کے یوں رُخِ پُر بہار چلے گئے
ذرا جھانکا کھڑکی سے کار کی اور بھگا کے کار چلے گئے

تیرے عشقِ ٹیڑی مزاج نے کبھی جا پہ ٹکنے نہیں دیا
کبھی زنجبار چلے گئے کبھی ہر دوار چلے گئے

شب وعدہ وہ جو نہ آسکے رہی یہ فتیگ ہی رات بھر
کبھی کوئے یار میں جا گھسے کبھی سوئے بار چلے گئے

اس مختصر سے جائزہ کے اختتام سے پہلے آزر کے چند منتخب اشعار قارئین کی تفننِ طبع کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

صرف افسر ہی کا ڈر اس میں نہیں ہے کافی
ساتھ بیوی کا بھی ڈر ہو تو غزل ہوتی ہے
دردِ دل دردِ جگر مال ہیں کنڈم دونوں
دردِ سر دردِ کمر ہو تو غزل ہوتی ہے

......☆......

ازل سے ہی اُلٹ تاثیر ہے ہے کشتِ محبت کی
کہ گندم اس میں گر بوئیں تو ہوتے ہیں مٹر پیدا
سوہنی کے گھڑے کا افسانہ تاریخ نے یوں دہرایا ہے
ساحل پہ کھڑے ہم دیکھا کئے اور یار کا بیڑا غرق ہوا
قسمت ہی کچھ ایسی لائے ہیں اب اس کا مداوا کون کرے
اخبار نے فوٹو چھاپی تو اخبار کا بیڑا غرق ہوا
اتوار کا وعدہ اُن کا تھا جانا تھا کلفٹن دونوں کو
ڈیڈی کی اچانک آمد سے اتوار کا بیڑا غرق ہوا

......☆......

اگر طے ہو گیا ہوتا میرے کشمیر کا قصہ
یہ لیڈر لیڈری کو اپنی چمکانے کہاں جاتے

نظم ''میرا تیرا شہر چھوڑ کر'' سے یہ اشعار:

اس سے پہلے کہ وہ عدُو کم بخت

تیرے گھر جا کے چغلیاں کھائے

اس سے پہلے کہ دیں رپٹ جا کر

تیرے میرے شریف ہمسائے

اس سے پہلے کہ تیری فرمائش

مجھ سے چوری کا جرم کروائے

اس سے پہلے کہ اپنا تھانے دار

مُرغ تھانے کا مجھ کو بنوائے

میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا

''فال نامۂ جدید'' سے یہ برجستہ اور برمحل اشعار:

بشارت ہو تجھے اے صاحبِ فال

مبارک ہر طرح تجھ کو ہے یہ سال

تری قسمت میں حج کا بھی سفر ہے

مگر اس میں ذرا سا یہ فرر ہے

کہ سونا جب وہاں سے لائے گا تُو

یہاں آتے ہی پکڑا جائے گا تُو

......☆......

بخار و دردِ سر، اسہال، نزلہ، کھانسی و پیچش

مرض تو موسمی سب آ گئے کیا تم نہ آؤ گے

سحر سے دو پہر تک پان والے کی دُکاں سے ہم

کوئی پچاس پتّے کھا گئے کیا تم نہ آؤ گے

......☆......

خلاف توقع وہ آئیں بظاہر عنایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
مگر اس عنایت کے پردے میں اپنی حجامت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے
وہ ایٹم شکن اُن کی دوست آنکھیں وہ دو جوہری بم وہ قامت کہ راکٹ
اب ایسے خطرناک پر جان دینا شہادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

......☆......

اور اخیر پر اُن کی معرکۃ الآراء نظم ''سرِ دگراں'' سے یہ اشعار نقل کر کے تذکرۂ آزر کو اختتام پر لاتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں مجھے خوش فکر ہوں دلشاد ہوں
ہر طرح کے رنج و غم آلام سے آزاد ہوں
یہ نہیں معلوم سر سے پاؤں تک فریاد ہوں
بیوی میکے جا بسی ہے میں مظفر آباد ہوں
ساس کے پنجے میں اک جکڑا ہوا داماد ہوں

☆...... سرفراز حسین خاں تحسینؔ جعفری

تحسینؔ جعفری کی ولادت پونچھ میں 1908ء میں ہوئی۔ 1949ء میں پاکستان ہجرت کرنے کے بعد پہلے وہاں امور کشمیر کے شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ رہے اور پھر ہفت روزہ ''کشمیر'' کے مدیر مقرر کیے گئے۔

تحسین کا تعلق مسلکی لحاظ سے شیعہ فرقے کے ساتھ تھا لہٰذا اُن کے یہاں کلام کا بیشتر حصہ اہل بیت کی نوحہ خوانی اور شہدائے کربلا کی مرثیہ خوانی پر ہی مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نعت، منقبت، حمد اور وطن پرستی کے نغمات بھی لکھے ہیں۔ جعفری کے اردو مجموعۂ ہائے شعر میں ''سرمایۂ نجاتِ دل''، ''لخت لخت'' اور ''سفینۂ نجات'' شامل ہیں۔

جعفریؔ کی اردو یا کشمیری شعر گوئی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اسے عام قسم کی شاعری ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جعفریؔ پر اگرچہ علامہ اقبالؔ کا گہرا اثر تھا لیکن اقبالؔ کی فنی نزاکتوں کی دہلیز پر جعفریؔ بس کھڑے ہو کر رہ گئے اور اقبال کے گنجینۂ سخن سے اپنا خالی دامن بھرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ تاہم جعفری صاحب کے بارے میں منشور بانہالی کے اس اظہارِ خیال کو بھی مکمل طور پر خارج از فکر نہیں کیا جاسکتا۔ جب وہ کہتے ہیں ''تحسین جعفری ایک کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر ہیں جو زبان و بیان پر پوری دسترس اور مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنے دور کے کچھ سرکردہ ہم عصر شعراء کی طرح اپنا ادبی سفر اردو شعر گوئی سے شروع کیا ہے۔ شعر گوئی کی یہ تحریک بنیادی طور پر آپ کو کچھ رثائی منظومات خاص کر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مراثی سننے اور مطالعہ کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ جس نے آگے چل کر آپ کی فکری اور فنی صلاحیتوں کو بہت ہی مستحکم اور معتبر بنا دیا ہے۔''(9)

تحسینؔ مشہور اردو افسانہ نگار کرشن چندر کے ہم جماعت تھے۔ انھیں ایک اور پونچھی ادیب اور صحافی چراغ حسن حسرتؔ کی صحبت بھی حاصل رہی۔ تحسین کے شاگردوں میں سردار محمد عبدالقیوم خان، سردار سکندر حیات خان، جسٹس محمد اقبال فانی وغیرہ شامل ہیں۔ جعفری صاحب جب 1996ء میں انتقال کر گئے تو ممتاز مزاح نگار اور شاعر سید ضمیر جعفری نے کراچی کے روزنامہ جنگ میں جعفری صاحب کے بارے میں لکھا کہ ''پونچھ نے تین نامور ادبی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ کرشن چندر، چراغ حسن حسرت اور تحسین جعفری''

تحسینؔ جعفری کا کشمیری مجموعہ کلام ''پوشہ تھر'' نام کے دیوان کی شکل میں شائع ہوا ہے جسے انھوں نے اپنے ان الفاظ میں واضح کیا ہے ''کہ اس کی اشاعت کا مدّعا یہ تھا کہ میری اولادیں نسلاً بعد نسلاً یہ حقیقت ذہن نشین کریں کہ وہ سارے کشمیری الاصل ہیں خواہ ان کا قیام کہیں پر بھی ہو اور انھیں اپنے وطن کشمیر کو کسی صورت میں بھولنا نہیں''۔

نمونۂ کلام یوں ہے:

آغازِ بہاراں میں اپنا کچھ اور ہی عنواں ہوتا ہے
ہر زخمِ جگر لو دیتا ہے ہر داغ فروزاں ہوتا ہے

آنکھوں کے سُونے جھروکوں میں اشکوں کی شمعیں جلتی رہیں

ہر شب میرے کلبۂ احزاں میں اک جشنِ بہاراں ہوتا ہے

آسودۂ ساحل کیا جانے موجوں کی تلاطم خیزی کو

ہم موجۂ ساحل ہیں ہم سے اندازۂ طوفاں ہوتا ہے

آئینِ محبت میں واعظ احساسِ زیان وسُود نہیں

جاتے ہیں اس کوچے میں جہاں رُسوائی کا ساماں ہوتا ہے

کس رشکِ گل تر کی خوشبو انفاس میں میرے شامل ہے

ہر سانس کی آمد و شد پر جو احساسِ بہاراں ہوتا ہے

آنکھوں کے دیئے بجھنے سے لگے ہونٹوں کے کنول مُرجھا سے گئے

اب آئینہ دیکھ کے سوچتے ہیں کیوں حسن گریزاں ہوتا ہے

یہ دورِ بہار وخزاں تحسین کیا جانئے کب تک ختم نہ ہو

دل خون کے آنسو روتا ہے اک غنچہ جو خنداں ہوتا ہے

☆...... **احمد شمیم**

برصغیر کی تقسیم کے بعد جو ادبی، ثقافتی اور صحافتی شخصیات کشمیر سے پاکستان یا پاکستانی کشمیر چلی گئیں اُن میں احمد شمیم سب سے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا اصلی نام غلام احمد زرگر تھا۔ کالج میں اُنھوں نے الہام شمیم کا قلمی نام اختیار کیا تھا۔

احمد شمیم 3 مارچ 1930ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے حزب اختلاف کی سیاست سے وابستہ تھے، جس کی بنا پر اُنھیں 1948ء میں اُس وقت کی ریاستی حکومت نے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہ پہلے آزاد کشمیر کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہوئے اور پھر وہاں کے ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔

سرینگر میں وہ کچھ عرصے تک پریم ناتھ بزاز کی سوشلسٹ تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ شمیم

نے اگر چہ شاعری کا آغاز اُردو ہی میں کیا اور اُن کا کلام پاکستان کے کئی رسائل وجرائد میں شائع ہوتا رہا، تاہم وہ جلد ہی اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف مائل ہوئے اور پھر ان کی شاعری میں ایک نکھار آ گیا۔

شمیمؔ کا مثالی شاعر عبدالاحد آزاد تھا، جس سے وہ اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مہجور پر آزادؔ ہی کو ترجیح دی۔ البتہ ان کے کلام میں اکثر مہجورؔ اور آزادؔ ہی کی بحر، اوزان اور ردیف وقوافی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے بہترین دوستوں میں غلام رسول طاؤسؔ بانہالی سر فہرست تھے۔

چونکہ احمد شمیم نے اپنی زندگی کے بیشتر ماہ وسال وطن سے دور گزارے، لہٰذا اُن کی سوانح مکمل شکل میں دستیاب نہیں۔ اُنھوں نے 1982ء میں انتقال کیا۔ اُن کی مشہور اُردو نظم ''دجلۂ خون'' سے یہ چند اشعار پیش ہیں:

ستم و جور وہی
رگِ جان بھی ہے وہی اور نشتر بھی وہی
دستِ اغیار میں خنجر بھی وہی
کیسا جذبہ ہے کہ جو خانۂ زنجیر کا پابند نہیں
پھر اُمڈ آئی ہے بازاروں میں
موت پر خندہ کناں
اک تمنائے جواں
لب پہ آجائے تو اک نعرۂ مستانہ ہے
ہاتھ میں آئے تو اِک خشتِ جنوں بنتی ہے
دل میں آجائے تو اک ولولۂ نو کی طرح
در و دیوار ہلا دیتی ہے
سوئی قسمت کو جگا دیتی ہے
کوئی دیکھے تو میرے شہر کے بازاروں میں
دجلۂ خوں تو رواں آج بھی ہے

رسمِ شبیر جواں آج بھی ہے

ریاستی کلچرل اکیڈیمی اس لحاظ سے درخورِ تحسین ہے کہ اس نے شمیم کے دستیاب مختصر کشمیری کلام کی شیرازہ بندی کر کے اسے 1989ء میں ''دگ تہ داغ'' (درد اور داغ) کے نام سے شائع کر کے محفوظ کیا۔

شمیم کے چند کشمیری اشعار کو اردو میں یوں منتقل کیا گیا ہے:

جس ستم گار نے دل کو میرے برباد کیا
دل نے ہر لمحہ اُسے شوق سے پھر یاد کیا
غمِ جاناں غمِ دوراں کو بسایا دل میں
اور اسی درد سے اس گھر کو بھی آباد کیا
دہر کی خاطر سبب ہے فخر کا میرا وجود
ہاں یہی غم ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا

......☆......

کتنا پیارا ہے خزانوں میں بہاروں کا خیال
دشمنوں کے نرغے میں گویا کہ یاروں کا خیال
دیس سے پردیس آکر روز وشب کی یہ کسک
صبح ہو یا شام ہو آئے چناروں کا خیال
دیکھئے کس نوع کا شاعر ہے یہ احمد شمیم
آتشِ نمرود ہے اور گلعذاروں کا خیال

☆...... میر عبدالعزیز

میر عبدالعزیز وطنِ مالوف کشمیر کے ایک پختہ مشق اور مشہور صحافی تھے۔ وہ جنوری 1924 کو سرینگر کے رام باغ علاقے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلے اپنے ہی محلے کے مدرسے میں اور اس کے

بعد سری پرتاپ ہائی سکول اور اخیر پر ایس پی کالج میں تعلیم حاصل کی۔

صحافت کی دنیا میں انھوں نے ہفت روزہ ''ملت'' اور پریم ناتھ بزاز کے روزنامہ ''ہمدرد'' کی ادارت سے آغاز کیا۔ 1947ء میں وہ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے کنوینر بنائے گئے۔ 1948ء میں کشمیر سرکار نے انھیں زندہ گرفتار کئے جانے پر انعام مقرر کیا، کیونکہ وہ اپنے اداریوں میں حکومتِ وقت کے خلاف انتہائی زہر افشاں تنقید اور تضحیک کا اسلوب اختیار کرتے تھے۔ اسی دوران وہ روپوشی کی حالت میں سرحد پار چلے گئے۔ پاکستان میں انھیں نئی نئی مشکلات اور مصائب نے آن گھیرا۔ حتیٰ کہ جب 1958ء میں پاکستان میں جنرل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کیا تو میر عبدالعزیز کو بھی 26 جون 1959ء کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس موقعے پر پنڈت پریم ناتھ بزاز نے پاکستان سرکار کی نکتہ چینی کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ ''وہ تنگ نظر افسر جس نے حکومتِ پاکستان کو اس اقدام کا مشورہ دیا، اس نے پاکستان کے کشمیر کیس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور یہ افسوس ہے کہ وزارتِ داخلہ میں بھی کسی نے اس امر کی نشاندہی نہیں کی''۔ اس حوالے سے میر عزیز نے یہ اشعار قلم بند کئے:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

میر عبدالعزیز آخر دم تک اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ اُنھوں نے اگرچہ کئی سیاسی تنظیموں میں وقتاً فوقتاً شمولیت بھی کی لیکن بعد میں انھوں نے سیاست کو خیر باد کہہ کر باقی ماندہ زندگی اپنے دو اخباروں ہفتہ وار ''انصاف'' اور ''ٹائمز آف کشمیر'' کے لیے ہی وقف کرلی۔ یہ دونوں جریدے راولپنڈی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ پاکستانی کشمیر کے اولین صدر سردار محمد ابراہیم نے میر کے اس انتھک عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ جب دو انگلیوں سے ٹائپ کرتا تھا تو اُس کو کھانے پینے سمیت کسی بھی چیز کا ہوش نہیں رہتا تھا''

1997ء میں انھیں صدرِ پاکستان کی طرف سے صحافتی خدمات کے عوض ''پرائڈ آف

پرفارمنس'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ آپ صرف ایک بار 1982ء میں اپنے وطن کشمیر آئے اور میرے ساتھ اُن کی ایک طویل ملاقات میری رہائش گاہ پر ہوئی ، جہاں ہم رات گئے تک ہندوستان اور پاکستان کے حالات بالخصوص سیاسیات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ اُس وقت مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوا کہ میر صاحب برصغیر کے کوائف سے نہایت دل برداشتہ تھے اور ان کے بقول اس پریشان کن سیاست گری سے سب سے زیادہ زیاں اہل کشمیر کو ہوا تھا۔

میر عبدالعزیز 6 فروری 2000 کو راولپنڈی کے ایک ہسپتال میں 76 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادے میر وقار عزیز نے یہ مصرعہ پڑھا:

چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

☆...... مسعود کشفی

مسعود کشفی ، علامہ میر غلام احمد کشفی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کا اصل نام میر مسعود احمد سلطان تھا۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب محمد حنیف نے مسعود کی وفات پر ناصر کاظمی کا یہ شعر ایک تعزیتی محفل میں پڑھا تھا:

وہ ہجر کی رات کا ستارہ ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا

سدا رہے اُس کا نام پیارا ، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

اور اپنے ایک تہنیتی مضمون میں لکھا تھا۔ ''موت کے پنجہ سے کوئی ذی نفس نہیں جو بچ سکا ہو۔ اس تلخ حقیقت نے انھیں بھی نہیں بخشا جنھوں نے اپنی ساری عمر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گزاری ہو''

مسعود کشفی شمالی کشمیر کے بانڈی پورہ قصبے میں داچھی گام کی نہایت خوبصورت وادی میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر غلام احمد کشفی کشمیر کے مشہور روزنامہ ''خدمت'' کے مدیر اعلیٰ تھے اور وہ شیخ محمد عبداللہ اور مولانا محمد سعید مسعودی کے قرابت داروں میں شامل تھے۔

مسعود صاحب جب پاکستان چلے گئے تو وہاں تراڈ کھل ریڈیو میں ان کی تقرری ہوئی اور پھر ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے انھوں نے اس نشریاتی ادارے کی قیادت سنبھالی۔ چونکہ مظفر آباد

میں ثقافت اور ادبیات کا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا، مسعود نے ریڈیو کے ذریعہ ہی فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے اس غیر آباد اور بنجر علاقے کو ادبی سرگرمیوں کا ایک مرکز بنایا۔

بقول حنیف ''مسعود اپنی ذات میں سیماب صفت تھے، کشمیر ان کی پہچان اور کشمیری ہی ان کی زبان تھی، لیکن بد قسمتی سے ان کا کشمیری کلام ہم تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ مسعود کے جانے سے روزنامہ ''گردش'' کے قارئین مسعود سے محروم ہو گئے اور قارئین ''سیاست'' بھی ان کے دلچسپ مضامین اور شذرات کو ترستے رہے۔

وفات سے چند روز قبل معاصر جریدے ''آتش چنار'' میں کشمیری ادب اور ثقافت پر اُن کا ایک شاندار مقالہ شائع ہوا جس نے پاکستان کے اُردو دان حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ مسعود کے دوست محمد حنیف نے بالآخر ان کی یاد میں کہا، ''مسعود کشفی اپنی ذات میں گلدستہ تھے جس کے پھولوں اور جس کی یادوں کی مہک سے فضائیں معطر رہیں گی''۔

حوالہ جات:

(1) کشمیر میں اردو۔ جلد 3۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سری نگر۔ 1984ء

(2) جموں صوبس منز کاشرہ زبان و ادبک تواریخ۔ منشور بانہالی۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 2001ء۔ ص 188

(3) ریشی نامہ۔ لوک ورثہ قومی ادارہ اسلام آباد۔ 1980ء ص 19

(4) کشمیری لوک کہانیاں۔ 1987ء، ص 8

(5) پیش لفظ کشتِ زعفران۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن بینک روڈ، مظفر آباد۔ جولائی 1976ء۔ ص 9

(6) عکسِ کشمیر۔ گلشن بکس سری نگر، 2011ء، ص 128

(7) کشمیر میں اردو۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ 1979ء، ص 203

(8) ایضاً۔ ص 204

(9) تحسین جعفری۔ منشور بانہالی۔ کلچرل اکادمی سری نگر۔ 2009، ص 100

بھگوت گیتا کے اُردو تراجم

بھگوت گیتا دراصل ہندوؤں کے مشہورِ عالم عقیدتی رزمیہ مہا بھارت ہی کی ایک داستان ہے جس میں کرشن جی کی کوروؤں کے ساتھ کورکھشیتر میں حق وصداقت کی جنگ کا حال نہایت ہی فلسفیانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس صحیفے کو ہندو دھرم میں اعتقاد کے لحاظ سے اعتبار اور وقار حاصل ہے۔

بھگوت گیتا یا نغمہ الٰہی یعنی یہ مقدس صحیفہ سات سو اشعار پر مشتمل ہے، جو پانڈوؤں کے شہزادے ارجن اور اس کے رہبر کرشن کے ایک تاریخی مکالمے کے اردگرد گھومتا ہے۔ جب ارجن اس شش وپنج میں پڑ جاتا ہے کہ اسے اپنے ہی قرابت داروں یعنی کوروؤں کو میدان جنگ میں ہلاک کرنا ہے تو کرشن اُس سے کہتا ہے کہ ''تم ایک سپاہی کا فرض ادا کرو اور مارو''۔

بھگوت گیتا میں انسانیت کے تحفظ کا جو درس اور سچ کی خاطر اجرِ خداوندی کی فکر کیے بغیر فرض منصبی ادا کرنے کی تلقین ہے اس نے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے کئی رہنماؤں کو متاثر کیا جن میں مہاتما گاندھی بھی شامل ہیں جن کے بقول گیتا اُس کے لیے ایک ''روحانی لغت'' تھی۔

کرشن مہاراج نے خود اپنی زبانی اس فلسفۂ حیات کا ذکر بھگوت گیتا کی ابتدا میں اس طرح کیا ہے۔ ''جب جب اچھائی زیر ہوتی ہے اور برائی کا بول بالا ہوتا ہے، میں بذاتِ خود اچھائی کی حفاظت اور برائی کی بربادی کے لیے اور مذہب کی بالادستی کی خاطر ہر دور میں وارد ہوتا ہوں''۔

شری کرشن کا سالِ ولادت 3228 قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش قید خانے کے اندر ہوئی کیونکہ اس کے ماموں کنس نے، جو اسے قتل کرنا چاہتا تھا، اسے قید خانے میں ڈال رکھا تھا۔ کرشن کو چپکے سے جیل سے نکالا گیا اور پھر اس کے سوتیلے والدین نند اور یشودھا نے اس کی پرورش کی۔

بھگوت گیتا کے تراجم دنیا کی بے شمار زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا کہنا ہے

''سب سے پہلے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں اکبر اعظم کے زمانے میں فیضی جیسے قادر الکلام شاعر نے کیا۔ یہ ترجمہ آزاد ہے۔ فیضی نے اس میں یہ کامیاب کوشش کی ہے کہ ترجمے اور شعر کی خوبی کے ساتھ ساتھ اصل مضمون کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے(1) انگریزی میں گیتا کا ترجمہ پہلی بار چارلس ولکنس نے 1785ء میں کیا۔

بھگوت گیتا کے اردو تراجم کی تعداد اگر چہ چند قلم کاروں نے بارہ سے لے کر نوسے تک بتائی ہے لیکن انھوں نے کسی مترجم کا نام تک نہیں لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں کو دوہراتے ہوئے رواروی کے عالم میں یہ اعداد پیش کیے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں حیدرآباد کے شیخ عبدالغنی کی مساعی کی داد دئے بنا نہیں رہا جاسکتا جنھوں نے انگریزی میں گیتا پر ایک مبسوط اور جامع مقالہ قلم بند کر کے اس کے ترجمہ کاروں کی تفصیلات بھی غالباً پہلی بار فراہم کی ہیں۔ ان مترجمین کے اسماء یوں ہیں: کنہیا لال الکھ وہاری، منشی شام سندر لال بنارسی، منشی دیوی پرشاد، منشی رام سہائے، قاضی محمد نیر صدیقی، جانکی ناتھ مدن دہلوی، منشی جگن ناتھ پرشاد عارف، منشی کیدار ناتھ، بابو بھگوان داس بھارگو، چودھری روشن لال، پنڈت روپ نرائن پانڈے، بنکٹ پرشاد خلیق، پنڈت لکشمی نرائن مشرا، ستیہ پرکاش سہروردی، چرن داس ریڈی، عبدالعزیز خالد، سلطان احمد صدیقی گورکھپوری، مہاریشی شوبھرت لال، پربھودیال عاشق لکھنوی، سورج نرائن مہر دہلوی، محمد اجمل خان اور مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی۔

ان مترجمین کے اسماء کے ساتھ اگر چہ شیخ صاحب نے تراجم کے اشاعتی اداروں اور سالہائے اشاعت کا بھی ذکر کیا ہے لیکن طوالت کی بنا پر یہ تفصیلات ہم نے یہاں حذف کی ہیں۔

اس طویل مقالے کے لیے ہمیں بھگوت گیتا کے جو اردو ترجمے حاصل ہوئے وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، منور لکھنوی، حسن الدین احمد، منیر بخش عالم، انور جلالپوری، پنڈت دینا ناتھ مدن، خواجہ دل محمد، وینکٹ ٹی، ای، اپالا چاری، ساجد صدیقی، نسیم نور محلی، منشی پنا لال بھارگو، پریم ناتھ شاستری، کیول کرشن ریشی، صلو چودھری، سروانند کول پریمی اور نظر سوہانوی نے کیے ہیں اور زیر نظر تحریر میں ظاہر ہے کہ ان ہی کے ترجموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انگریزی کے ترجمہ کاروں میں بالخصوص اینی بیسنت اور ایڈوِن آرنالڈ کے نام نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ترجمہ لاہور میں اشاعت پذیر ہونے کے بعد ہریانہ اردو اکیڈمی نے 1995ء میں دوبارہ شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دیباچے میں گیتا اور اس میں بیان کردہ فلسفے کو جس پُرکاری اور گہری تجزیہ نگاری کے پس منظر میں پیش کیا ہے اس کے مدنظر ان کا یہ اقتباس بے حد برمحل اور گیتا کو ذہن نشین کرنے میں ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ خلیفہ عبد الحکیم کہتے ہیں۔ ''یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اس کے اندر عرفان کا ایک دریا کوزے میں بند ہے۔ توحید کا بلند تصور، روح انسانی کا خدا سے واسطہ، زندگی اور موت کا راز، جسم اور روح کا تعلق، علم اور عمل کی باہمی نسبت، جذبات اور عقل کا رشتہ، صلح اور جنگ کا فلسفہ، غرضیکہ حیات و ماورائے حیات کا شاید ہی کوئی ایسا اساسی مسئلہ ہو جو اس کے اندر موجود نہیں۔ گیتا کا بنیادی نظریہ قران کریم اور تصوف اسلامی کے نظریہ سے بہت قریب ہے۔ ہندوؤں کے شاستروں میں یہی ایک کتاب ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو دین قدیم کی اصلی وحدت سے آشنا کرسکتی ہے۔ از روئے اسلام توحید اصلِ دین ہے۔ کائنات کی وحدت اور انسان کی وحدت اس سے بطور نتیجہ حاصل ہوتی ہے۔ علم بھی کثرت میں وحدت کی تلاش کا نام ہے اور اخلاق بھی کثرت اور تضاد میں وحدت کی کوشش ہے۔ عشق بھی وحدت کے جذباتی پہلو کا نام ہے۔ اگر یہ وحدت کی روح کسی فرد یا قوم کے علم و عمل میں سرایت کر جائے تو جنگ اضداد آشتی میں تبدیل ہو جائے۔ گیتا کی تعلیم میں تمام وہ عناصر موجود ہیں جو زندگی کے اہم مسائل کی عقدہ کشائی میں مدد دیتے ہیں۔ گیتا کا مردِ عارف یا مردِ کامل کا تصور بہترین انسان یا جدید اصطلاح میں فوق الانسان کا تصور ہے۔ بعض لوگ اس کو بے حد بلند ہونے کی وجہ سے نا قابل عمل سمجھیں گے لیکن زندگی کے تمام حقیقی نصب العین اسی انداز کے ہیں:

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت مے نشوم آنم آرزوست (2)

خلیفہ عبدالحکیم کے ترجمے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مترجم نے نہایت خوبصورت اسلوب میں خیال کو بطریقِ احسن بیان کیا ہے۔ ایک ہی بحر میں ترجمہ شدہ اشعار دل کی گہرائیوں کو چھوتے ہیں اور قاری کو ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی اصل کلاسیکی شہہ پارے کا مطالعہ کر رہا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

''سب سے پہلے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں اکبراعظم کے زمانے میں فیضی جیسے قادرالکلام شاعر نے کیا۔ یہ ترجمہ آزاد ہے۔فیضی نے اس میں یہ کامیاب کوشش کی ہے کہ ترجمے اور شعر کی خوبی کے ساتھ ساتھ اصل مضمون کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے(1) انگریزی میں گیتا کا ترجمہ پہلی بار چارلس ولکنس نے 1785ء میں کیا۔

بھگوت گیتا کے اردو تراجم کی تعداد اگر چہ چند قلم کاروں نے بارہ سے لے کر نوے تک بتائی ہے لیکن انھوں نے کسی مترجم کا نام تک نہیں لیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں کو دوہراتے ہوئے رواروی کے عالم میں یہ اعداد پیش کیے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں حیدرآباد کے شیخ عبدالغنی کی مساعی کی داد دئے بنا نہیں رہا جاسکتا جنھوں نے انگریزی میں گیتا پر ایک مبسوط اور جامع مقالہ قلم بند کر کے اس کے ترجمہ کاروں کی تفصیلات بھی غالباً پہلی بار فراہم کی ہیں۔ان مترجمین کے اسماء یوں ہیں: کنہیالال الکھ وہاری، منشی شام سندر لال بنارسی، منشی دیوی پرشاد، منشی رام سہائے، قاضی محمد نیر صدیقی، جانکی ناتھ مدن دہلوی، منشی جگن ناتھ پرشاد عارف، منشی کیدار ناتھ، بابو بھگوان داس بھارگو، چودھری روشن لال، پنڈت روپ نرائن پانڈے، بنکٹ پرشاد خلیق، پنڈت لکشمی نرائن مشرا، ستیہ پرکاش سہروردی، چرن داس ریڈی، عبدالعزیز خالد، سلطان احمد صدیقی گورکھپوری، مہاریشی شوبھرت لال، پربھودیال عاشق لکھنوی، سورج نرائن مہر دہلوی، محمد اجمل خان اور مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی۔

ان مترجمین کے اسماء کے ساتھ اگر چہ شیخ صاحب نے تراجم کے اشاعتی اداروں اور سالہائے اشاعت کا بھی ذکر کیا ہے لیکن طوالت کی بنا پر یہ تفصیلات ہم نے یہاں حذف کی ہیں۔

اس طویل مقالے کے لیے ہمیں بھگوت گیتا کے جو اردو ترجمے حاصل ہوئے وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، منور لکھنوی، حسن الدین احمد، منیر بخش عالم، انور جلالپوری، پنڈت دینا ناتھ مدن، خواجہ دل محمد، وینکٹ ٹی، ای، اپالا چاری، ساجد صدیقی، نسیم نور محلی، منشی پنالال بھارگو، پریم ناتھ شاستری، کیول کرشن ریشی، صلو چودھری، سروانند کول پریمی اور نظر سوہانوی نے کیے ہیں اور زیر نظر تحریر میں ظاہر ہے کہ ان ہی کے ترجموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انگریزی کے ترجمہ کاروں میں بالخصوص اینی بیسنت اور ایڈون آرنالڈ کے نام نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ترجمہ لاہور میں اشاعت پذیر ہونے کے بعد ہریانہ اردو اکیڈیمی نے 1995ء میں دوبارہ شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دیباچے میں گیتا اور اس میں بیان کردہ فلسفے کو جس پُرکاری اور گہری تجزیہ نگاری کے پس منظر میں پیش کیا ہے اس کے مدنظر ان کا یہ اقتباس بے حد برمحل اور گیتا کو ذہن نشین کرنے میں ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ خلیفہ عبد الحکیم کہتے ہیں۔ ''یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اس کے اندر عرفان کا ایک دریا کوزے میں بند ہے۔ توحید کا بلند تصور، روح انسانی کا خدا سے واسطہ، زندگی اور موت کا راز، جسم اور روح کا تعلق، علم اور عمل کی باہمی نسبت، جذبات اور عقل کا رشتہ، صلح اور جنگ کا فلسفہ، غرضیکہ حیات و ماورائے حیات کا شاید ہی کوئی ایسا اساسی مسئلہ ہو جو اس کے اندر موجود نہیں۔ گیتا کا بنیادی نظریہ قران کریم اور تصوف اسلامی کے نظریہ سے بہت قریب ہے۔ ہندوؤں کے شاستروں میں یہی ایک کتاب ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو دین قدیم کی اصلی وحدت سے آشنا کرسکتی ہے۔ از روئے اسلام توحید اصلِ دین ہے۔ کائنات کی وحدت اور انسان کی وحدت اس سے بطور نتیجہ حاصل ہوتی ہے۔ علم بھی کثرت میں وحدت کی تلاش کا نام ہے اور اخلاق بھی کثرت اور تضاد میں وحدت کی کوشش ہے۔ عشق بھی وحدت کے جذباتی پہلو کا نام ہے۔ اگر یہ وحدت کی روح کسی فرد یا قوم کے علم و عمل میں سرایت کرجائے تو جنگ اضداد آشتی میں تبدیل ہوجائے۔ گیتا کی تعلیم میں تمام وہ عناصر موجود ہیں جو زندگی کے اہم مسائل کی عقدہ کشائی میں مدد دیتے ہیں۔ گیتا کا مردِ عارف یا مردِ کامل کا تصور بہترین انسان یا جدید اصطلاح میں فوق الانسان کا تصور ہے۔ بعض لوگ اس کو بے حد بلند ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل سمجھیں گے لیکن زندگی کے تمام حقیقی نصب العین اسی انداز کے ہیں:

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت مے نشوم آنم آرزوست (2)

خلیفہ عبدالحکیم کے ترجمے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مترجم نے نہایت خوبصورت اسلوب میں خیال کو بطریقِ احسن بیان کیا ہے۔ ایک ہی بحر میں ترجمہ شدہ اشعار دل کی گہرائیوں کو چھوتے ہیں اور قاری کو ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی اصل کلاسیکی شہہ پارے کا مطالعہ کررہا ہے۔ یہ شعر دیکھئے:

جو پیدا ہوا اُس کا مرنا ضرور
ہے سب کو اسی گھاٹ اترنا ضرور
گیا آج جو یاں سے کل آئے گا
وہ صورت بدل کر نکل آئے گا
ہے گر مرنے جینے کا قانوں اٹل
تو پھر اس پہ افسوس ہے بے محل
یہ تخریب و تعمیر مخلوق ہے
ازل سے یہ تقدیرِ مخلوق ہے
عدم سے ابھرتے ہیں سارے وجود
ہے دیرینہ آئینِ بود و نمود
ابھرتے، سنورتے، گزرتے ہیں سب
عدم کی طرف عود کرتے ہیں سب
اٹھاتی ہے سر جیسے دریا سے موج
گھڑی بھر کا ہے سب غرور اور اوج
جو عارف ہے وہ اس سے گھبرائے کیوں
جو عاقل ہے وہ مفت غم کھائے کیوں؟

بشیشور پرشاد المعروف منور لکھنوی کا بھگوت گیتا کا ترجمہ بقول مترجم کے اصل سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ اسے منور صاحب نے بھگوت گیتا موسوم بہ نسیمِ عرفان کے نام سے مکمل کیا ہے اور اس کی پہلی اشاعت 1936ء میں ہوئی تھی۔

علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی نے اس ترجمے کے بارے میں یوں خیال آرائی کی ہے: ''میں نے پیش نظر منظوم ترجمے کو جستہ جستہ دیکھا۔ نفسِ معنی میں اصل سے مطابق اور خوبیِ بیان میں حُسنِ ادا کی جان پایا۔ ان اوصاف اور اصل موضوع کی دقیع اہمیت کے باوجود نسیمِ عرفان باغِ فصاحت کے

دلدادوں کے لئے شمیم مشام پرور بھی ہے۔ بیان کی سلاست، بندش کی چشتی، اسلوب کی تازگی و دلآویزی اور مشکل پسندی سے اجتناب میں یہ کتاب ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ترجمہ مقبول ہوگا اور مفید ثابت ہوگا''۔(3)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منوّر صاحب نے گیتا کو اردو میں منتقل کرتے وقت ذہن میں اس کا اصل سنسکرت ہی رکھا ہے جس کے نتیجے میں ترجمہ سنسکرت کے الفاظ سے بھاری ہوا ہے اور اس سے ترجمے کا تغزل بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ مثلاً:

مٹ جائیں گے دھرم کرم جس وقت

غالب ہوگا ادھرم جس وقت

اس قبح کی ایک اور وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ منوّر صاحب نے جگہ جگہ پر مہابھارت اور گیتا کے پس منظر میں ان کے کرداروں کے نام بھی ترجمے میں موزون کرنے کی کوشش کی ہے جس کی بنا پر شعر کی روانی میں خلل پڑا ہے۔

حسن الدین احمد کے ترجمے کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ منثور ہونے کی وجہ سے یہ قاری کے ذہن میں آسانی کے ساتھ گھر کرتا ہے۔ البتہ ان کی یہ رائے کسی حد تک مبالغہ آمیزی ہی کا اظہار ہے کہ ''گیتا کے اردو تراجم دیکھنے سے مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ ایسا کوئی ترجمہ نہ مل سکا جس کو پڑھ کر میں بھگوت گیتا کا مطلب بخوبی اور آسانی سے سمجھ سکتا''۔(4) احمد چونکہ سنسکرت زبان سے واقف نہیں تھے لہٰذا انھوں نے اپنے لیے بیسنت اور آرنالڈ کے انگریزی ترجموں ہی کا سہارا لیا ہے۔

کئی اور مترجمین کے برعکس احمد نے ہندو دیو مالائی اسما اور اصطلاحات کو حاشئے میں درج کرکے اور اُن کی توضیح کرکے اور ان کے معنی درج کرکے قاری کو سہولت بہم پہنچائی ہے۔ ترجمے میں شروع سے آخر تک سہل ممتنع کی زبان استعمال کی گئی ہے۔

خواجہ دل محمد کا ترجمۂ گیتا جو بے پناہ مقبولیت کی بنا پر 'دل کی گیتا' کے نام سے مشہور ہوا غالباً دوسرے تمام تراجم پر سبقت لے چکا ہے۔ دل محمد نے اس کی ابتدا میں ایک طویل مگر بامعنی مقدمے میں مہابھارت اور گیتا کے پس منظر میں ہندو فلسفے اور دیگر مذاہب کے ساتھ اس کے فطری رشتے کی

جزیات پر سیر حاصل بحث کر کے قاری کو اس فلسفے کی باریکیوں اور نزاکتوں سے کما حقہ آگاہ کیا ہے جس کی بدولت گیتا کی روح کو سمجھنے میں آسانی بہم ہو جاتی ہے۔ دل محمد نے اپنے ابتدائیہ کے اخیر پر مہابھارت کی توسیع پسندی پر مبنی جنگ کے برعکس گیتا کی حق اور سچائی کی لڑائی کے تناظر میں ہمعصر حالات کا یہ موازنہ کیا ہے: ''آج بھی وہی مہابھارت کی جنگ ہو رہی ہے۔ انسان کا تن کوروکشیتر کا میدان ہے۔ من دھرم کشیتر ہے۔ کھیت میں جو بیج بویا جائے گا ویسا ہی پھل پائے گا۔ آم کی گٹھلی سے آم اور نیم کی بیج سے نیم کا پور نکلے گا۔ محبت کے بیج سے محبت اور نفرت کے بیج سے نفرت پیدا ہوگی۔ حق وباطل، نیکی اور بدی کی فوجیں برسرپیکار ہیں۔ نیکی کی فوج کا سردار ضمیر ہے جو یدھشٹر کی طرح یدھ یعنی جنگ میں مستقل مزاج رکھتا ہے۔ دوسری طرف بدی کی فوج ہے جس کا سردار نفسِ امارہ ہے جو دھرت راشٹر (اندھے راجے) کی طرح دوسرے کے راج کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔

''ارجن کی طرح انسان کو چاہئے کہ اپنی رتھ (قوتِ عمل) کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں دے، جذبات کو فرائض پر غالب نہ آنے دے، حق کے لیے پوری کوشش کرے اور سب کام کرم سمجھ کر خدا کے لیے اور خدا ہی کا کام سمجھ کر پورا کرے۔ خدا اس کا مددگار ہو'' ۔(5)

سوامی تپسیانند نے گیتا کے فلسفے کی یوں وضاحت کی ہے۔''اس صحیفے کی زبردست پذیرائی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کے عملی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر قابو پانے کے لیے انسان کا یہ فریضہ بھی شامل ہے کہ بنی آدم ایک نامکمل سماجی نظام میں اپنا کام سرانجام دے تاکہ اسے تکمیل کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو سکے۔ گیتا اسی مسئلے سے شروع ہو کر اسی کے حل پر اختتام پذیر ہوتی ہے اور اس میں عقیدتی فلسفے کی پُراثر ترسیل موجود ہے''۔

بھگوت گیتا کے تئیں دنیا بھر کے مفکروں، دانشوروں اور اصحاب فکر و دانش نے انتہائی عقیدت اور تحسین کے ساتھ خیال آرائی کی ہے اور اسے ایک عظیم آسمانی صحیفہ اور رہبرِ زندگی قرار دیا ہے۔ مہاتما گاندھی کا کہنا ہے،''جب بھی شکوک وشبہات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ جب ناامیدی میرے چہرے بشرے سے جھلکتی ہے اور مجھے افق پر امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، میں بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتا ہوں اور اسے سکون قلب عطا کرنیوالی ایک راحت بخش تخلیق پاتا ہوں۔ میں اس عالمِ افسردگی میں فوراً ہی

مسکرانے لگتا ہوں۔ میرے خیال میں جو بھگوت گیتا کا سہارا لیتے ہیں انھیں ہر دن اس سے حیات بخش سرور اور نئے معنے حاصل ہوں گے۔''

سوامی وویکا نند جب 1888ء سے لے کر 1893ء تک سارے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے تو انھوں نے جو دو کتابیں ساتھ رکھی تھیں وہ تھیں **The Imitation of Christ** اور بھگوت گیتا۔

ایک دلچسپ واقعہ یوں ہے کہ تامل ناڈو کے رام ناتھ پور میں ہر جمعرات کو ایک مندر میں ہندو فرقے کے لوگ کسی ہندو سے نہیں بلکہ ایک مسلمان سے گیتا کا پاٹھ انتہائی انہماک اور ذوق وشوق سے سنتے ہیں۔ ایم۔ عبدالسلام نامی اس دانشور نے بیک وقت قران، گیتا اور بائبل کا بغور مطالعہ کیا ہے اور وہ اب تامل ناڈو میں ان تینوں الہامی صحائف کی تدریس میں رات دن محو رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ ''میں ان تینوں کتابوں میں کوئی تضاد نہیں پاتا''۔ صوبے میں اب اس کا نام ''گیتا سلام'' پڑ گیا ہے۔

منیر بخش عالم نے ''یتارتھ گیتا'' کے نام سے اس کی مبسوط تشریح کی ہے اور اس کے ترجمے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ترجمہ کار نے انتہائی وضاحت کے ساتھ گیتا کے تخلیقی پس منظر اور اس کے آفاقی فلسفے پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کا وجدان اُن کے بقول انھیں گورو سوامی پرمانند سے ودیعت ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دین کی اور ایمان کی باتیں
اس عظیم انسان کی باتیں
میں نا چیز کہاں لکھا باتیں
گیتا کی یہ گیان کی باتیں

منیر عالم کے مطابق ''گیتا کسی خاص انسان، ذات، طبقہ، موقع محل، مذہبی تفریقات یا کسی قدامت پرست کی کتاب نہیں بلکہ یہ تمام عالم کی دائمی دینی کتاب ہے۔'' ان کے دیباچے کا قدرے طویل یہ اقتباس قاری کو گیتا کی آفاقی اہمیت اور ابدی افادیت کو سمجھنے میں کسی حد تک ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ ''گیتا عالم گیر ہے۔ دین کے نام پر مروجہ دنیا کی تمام شریعتوں میں گیتا کا مقام بے مثال ہے۔ یہ

خود میں کتابِ شریعت ہی نہیں بلکہ دیگر مذہبی کتابوں میں پوشیدہ سچائی کا پیمانہ بھی ہے۔ گیتا وہ کسوٹی ہے جس پر ہر ایک مذہبی کتاب میں دھندلا سچ اجاگر ہو اٹھتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف بیانات کا حل نظر آتا ہے۔ ہر ایک مذہبی کتاب میں دنیا میں جینے کا فن اور مذہبی روش کے طور طریقوں کی افراط ہے۔ زندگی کو دلکش بنانے کے لیے انہیں کرنے اور نہ کرنے کے دلچسپ لیکن خوفناک بیانات سے مذہبی کتابیں بھری پڑی ہیں، مذہبی طور طریقوں کی اسی روش کو عوام دین سمجھنے لگی ہے۔ زندگی گزارنے کے فن کے لیے تیار شدہ اصولوں میں وہ زمانہ اور حالات کے مطابق بدلاؤ قدرتی ہے۔ مذہب کے نام پر سماج میں جھگڑے کی واحد وجہ یہی ہے۔ گیتا ان لمحاتی انتظامات سے اوپر اٹھ کر روحانی تکمیل میں قائم کرنے کا عملی غور و فکر ہے جس کا ایک بھی اشلوک مادی زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں ہے۔ اس کا ہر ایک شلوک آپ سے باطنی جنگ 'عبادت' کی مانگ کرتا ہے۔ غیر مستند مذہبی کتابوں کی طرح یہ آپ کو جنت یا دوزخ کی کشمکش میں پھنسا کر نہیں چھوڑتی بلکہ اُس ابدیت کا حصول کراتی ہے جس کے پیچھے زندگی اور موت کی قید نہیں رہ جاتی"۔

مترجم نے اپنے نثری ترجمے کے ساتھ اصل متن بھی درج کیا ہے جس سے قاری کو ترجمے کا ہر باب ذہن نشین کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ البتہ قارئین کے لیے اس ترجمے سے لیے گئے درجِ ذیل اقتباسات سے لگتا ہے کہ غالباً انھیں فصیح و بلیغ اردو پر کما حقہ عبور حاصل نہیں تھا جس سے یہ ترجمہ پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے جگہ جگہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کا اس طرح استعمال کیا ہے کہ بعض اوقات ان کے معنی مہمل نظر آتے ہیں:

"پانڈو کے پسر ارجن نے (نیکی ہی پانڈو ہے۔ نیکی ہی عشق کو جنم دیتی ہے) اس وقت مختلف قسموں میں بٹی ہوئی ساری دنیا کو ان اعلیٰ معبود کے جسم میں ایک جگہ موجود دیکھا۔"

"جس طرح پروانے ختم ہونے کے لیے جلتی ہوئی آگ میں بے حد رفتار سے داخل ہوتے ہیں ویسے ہی یہ ساری جاندار (؟) بھی اپنی تباہی کے لئے آپ کے دہان میں بہت زیادہ بڑھے ہوئے (؟) رفتار سے داخل ہو رہے ہیں۔"

"اے مالک! میرے ذریعے سے آپ کی وہ شکل دیکھی جانی ممکن ہے اگر آپ ایسا مانتے

ہوں؟ تو اے جوگ مالک! آپ اپنی لافانی حقیقی شکل کا مجھے دیدار کرائیے۔ اس پر جوگ کے مالک نے کوئی اختلاف نہیں کیا کیونکہ وے پہلے ہی جگہ جگہ پر کہہ آئے ہیں کہ تو میرا شریک بندہ اور محبوب دوست ہے لہذا انھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اپنے (؟) حقیقی شکل کا دیدار کرلیا۔''

وینکٹ ٹی ای اپالا چاری نے ''نغمۂ الاہی'' کے نام سے گیتا کا ترجمہ اس وقت مکمل کیا جب ان کی عمر 74 سال تھی۔ ان کا دعوی ہے کہ ''میں نے یہ کام ایک سال میں مکمل کرلیا اور اسے 2003 میں شائع کیا۔ بھگوت گیتا کے جو اردو تراجم میری نظروں سے گذرے ہیں وہ بے معنی ہیں البتہ مجھے اطمینان ہے کہ میرا ترجمہ اصل کے عین مطابق ہے۔ میں اردو کی جان پہچان کا سہرا اپنے سکول کے اردو مدرس قادر حسین خان کے سر باندھتا ہوں''۔ چاری ان دنوں پچاس سالہ پرانی تیلگو۔ اردو لغت پر کام کررہے ہیں۔

گیتا کے دیگر کئی اردو تراجم کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ بے معنی ہیں چاری کی یاوہ گوئی کے سوا اور کچھ نہیں کیونکہ اگر انھوں نے دل محمد، شان الحق حقی یا خلیفہ عبدالحکیم کے ترجموں کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اس خودستائی میں مبتلا نھیں ہوتے۔ یہ دعوائے پیغمبری محض ایک خودستائی ہے کیونکہ ان کے ترجمے میں فنی التزام اور ادبی معیار کہیں پر نظر نہیں آتا۔ نمونے کے طور پر غیر معیاری منثور ترجمے سے یہ بے اثر مثالیں پیش ہیں۔ اس ترجمے میں شعری نزاکت، حسن کلام اور فنی برجستگی ہر طرح سے ناپید ہے۔

''اے ارجن! ساتوک عمل وہی ہے جس میں پھل کی خواہش نہ ہو۔ نتیجہ کی خواہش نہ رکھنے والا جو نہ تو رغبت اور نفرت رکھ کر بغیر لگاؤ کے اپنے فرائض کے مطابق جو مقررہ عمل کرتا ہے اُس فعل کو ساتوکی فعل کہتے ہیں''۔

''جو شخص شاستر کے احکام کی پروانہ کرکے اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے وہ نہ تو کمال حاصل کرتا ہے، نہ ہی مسرت اور نہ ہی منزلِ مقصود''۔

''خواہش آلود عمل کو چھوڑنا (سنیاس) کہلاتا ہے اور تمام اعمال کے پھل کو چھوڑنا تیاگ (ترکِ علائق) کہلاتا ہے''۔

''قربانی، ریاضت، خیرات اور عمل کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اعمال کو کرنا ہی چاہئے۔ ریاضت

کے کام روح کو پاک کرنے والے ہیں مگر پھل اور تعلق کا خیال چھوڑ کر ان کو کرنا چاہئے''۔

''نہ وہاں سورج کی روشنی ہے نہ چاند اور نہ ہی آگ اسے روشن کرتی ہے۔ وہاں جا کر کوئی انسان اس دنیا میں واپس نہیں آتا۔ وہی میرا افضل مقام ہے''۔

انور جلال پوری مشاعروں کے شاعر تھے جو اکثر شاعری کی محفلوں میں کلام سنانے کے علاوہ نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ انہوں نے بھگوت گیتا کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مگر ان کا ناشر شائقین کو دیونا گری میں شائع شدہ جلد ہی فراہم کرتا ہے جس سے اس رسم خط سے نابلد قارئین اس تخلیق سے محظوظ ہونے سے قاصر رہتے ہیں۔ بقول انور انھوں نے گیتا کے اسی (80) تراجم دیکھے ہیں جن میں ساٹھ نثر میں اور باقی منظوم ہیں۔ انھوں نے سات سو ایک شلوک، اٹھارہ ابواب سے ایک ہزار سات سو اکسٹھ اشعار میں ڈھالے ہیں۔

ہمارے یہاں چند اردو ادبا نے یہ رویہ اپنایا ہے کہ اردو کی نام نہاد خدمت کے نام پر وہ دیونا گری میں اپنی تصانیف کو شائع کر کے اردو کی بے حرمتی کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں کیونکہ اردو کا ایک مسلمہ نستعلیق رسم خط ہے جو دنیا بھر میں رائج ہے۔ اس سے کئی کترانا اور ہندی کے پجاریوں کی چاپلوسی میں ملوث ہونا قابل افسوس ہے، انور جلالپوری نے بھی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اسی کوتاہ نظری سے کام لیا ہے۔

البتہ مثنوی کی ہیئت میں کیے گئے انور جلالپوری کے اردو ترجمے کی یہ خاصیت ہے کہ انھوں نے کئی دوسرے مترجمین کے برعکس بحر اور وزن، ردیف و قافیہ اور شعری لوازمات کا پورا خیال رکھا ہے۔ اگر اس کا موازنہ خواجہ دل محمد کے ترجمے کے ساتھ کیا جائے تو دل محمد کی شیرینی اور معنی آفرینی بے مثال ہے، پھر بھی انور نے حتی الامکان اپنے ترجمے کو سہل ممتنع میں ڈھال کر ایک اچھی تخلیق پیش کی ہے۔ اس ترجمے سے چند مثالیں پیش ہیں:

خوشی اور غم کچھ بھی ہوتے نہیں
سمجھ دار جو ہیں وہ روتے نہیں
تجھے پھر بھی لازم نہیں رنج و غم
تو سب کی نگاہوں میں ہے محترم

چکھے گا ہر اک موت کا ذائقہ
یہی ہے ازل سے یہی سلسلہ
مرے گا جو پیدا بھی ہوگا وہی
یونہی چلتی جائے گی یہ زندگی
تیرے میرے بس کی یہ باتیں نہیں
ہوا و ہوس کی یہ باتیں نہیں
جو بس میں نہیں اُس پہ رونا ہی کیا
بلا وجہ پلکیں بھگونا ہی کیا؟

......☆......

وہ اک ذات ہے خالقِ کائنات
وہ اک ذات ہے مالکِ شش جہات
اُسی کے تو جلوے ہیں چاروں طرف
اُسی کے کرشمے ہیں چاروں طرف
فنا سے پرے تو وہی ذات ہے
سدا جو رہے تو وہی ذات ہے

اور جاودانی حقیقت کے یہ لافانی اشعار جن میں پیغمبرانہ انداز میں دین دھرم کی افادیت کا خوبصورت بیان ہے:

کرشن سے ہی ارجُن نے پھر یہ کہا
کہ سُن لے میری آپ یہ التجا
اگر دھرم پر آنچ آجائے گی
تو دنیا کو دیمک ہی کھا جائے گی

اگر پاپ پھیلے گا سنسار میں
بکیں گی خواتین بازار میں
اگر اس میں کچھ چوک ہو جائے گی
تو اولاد مشکوک ہو جائے گی
جہنم کا پھر پیٹ بھر جائے گا
شریف آدمی جونہی ڈر جائے گا

پنڈت یوگی راج نظؔر سوہانوی نے ''کلام رّبانی'' کے نام سے بھگوت گیتا کا جو ترجمہ کیا ہے وہ اس لحاظ سے نہایت اہمیت اور افادیت کا حامل ہے کہ 1934ء میں انبالہ پنجاب سے شائع شدہ اس ترجمہ پر اُس وقت کے ممتاز صاحبانِ علم و دانش اور دنیائے ادب کے اکابرینِ دہر نے دل کھول کر اظہار خیال کیا ہے جن میں نوؔح ناروی، سید امتیاز علی تاؔج، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، سید مسعودالحسن رضوی، مولوی عبدالحق، رضا علی وحشتؔ کلکتوی، برج موہن دتاتریہ کیفؔی، منشی پریم چند، احمد شاہ بخاری پطرس، صوفی غلام مصطفیٰ تبسؔم اور خواجہ حسن نظامی کے شہرہ آفاق اسمائے گرامی شامل ہیں۔

بقولِ نوح ناروی ''نظر سوہانوی نے اس کتاب کو لکھ کر ادبی دنیا پر احسان کیا ہے''۔ مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ'' گیتا کا ترجمہ دنیا کی ہر شائستہ زبان میں ہو چکا ہے۔ اردو میں کئی ترجمے نظم اور نثر میں ہوئے ہیں۔ یہ ترجمہ جو نظر صاحب نے کیا ہے بلا شبہ دوسرے ترجموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ترجمہ میں روانی پائی جاتی ہے اور دقیق مسائل کو بھی مترجم نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے''۔ کیفی دہلوی کا کہنا ہے کہ ''نظم کی سلاست، بیان کی روانی اور ادائے مطلب میں وقتِ نظر کے ساتھ سہل پسندی اس ترجمے کے جوہر ہیں جو ہر پڑھنے سے خراج تحسین طلب کرتے ہیں''۔ منشی پریم چند کی یہ رائے ہے کہ ''موازنہ کرنا تو بہت مشکل ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تک اس قسم کے جتنے منظوم ترجمے شائع ہوئے ہیں اُن میں حضرت نظؔر کے کلام ربّانی کو ممتاز درجہ حاصل ہے''۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے مبسوط تجزیے میں لکھا ہے کہ ''پنڈت یوگی راج نظؔر سوہانوی ایک خوش فکر اور مشّاق شاعر ہیں۔ آپ نے حال ہی میں شری کرشن جی مہاراج کی گیتا کا ترجمہ سلیس اردو نظم میں کیا ہے جس میں مثنوی کی بحر اختیار کی ہے۔

میں نے جستہ جستہ مقامات سے اس ترجمے کو دیکھا۔ نظم میں متانت اور ترجمے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ اس قسم کا لٹریچر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وحدت فکر پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے احساساتِ مذہبی کو سمجھنے میں بے انتہا کارآمد ہوتا ہے۔ اردو دان ہندوؤں اور مسلمانوں کو پنڈت نظر صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جنہوں نے شری کرشن کے بے نظیر موعظۂ عمل کو نظم اردو کا لباس پہنا کر اردو خوانوں پر احسان عظیم فرمایا ہے''۔

عالمی شہرت یافتہ ماہر لسانیات اور مورخ ڈاکٹر تارا چند کا یہ تجزیہ قابل مطالعہ ہے کہ ''بھگوت گیتا قدیم ہندوستان کی ذہنی و روحانی ترقی کی ایک قابل فخر یادگار ہے جس کے ترجمے تقریباً تمام متمدن ممالک کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ فیضی نے اکبر کے زمانہ میں اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندی، مراٹھی، بنگلہ اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں اور شرحیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ اردو زبان میں بھی گیتا کے ترجمے ہوئے ہیں لیکن پنڈت نظر سوہانوی نے اس کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے جو اپنی نوعیت میں ایک نئی چیز ہے۔ مترجم کی یقیناً یہ ایک جدت ہے کہ سنسکرت نظم کا براہ راست اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے''۔

بھگوت گیتا کے اکثر تراجم میں ہندی اور سنسکرت الفاظ و تراکیب کا تکلیف دہ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کے برعکس نظر صاحب نے فصیح و بلیغ اردو زبان ہی کا استعمال کیا ہے جس کی بدولت اسے ایک انفرادی خاصیت عطا ہوئی ہے۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس ترجمے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت اور ہندی کی مذہبی اور روحانی اصطلاحوں کی بجائے زیادہ تر عربی اور فارسی کی اسلامی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں''۔ مندرجہ ذیل دیگر تبصرہ نگاروں نے بھی اپنے اظہار خیال میں ایسے ہی تاثرات بیان کیے ہیں۔

اس خوبصورت ترجمے سے ثنائے خداوندی کی یہ چند خوبصورت مثالیں پیش ہیں:

ایک ہے، یہ سب اُسی کا ہے ظہور
جسم و جاں سے برتر و بے مثل نور

ابتدا و انتہا سے ہے بری
ہے اُسی کی چار سو جلوہ گری

بے تعلق ہے حق و باطل سے وہ
سب میں شامل، دُور ہر شامل سے وہ

اُس کے ہر سو ہیں دہان و گوش و سر
دست و پا و دیدۂ جلوہ نگر

سب کو دے کر صورت نقش و نگیں
اس جہاں میں آپ ہوتا ہے مکیں

ہے اُسی کے دم سے احساسِ حواس
خود ہے لیکن بے حواس و بے قیاس

گو صفاتِ ظاہری سے دور ہے
لیک اُسی میں یہ جہاں مستور ہے

جملہ مخلوقات پر فائق ہے وہ
حمد کے، توصیف کے لائق ہے وہ

وہ اگر چہ ہے سراسر بے صفات
ہر صفت میں پُر ہے لیکن اُس کی ذات

سب کے اندر سب کے باہر ہے وہی
سب سے بہتر سب سے برتر ہے وہی

ڈاکٹر ساجد صدیقی کا تعلق مالیگاؤں مہاراشٹر سے ہے۔ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کر کے اسے قران کریم کی روشنی میں تقابلی مطالعہ کے ساتھ یہ بات واضع کی ہے کہ مسلمانوں کی مقدس ترین آسمانی کتاب قران اور بھگوت گیتا کی تعلیمات میں حد درجہ مماثلت ہے اور ان میں گیتا کے اٹھارویں ادھیاے میں بیان کردہ یہی جاودانی فلسفہ درج ہے کہ "تمام خداؤں کی عبادت کو چھوڑ کر ایک خدا کی

پناہ میں آجاؤ۔ بہت سارے خداؤں کو چھوڑتے وقت غم نہ کرو۔ میں تم کو تمام گناہوں سے آزاد کردوں گا''اسی لیے مترجم نے اس تصنیف کو''خدا کا بیان'' کہا ہے۔

مولانا محفوظ الرحمان شاہین جمالی چترویدی نے اپنی تقریظ میں مہابھارت اور بھگوت گیتا کے تذکرہ میں حقیقت اور فسانہ کی توضیح اس طرح کی ہے کہ''شریمد بھگوت گیتا دراصل دنیا کی جنگی کہانیوں میں ناقابل یقیناً مبالغہ آمیز واقعات وعجائبات پر مشتمل مہابھارت کا ایک حصہ ہے مگر دونوں کے مضامین میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مثلاً مہابھارت کی جنگ میں مرنے والوں کی تعداد ایک ارب چھیاسی کروڑ بتائی گئی ہے۔ قابل غور بات ہے کہ موجودہ ہندوستان کثرتِ آبادی کے باوجود اب تک ایک ارب چھیاسی کروڑ کی تعداد کو نہیں چھو سکا ہے تو آج سے لگ بھگ سوا پانچ ہزار سال پہلے (شری کرشن جی کی پیدائش 28 رجولائی 3338 قبل مسیح اور وفات 3102 قبل مسیح کے مطابق) سرزمین ہند میں نہیں بلکہ اس کے صرف ایک چھوٹے سے علاقے کوروکھشیتر میں اتنا بڑا فوجی اجتماع کسی حساب سے ممکن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

''اس کے برعکس شریمد بھگوت گیتا حقائق ومعارف سے لبریز، خدا کی وحدتِ ذات وعظمتِ صفات اور اس کی عبادت ومعرفت اور خدمتِ خلق اور انسان کے صالح کردار اور اقدارِ حیات کے گہرے فلسفے اور شعورِ بندگی اور فرائضِ زندگی کے بیش بہا نکات پر مشتمل خزینۂ معرفت ہے''۔

مولانا نے گیتا کے اردو تراجم کی تعداد 67 بتائی ہے۔ البتہ ان میں سے انھوں نے صرف دو تراجم یعنی سیماب اکبرآبادی کے شاگرد الم مظفر نگری اور چودھری روشن لال، سابق کمشنر پنجاب، ہی کے ترجمے کا ذکر کیا ہے۔

بامحاورہ سنسکرت میں لکھی گئی گیتا کا اردو نظم میں کامیابی کے ساتھ ترجمہ کرنا نہایت کارے دارد والا معاملہ ہے۔ ہمارے خیال میں ابھی تک صرف نظر سوہانوی نے اس کام میں کامیابی پائی ہے۔ اسی تکلیف دہ دشت نوردی میں آبلہ پا ہونے سے بچنے کی خاطر ساجد صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سعی کو نثر ہی کی راہ اختیار کرکے روبہ عمل لایا جائے جسے انھوں نے بطریق احسن انجام دیا ہے۔ ترجمہ کا

یہ اقتباس خوبصورت نثر پر ساجد صاحب کی دسترس کی دلالت کرتا ہے:

''خدا جو مخلوق سے بالکل الگ ہے، وہ نہ ہی کسی کے نیک کاموں کا اور نہ ہی گناہ کے کاموں کا حساب لینے کا ذمہ وار ہے۔ جہالت کی وجہ سے انسان ایسا کہتا ہے کیونکہ بلاشبہ انسان کے غرور اور لالچ نے اُس کے علم پر پردہ ڈال کر اُسے چھپا دیا ہے۔

''لیکن وہ تمام انسان جن کے علم کو جہالت نے برباد کر دیا ہے، یہ حقیقی علم، اُس سب سے اعلیٰ خدا کو اُن پر سورج کی طرح روشن کر دیتا ہے۔

''جن لوگوں نے علم کے ذریعے اس ایک خدا سے اپنے شعور کو جوڑ رکھا ہے۔ اپنے آپ کو اس خدا کے سپرد کر دیا ہے، اس ایک خدا پر پختہ ایمان قایم کر رکھا ہے، صرف اُس کی پناہ لے لی ہے، ایسے لوگ اس جنت کے مقام میں جائیں گے جہاں جا کر دوبارہ کوئی بھی واپس نہیں آتا اور جہاں جا کر انسان تمام تکالیف اور خوف وغم سے پاک ہو جاتا ہے''۔

ساجد صدیقی نے یہ ترجمہ، جو 178 صفحات پر محیط ہے، خود ہی شائع کر کے انسانیت کی خدمت کی ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مترجم نے قران پاک کے ارشادات اور بھگوت گیتا کی تعلیمات کا ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کر کے یہ بات ایک بار پھر باور کی ہے کہ دراصل سبھی الہامی اور آسمانی صحائف انسان کو ایک ہی نوع کا درس حیات دیتے ہیں اور فلسفۂ زندگی کو واضع کرنے میں ان میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ مختلف مذاہب کے آسمانی یا الہامی صحائف کے بارے میں ان سے متعلق فرقے اپنے عقیدتی نظریہ کے لحاظ سے مختلف تاویلات پیش کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اس سلسلے میں کئی مقامات پر اختلافی تصورات بھی سامنے آجاتے ہیں لیکن جہاں تک انسانی اقدار، نیک خیالات اور ہمدردی کے جذبات کا تعلق ہے وہاں قران یا گیتا میں اختلافات کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ شری کرشن کی ہمہ جہت ذات کے گونا گوں پہلوؤں کی توضیح اس طرح سے بھی ہوتی ہے کہ روایت کے مطابق اُس کے ایک سو آٹھ نام ہیں جو اُس کی شخصیت کی اُن صفات کی نشان دہی کرتے ہیں جن کی رو سے وہ حق وصداقت کا مجسمہ اور بے لاگ عملِ پیہم کا علمبردار ہیں۔ ان اسماء میں اننت، اجے، بال

گوپال، دیالو، دوارکاس پتی، جگدیش، مدن، مادھو، مدھوسودن، من موہن، میور، مرلی، نارائن، نرنجن وغیرہ شامل ہیں۔

پنڈت دینا ناتھ مدن المتخلص بہ معجز دہلوی نے بھگوت گیتا کا اردو ترجمہ پہلی بار 1912ء میں شائع کیا۔ اس کا چوتھا ایڈیشن جو 1921ء میں اشاعت پذیر ہوا، وہی میرے پاس ہے۔ جو ''مخزن اسرار'' کے نام سے ان کے برادر پنڈت امرناتھ مدن نے پنجاب سے منظر عام پر لایا۔ کہا جاتا ہے کہ مدن کے والد پنڈت جانکی ناتھ مدن نے بھی نثر میں گیتا کا اردو میں ترجمہ جو میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ دینا ناتھ مدن کو چونکہ سنسکرت، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں پر خاصی دست رس حاصل تھی لہٰذا انھوں نے اس صحیفہ کی توضیح کے سلسلے میں کئی فارسی اساتذہ کے چیدہ چیدہ اور بامعنی اشعار بھی شامل کئے ہیں۔ مثلاً:

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را نہ دہند

پنڈت دینا ناتھ مدن نے گیتا اور دیگر آسمانی صحائف کے فلسفے کا اس فاضلانہ انداز میں تجزیہ کیا ہے: ''یہ صورت طلسم جو دیدۂ سیر بین میں سمائی ہے اور جو مختلف صدائے ہو ہا گوش شنوائی میں آئی ہے، یہ کیا شعبدہ ہے، اور کس کا ہے اور کیونکر ہوا ہے؟۔ عارف اور عاشقِ حقیقی جو اس عالم کی روحِ خاص ہیں۔ اس حجاب ظلماتی کی پردہ دری کا سبب ہوئے ہیں اور اس دائرہ جہل و نادانی میں اون کا وجود مطلق علم سرور کا نقطہ ہوا ہے جس قدر کلام صغیر و کبیر مختلف مذاہب کے اس وقت گفت و شنود اور علم میں ہیں، اسی نقطہ کا شہود ہیں اور اسی سے نقاط خطوط اور زاویہ کل صفحہ ہستی پر منقش ہو رہے ہیں۔ پس علم عارفان علم ذات ہے اور اون کا کلام کلامِ حق جو کلام عارفوں کے ہیں وہی وید متبرک، او پنشد سمرتی، قران، انجیل، توریت اور زبور کہلائے ہیں اور کلام حق ان ہی کے وسیلے سے عالم میں ظاہر ہوا ہے''۔

مدن صاحب کے ترجمہ کا یہ دل نشین نمونہ پیش ہے:

دیکھ کر کوروؤں کو اپنے سامنے صف میں کھڑا
ہاتھ میں لے کر کمان جب کشت وخون ہونے لگا
کرشن سے اے مہربان اُس وقت ارجُن نے کہا
وسط میں فوجوں کو میرے رتھ کو ٹھہرادو ذرا
تا کہ مجھ کو بھی خبر ہو کون ہیں وہ سورما
معرکے میں آج ہوگا جن سے میرا سامنا
میں بھی اُن زورآوروں کو اک نظر سے دیکھ لوں
جن کو دریودھن کی حشمت پر سمایا ہے جنوں
مجھ کو تو خواہش نہیں سامان فتح و عیش کی
ہیچ ہیں میری نظر میں مال و جاہِ زندگی
سلطنت کے ٹھاٹھ جن کے واسطے درکار تھے
وہ کھڑے ہیں ہاتھ دھو کر اپنی مال و جان سے
نیک اعمالی میں جس کنبے کو آتا ہے فتور
لوگ کہتے ہیں کہ وہ دوزخ میں جاتا ہے ضرور
ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے شعاع ذو الجلال
غیر ممکن ہے کسی تدبیر سے اُس کا زوال

مدن صاحب نے اپنے فلسفیانہ نظریات کو بھی گیتا کے ترجمے میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کر کے اس صحیفے کے ساتھ مدرجہ ذیل فارسی اشعار کو بھی برمحل طریقے سے جگہ جگہ درج کیا ہے:

مخصوص صفا بہ سر تراشیدن نیست
تسلیم و رضا بہ خرقہ پوشیدن نیست
رمزے است کہ از فیض سیر گردد
ایں دولت نایاب بہ کوشیدن نیست

لکشمی چند نسیم نور محلی (1912-1967) کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ ابوالفصاحت جوش ملسیانی کے شاگردِ رشید تھے۔ وہ پنجاب کے ایک برگزیدہ کھتری خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اپنی امارت اور زمینداری کی بدولت سارے علاقے میں مشہور تھے۔ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ایران گئے جہاں انھوں نے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق صرف ونحو میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ انہوں نے شاعری بھی اردو اور فارسی میں کی۔

بھگوت گیتا کا ان کا کیا ہوا منظوم اردو ترجمہ ایک اہم کارنامہ ہے جس میں انھوں نے فصیح اور بامحاورہ زبان میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا یہ ترجمہ 1973ء میں شائع ہوا۔ نسیم صاحب کے ترجمۂ گیتا پر اساتذۂ اردو جوش ملسیانی، نوح ناروی، ابراحسنی گنوری اور قیس جالندھری نے اپنی قیمتی آرائ سے نوازا ہے۔ جوش صاحب لکھتے ہیں۔ ''میرے عزیز شری لکشمی چند نسیم نور محلی نے حال ہی میں گیتا کا منظوم اردو ترجمہ تصنیف کیا ہے اور اس کا تاریخی نام ''فضیلت الٰہی'' رکھا ہے۔ گیتا جیسے مشہور روحانی فلسفے کے منظوم ترجمے اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ تین ترجمے تو میری نظر سے بھی گزرے ہیں۔ مگر جہاں تک زبان کی صفائی اور بیان کی وضاحت کا تعلق ہے، یہ ترجمہ اُن سب سے بہتر ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسی مختصر بحر میں ایسے وسیع مفہوم کو صرف دو شعروں میں اتنی صفائی، اتنی سادگی اور اتنی سلاست سے کس طرح بیان کیا ہے۔ یہ کامیابی اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ شاعر نے اپنی فنی چابک دستی اور قادر الکلامی پر اپنے آپ کو بہت ہی تحسین و آفرین کا مستحق ثابت کر دیا ہے اور اس ہفت خوانِ سخن کو بڑی کامیابی سے طے کیا ہے''۔

نوح ناروی کا خیال ہے کہ ''نسیم صاحب جیسی خوبی اور کسی ترجمے میں نظر نہیں آئی۔''

قیس جالندھری کی رائے میں ''اردو زبان کے اس دور میں یہ سلیس انداز بیان قابل رشک ہے''۔

نسیم صاحب کے اس ترجمے سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

جو نہیں ہے وہ ہو نہیں سکتا
اور جو ہے وہ کھو نہیں سکتا

جس نے کل کائنات پیدا کی

بے شک اُس کی ہے ذات لافانی

کوئی اُس کو مٹا نہیں سکتا

موت کی زد میں لا نہیں سکتا

روح ہے لا زوال، لا محدود

اس کے دم سے ہے کل جہاں کی نمود

نہ کبھی روح آپ مرتی ہے

نہ کسی کو یہ قتل کرتی ہے

آرزو کی مراد میں نہ الجھ

رنج و راحت کی یاد میں نہ الجھ

عزیز اللہ شیرانی نے بھگوت گیتا کے جن قدیم اور نایاب تراجم کا کیا ہے ان میں 1893ء میں پچھی نراین ٹونکی کا کیا ہوا منظوم ترجمہ مخطوطے کی شکلیں موجود ہے۔ کیول کشن فرح کا ترجمہ بعنوان 'جلوہ عالم نما' جو 1911ء میں جے پور سے شائع ہوا۔ تیسرا ترجمہ 'گنجینہ معرفت' شنکر دیال نگار کا کیا ہوا ہے جو 1915ء میں کانپور سے اشاعت پذیر ہوا۔ منثور تراجم میں مسودے کی شکل میں حکیم جگن ناتھ پرساد کا میں 1951ء کیا ہوا ترجمہ موجود ہے۔ ایک اور نثری ترجمہ گوپی ناتھ غمگین نے 1943 میں کیا۔ یہ بھی غیر مطبوعہ اور نایاب ہے۔ راجستھان کے گنگا سہائے نے بھی نثر میں گیتا کو اردو میں ڈھالا (6)۔

شیرانی کے پیش کردہ منشی پنالال بھارگو کے ترجمے سے یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

عجب ہی سفر ہے یہ سنسار ارجُن

ذرا دیکھ تو اس کا بستار ارجُن

ورق ہائے دید اس شجر کے ہیں پتے

سمجھتے ہو وہ کس شجر کے ہیں پتے

حقیقت جو اس بھید کی جانتے ہیں
حقیقت وہی وید کی جانتے ہیں

سنبھالی کمان ارجنِ خوش سیرؔ نے
تو باندھی کمر اپنی فتح و ظفر نے

کہا یہ شری کرشن سے اُس نے دیکھو
چلو بیچ میں لے چلو میرے رتھ کو

میں دیکھوں کہ ہے کون میرا مقابل
سمجھتا ہے اپنے کو ایسا قابل

ہیں آئے ہوئے کون کون اس کے یاور
ہیں وہ کیسے جری اور دلاور

شری کرشن مہاراج نے رتھ کو ہانکا
دکھایا وہیں آکے نقشہ وہاں کا

کہا ہے ادھر تو یہ سینا تمہاری
ادھر کوروؤں کی جماعت ہے بھاری

زبردست ان میں تو بھیشم ہے سب سے
زبردست ڈرتے ہیں جس کے غضب سے

درونا کو دیکھو سب کے گرو ہیں
تنو مند استادِ فن جنگ جو ہیں

نہ میں ان پہ حربہ نہ حملہ کروں گا
یہ ہتھیار بھی ہاتھ سے ڈال دوں گا

یہ کہہ کر وہیں با دلِ غم رسیدہ
بہت مضطر و ششدر و آب دیدہ

وہ جا بیٹھا گوشے میں رتھ کے نرالا
دھنش ہاتھ سے اپنے ارجُن نے ڈالا

جو دیکھی یہ حالت شری کرشن جی نے
لگے کہنے اچھے نہیں یہ قرینے

تم ارجن ذرا دل میں سوچو بچارو
نہ ہو ایسے مایوس ہمت ہارو

نہیں بزدلی ایسے موقعے پہ شایاں
دکھاؤ کوئی اپنا کارِ نمایاں

دلیرانہ مردانہ میداں میں آؤ
شجاعت کے ہمت کے جوہر دکھاؤ

بھارگو کا ترجمہ ان تراجم میں شامل کیے جانے کا استحقاق رکھتا ہے جنھیں ہم اچھے ترجمے کہہ سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مترجم کو اردو پر خاصی دست رس حاصل ہے اور انھوں نے اسی لسانی قابلیت کے سہارے جگہ جگہ برمحل استعاروں، محاورات اور تراکیب کا صحیح استعمال کیا ہے۔

پریم ناتھ شاستری کا 346 صفحات پر محیط یہ ترجمہ کسی بھی طرح اردو زبان سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر چہ اسے نستعلیق رسم خط ہی میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں استعمال شدہ زبان کو ہندی بلکہ

شدھ سنسکرت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی ادبی کوشش کو بہر حال قارئین کو گمراہ کرنے سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس ترجمے سے مثالیں دینا بے کار کی بات ہوگی البتہ قارئین کو بھی کم از کم اس بات کا علم ہو کہ ترجمے میں کس قبیل کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ پہلے شاستری کی اردو نثر کا یہ نمونہ دیکھئے:

''بھگوت گیتا کی سینکڑوں ٹیکائیں اتھوا ترجمہ ہونے پر بھی یہ بھگوت گیتا اس لیے پرکاشت کی گئی ہے کہ کئی پاٹھک ایسے بھی ہیں جو سنسکرت اتھوا دیوناگری لپی کا گیان نہیں رکھتے ہیں۔ جنہیں صرف اردو کی مہارت ہے۔ وہ بھی گیتا کا پاٹھ کر سکیں۔ چونکہ سنسکرت کی نسبت اردو میں ماترائیں کم ہیں اس لئے سنسکرت شلوک اردو میں صحیح روپ میں نہیں لکھے جاسکتے ہیں۔ اردو شلوک صحیح روپ میں پڑھے جاسکیں اس لئے ہم نے سنسکرت شلوک پد چھید کر کے لکھے ہیں۔ کہیں کہیں پد چھید نے کے لیے ویا کرن کی مریادا سے بھی باہر جانا پڑتا ہے تا کہ اردو صحیح روپ میں لکھا جا سکے۔ اس لیے گیتا کا پاٹھ کرنے کے پشچات اوش پڑھیں''۔

اوراب اس بے اثر ترجمے سے یہ اقتباسات دیکھیں:

''اس اوناشی، اپرمی یہ، نتیہ سروپ، جیوآتما کے یہ سبھی شریر ناشوان کہے گئے ہیں۔ اس لئے ہے بھرت ونشی ارجن! تو یدھ کر!

ان ان بھن کاماؤں کے کارن جن کا گیان نشٹ ہو چکا ہے اور جو اپنے سوبھاو کے ادھین ہو چکے ہیں، ایسے اگیانی لوگ بھن بھن ودھی نیموں کے مطابق دوسرے دیوتاؤں کے شرن جاتے ہیں۔

میں شستروں میں وجر اور گیوؤں میں کام دھینو ہوں۔ شاستروں میں کہی ہوئی ریتی سے سنتان اتپن کرنے والا کام دیو ہوں اور سرپوں میں سرپ راج واسوکی ہوں''۔

بھگوت گیتا کے اس ترجمے کے ساتھ نہ تو ناشر ہی کا پتہ درج ہے اور نہ ہی اس کی تاریخ اشاعت کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک گمنام ناشر نے یہ ترجمہ کیوں چھاپا اور اگر چھاپا بھی تو اس کا کیا مقصد تھا؟

اس ترجمے کو قاری کسی بھی زبان سے تعبیر تو کر سکتا ہے لیکن اسے بہر صورت اردو زبان کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر کیول کرشن ریشی کا ترجمہ سارے کا سارا دیوناگری خط میں لکھا گیا ہے اور قاری کو لبھانے کی غرض سے اسے اردو کا ایک فصیح نام یعنی ''شمع حقیقت'' دیا گیا ہے۔ مترجم نے اولین صفحے پر دعویٰ کیا ہے کہ یہ گیتا کا منظوم اردو ترجمہ ہے جو حقیقت کے عین منافی ہے۔ 2003ء میں شائع ہونے والی تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب کسی بھی صورت میں اردو ترجمہ کہلائے جانے کی درخور نہیں کیونکہ ترجمہ بھی سنسکرت اور ہندی کے نا قابل فہم الفاظ سے بھرا پڑا ہے اگرچہ اردو کا ترجمہ اردو زبان کے جان کاروں کی خاطر ہی کیا جاتا ہے۔

یہ چند ٹیڑھے میڈھے اشعار سنئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ ریشی کا نام نہاد ترجمہ کیا اردو کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے؟:

کہ بن تیرے یہ لا محدود جلوہ
کسی نے کبھی پہلے نہ دیکھا

سبھی جلوؤں میں جلوہ آپ کا ہے
ہر اک جانب سے ہے میرا نمسکار

ملے گی وہ جہاں کی تجھ کو شاہی
میں پاؤں دیوتاؤں کا بھی رتبہ

سروانند کول پریمی (1990-1924) ایک نیک خصلت کشمیری شاعر اور ادیب تھے۔ پریمی نے بھی بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جس میں انھوں نے دیگر ترجمہ کاروں کے برعکس گیتا کے فلسفے اور اس کے پس منظر میں مہابھارت کی مرکزی کہانی سے استفادہ کرنے کے ساتھ کئی اختلافات کو بھی دلائل کے ساتھ واضع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پریمی نے گیتا کے علاوہ رامائن، ٹیگور کی گیتانجلی، ٹیگور ہی کی کہانیوں اور روسی لوک کتھاؤں کے کشمیری اور اردو تراجم کے ساتھ ساتھ کئی کشمیری شاعروں پر مختصر کتابچے بھی قلم بند کئے ہیں۔ انھوں نے ایک مبسوط اور جامع پیش

نامے میں ہندو دھرم کے عقائد اور فلسفوں کی بھرپور انداز میں وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس اس ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مجھے خوشی ہے کہ ایسی سلیس، شائستہ اور سادہ زبان میں گیتا کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ہر سطح کے لوگوں کے لئے مفید ہے۔ گیتا کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ عظیم صحیفہ کسی ایک مذہب کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔ ہاں! میں یہ عرض کروں کی گیتا کے فلسفے نے ہندوستانی مسلمانوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جتنے منظوم اور اور منثور ترجمے اردو میں گیتا کے ہوئے ہیں کسی اور زبان میں نہیں ہوئے''۔(7)

البتہ رام پرکاش راہی نے اپنی اختلافی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس ترجمہ کا یہ تجزیہ کیا ہے:

''نثری تحریریں ایک برجستہ اسلوب کی حامل ہیں، معلومات کے منظر نامے ہیں اور اپنی دلچسپ پیرائیگی کی بدولت قاری کو اس شعری اظہار کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ جو منظوم ترجمے کی صورت میں مصنف کا نصب العین رہا ہے، منظوم ترجمے کی اس خوبی سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ گیتا گیان کی معنویت کو مکمل حالت میں پیش کیا گیا ہے لیکن شعری فصاحت اور فنی لوازمات کے کچھ ایسے ناگزیر سے پہلو ہیں جن کے ساتھ شاعر پورا انصاف کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ کتابت کے سہو در آئے ہوں لیکن اشعار کا مجموعی رنگ و آہنگ زیادہ موثر نہیں ہے''۔(8)

سروانند کول پریمی کے ترجمۂ گیتا سے یہ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

جو کوئی پیدا ہوا مرنا اسے ہے مان لے
جو مرا جینا اسے پھر ہے یہ ارجن جان لے
راز پوشیدہ ہے سارا اس کا اک یہ کھیل ہے
پھر نہیں جائز ہے یہ غم یہ برا ہی فعل ہے
ہیں جو گیانی عقل ان کی قائم رہتی ہے سدا
ہیں نہیں گیانی جو ان کی عقل مرتی ہے سدا
رات دن بس عیش و عشرت میں لگے رہتے ہیں جو
عقل گم ہوتی ہے ان کی حق سے ہیں محروم وہ

کرم کر اے نیک ہر دم یہ تیرا ادھیکار ہے
پھل کی خواہش چھوڑ دے تو تیرا بیڑا پار ہے

رام پرکاش راہی نے جو تنقیدی جملے پریمی کے ترجمے پر کہے ہیں ان سے بہت حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے کیونکہ پریمی کے ترجمے میں بحر اور وزن کا پورا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ایسے بے شمار اشعار ہم نے یہاں پر نقل نہیں کیے ہیں اور ترجمہ لاتعداد ٹھیٹھ سنسکرت اور ہندی لفظوں سے بھرا پڑا ہے جن کے متبادل میعاری الفاظ اردو میں آسانی سے موجود ہیں۔

صلو چودھری نے گیتا کا بہت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں چودھری نے غالباً پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ علامہ اقبال بھی گیتا کا ترجمہ کرنے کی خواہش رکھتے تھے: ''اردو زبان میں سب سے پہلے ترجمہ سترہویں صدی میں سید متین نامی ایک شخص نے کیا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترانۂ ہندی 'سارے جہاں سے اچھا' کے خالق ڈاکٹر سر محمد اقبال نے فیضی کے ہاتھوں ہوئے 'بھگوت گیتا' کے فارسی ترجمے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس تعلق سے اقبال نے 11 اکتوبر 1921 کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے ایک خط میں صاف طور پر لکھا ہے کہ: ''اگر وقت نے اجازت دی تو میں نے گیتا کا اردو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے فیضی کے ذریعے کیا ہوا گیتا کا فارسی ترجمہ دیکھا ہوگا۔ کوئی شخص ان کی تحریر کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا لیکن میرا خیال ہے کہ انھوں نے گیتا کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے متن اور طرز نگارش کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ فیضی گیتا کی روح کو سمجھ نہیں پائے''۔(9)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال بھی شری کرشن کو قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ''اسرار خودی'' کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں: ''بنی نوع انسان کی تاریخ میں شری کرشن کا نام ہمیشہ ادب واحترام سے لیا جائے گا۔ اس عظیم شخصیت نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں پیغام عمل دیا ہے جو اقتضائے فطرت ہے اور استحکامِ زندگی کا ضامن''۔

اقبال کے ہم عصر مولانا ظفر علی خان نے بھی ان اشعار میں کرشن جی کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

سری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں
اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں

وہ جور و ظلم کی بنیاد ڈھانے آیا تھا
میں اس کی رسم کو دنیا میں عام کرتا ہوں

ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے صلو چودھری کے ترجمے کے حوالے سے اپنی رائے یوں دی ہے:

"بھگوت گیتا کے اردو تراجم کے تعلق سے عرصہ دراز سے ایک ایسے ترجمے کا انتظار تھا جو بہت عام فہم اور بہت آسان زبان میں ہوتا کہ کم سے کم درجے کا پڑھا لکھا اور ادنیٰ سمجھ رکھنے والا انسان بھی گیتا کے پیغامات کو سمجھ سکے۔

"محترم صلاح الدین چودھری نے، جنھیں صلو چودھری کے نام سے جانا جاتا ہے، بھگوت گیتا کا ترجمہ آسان ترین اور روزمرہ کی زبان میں کر دیا ہے۔ یہ کارنامہ بلا شبہ قابل قدر بھی ہے اور لائق رشک بھی"۔(10)

چودھری نے اپنے ترجمے کے لیے ایک چھوٹی بحر کا انتخاب کر کے جس عام فہم اسلوب میں اسے اردو نظم میں پیش کیا ہے اس نے واقعی اس کاوش کو کئی دوسرے اردو تراجم کے مقابلے میں ایک انفرادیت اور فنی برتری بخشی ہے۔ بھگوت گیتا کے بے شمار اردو ترجم میں اسے واقعی بہتر اور پر اثر قرار دیا جا سکتا ہے۔ نمونے کی خاطر چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں تا کہ چودھری کی فن شناسی کا اندازہ ہو سکے:

وہ قطرہ سمندر ہی کہلائے گا
سمندر میں شامل جو ہو جائے گا
سب آشائیں ہو جائیں گم سینے میں
تو حاصل اسے ہو خوشی جینے میں

☆

اجالوں سے بڑھ کر اجالا ہے وہ
وہی سب سے اتم نرالا ہے وہ
دکھاتا ہے بھگتی کا جو راستہ
وہ ہے گیان داتا وہ پرماتما

☆

نہ ہے اُس میں آشا نراشا نہ آس
مگر خوبیاں ساری ہیں اس کے پاس
کسی سے نہ ناتا مگر سب کا وہ
نہیں ایسا گُن جو کہ اس میں نہ ہو

☆

ہے من میرا کمزور دل نرم ہے
بتائیں مجھے کیا میرا دھرم ہے
میں چیلا ہوں مجھ پر دیا کیجئے
بھلائی کا رستہ مجھے دکھا دیجئے

وہ ہے سب میں موجود سب سے جدا
کسی میں چھپا ہے کسی میں کھلا
وہ پیارا ہے ایسا نہ سمجھے کوئی
وہی پاس ہے دور بھی ہے وہی

حوالہ جات:

(1) شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ، شیخ امین الدین پرنٹر و پبلشر، لاہور۔

(2) شریمد بھگوت گیتا، خلیفہ عبدالحکیم، ہریانہ اردو اکیڈیمی، چندی گڑھ، 1995ء، ص 12-11

(3) نسیم عرفان، آدرش کتاب گھر، دہلی، 1955ء۔ص 5

(4) حسن الدین احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1975ء ص 10

(5) دل محمد، ص 52

(6) ہماری زبان، نئی دہلی، 8 نومبر 2015

(7) انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے 26 نومبر 1993 کو مرحوم پریمی کے صاحبزادے راجندر پریمی کے نام تحریر کردہ مکتوب۔

(8) ہفتہ روزہ، ہماری زبان، نئی دہلی، اکتوبر 1994

(9) بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ، ملینیم آفس، 67 تھیٹر روڈ، کلکتہ، 2013ء، ص 14

(10) ایضاً، ص 16

جوشؔ اور حفیظؔ کی شاعری میں کشمیریات

اردو زبان کے متقدمین سے لے کر آج تک کے ہم عصر شعراء نے وقتاً فوقتاً کشمیر کی تعریف و توصیف میں قصیدہ خوانی کی ہے۔ گزشتہ صدی کے اوائل میں برصغیر کے جو سخن ور کشمیر کے مدح خواں بنے اُن میں علامہ اقبالؔ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نواب جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی، چودھری خوشی محمد ناظرؔ، فانی بدایونی، محمد دین فوقؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظؔ جالندھری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بعد میں عاشقانِ کشمیر کے اِس قافلے میں ساغرؔ نظامی، مخدومؔ محی الدین، علی سردارؔ جعفری، شاہدؔ عزیزؔ، روشؔ صدیقی، شاذؔ تمکنت، راہی معصوم رضاؔ، وامقؔ جونپوری اور شمیمؔ کرہانی بھی شامل ہوگئے۔ روشؔ صدیقی نے تو سرزمینِ کشمیر پر نازل شدہ حسنِ فطرت کی شکل میں فیضانِ الٰہی کی ثناخوانی میں ایک پورا شعری مجموعہ ''خیاباں خیاباں'' تخلیق کیا۔

ان شاعروں نے یا تو بذاتِ خود کشمیر آکر یا اُس کے بے پناہ حسن کی رنگارنگیوں کا بیان سن کر اس کی تعریف میں کچھ نہ کچھ لکھا۔ اس طرح حافظؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور چکبستؔ بھی ذکرِ کشمیر سے دامن نہ چھڑا سکے اور بشمول عرفیؔ لاتعداد غیر کشمیری فارسی شعرأ نے بھی اس وادیٔ گلفام کی مدح سرائی کی۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب سارے ہندوستان میں تحریکِ آزادی کا ڈنکا بج رہا تھا کشمیر میں بھی ایک ایسی ہی تحریک کا باضابطہ آغاز 13 جولائی 1931 کو دو درجن کے قریب کشمیری شہداء نے اپنا خون بہا کر کیا تھا۔ اسی خون سے سرزمینِ کشمیر جبر اور استبداد کے خلاف مبارزت کے

جذبے سے سرشار ہو کر لالہ زار بن گئی۔

اُس وقت برصغیر کے دو اہم اُردو شعراء کشمیریوں کی جدوجہد کی تائید میں کھڑے ہو گئے اور اس طرح علامہ اقبالؔ کے بعد جوشؔ ملیح آبادی اور حفیظؔ جالندھری اہلِ کشمیر کی جدوجہد کے ہمدرد بن گئے۔ اِس دوران یہ دونوں عظیم المرتبت سخن گو کشمیر بھی آئے اور یہاں آکر کشمیر کی وہ تصویر اپنے قلم کے کینواس پر اُتاری جو انسانی ہزیمت، بیچارگی، پسماندگی اور اجتماعی بے کسی کی عکاس بن گئی۔

یہ جذبہ اُس وقت اور بھی اُجاگر ہوا جب جوشؔ اور حفیظؔ دونوں نے مختلف اوقات پر تحریک کے روحِ رواں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو اپنا منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

حُسنِ اتفاق ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی (1894-1982ء) اور حفیظؔ جالندھری (1900-1982ء) نے جو کچھ کشمیر کے حوالے سے اپنے شعری فن پاروں کی شکل میں تخلیق کیا اُس میں شیخ محمد عبداللہ کے لئے اُن کے منظوم قصائد کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ دونوں شیخ صاحب کے شیدائی تھے اور وہ بھی اُن کے قدردانوں میں شامل تھے۔

اس ضمن میں جہاں جوشؔ نے شیخ محمد عبداللہ پر لکھی ہوئی ایک ہی لافانی نظم سے شیخ کو بھی ایک طرح کی جاودانی حیثیت عطا کرلی وہاں حفیظؔ بار بار عبداللہ کی تعریفوں میں نظموں پر نظمیں لکھ کر اپنے صریرِ خامہ سے مدھر اور دل نشین آوازیں اُبھارتے رہے۔

جوشؔ اور حفیظؔ کی اس قبیل کی منظومات میں مقابلتاً حفیظؔ کا کلام اکثر و بیشتر بے اثر اور فنی نزاکتوں کی حامل شاعری سے زیادہ نعرہ بازی ہی کی مثال پیش کرتا ہے، البتہ اُن کی ''تصویرِ کشمیر'' اور ''خون کے چراغ'' اہلِ کشمیر کو حفیظؔ کا بہترین نذرانہ ہیں۔

کشمیر کے حوالے سے جوشؔ ملیح آبادی کی چار نظمیں اور شیخ صاحب پر اُن کی نظم دستِ بردِ زمانہ سے محفوظ رہ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے ایک دو قطعات بھی اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ان نظموں میں ''شیخ عبداللہ''، ''اے جوانانِ کشمیر''، ''اے جنت کشمیر''، ''فضائے کاشمر'' اور

''مناظر سحر'' جیسے نایاب فن پاروں کو محفوظ کرنے کی غرض سے یہاں من وعن نقل کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ کشمیر کے پسِ منظر میں جوشؔ کے صرف یہ دو قطعات ہم تک پہنچ سکے ہیں:

ممنوعہ شجر سے لطفِ پیہم لینے
نیساں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو پھر کاشمر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

.....☆.....

سنو اے بستگانِ زلف گیتی
ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اِک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

چونکہ قطعۂ ثانی 1946ء کی ''کشمیر چھوڑو تحریک'' کے دوران لکھا گیا لہٰذا غالب امکان یہی ہے کہ یہ قطعہ بھی کشمیر ہی کے حوالے سے تخلیق کیا گیا ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔

شیخ محمد عبداللہ پر جوشؔ نے اپنی نظم سری نگر میں ایک مشاعرے میں پڑھی۔

جوشؔ کو شیخ صاحب سے زبردست عقیدت تھی اور کشمیری عوام میں اُن کی بے مثال مقبولیت کو دیکھ کر اس جذبۂ احترام میں اور اضافہ ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے جوشؔ نے دیکھا کہ شیخ صاحب سامعین میں خواتین کے ایک مجمع کے قریب بیٹھے ہیں تو انہوں نے شیخ کو آواز دی ''قبلہ! اب زنانے سے ذرا مردانے میں تو تشریف لائیے'' اور اُس کے بعد جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی گھن گرج والی آواز اور دلوں کو دہلانے والے پٹھانی لہجے میں شیخ محمد عبداللہ کے نام تحت اللفظ یہ سدا بہار نظم سنائی:

کشورِ ہند میں بحمد اللہ
میں ہوں جوشؔ ایک رندِ نامہ سیاہ
لعل و الماس سے دمکتی ہے
فقر کے باوجود میری کلاہ
میرے آگے وہ بحر ہے پایاب
نہیں ملتی خضر کو جس کی تھاہ
سرکشی کے طفیل وہ لا ہوں
نہیں بڑھتا جو سوئے لا الہ
طرح دارانِ شہر کا خادم
تاجدارانِ دہر کا بدخواہ
کام ہے شیخ سے نہ پنڈت سے
دیر ہی پر ہے نے حرم پہ نگاہ
رند ہوں رند نبھ نہیں سکتی
شیخ صاحب سے میری رسم و راہ
اُن کی محفل میں ہے چراغِ ثواب
میری محفل میں آفتابِ گناہ
اُن کی لوحِ جبیں پہ داغِ سجود
میرے آئینے میں تجلیٔ ماہ
ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا
جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ

جس کی ہر اِک روش ہے حسب مراد

جس کا ہر اِک اصول ہے دل خواہ

تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس

تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ

ہے وہ اس تیرہ دورِ باطل میں

حق نگہ، حق شناس، حق آگاہ

نام اس شیخ کا بتاؤں تمہیں

دلِ رنداں میں بھی ہے جس کی چاہ

چارہ گر رہنما غریب نواز

شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ

صرف اِسی شیخ سے محبت ہے

ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ!

جوشؔ ملیح آبادی شخصی راج کی غلامی کے خلاف لاکھوں اہلِ کشمیر کی جدوجہد کی حدت وحرارت محسوس کر چکے تھے اور اس مفلوک الحال اور ظلم و جبر کی چکی میں پسی ہوئی درماندہ قوم کو بیدار کرنے کی خاطر انہوں نے جو نظمیں تحریر کیں انہیں پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ شیرِ کوہستان شیرِ کشمیر کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے کشمیر میں اپنی لہراتی ہوئی بلند آواز کو اور بلند کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس کشمیر آپہنچا ہے۔

''اے جوانانِ کشمیر''، ''جنت کشمیر''، مناظرِ سحر'' اور فضائے کاشمر'' کو یہاں پر اُن کے مکمل متن کے ساتھ درج کیا جاتا ہے تا کہ کل کے تحقیق کاروں اور جوشیاتؔ کے طالب علموں کو اُن کے حُبِ کشمیر کے حوالے سے اپنی تحقیقات کو ایک دستاویزی صورت بخشنے میں آسانی میسر ہو سکے:

کشورِ ہند میں بحمد اللہ

میں ہوں جوشؔ ایک رندِ نامہ سیاہ

لعل و الماس سے دمکتی ہے

فقر کے باوجود میری کلاہ

میرے آگے وہ بحر ہے پایاب

نہیں ملتی خضر کو جس کی تھاہ

سرکشی کے طفیل وہ لا ہوں

نہیں بڑھتا جو سوئے لا الہ

طرح دارانِ شہر کا خادم

تاجدارانِ دہر کا بدخواہ

کام ہے شیخ سے نہ پنڈت سے

دیر ہی پر ہے نے حرم پہ نگاہ

رند ہوں رند نبھ نہیں سکتی

شیخ صاحب سے میری رسم و راہ

اُن کی محفل میں ہے چراغِ ثواب

میری محفل میں آفتابِ گناہ

اُن کی لوحِ جبیں پہ داغِ سجود

میرے آئینے میں تجلیٔ ماہ

ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا

جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ

جس کی ہر اِک روش ہے حسب مراد

جس کا ہر اِک اصول ہے دل خواہ

تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس

تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ

ہے وہ اس تیرہ دورِ باطل میں

حق نگہ، حق شناس، حق آگاہ

نام اس شیخ کا بتاؤں تمہیں

دلِ رنداں میں بھی ہے جس کی چاہ

چارہ گر رہنما غریب نواز

شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ

صرف اِسی شیخ سے محبت ہے

ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ!

جوشؔ ملیح آبادی شخصی راج کی غلامی کے خلاف لاکھوں اہلِ کشمیر کی جدوجہد کی حدت وحرارت محسوس کر چکے تھے اور اس مفلوک الحال اور ظلم وجبر کی چکی میں پسی ہوئی درماندہ قوم کو بیدار کرنے کی خاطر انہوں نے جو نظمیں تحریر کیں انہیں پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ شیرِ کوہستان شیرِ کشمیر کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے کشمیر میں اپنی لہراتی ہوئی بلند آواز کو اور بلند کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس کشمیر آپہنچا ہے۔

''اے جوانانِ کشمیر''، ''جنت کشمیر''، ''مناظرِ سحر'' اور ''فضائے کاشمر'' کو یہاں پر اُن کے مکمل متن کے ساتھ درج کیا جاتا ہے تاکہ کل کے تحقیق کاروں اور جوشیاتؔ کے طالب علموں کو اُن کے حُبِ کشمیر کے حوالے سے اپنی تحقیقات کو ایک دستاویزی صورت بخشنے میں آسانی میسر ہو سکے:

اے جوانانِ کشمیر

اے جنتِ کشمیر کے بیدار جوانو
اے ہمتِ مردانہ کے ذی روح نشانو
سو بات کی یہ بات ہے اس بات کو مانو
جینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو

بے غرق ہوئے کوئی اُبھرتا ہی نہیں ہے
جو قوم پہ مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں ہے

بے ذوقِ وفا کوئی تہمتن نہیں بنتا
بے سلسلۂ برق نشیمن نہیں بنتا
سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا
جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا

جنگل میں جو لذت کش پیکاں نہیں ہوتا
وہ شیر کبھی شیرِ نیستان نہیں ہوتا

سوتے ہوئے دھارے کبھی طوفاں نہیں بنتے
جو قید نہ ہوں یوسفِ کنعاں نہیں بنتے
مرتے جو نہیں عیسیٔ دوراں نہیں بنتے
جو موت سے ڈرتے ہیں وہ انساں نہیں بنتے

بے سوزِ نم اشک فشانی نہیں ملتا
بے آگ میں کودے ہوئے پانی نہیں ملتا

کمزور کو آسودگیٔ دل نہیں ملتی
جب تک نہ جلے، شمع کو محفل نہیں ملتی
کانٹوں سے جسے لذت کامل نہیں ملتی
اس رہروِ نااہل کو منزل نہیں ملتی

گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اُس شخص کا ساحل پہ سفینہ نہیں آتا

جب تک کہ ہر اِک ذرّہ پُر افشاں نہیں ہوتا
اِک پھول بھی گلزار میں خنداں نہیں ہوتا
گلشن میں کبھی رقصِ بہاراں نہیں ہوتا
جب تک کہ ہواؤں پہ گریباں نہیں ہوتا

جب تک دلِ یوسف پہ گرانی نہیں آتی
رخسارِ زلیخا پہ جوانی نہیں آتی

ہوتا ہے تلاطم کا اب آغاز جوانو
سیلاب میں در آؤ بصد ناز جوانو
یہ موج یہ گرداب ہے جانباز جوانو
دو وقت کی آواز پر آواز جوانو

دنیا میں کسی خوف کے قائل نہیں ہوتے
جو شیر کے بچے ہیں وہ بزدل نہیں ہوتے

طوفان کو ٹھکراؤ ہواؤں کو بدل دو
دریاؤں کو روندو تو پہاڑوں کو کچل دو
مردانہ بڑھو موت کو پیغامِ اجل دو
پھولوں کی تمنّا ہے تو کانٹوں کو مسل دو

تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پر تبسم نہیں آتا

سینوں کو چلو عرصۂ ہمت میں اُبھاریں
ہاں آؤ طمانچہ رخِ سیلاب پہ ماریں
شیروں کی طرح آؤ کچھاروں میں ڈکاریں
پلتی ہیں سدا خون کے دھاروں میں بہاریں

عزت کو خرابات قرینے نہیں دیتی
دنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی

اے جنت کشمیر

عالم تیری برنائی گل رنگ کا شیدا
کونین کے دل میں ترے جلوے کی تمنا
آفاق کے شانے پر تیری زلفِ گرہ گیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

ہاں تجھ کو جلانے کی تمنا میں مریں گے
چلتی ہوئی تلوار سے ہم قطع کریں گے
پہنائیں تو اغیار ترے پاؤں میں زنجیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

منڈلائیں گے شاہیں جو تری پاک فضا پر
اغیار نیاموں سے نکالیں گے جو خنجر
ہم جنگ کے میدان میں چمکائیں گے شمشیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

ظلمات کو رنگ اپنا جمانے نہیں دیں گے
اُس خاک پہ ہم رات کو چھانے نہیں دیں گے
جس خاک کا ہر ذرّہ ہے خورشید کی تصویر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

تو کیف کا میخانہ صبوحی کا علم ہے
تو ناز کا بت خانہ تبسم کا حرم ہے
تو کوثر و تسنیم کے ہر خواب کی تعبیر
اے جنت کشمیر، اے جنت کشمیر

مناظرِ سحر

کیا روح فزا جلوۂ رخسارِ سحر ہے
کشمیر دل نواز ہے فردوسِ نظر ہے
ہر پھول کا چہرہ عرقِ حسن سے تر ہے
ہر چیز میں اک بات ہے ہر شئے میں اثر ہے

ہر سمت بھڑکتا ہے رخِ حور کا شعلہ
ہر ذرۂ ناچیز میں ہے طور کا شعلہ

لرزش وہ ستاروں کی وہ ذرّوں کا تبسم
چشموں کا وہ بہنا کہ فدا جن پر ترنم
گردوں پہ سیاہی و سپیدی کا تصادم
طوفان وہ جلوؤں کا وہ نغموں کا تلاطم

اُڑتے ہوئے گیسو وہ نسیمِ سحری کے
شانوں پہ پریشان ہیں یا بال پری کے

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا
وہ چاندنی مدہم وہ سمندر کا جھلکنا
وہ چھاؤں میں تاروں کے گل تر کا مہکنا
وہ جھومنا سبزے کا وہ کھیتوں کا لہکنا

شاخوں سے ملی جاتی ہے شاخیں وہ اثر ہے
کہتی ہے نسیمِ سحری ''عیدِ سحر ہے''

خنکی وہ بیاباں کی وہ رنگینیٔ صحرا
وہ وادیٔ سرسبز وہ تالابِ مصفا
پیشانیٔ گردوں پہ وہ ہنستا ہوا تارا
وہ راستے جنگل کے وہ بہتا ہوا دریا

ہر سمت گلستاں میں وہ انبار گلوں کے
شبنم سے وہ دھوئے ہوئے رخسار گلوں کے

وہ روح میں انوارِ خدا صبح وہ صادق
وہ حسن جسے دیکھ کر ہر آنکھ ہو عاشق
وہ سادگی انسان کی فطرت کے مطابق
زرّیں وہ اُفق نور سے لبریز وہ مشرق

وہ نغمۂ داؤد پرندوں کی صدا میں
پیراہنِ یوسف کی وہ تاثیر ہوا میں

وہ برگِ گل تازہ وہ شبنم کی لطافت
اِک حسن سے وہ خندۂ سامان حقیقت
وہ جلوۂ اصنام وہ بت خانے کی زینت
زاہد کا وہ منظر وہ برہمن کی صباحت

ناقوس کے سینے میں صدائیں وہ فغاں کی
وہ حمد میں ڈوبی ہوئی آواز اذاں کی

آقا کا غلاموں سے یہ ہے قرب کا ہنگام
دل ہوتے ہیں سرشار فنا ہوتے ہیں آلام

چھا جاتی ہے رحمت تو برس پڑتے ہیں انعام
اس وقت کسی طرح مناسب نہیں آرام

رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے
اے روح خودی چھوڑ کہ نزدیک خدا ہے[2]

کشمیر کی حسین وادیوں کی رطب اللسان تعریف و توصیف میں قلم بند کی گئی جوشؔ کی یہ ایک اور نظم ''فضائے کاشمر'' اب ایک نایاب شعری فن پارے کی حیثیت رکھتی ہے:

زہے فضائے کاشمر، بہشت حُسنِ جاوداں
ترانہ ریز و مئے چکاں، شگوفہ بار و گل فشاں
ہر ایک سنگ اِک صنم ہر ایک خار اِک جناں
ہر ایک پیچ ہے دھنک، ہر ایک جادہ کہکشاں
زمین پہ سرخ بادلے، فلک پہ موجِ پرنیاں
وفورِ آب و رنگ میں، ہجومِ برگ و بار میں
فضائے لالہ کار میں، ہوائے کوہ سار میں
تموجِ سرور میں، تلاطمِ بہار میں
بہشت شاخسار میں، چنار و دیودار میں

طیور مست و پُرفشاں کبھی یہاں کبھی وہاں
نیا تصور طرب ہر اک جواں اُمنگ میں
نواگری سرور میں، قلندری ترنگ میں
مذاقِ غنچہ خشت میں، مزاجِ پنبہ سنگ میں

ہزار مے کدوں کی رو، سبو کے ایک رنگ میں
فضائے شوخ و شنگ میں رواں رواں گلابیاں

فضائیں اضطراب میں، گھٹائیں پیچ و تاب میں
سروں کی رو رباب میں کہ مے رگِ شباب میں
کہانیاں حباب میں، جوانیاں سحاب میں
شکارِ موج آب میں اور آبِ موج خواب میں
کہ مست جوں شراب میں، فسانہ بار و نغمہ خواں

جوشؔ جب پاکستان چلے گئے تو اُنہیں اُن کے قریبی دوست پنڈت جواہر لال نہرو نے وہاں نہ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن شاعرِ انقلاب کی سیمابی طبیعت کو غالباً ہندوستان کی اُردو دشمن فضا راس نہیں آئی تھی اور وہ سرزمین پاک میں باقی ماندہ زندگی اطمینان سے گزارنے کے لئے وہاں گئے لیکن پاکستان میں بھی انتہا پسندوں نے اُن کے خلاف طوفانِ بے ہنگم کھڑا کر کے اُنہیں بے حد ملول اور دل آزردہ کر دیا۔

ہندوستان میں کچھ عناصر ایسے بھی تھے جو جوشؔ کے پاکستان چلے جانے پر اپنے اطمینان کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ وہ اُن کی نظروں میں ایک ''رندِ بلانوش ملحد'' تھا دوسری طرف جب وہ پاکستان میں قیام پذیر ہوئے تو وہاں جس طرح سے انہیں پریشان کیا گیا، وہ اس غم ناک حقیقت کی روداد یوں بیان کرتے ہیں: ''میرے پاکستان بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ پورا پاکستان اور شہرِ کراچی تو اس قدر بلبلا اُٹھا گویا صورِ قیامت پھونک دیا گیا ہو۔ تمام چھوٹے بڑے اردو انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک کر میدانِ جنگ میں آ گئے۔ تمام ادباء اور شعراء اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں نیام سے نکال کر میرے خلاف مضامین،

قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کردی۔ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ میرے خلاف متحد ہوکر شیر وشکر ہوگئے۔''۔

''میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں۔ غیرت نے اجازت نہیں دی۔ میں نے دل سے پوچھا، خان صاحب! اب کیا ہوگا۔ دل نے کہا ہمت نہ ہار:

اگر خارے بود گلدستہ گردد[۳]

پاکستان میں اگرچہ جوشؔ کو شاعرانِ پاکستان میں شامل کرکے اُن کے نام سے سرکاری سطح پر پانچ روپے کا ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا گیا لیکن وہ اپنے قیامِ پاکستان کے بارے میں یہی کہتے ہیں:

میں کراچی میں ہوں ایسے جیسے کوُفے میں حسیُن

شیخ محمد عبداللہ کی یہ رائے بھی صحیح ثابت ہوئی کہ جوشؔ نے پاکستان میں جو زندگی گزاری اُس میں صرف بدمزگی تھی[۴] وہ اس خیال کا اظہار اپنی سوانح حیات میں ان الفاظ میں کرتے ہیں'' قبلۂ رنداں جوشؔ ملیح آبادی بھی میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ اُن کا پٹھانوں کا طنطنہ اور شاعرانہ جلال اُنہیں خاصے کی شخصیت بنا دیتا ہے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزادؔ اُن کے قدردانوں میں سے تھے۔ وہ مئے گلفام کے بڑے رسیا ہیں۔ چونکہ میں کبھی اس شے کی طرف رغبت پیدا نہیں کرسکا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنے شاعرانہ انداز میں مجھے چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ انہوں نے میرے بارے میں نظم لکھی۔ اس نظم میں چھیڑخوانی کا یہ انداز موجود ہے۔ بعد میں جوشؔ صاحب اپنے کچھ دوستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پاکستان چلے گئے۔ اُن کے جانے سے اُن کے دوستوں کو صدمہ تو ہوا لیکن خود جوشؔ بھی کبھی مزے میں نہ رہے''[۵]

اِس چھوٹی سی بات کو حسن اتفاق ہی تو کہا جاسکتا ہے کہ جوشؔ اور شیخ عبداللہ کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے۔ جوش 5 دسمبر 1898ء کو اس عالمِ ہست وبود میں آئے اور شیخ صاحب کا یومِ پیدائش بھی 5 دسمبر ہی ہے۔ جوشؔ عمر میں شیخ عبداللہ سے سات سال بڑے تھے۔

کشمیر کے ساتھ حفیظ جالندھری کے والہانہ عشق اور اہلِ کشمیر کے ساتھ اپنی یکجہتی کے مسلسل اظہار کے بارے میں سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں ''اُن کی شاعری میں کشمیر حسنِ بیان کا کوئی سہارا یا استعارہ نہیں ہے بلکہ ایک مستقل موضوع ہے۔ فکر وخیال کا ایک مسلسل دھارا ہے جس میں حقیقت اور کشمیر سے ذاتی محبت خاص طور پر جھلکتی ہے جو نغمہ اور آنسو بن کر شعر کے پیکر میں ڈھل گئی ہے۔''

میں سمجھتا ہوں حفیظ کو اپنے فن میں نفاستِ زیبا اور فکر کی مخصوص چھاپ کشمیر ہی نے بخشی ہے۔ شاعر کے ذاتی پس منظر کے طور پر یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ حفیظ بائیس برس کے تھے کہ پہلی بار بانہال کے راستے سے پا پیادہ ہی وادیٔ کشمیر کی سیاحت کو گئے۔ پھر اُس کے بعد 1946ء تک وہ تقریباً ہر سال باقاعدگی سے وہاں جاتے رہے اور اس طویل مدت میں اس کے دور دراز گوشوں تک گھوم آئے۔ اسی زمانے میں کشمیریوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف تحریک حریت کا علم بلند کیا تھا۔ اس تحریک کے قائدین سے حفیظ کے ذاتی مراسم تھے۔ چنانچہ حفیظ جب بھی کشمیر پہنچے تو مشاعروں اور ملی جلسوں میں اپنی شعلہ نوائی کے ذریعے گویا عملاً جدوجہد کشمیر میں شامل ہوتے رہے۔ حفیظ جب تک کشمیر نہیں آئے تھے محض غزل کے شاعر تھے۔ کشمیر دیکھا تو انہوں نے 1932 میں اپنی زندگی کی پہلی نظم لکھی جس کا عنوان تھا ''چشمۂ ویری ناگ پر ایک آنسو'' جو اُس وقت کے مقبول رسالہ ''شباب اردو'' لاہور میں شائع ہو کر زبانِ زدِ خاص وعام ہوگئی۔ افسوس کہ یہ نظم جو مسلمانانِ کشمیر کی ناداری ومحکومی کی منہ بولتی تصویر ہے ''شباب اردو'' کے اوراق کے ساتھ نایاب ہو چکی ہے۔

چونکہ حفیظ غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف بھی مائل ہو کر دلسوز گیتوں، رنگین نغموں اور حسین ترانوں کی اس طرزِ خاص کے موجد ومؤسس بن گئے جس کی سادگی اور پُرکاری، نغمگی اور شیرینی اُردو شاعری کا ایک عہد آفرین باب ہے۔

میں تو ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ حفیظ اگر کشمیر نہ گئے ہوتے تو تعجب نہیں کہ اردو شاعری حسن و نغمگی کے ان موتیوں سے کسی حد تک اور کب تک محروم رہتی جو آج حفیظ کی تخلیقات میں جا بہ جا

جھلملاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کشمیر سے حفیظؔ کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ غزل میں بھی کشمیر کو نہیں بھولتے:

کشمیر ہے وہ جلوہ مگر اس کی راہ میں
فرقت کی وادیاں ہیں، پہاڑ انتظار کے
کشمیر میں حفیظؔ دل جلے کی یادگار
ڈھیری ہے ایک راکھ کی نیچے چنار کے[6]

1846ء کے رسوائے زمانہ بیع نامہ امرتسر کے خلاف بھی حفیظؔ جالندھری نے اپنی صدائے احتجاج بلند کی۔ اُن کا بھی یہی خیال تھا کہ انگریزوں اور ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے جس غیر انسانی اور غیر اخلاقی طریقے پر کشمیری قوم اور ملکِ کشمیر کی خرید وفروخت کا مذموم کام سرانجام دیا تھا وہ تاریخ کی دنیا میں ایک ایسے کٹھن اور جان لیوا سفر کا آغاز تھا جس کے ہر گام پر کشمیریوں کے لہو کی چھینٹیں تڑپ تڑپ کر بزبانِ حال اپنی داستانِ کلفت بیان کر رہی تھیں۔

حفیظؔ کی نظم کا لہجہ طنزیہ ہے اور اپنے زورِ کلام کی بدولت انہوں نے انگریزوں کی مکّاری اور گلاب سنگھ کی ملک گیری کی اس سازش کو بے نقاب کیا ہے۔ ابھی تک اس طویل نظم کو طبع شدہ صورت میں نہیں دیکھا گیا ہے۔ گمانِ اغلب یہی ہے کہ یہ نظم انہوں نے پاکستان کے کسی ریڈیو سے خود نشر کی ہو کیونکہ وہ لحنِ داؤدی کے مالک تھے اور اُن کا ترنم سارے برصغیر میں لاجواب اور بے مثال تھا۔ اس نظم کا صرف یہ بند سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچ سکا ہے:

وادیاں کہسار بھی پھل پھول بھی اور سب اناج
ڈھور، ڈنگر، آدمی اُن سب کی محنت کام کاج
یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد ہیں سب زر خرید
ان کے بچے بچیاں اولاد ہیں سب زرخرید
بک گئے کھیت اور کھلیاں سب پچھتر لاکھ میں
بس پچھتر لاکھ میں ہاں ہاں پچھتر لاکھ میں

فاروق ارگلی، حفیظؔ جالندھری کی ابتدائی زندگی کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں: ''ابوالاثر حفیظؔ کا تعلق مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے ایک معزز چوہان مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔ اُن کے اجداد نے سترھویں صدی میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ حفیظؔ نے ابتدائی تعلیم جالندھر ہی میں حاصل کی۔ خانگی حالات کی ناموافقت نے اُنہیں تعلیم سے محروم رکھا۔ پنجاب کی سرزمین میں جنم لینے والے اس غیر معمولی بچے کو جس کی مادری زبان پنجابی تھی، گیارہ سال کی عمر میں ہی اردو شاعری کا گہرا شوق ہو چکا تھا۔ زبان وادب سے عشق اس حد تک بڑھا کہ تیرہ سال کا حفیظؔ گھر سے بھاگ کر دہلی پہنچ گیا۔ مقصد تھا اردو زبان سیکھنا اور معیاری لب ولہجہ اختیار کرنا۔ اردو سے حفیظؔ کا عشق اُسے بار بار دہلی لے جاتا۔ دہلی میں کوئی رشتہ دار نہیں تھا اس لئے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آس پاس کسی کھنڈر یا مقبرے میں راتیں گزرتیں۔ شعر گوئی کا شوق پروان چڑھ رہا تھا۔ دہلی کے علمی حلقوں میں جان پہچان بڑھی۔ مولانا محمد علی جوہرؔ، ڈاکٹر مختار انصاری اور بیرسٹر آصف علی جیسی نامور شخصیتوں کی قربت ملی اور مولانا غلام قادر گرامی جیسے کامل اُستاد کی شفقتوں اور توجہ نے ان کی شاعری کو چمکا دیا تھا۔ حفیظؔ کی شاعری اور ان کی نغمگی سے متاثر ہوکر ریاست خیر پور (سندھ) کے والی نے اپنا درباری شاعر مقرر کیا لیکن اُن کی آزاد طبیعت کو درباداری راس نہ آئی اور اس منصب سے جلد ہی گلا خلاصی حاصل کرلی۔ تقسیمِ وطن سے پہلے ہی حفیظؔ لاہور میں مستقلاً قیام پذیر تھے اس لئے انہوں نے پاکستان میں ہی رہنا پسند کیا'' ؎

''تصویرِ کشمیر'' ستمبر 1936ء میں سرینگر کشمیر میں لکھی گئی اور 1938ء میں سرراس مسعود مرحوم کے دیباچے کے ساتھ الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ سرراس مسعودؔ لکھتے ہیں ''حفیظؔ کا دل آئینہ خانہ ہے۔ دنیا کی رنگا رنگی، آوازوں اور صورتوں کے لباس میں اس آئینہ خانے کی سیر کیا کرتی ہے۔ نغمہ بھی، نالہ بھی، زشتِ بھی خوب بھی۔ کبھی مل جل کر کبھی الگ الگ یہاں آتے ہیں، منہ بناتے ہیں، اِس گنبد میں قہقہے بھی لگاتے ہیں اور آہ وبکا بھی کرتے ہیں۔''

''جس طرح حفیظؔ نے کشمیر کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اپنی سیاحت کے دوران خود میں نے بھی

اُسی نظر سے دیکھا اور اسی دل سے محسوس کیا تھا لیکن یہ خیال کہ میں نے بھی اسی نظر سے دیکھا اور محسوس کیا تھا حفیظؔ کی کھینچی ہوئی تصویر کشمیر کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔۸؎ حفیظؔ جالندھری کے بقول ''خون کے چراغ'' 1946ء میں مکمل ہوئی۔

چونکہ ہند میں حفیظؔ پر گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران نہ تو کوئی سنجیدہ تحقیق کی گئی ہے اور نہ ہی اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں، حسن و قبح اور من جملہ اُن کے فن پر کوئی کام سرانجام دیا گیا ہے۔ اس مایوس کن صورتِ حال کے پیش نظر حفیظؔ کے بارے میں چند مقتدر اور معتبر ثقافتی شخصیات اور دانشوران نے اپنے دور میں جو آراء قلم بند کی ہیں اُنہیں یہاں پر اختصار کے ساتھ دوہرانے سے غالباً حفیظؔ اپنے ہندوستانی اہالیانِ فہم و دانش کو اُن پر مزید تحقیق کرنے اور اُنہیں زیر تجزیہ لانے کی ترغیب دے گا۔

حفیظؔ کے بارے میں مولانا عبدالقادر گرامی، پطرس بخاری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور پنڈت ہری چند اختر نے ابوالاثرؔ کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا گرامی نے تو حفیظؔ کی تعریف میں ایک فارسی شعری تخلیق کو شاعر کی نذر کیا جس کی پذیرائی حفیظؔ نے اس طرح کی ہے کہ ''فخرِ ایشیا ملک الشعراء حضرت استاد مکرم مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی (قدس سرہ) نے ذیل کے اشعارِ آبدار اس عاجز کے کلام کے متعلق ارشاد فرما کر ذرّے کو آفتاب بنا دیا تھا۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ ان اشعار کو پڑھتا ہوں اور شرمندہ ہوتا ہوں کہاں گرامی شہنشاہِ قلمِ سخن اور کہاں حفیظؔ گدائے گوشہ نشین اور عامی کج مج زبان۔ لیکن گرامی کی نسبت نے اس کو گرامی کر دیا:

فصاحت مجسم بلاغت مصوّر
کلامِ حفیظؔ است اللہ اکبر
معانی دلآویز و الفاظِ دلکش
کلامِ حفیظؔ است یا سلکِ گوہر
معانی در آغوشِ الفاظ پنہاں
بآب استِ ماہی بہ آتش سمندر

معانی در الفاظ پنہاں و پیدا
بہم کردہ فکرش مگر شیر و شکر

فصیح معظم بلیغِ مکرّم
حفیظ سخن گو حفیظ سخن ور

بہ فہرست معنی است نامش مقدم
بہ بزمِ گرامی کلامش موٴخر

بطرز آفرینی طبعِ بلندش
بود آسماں کارگاہِ محقر

گرامی سحر گفت سالک بگوشم
زبانِ حفیظ است یا موجِ کوثر ۹

سید احمد شاہ بخاری پطرسؔ نے حفیظ کو جالندھر کے نغمہ پرور شہر کا ساحر کہتے ہوئے اُس کی شاعری کے بارے میں کہا ہے "وہ کچھ مدت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے۔ جس کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت و نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگتی ہیں"۔ ۱۰

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حفیظ کی شاعری سے اثر پذیری کے عالم میں گویا سرشار ہو کر اس شاعر کو یوں خراج عقیدت ادا کرتے ہیں "حفیظ کی شاعری امید افزا ابتداء سے تکمیل تک جا پہنچی مگر میرے دل میں جو جگہ "نغمہ زار" کی نظموں کے لئے ہے وہ کسی اور نظم کے لئے نہیں۔ نغمہ زار کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا وہ فن اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے بلند تر اور پختہ تر ہے۔ ادبیات میں اُن کا مقام جاودانی ہے اور اس کا سکہ جواں دلوں پر جما رہے گا"۔ ۱۱

استادِ سخن اُردو پنڈت ہری چند اختر نے بھی اپنے مخصوص اور منفرد اندازِ بیان میں حفیظ کا یوں

تجزیہ کیا ہے ''حفیظ کا فن یہ ہے کہ لفظ دوسرے مصرع پر، مصرع دوسرے مصرع پر اور شعر دوسرے شعر پر اس طرح اضافہ کرتا ہے جس سے دیدۂ دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ اس لطافت و سادگی اور دلآویزی کے ساتھ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گرد و پیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پائیں۔ منظر کشی کا یہ اسلوب قادر الکلامی اور قوت اختراع کا زبردست ثبوت ہے۔ اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ کے اس رنگِ سخن نے فطری شاعری کی دنیا میں ایک بالکل نئے اور انقلاب انگیز باب کا اضافہ کیا ہے''[۱۲]

اختر نے حفیظ کے بارے یہ خیال آرائی شاعر کے مجموعۂ کلام ''سوز و ساز'' کے دیباچہ میں کی ہے جہاں انہوں نے سید امتیاز علی تاج کے اُس اقتباس کو بھی دوہرایا ہے جو تاج نے حفیظ کے ''ہفت پیکر'' عنوان کے ایک اور مجموعہ کے مقدمہ میں شامل ہے۔ ''جو لوگ حضرت حفیظ کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اگر ان سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے اُن کی شاعری سے کم قابلِ قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔ ہمیشہ یونہی ہوتا آیا ہے۔ دنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ ایک وقت میں دو حیثیتوں سے اعترافِ کمال کرنا اس کی بساط سے باہر ہے''[۱۳]۔

آسمانِ اردو ادب کے تابناک ستاروں پطرس بخاری، محمد دین تاثیر، مولانا گرامی، ہری چند اختر اور امتیاز علی تاج کے یہ خیالات جو انہوں نے وقتاً فوقتاً حفیظ جالندھری کے بارے میں ظاہر کئے یہاں پر ایک دستاویزی حیثیت کے حامل ہونے کی شکل میں درج کئے گئے ہیں تاکہ ہندوستان میں حفیظ جیسے قادر الکلام اور سدا بہار شاعر پر تحقیق و تلاش کے گوشے منور کئے جا سکیں۔ یہ اس لئے اور بھی تقاضائے وقت کی صورت اختیار کرتا ہے کہ اس شاعر پر ہند میں جو تحقیقی یا تنقیدی کام ہوا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے اور اُس سے کسی طرح برصغیر کے اس اہم شاعر کی شاعرانہ شخصیت اُبھر کر سامنے نہیں آتی۔

حفیظ کا پہلے مجموعہ کلام ''نغمہ زار'' اور ''سوز و ساز'' 1933ء میں شائع ہوا۔ 1946ء میں اُن کا تیسرا شعری مجموعہ ''تلخابہ شیریں'' منظرِ عام پر آیا۔ اس کے دیباچے میں حفیظ نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے یہ اقتباسات قارئین کی توجہ لازماً اپنی طرف مبذول کریں گے۔ حفیظ کا یہ قلم پارہ بجائے خود ادبِ لطیف کا ایک دلنواز نمونہ ہے جس میں شاعر نے اپنی حساس اور باشعور زندگی کے چند پہلوؤں کی نقاب کشائی کے ساتھ ملکی سیاسیات اور ادبی و ثقافتی دنیا کی روشنیوں اور تاریکیوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ پھر بھی طوالت کے خوف سے اس کے دو برمحل اقتباسات ہی پیش کئے جاتے ہیں۔ حفیظ نے ان خیالات کا آغاز اپنے ذوقِ محبوبی کی اس حدت اور حرارت بھری یاد کے دریچے پھر ایک بار وا کر کے یوں کیا ہے۔ جب میں پہلے پہل تیری طلب میں نکلا تھا، کھیت کیسے سہانے تھے، ان کی مینڈیروں پر سے گنگناتا ہوا میں گزرا، وادیاں اور اُن کا اچھوتا پن، حسن، پھر وہ دامن کہسار۔''

''میرے گھرانے پر موت وارد تھی اور میری جان پر نزولِ غم۔ میرے بھائیوں کو پلیگ، ہیضہ لئے جارہا تھا اور مجھے قافیے اور غزل۔ زندگی میرے سر پر ہر قدم تازہ ذمہ داریوں کا پہاڑ لادتی اور شاعری مجھے ہانکتی تھی:

اے مصور ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بارِ دوشِ بے کسی ، کوہِ گرانِ زندگی

''میں گوشہ نشین نہیں ہوں۔ مجھے اپنے عصر کے سخن وروں سے شرفِ ملاقات کے مواقع، بخت اور اتفاق نے سب سے زیادہ اور بار بار بہم پہنچائے ہیں۔ اکثر نامی ناموروں سے نیاز حاصل رہا ہے اور اُن سے بھی جو نام اور ناموری کے لئے لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے اسی ڈھرے پر چلے جارہے ہیں۔ اسی ایک منزل کی طرف جہاں ایک دوسرے سے نفرت اور ایک دوسرے کا قتل زندگی کا ثبوت ہے۔

اُس طرف سیاستِ وقت کی تلوار زبانِ اردو اور اس میں جو کچھ ہے سب کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اس طرف اسی زبان کے سب سے بڑے دعویدار اور محافظ ایک دوسرے کی گردن مار رہے ہیں۔ یہ ہے

ماحول میرے وقت کی اردو شعر و شاعری کا:

فلک بے مہر عالم دشمن و معشوق بے پروا
مرا بر آرزو ہائے نظیری خندہ می آید[14]

کشمیر پر کہی گئی یہ رزمیہ نظم ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے:

تصویرِ کشمیر

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تفسیر کا
ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا

لطف جب ہے کہہ اُٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چار سو پہرے کھڑے ہیں ساکت و صامت خموش
تاجِ نُوران کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش
ایک ہی قانونِ قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
کچھ نہیں جز خدمتِ کشمیر کہساروں کو ہوش

روکتے ہیں راستہ ہر دشمنِ بے پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بُو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیوداروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

برف کے دیوزاد تودے نور کے آئینہ دار
نقرئی جھیلوں میں صبح و شام عکسِ زرنگار
نغمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوئبار
خندۂ قدرت گُل اندر گُل بہار اندر بہار

کیوں شگفتہ ہو نہ دل اک شاعرِ دلگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ندّیاں ہرسو تھرکتی ناچتی گاتی ہوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہوئی
آدمی کیا پتّھروں کو وجد میں لاتی ہوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصود کو جاتی ہوئی

کرتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیوداروں کے بن
سینۂ ہر سنگِ خارا سے رواں نہر لبن
بوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن

سن لیا تھا نام بیچارے نے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دامنِ سن مرگ سے قائم ہے فطرت کا سُہاگ
حسن کی مُورت امرناتھ آئینہ ہے شیش ناگ
ہائے چشموں کی روانی ، ہائے چرواہوں کے راگ
اک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اک مرے سینے کی آگ

نقشِ حیرت ہوں مجھے یارا نہیں تقریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دل رُبا دوشیزگی ہے چہرۂ لولاب پر
حسن سادہ ہنس رہا ہے عالمِ اسباب پر
کوثر و تسنیم غش ہیں اِس ردائے آب پر
رشک ہے فردوس کو اِس سبزۂ شاداب پر

آب میں مے کا اثر ہے خاک میں اکسیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عاصیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنت چند حوریں اِک چمن دو ندّیاں
خیر زاہد کی رعایت سے میں کہتا ہوں کہ ہاں

عالمِ بالا پہ ہے پَرتو اِسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خوبصورت کھیت بھی ، گلزار بھی ، کہسار بھی
خوبصورت پھول بھی، اشجار بھی، اثمار بھی

خوبصورت ہر بشر مفلس بھی اور زردار بھی

ظاہرِ کشمیر رنگیں بھی ہے اور پُرکار بھی

باطنِ کشمیر لیکن پیٹ ہے انجیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حُسن کی افراط خوبی کی فراوانی یہاں

ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں

بہرِ جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں

بے کس و محتاج لیکن نوع انسانی یہاں

نقش فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

وادی و کُہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی

نخل آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی

اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مُرجھائی ہوئی

راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِک طرف مہمان خوش اوقات، خوش دل، خوش لباس

اِک جانب میزبان فاقہ زدہ تصویرِ یاس

اِک طرف مَے کا نشہ، پھل کا مزہ، پھولوں کی باس

اِک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس

اِک تماشائی ہے، اِک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہائے جہلم کے یہ بجرے، ہائے آنچل کی یہ اوٹ
چادرِ آبِ رواں دونوں طرف رنگین گوٹ
ہائے مانجی کا یہ کنبہ جس کا سرمایہ ہے بوٹ
یہ مشقت، یہ فلاکت لب پہ نغمہ، دل پہ چوٹ
شِیر سے محروم ہے، مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

سطحِ ڈل لرزاں، کنول رقصاں شکارے ہیں رواں
اِن کے اندر کچھ حسیں بھی پیارے پیارے ہیں رواں
لیٹے لیٹے خوابِ راحت کے سہارے ہیں رواں
آسمانِ حسن پر گویا ستارے ہیں رواں
نیم باز آنکھیں مگر ہر سو نشانہ تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشتیوں کی استراحت اور باغوں کی بہار
دن چناروں کی فضائیں شب چراغوں کی بہار
ہے یہ زرداروں کی اور اونچے دماغوں کی بہار
ان کے چاکر دیکھتے ہیں دل کے داغوں کی بہار
ہے دھواں چولہے کا ان کو مشغلہ کفگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جس کی محنت سے چمن میں روئے گُل پر خندہ ہے
اس کا گھر تاریک اس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقشِ صنّاعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
اس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجمعِ اضداد ہیں دیہات بھی اور شہر بھی
موت بھی طاری ہے ان پر زندگی کی لہر بھی
اس زمیں پر آسماں کا لطف بھی ہے، قہر بھی
اپنے بچوں کے لئے یہ شہد بھی ہے زہر بھی
آب و گل کا یہ عجوبہ ہے عجب تخمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ چمن اغیار کی شُعلہ خرامی کے لئے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لئے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لئے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لئے
ہر نفس اِک سلسلہ ہے قید بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حاکم و محکوم کا کوئی نہیں ہے امتیاز
سب نگاہِ نازِ مغرب پر ہیں مجبورِ نیاز

یہ برہمن کے بھجن یہ شیخ صاحب کی نماز
کر رہے ہیں قیدِ نا محسوس کی رسی دراز

ہے نگاہوں سے نہاں صیاد اس نخچیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

☆

خیر ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے
بدگماں ہوتی ہے دنیا اِک ذرا سی بات سے
ہم تو لطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے
ہم کو دل چسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے

لطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشمِ لذت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمۂ شاہی پہ آؤ لے کے اِک بوتل چلیں
شہر کے جھگڑوں سے گاندربل کی جانب ٹل چلیں
آؤ ویریؔ ناگ دیکھیں آؤ اچھا بل چلیں
ہستیِ مزدور کو پیروں کے نیچے مل چلیں

اس کی یہ مسکین صورت دام ہے تزویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں!
کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں!
حسن و صنعت کے لئے مشہور ہیں ہم کیا کریں!
ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں!

ان کی صورت ہے نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے ، کشمیر کی تصویر کا

دیکھ کر باشندۂ کشمیر کو اندوہ گیں
ہنستے ہیں اہل تماشا کوئی ہمدردی نہیں
غیر ملکی زائروں کو ہوگیا ہے یہ یقیں
جنتی ہے مزدور ہی اس باغِ جنت کی زمیں

یہ نتیجہ ہے کسی ناگفتنی تقصیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زائروں کا موسمِ گرما میں رہتا ہے ہجوم
جلوہ گر ہوتے ہیں صحنِ باغ میں مثلِ نجوم
منحصر مزدوریٔ ارزاں پہ ہیں ان کے قدوم
اہلِ دل کم، بیشتر ان میں نظر آتے ہیں شوم

یہ زمیں گوشہ ہے ان کی خانگی جاگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان کے دم سے رونقِ گلمرگ، شانِ پہلگام
لیکن ان دونوں میں ہے بد ذوقیوں کا اژدہام
رات دن آلودہ کرتا ہے انہیں انبوہِ عام
حسن فطرت کا نہیں ان کے دلوں میں احترام

کام ہے تفریح سے جذبہ نہیں توقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اصل میں انسان کا ذوقِ نظر ہے بے بساط

ڈھونڈتا ہے ہر جگہ یہ مردوزن کا اختلاط

آبتاؤں میں تجھے راہِ حصولِ انبساط

"شام در باغِ نسیم و صبح در باغِ نشاط"

دیدۂ و دل کے لئے سامان ہے تطہیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالامار دیکھ

آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ

کچھ نہیں دیکھا ابھی، پھر دیکھ پھر اِک بار دیکھ

شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ

تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فن تعمیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا تجھے معلوم ہے یہ نہر کیوں ہے بے قرار

سر پٹکتے ہیں زمیں پر کس لئے یہ آبشار

سرد کیوں ہیں پا بہ گلِ اور دم بخود ہیں کیوں چنار

سر جھکائے کیوں کھڑے ہیں نخل ہائے باردار

سبزہ کیوں منہ تک رہا ہے آسمانِ پیر کا؟

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کون جانے کس لئے رنگین گل روتے ہیں خوں

اس حسیں بارہ دری پر سوگ سا طاری ہے کیوں

محوِ عبرت کیوں کھڑے ہیں سنگِ موسیٰ کے ستوں
کیوں شکستہ قلب فواروں کو ہے جوشِ جنوں
منتظر ہے باغ کس کے خواب کی تعبیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمِ شاعر کے ہیں آنسو ان کو مٹّی میں نہ رول
بے خبر انمول جوہر کو ترازو سے نہ تول
ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منّہ سے نہ بول
او تماشائی ! تصوّر شرط ہے آنکھیں نہ کھول
چشمِ دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عامیوں سے کوئی کہہ دے بند کردیں کھیل کُود
باغ کو خالی کرے اہلِ نمائش کا وجود
ہوگئی ہے رات سو جائے کہیں بزمِ نمود
ہونے والا ہے یہاں اب پاک روحوں کا وُرُود
پیش خیمہ آگیا اِک بزمِ خلوت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اک سہانی چاندنی رات اور شالامار باغ
دیکھ روشن ہوگیا ہر ایک لالے کا چراغ
خود بخود پُر کرلئے رنگین پھولوں نے ایاغ
عرش پر جانے لگا پامال سبزے کا دماغ

رنگ و بو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطرب آئے، نے نواز آئے، مزامیر آگئے
نغمۂ خاموش کی بن بن کے تصویر آگئے
دفعتاً بیرونِ در کچھ اہلِ شمشیر آگئے
اندرونِ در شہنشاہ جہانگیر آگئے
ساتھ اک پُرنور حلقہ عدل کی زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کا در پھر کھلا بادِ بہاری آگئی
اِک ردائے سبز بہرِ پردہ داری آگئی
صد نقاب اوڑھے ہوئے پرہیزگاری آگئی
لیجئے نورِ جہاں کی بھی سواری آگئی
گردِ جھرمٹ عقل کا تہذیب کا تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

غنچہ و گل میں مثالِ بو ہوئے دونوں نہاں
باغ میں داخل ہوا شاہِ جہاں صاحبقراں
سخت گیر و داد گستر قہرمان و مہرباں
ہمرکاب اقبالِ شاہی شان و شوکت ہم عناں
میرِ ساماں ساتھ اور سامان بھی تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

محوِ سیر باغ ہے یہ مرکزِ توقیر بھی

اب چمن میں گونج اُٹھا اِک نعرۂ تکبیر بھی

غل ہوا وہ آئے شاہنشاہ عالمگیر بھی

فقر کے قبضے میں تخت و بخت بھی تسخیر بھی

سامنے قرآن ، قبضہ ہاتھ میں شمشیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہے عُجب دھندلی ضیا، اُجلا اندھیرا باغ میں

ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں

ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں

بانیانِ باغ کا اُترا ہے ڈیرا باغ میں

خوف ہے تعزیر کا ان کو نہ دارو گیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تونے دیکھا اے تصوّر کیا ہے اب پھولوں کا رنگ

آبشاروں کا یہ نغمہ نہر کا یہ جلترنگ

ڈل کے اندر نُقرئی لہروں کی پریاں محوِ جنگ

چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی امنگ

بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چاند ڈل میں ڈوبنے کو ہے سحر ہونے کو ہے

روز کا ہنگامہ پھر پیشِ نظر ہونے کو ہے

ہائے یہ منظر بھی اب زیر و زبر ہونے کو ہے
سوئے بالا پاک روحوں کا سفر ہونے کو ہے
اِذن دے اے ہم نشیں اک نالۂ شبگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کے در پر بسر راتیں کیا کرتا ہوں میں
نذرِ خاموشی مناجاتیں کیا کرتا ہوں میں
ماضیِ کشمیر سے باتیں کیا کرتا ہوں میں
بادشاہوں سے ملاقاتیں کیا کرتا ہوں میں
پوچھتا رہتا ہوں مقصد اُن سے اس تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہنس کے فرماتے ہیں وہ اے شاعرِ رنگیں بیاں
تو نے دیکھے شوکتِ انسانِ فانی کے نشاں
دیکھنے والا اگر ہو زندگی کا رازداں
وہ بھی کرسکتا ہے یونہی حسنِ فطرت کو عیاں
ہے یہ اِک ادنیٰ نمونہ قوّت و تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھنے والے مگر اس بات کو سمجھے نہیں
حوصلے والوں کی نفسیات کو سمجھے نہیں
اِن سبق آموز تعمیرات کو سمجھے نہیں
اور کیا سمجھیں گے اپنی ذات کو سمجھے نہیں

توڑ کر ہمت کھلونا بن گئے تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زندگانی چار دن کی زندگانی ہی سہی
شوکتِ مغلیّہ اب قصّہ کہانی ہی سہی
اِک سبق دیتی ہیں تعمیریں پرانی ہی سہی
نقش قائم ہے ہمارا، نقشِ فانی ہی سہی

راز تو کھلتا ہے اس سے عالمِ تغییر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا مجالِ دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
شاہدِ عادل ہے تاریخ اُن کے احسانات پر
جو نظر تھی قصر و ایوانات پر، باغات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر

پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیٔ تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا بے کار و زِشت
رائیگاں ہوتی رہی دہقان کی زرخیز کِشت
رنگ ونغمہ، ساغر ومُل، سبزہ وگل، سنگ وخشت
خواب کے عالم کو اہلِ مقدرت سمجھے بہشت

خواب دیکھا، منہ نہ دیکھا، خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ زر کشمیریوں کے حال پر ہنستا ہے آج
نام ہے ان کا فریبی حیلہ گر روباہ مزاج
بے دلی، بے اعتمادی، مفلسی اور احتیاج
بندگی صدہا برس کی اور مسلسل سامراج
کس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ حشمت کی یہ قبریں، یہ شکستہ کاخ و کُو
زنگ خوردہ اسلحہ، ٹوٹے ہوئے جام و سبُو
ہڈیاں مزدور کی ہیں اور کسانوں کا لہُو
جس کھنڈر کو دیکھ کر اے دوست افسردہ ہے تُو
یہ خرابہ ہے خدا کی بہتریں تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عشرتِ ماضی کی ہے خمیازہ کش دنیائے حال
عیش چند افراد کا لایا جماعت پر وبال
ہائے یہ مغموم مائیں زیست کے غم سے نڈھال
ہائے یہ مدقوق بچے، ہائے روٹی کا سوال
ہائے کترا کر نکلنا ان سے ہر رہگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہم وطن ہی جب نہ اپنے ہم وطن کے کام آئے
سر پہ ہمسایے کے ہمسایہ ہی جب طوفاں اُٹھائے

کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ہائے ہائے
یہ مناظر دیکھتا جا اور نہ کر اظہارِ رائے

ورنہ فتویٰ ایک دن لگ جائے گا تکفیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

1953ء میں وزارتِ عظمیٰ سے برخاست کر کے شیخ عبداللہ کو پسِ زنداں ڈال دیا گیا۔ اپریل 1964ء میں وہ دوسری بار قید و بند سے رہا ہو کر نکلے تو حفیظ نے اس موقعے پر اپنے اس محبوب کشمیری رہنما کی خدمت میں سلام پیش کیا جس سے یہ منتخب اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں:

شیرِ کشمیر اے مجاہد مردِ فردِ بے نظیر
تو ہے پھر آزاد گیارہ سال تک رہ کر اسیر
شیخ عبداللہ شیدا کملی والے ہی کا ہے
اس اندھیری رات میں طالب اُجالے ہی کا ہے
شیر بھی شیدائی ہے اللہ کے محبوب کا
حق نے بخشا ہے اُسے بھی علم زشت و خوب کا
امتحان رکھے گئے ہیں جن کی راہوں کے لئے
جلوے خود بیتاب ہیں اُن کی نگاہوں کے لئے
میں حفیظ بے نوا ادنیٰ غلامِ مصطفےٰ
آج پھر تجھ سے مخاطب ہوں بنامِ مصطفےٰ
تیری میری دوستی اسلام کا انعام ہے
راہِ حق میں کام آئیں یہ ہمارا کام ہے
شیر میں نے تجھ کو دیکھا برسرِ پیکار و کار
تو نے کردیں وادیاں بیدار، جاگے کوہسار

کاش تیرے ساتھ ہوتا قید میں کشمیر میں
رنگ بھرتا اور بھی کشمیر کی تصویر میں
اپنی آنکھوں دیکھتا میں ٹوٹنا زنجیر کا
یہ نیا پہلو ہے اب کشمیر کی تصویر کا
شیخ عبداللہ تو مومن ہے شیدائے رسولؐ
کر سلامِ شاعرِ اسلام دوری میں قبول ۱۵

اپریل ہی کے مہینے میں یہ خبر آئی کہ شیخ محمد عبداللہ نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند جواہر لال نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد پنڈت جی کی ایماء پر پاکستان جا رہے ہیں جہاں وہ ہندو پاک کے مابین کئی حل طلب مسائل خاص طور کشمیر کے مسئلہ پر بھی صدر ایوب خان کے ساتھ بات کریں گے۔ اس موقعے پر بھی حفیظؔ شیخ صاحب کی محبت کا برملا اظہار کرنے سے نہیں چوکے اور اُن کی ایک استقبالیہ نظم عبداللہ کے وارد پاکستان ہونے سے پہلے ہی مظفر آباد ریڈیو سے کئی دنوں تک حفیظؔ کے خوبصورت مترنم لہجے میں نشر ہوتی رہی۔ اس نظم کا صرف مطلع ہی ذہن میں محفوظ رہ سکا ہے:

شیر کشمیر اس طرف پایانِ کار آنے کو ہے
مدتوں تھا سب کو جس کا انتظار آنے کو ہے

5 دسمبر 1964ء کو جب شیخ عبداللہ انسٹھ برس کے ہو گئے تو حفیظؔ نے اس سالگرہ پر بھی یہ نظم قلم بند کی جو ''کلیم اللہ کے پیرو'' کے عنوان سے اُسی شام مظفر آباد ریڈیو سے پڑھ کر سنائی گئی۔ اس کے اشعار یوں ہیں:

تیری عمرِ رواں کا ہر نفس وقف عبادت ہے
مبارک ہو کہ اُنسٹھواں تیرا جشنِ ولادت ہے
شبِ کشمیر میں ہے صبحِ روشن تیری پیشانی
یہ پیشانی کہ ہیں کہسار و وادی جس سے نورانی

یہ نورانی تبسم جس میں پیدا دل کی تابانی
یہ تابانی ہویدا جس سے ہے تائیدِ ربانی
یہی تائیدِ ربانی رہائی کا سہارا ہے
یہی کشمیریوں کے جان و دل میں جلوہ آرا ہے
محمدؐ کی محبت نے کیا ایسا قوی تجھ کو
کلیم اللہ کی بخشی خدا نے پیروی تجھ کو
تجھے میں یاد کرتا ہوں تو کیا کیا یاد آتا ہے
تصور میں مجھے گزرا زمانہ یاد آتا ہے
اُدھر تیرے جلو میں سیلِ آدم یاد آتا ہے
اُدھر تو قید میں رہنے سے بھی آزاد آتا ہے
کچھاروں میں سے اکثر شیر کی آواز سنتا ہوں
جدائی مجھ کو رلواتی ہے رو کر سر بھی دھنتا ہوں
وہ تیری قرأتِ قرآں وہ حضرت بل کی تقریریں
رجز خوانی تیری! عزمِ مصمم کی وہ تدبیریں
وہ رزم و بزم میں تیری ہی رنگا رنگ تصویریں
مسلسل جادہ پیمائی، رفاقت کی وہ زنجیریں
وہ زنجیریں مجھے باندھے ہوئے ہیں میرے یار اب تک
اِسی باعث مرا کشمیریوں میں ہے شمار اب تک
وطن کے شیر! اُس جانب سے میری ہم نوائی کر
مرا کشمیر مجھ کو پھر دکھا دے رہنمائی کر!

چھتہ بل سے مرے ڈونگے کو لے کر نا خدائی کر
شکارے میں میرے اشعار کی نغمہ سرائی کر
تری عمرِ رواں کا ہر نفس وقفِ عبادت ہے
مبارک ہو کہ اُنسٹھواں ترا جشنِ ولادت ہے [۱۶]

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے عقیدت کی بنا پر ''شاہنامہٗ اسلام'' تحریر کیا جس کی وجہ سے اُسے شاعرِ اسلام کا لقب بھی دیا گیا۔

حفیظ جالندھری کی کشمیر نوازی اور اہلِ کشمیر کی پائمالی کے ساتھ اُن کی فکری یک جہتی کے عالم میں جنون کی حد تک والہانہ پن تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے بار بار الگ الگ مواقع کے پسِ منظر میں مختلف موضوعاتی منظومات سے کیا ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے وطن کے لئے قومی ترانہ ''شاد باد منزلِ مراد'' تخلیق کیا وہاں POK کو بھی ایک ترانے سے نوازا جس میں انہوں نے وادیٔ کشمیر کو باغوں اور بہاروں والی، دریاؤں اور کہساروں والی اور جنت کے نظاروں والی سرزمین سے مشابہت دی ہے۔ یہ گیت ہر محبِّ وطن کشمیری کا نغمہٗ دل ہو سکتا ہے۔

حفیظ جالندھری کے کلام میں سے اگرچہ ہندوستان میں ''شاہنامہٗ اسلام'' کی غیر قانونی طور پر نقل شدہ جلدیں کہیں کہیں دستیاب ہیں البتہ انہوں نے 1942ء میں خود اپنی زبانی اپنی مطبوعات کا ذکر کیا ہے جن میں تصویرِ کشمیر نام کی تخلیق بھی شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں ''تصانیف میں نظموں اور گیتوں کے دو مجموعے ''نغمہ زار'' اور ''سوز و ساز'' طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''تلخابہٗ شیریں'' زیرِ طبع ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ ''شاہنامہٗ اسلام'' تین جلدوں میں چھپ کر شہرت و دوام حاصل کر چکی ہے۔ اس میں سات ہزار اشعار ہیں۔ کچھ نظمیں ''تصویرِ کشمیر'' وغیرہ الگ الگ کتابی شکل میں بھی نکل چکی ہیں۔ بچوں کے لئے ''بہار کے پھول''، ''پھول مالا'' اور ''ہندوستان ہمارا''، ''حفیظ کے گیت'' اور دیگر نظمیں چار حصوں میں طبع ہو چکی ہیں [۱۷] اور یہ مطبوعات ہندوستان میں تقریباً ناپید ہی ہیں۔

اخیر پر جوشؔ، حفیظؔ اور عبداللہ جیسے تین عاشقان اور محبان یک دیگرے کے بارے میں یہ واقعہ ضرور دوہرانا ہوگا کہ جہاں شیخ محمد عبداللہ اور جوشؔ ایک ہی تاریخ یعنی 5 دسمبر کو پیدا ہوئے وہاں یہ بات بھی حُسنِ اتفاق سے کم نہیں کہ یہ تینوں کے تینوں ایک ہی سال یعنی 1982ء میں خدا کو پیارے ہوگئے۔ یہ شعر ان تینوں شخصیات پر آج بھی فرداً فرداً صادق آتا ہے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

............☆☆☆............

حوالہ جات

۱۔ حیرت ہے کہ کشمیر پر جوشؔ کی تحریر کردہ نظمیں ماسوائے ''مناظر سحر'' اور شیخ عبداللہ پر اُن کی نظم ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کی مرتب کردہ ''کلیات جوشؔ ملیح آبادی'' میں کہیں نظر نہیں آتیں (خیالؔ)

۲۔ کلیات جوشؔ ملیح آبادی۔ مرتبہ عصمت ملیح آبادی۔ فرید بک ڈپو دہلی 2007۔ ص 62

۳۔ یادوں کی بارات، آئینہ ادب لکھنو، 1973۔ ص 220-219

۴۔ خیالات۔ غلام نبی خیالؔ۔ کشمیری رائٹرس ایسوسی ایشن سری نگر، 2009 ص 118

۵۔ آتش چنار۔ علی محمد اینڈ سنز سری نگر۔ 1986، ص 268-267

۶۔ مجلّہ ماہِ نو۔ کراچی، شمارۂ خاص۔ اکتوبر 1962ء

۷۔ کلام حفیظؔ جالندھری۔ فرید بک ڈپو، دہلی۔ 2003ء، صفحہ نمبر 4-3

۸۔ ایضاً صفحہ نمبر 234 ۹۔ مراد مشہور شاعر سالکؔ بٹالوی سے ہے۔ ۱۰۔ کلیات حفیظؔ۔ صفحہ نمبر 14

۱۱۔ ایضاً صفحہ نمبر 16 ۱۲۔ ایضاً صفحہ نمبر 103 ۱۳۔ ایضاً صفحہ نمبر 107

۱۴۔ ایضاً صفحہ نمبر 210-208-205 ۱۵۔ ہفت روزہ محاذ، شیر کشمیر نمبر، سری نگر 19، دسمبر 1964ء

۱۶۔ ہفت روزہ محاذ سری نگر، مدیر غلام نبی خیال، 12 دسمبر 1964ء

۱۷۔ اوراقِ گل، مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، حسب الحکم اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور دام اقبالکم و ملکھم، رامپور یوپی 1944، صفحہ نمبر 174

............●●●............

رابندر ناتھ ٹیگورؔ اور کشمیر

رابندر ناتھ ٹیگورؔ اُس وقت اکتوبر 1915ء میں پہلی بار کشمیر کی سیر کو آئے جب ملک کشمیر پر ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ راج کر رہا تھا۔ ٹیگور کے مختصر سے قافلے میں اس کا فرزند تھیندر ناتھ، بہو اور ایک نوجوان بنگالی شاعر ستیند ردت شامل تھے۔

مہاکوی ٹیگور کو کشمیر آنے کی دعوت جگدیش چندر چٹرجی کی طرف سے موصول ہوئی تھی جو خود ایک بنگالی تھا اور حکومتِ کشمیر کے محکمہ تحقیق میں سپرانٹنڈنٹ کی حیثیت میں کام کر رہا تھا۔ یہ محکمہ ان دنوں ودیا پیٹھ کہلاتا تھا۔

ٹیگور اور اس کے ہم سفر جب راولپنڈی کے راستے سے ہو کر واردِ کشمیر ہوئے تو چٹرجی نے بہ نفسِ نفیس ان کا استقبال کیا اور ڈل جھیل میں ایک ہاؤس بوٹ میں ان کے قیام کا اِنتظام کیا۔ اس ہاؤس بوٹ کا نام ''پرستان'' تھا اور اس کی آرائش اخروٹ کی لکڑی سے تیار کردہ خوبصورت فرنیچر سے کی گئی تھی۔ ریشمی پردوں اور کشمیری قالینوں نے اس قیام گاہ کی دلکشی میں اور اضافہ کیا تھا۔ اس دوران چٹرجی نے دل کھول کر مہمانوں کی خاطر تواضع کی اور کشمیر کے مختلف مقامات اور حُسنِ فطرت سے مالا مال جگہیں دیکھنے کی اُن کی خواہش کو وہ دل و جان سے پوری کرتا رہا۔(1)

جیسا کہ کسی بھی ملک یا ریاست میں غلامی کے دور یا شخصی راج کے ایام میں رواج ہوتا ہے ان دنوں کشمیر میں بھی یہ سرکاری حکم نافذ العمل تھا کہ اگر کوئی معتبر سیاح یا نامور شخصیت کشمیر میں وارد ہو تو اس پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنی اوّلین فرصت میں ریزیڈنٹ صاحب کے دفتر پر حاضری دے کر وہاں

مہمانوں کے لئے مخصوص کتاب میں اپنے تاثرات قلم بند کریں اوران کے نیچے اپنے دستخط ثبت کریں۔
ٹیگور کو جب اس فرض بالجبر کی انجام دہی سے آگاہ کیا گیا تو اس نے اس کی پیروی کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں مہاراجہ کشمیر سے ملوں گا نہ ہی انگریز ریزیڈنٹ سے ملاقات کروں گا۔ ٹیگور کی نظروں میں وہ نادار اور مظلوم کشمیری عوام مہاراجوں اور حاکموں سے زیادہ اہم تھے جو ذلت اور نکہت کے دن گزارنے پر اور دن رات خون پسینہ ایک کرنے کے باوجود فاقہ کشی کرنے پر مجبور تھے۔

اپنے سیر کشمیر کے دوران سری نگر کے مشہور کالج سری پرتاپ کالج میں ٹیگور کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا اوران سے یہ درخواست خاص طور پر کی گئی کہ وہ طلباء سے خطاب کریں۔ ٹیگور کا کالج پہنچنے پر والہانہ استقبال کیا گیا اور کالج کے در و بام دیر تک طلباء اور اساتذہ کی بھر پور تالیوں سے گونجتے رہے۔ اس طرح سے سرزمینِ کشمیر نے ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کے نقیب اور نمائندے کو خوش آمدید کہا۔

اپنی تقریر کا آغاز کرنے سے پہلے ٹیگور نے طلباء سے یہ دریافت کیا کہ آیا ان میں سے کسی ایک کے پاس اس کی مشہور کتاب ''گیتانجلی'' ہے جسے صرف دو سال قبل نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ ایک طالب علم نے فوراً گیتانجلی کی جلد ٹیگور کو پیش کی اور پھر شاعرِ بنگال نے اس میں سے وہ لافانی نغمہ اپنے مخصوص انداز میں پڑھنا شروع کیا جس میں انسان کی حب الوطنی اوراس کی اس شدید خواہش کا بے ساختہ اِظہار ہے کہ اس کے وطن کی فضائیں آزادی کی خوشبو سے معطر اوراس کے نور سے روشن ہوں۔ یہ مقبول عام نغمہ یوں ہے:

Where the mind is without fear
and the head is held high;
Where knowledge is free;
Where the world has not been broken up into
fragments by narrow domestic walls;
Where words come out from the depth of truth;
Where tireless striving stretches its arms
towards perfection;

Where the clear stream of reason has not lost its way
into the dreary desert sand of dead habit;
Where the mind is led foreward by thee
into ever widening thought and action;
My Father, let my country awake

کم وبیش پندرہ روز تک کشمیر میں قیام کے دوران ٹیگور کو سری نگر میں ایک محفل مشاعرہ کی صدارت کرنے کا شرف بھی نصیب ہوا جسے کشمیر کے ممتاز تاریخ دان پنڈت آنند کول بامزئی (1941-1867ء) نے شہر کے بیچوں بیچ دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر زینہ کدل کے نزدیک اپنے مکان میں آراستہ کیا تھا۔ ایک غیر مصدقہ روایت کے مطابق اس بزمِ شعر میں ٹیگور نے مہجورؔ کشمیری اور ماسٹر زندہ کولؔ کا کلام بھی سنا اور کشمیری شاعری کی داد دی۔(2)

کشمیر میں ٹیگور نے مارتنڈ کے وہ تاریخی کھنڈرات بھی دیکھے جو خالص پتھروں کے بنے ہوئے مندروں کی نشانی کی حیثیت میں زبان حال سے اپنے شاندار زمانے کی داستان سناتے ہیں۔ ٹیگورؔ آثار قدیمہ کی شان وشوکت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے بار بار یہ کھنڈرات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

کشمیر کے قدرتی مناظر اور ڈل میں ایک ہاؤس بوٹ میں قیام ٹیگور کے فکروفن کے تار چھیڑنے کے لئے کافی تھا۔ اس نے اسی دوران کشمیر پر ایک نظم لکھی جس کا عنوان اس نے ''مانسی'' رکھا۔ اس نظم کے چند ابیات ایک آزاد ترجمے کی صورت میں پیش ہیں:

آج اس صبح کی فضا میں اس گلستان کے اندر
شبنم کے قطرے دریا کے کنارے بیدزاروں کو
ہلکی ہلکی دھوپ میں ہلا دیتے اور روشن کرتے ہیں
پھر یہ درخت ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتے ہیں
اور شاعر کے دل میں ایک ہجوم بن کر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں
اسی وقت مجھے افسوس ہوتا ہے

کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آنے کی تگ ودو کر رہے ہیں

دیکھو، دیکھو اس وشال اور پر قوت کائنات کو دیکھو

جیسے یہ ایک بے انت سمندر میں

ایک کنول کی طرح یہاں سے وہاں لہرا رہا ہے

اور پھر کئی آوازوں کے ساتھ خود بھی

ہم آہنگ ہو جاتا ہے

اپنی سیاحتِ کشمیر کے دوران ٹیگور ڈل جھیل سے منتقل ہو کر جگہ کی تبدیلی کے لئے دریائے جہلم کے کنارے رام منشی باغ کے علاقے میں بھی ایک اور ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوئے جہاں اس نے ایک اور نظم ''اُڑتے ہنس'' لکھی جس میں شاعر نے حسنِ کشمیر کے دل گزیں پہلوؤں کو اپنی فن کاری کے کمال سے بے نقاب کر لیا ہے۔ اس نظم کا شان نزول یہ ہے کہ ایک شام ٹیگور ہاؤس بوٹ کے عرشے پر غروبِ آفتاب کا حظ اُٹھا رہا تھا کہ اس دوران اوپر سے ہنسوں کے جھنڈ کے پرواز کرتے رہے جو ایمپوریم گارڈن میں سالہا سال سے چنار کے فلک بوس درختوں پر مکین تھے۔ اس دل ربا نظارے نے شاعر کے جذبہ سخن کو اس منظوم تخلیق کے سانچے میں ڈھالا:

شفق شام کے سائے تلے یہ دریا جہلم

اور اس پر رقصاں لہریں

سیمیں تاروں کی طرح روشنی بانٹ رہی ہیں

ستاروں کا جلوس

سطحِ آب پر تیرتے ہوئے پھولوں کی مانند رواں ہے

دریائے جہلم کے کناروں پر دور دور تک پھیلے ہوئے

کوہ اور پہاڑ دیواروں کی طرح محافظ بن کر کھڑے ہیں

اور تخلیق ایک خواب میں اپنی تکمیل ڈھونڈ رہی ہے

1916ء میں ٹیگور نے اپنی منظوم کتاب ''بلاکا'' کے نام سے شائع کر لی۔ اس میں شاعر

کے تخلیق کردہ کشمیر سے متعلق وہ نغمے اور گیت بھی شامل ہیں جو اس نے اپنی سیرِ کشمیر کے دوران لکھے اور جن میں ورق ورق پر شاعر اپنے تخیل کے زینے طے کر کے فطرت اور قدرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ ناقدین کی رائے میں یہ شعری تخلیقات ٹیگور کے بہترین کلام کا ایک بیش بہا حصہ ہیں۔

مہجورؔ کشمیری کی شاعری سے ٹیگور کے متاثر ہونے کے سلسلے میں پے در پے بیانات سامنے آئے ہیں ان کا پس منظر بیان کرتے ہوئے عبدالاحد آزادؔ نے لکھا ہے کہ "1927ء کے موسم بہار میں پروفیسر دیوندر ستھیارتھی صاحب ڈائریکٹر آل انڈیا فوک سانگس مشن سیاحت کے لئے کشمیر آئے اور ویری ناگ کے جنگل میں گھوم رہے تھے کہ وہاں جنگل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو مویشیوں کو چَراتے اور سریلی آواز میں گاتے دیکھا۔ پروفیسر صاحب کو جنگل کی فضا میں ان کا ترنم بہت پسند آیا۔ آپ کے ساتھ ایک کشمیری نوکر تھا۔ اس کے ذریعہ ان بچوں کو سامنے بلایا اور خوشامد کے طور پر کچھ پیسے دے کر وہی گیت گانے کے لئے کہا۔ بچوں نے خوش ہو کر ایسے لطیف طرز میں مہجورؔ کا گیت "پوشے متہ جانانو" سنایا کہ پروفیسر صاحب پر رقت طاری ہوئی۔ چوں کہ کشمیری زبان سے ناواقف تھے۔ رومن میں یہ غزل لکھی اور بعد میں اپنے کشمیری نوکر سے اس کے معنی پوچھے اور دریافت کیا کہ یہ کس کا کلام ہے۔ وہ پروفیسر صاحب کو نہ اس کے معنی ومفہوم سے آگاہ کر سکا اور نہ ہی شاعر کے حالات بتا سکا۔ سری نگر پہنچ کر ستیارتھی نے ایک ماہر زبان سے ساری غزل کا انگریزی میں ترجمہ کرایا اور شاعر کا نام دریافت کیا۔ واپس جا کر اصل غزل مع ترجمہ موقر انگریزی پرچہ ماڈرن ریویو میں شائع کر دی۔"

اتفاقاً یہ مضمون فخر ہند ملک الشعراء رابندر ناتھ ٹیگورؔ کی نظر سے گزرا اور وہ پھڑک اٹھا۔ فرمایا کہ واقعی کشمیر شاعری کا گہوارہ ہے۔ اس کے بعد ٹیگور صاحب نے اپنے شاگرد خاص پروفیسر ستیارتھی کو 1934 میں دوبارہ کشمیر روانہ فرمایا اور کشمیری گیت، مہجور کا کلام، فوٹو اور حالاتِ زندگی دستیاب کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اکتوبر 1933ء کے آغاز میں ستیارتھی صاحب واردِ کشمیر ہوئے (3) یہاں پنڈت آنند کول صاحب بامزئی سے ملاقات کی اور ان کو اپنے مدعا سے آگاہ کیا۔ چنانچہ بامزئی صاحب کے گھر پر ستیارتھی صاحب اور مہجور کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد وہ پندرہ دن تک مہجورؔ کے ساتھ رہے اور آپ کی یادداشتیں اور بیاض دیکھ کر آپ کے سارے کلام کا ترجمہ کیا (4) یہ تمام واقعات کشمیر کے

مشہور روزنامہ اخبار ''مارتنڈ'' مورخہ 20 ماگھ 1991ء بکرمی میں شائع ہو چکے ہیں۔'' (5)

دیوندر ستیارتھی نے مہجور پر جو مضمون لکھا وہ ''ماڈرن ریویو'' میں 1934 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بلراج ساہنی نے بھی سہ ماہی وشوا بھارتی جریدے میں نومبر 1938ء اور جنوری 1939ء کے مشترکہ شمارے میں مہجور پر نو صفحات پر مشتمل ایک انگریزی مضمون تحریر کیا۔ یہ رسالہ رابندرناتھ ٹیگور نے خود شروع کیا تھا اور اس کی جائے اشاعت بنگال میں شانتی نکیتن ہوا کرتی تھی۔

بلراج ساہنی نے اپنے مضمون میں ایک پُر لطف واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے جسے یہاں دوہرانا بے محل نہیں ہوگا۔ اس سے اہل کشمیر کی اپنے شاعروں اور نغمہ نگاروں کے تئیں بے رخی اور ناواقفیت کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ ساہنی کہتا ہے کہ ایک دن ہم ڈل جھیل میں کشتی پر سوار تھے کہ ہانجی نے ایک کشمیری نغمہ چھیڑا جو ہمیں پسند آیا میں نے اس سے پوچھا کہ یہ گانا کس نے لکھا ہے تو وہ فوراً بولا ''مہجور شریف نے'' جب میں نے پوچھا کہ مہجور شریف کہاں رہتا ہے تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اُدھر اجمیر شریف میں جو یہاں سے بہت دور ہے۔'' (6)

انہی دنوں کشمیر کے ایک تاریخ دان پنڈت آنند کول بامزئی نے مہجور کے ایک گیت ''پوشے متہ جانانو'' اور گریس کور (دہقان زادری) کا انگریزی میں ترجمہ وشوا بھارتی رسالے ہی میں شائع کروایا تو رابندرناتھ ٹیگور اس کشمیری کلام سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے مہجور کے نام ایک مختصر سے مراسلے میں لکھا کہ ''میں نے آپ کی نظم دیکھی۔ میرے ساتھ آپ کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ اگر آپ بنگالی اور انگریزی سے واقف ہوتے تو میں ضرور یہ دعویٰ کرتا کہ یہ خیالات آپ نے میری نظموں سے لئے ہیں۔ میں آپ کے کلام سے بے حد خوش ہوا۔'' اسی طرح دہقان زادی کے ترجمے نے ٹیگور کو اس حد تک سرشار کیا کہ اس نے مہجور کو کشمیر کے ''ورڈس ورتھ'' کا خطاب دیا۔ (7) مہجور نے ایک تقریب پر اپنی تقریر میں ٹیگور کی اس داد دہی اور قدر دانی کا ان تہنیتی الفاظ میں جواب دیا کہ ''یہ ٹیگور کی انسان دوستی اور مردم شناسی ہے کہ انہوں نے صرف ایک لفظ کہہ کر میرے وطن کے لوگوں کو میری موجودگی کا احساس دلایا۔'' (8)

کشمیری زبان میں ٹیگور کے جتنے فن پارے اور تخلیقات منتقل کی گئی ہیں غالباً اس زبان میں

کسی اور فن کار کی تصانیف کا اس حد تک ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ ٹیگور بلاشک اس طرہ امتیاز کے حصول میں سارے ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کی محفل میں سرفہرست رہا ہے۔ ان تراجم نے ساتھ ہی کشمیری زبان وادب کے نثری اور شعری سرمائے کو بھی مالا مال کرنے میں اپنا حصہ ادا کر لیا ہے اور ہماری چھ سو سالہ تحریری ادبی تاریخ کے صفحات کو چند انمول موتیوں سے پیراستہ کیا ہے۔

گیتانجلی ٹیگور کے مناجاتی ادب کا وہ مختصر ترین مگر شہرہ آفاق شعری مجموعہ ہے جس میں شاعر اور انسان کی زندگی کے سبھی اسرار بے نقاب ہو کر خدا کے سامنے ایک غیر مرئی شکل میں آشکار ہو جاتے ہیں۔

ٹیگور کے اس مجموعہ کلام کو کشمیری زبان میں سروانند کول پریمی نے منتقل کیا اور اسے ''کشمیری گیتانجلی'' کا نام دیا، پریمی کا یہ ترجمہ اس کی اپنی والدہ سے منسوب ہے جو مترجم کو بچپن ہی میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بدنصیبی یہ ہے کہ خود پریمی بھی ہمیں اس وقت حادثاتی طور پر چھوڑ کر چلا گیا جب کچھ سال قبل اُسے گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ پریمی کے ترجمہ کے بارے میں پنڈت جیالال ناظر کہتے ہیں کہ ''پریمی کا کیا ہوا گیتانجلی کے ایک سو تین نغمات کا ترجمہ ٹیگور کے فلسفہ کو نہایت سیدھے طریقے پر اور سادگی کے ساتھ کشمیری زبان میں پیش کرتا ہے۔''

پھالگنی نام کا منظوم ڈراما مرزا غلام حسن بیگ عارف نے کشمیری زبان میں ڈھالا اور اسے ''سونتک اتہ گتھ'' کا نام دیا۔ The Cycle of Spring کے عنوان سے انگریزی زبان میں شائع شدہ یہ دلچسپ ڈراما موسموں کا حال اور ان کے مزاج کی تبدیلیوں کو اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ بقول شاعر اگر جاڑا آ گیا ہے تو کیا بہار دور ہے؟

اس ڈرامے کے کردار بادشاہ، وزیر، سپہ سالار، بجوے ورما، چینی سفیر، پنڈت سروتی بھوشن اور شاعر کبی شیکھر اپنی اپنی جگہ گویا انگوٹھی میں نگینوں کی طرح جڑے ہیں اور اپنی حدت اور حرارت کی روشنی بکھیر رہے ہیں۔ مترجم نے اس میں جلوہ بہار کی اس طرح سے تزئین کاری کی ہے جسے یہاں قارئین کی خاطر اُردو نثر میں پیش کیا جاتا ہے:

بیابانوں میں ہر سو بہار کا الاؤ روشن ہے

اس الاؤ نے گلزاروں اور لالہ زاروں کو آتشیں بنا دیا ہے

آسمان رنگوں پر رنگ نچھاور کر رہا ہے

بادِ صبا ہر طرف جھوم رہی ہے اور ساز بج رہے ہیں

کوہساروں کے بیچ درختوں کی شاخیں کِھل رہی ہیں

اور ہماری رگوں میں اضطراب اور ولولوں کا خون گردش کر رہا ہے

ساری فضا شاد ہوکر گویا دیوانہ پن پر اُتر آئی ہے

صبح کی ہوا جھوم جھوم کر پھولوں سے ان کا نام پوچھ رہی ہے

چوکھیر بالی نام کے ٹیگورؔ کے بنگالی ناول کا کشمیری ترجمہ پرتھوی ناتھ پشپ نے کیا ہے اور کشمیری میں اس کا نام ''اچھ کُٹر'' رکھا گیا ہے۔ اس ناول کی بدولت ہندوستانی ناول میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ چوکھیر بالی میں انسانی سرشت کے گونا گوں محسوسات اور جذبات یعنی عشق اور ہوس، اصول و عمل اور گرہستی و عشق کے تضادات کی عکاسی بہترین پیرائے میں کی گئی ہے۔ اس ناول کے کردار وِنودنی، آشاراج، لکشمی، انہ پورنا، مہند اور بہاری قاری کی آنکھوں کے سامنے باتیں کرتے اور گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

راجا و رانی ٹیگورؔ کا ایک مشہور ڈرامہ ہے جسے امین کاملؔ نے کشمیری زبان میں منتقل کیا ہے۔ اس ڈرامے کے پلاٹ کا کشمیر کے ساتھ تعلق ہے۔ کہانی میں ایک جگہ راجہ وکرم کی مہارانی سمترا کہتی ہے کہ ''میں کشمیر میں اپنے بھائی راجہ کمار سینؔ کے پاس جاؤں گی۔ اس سے امداد حاصل کرکے میں ان باغی سرداروں کے ساتھ جنگ کروں گی جنھوں نے سرزمین کشمیر کے نام کو دھبہ لگایا۔ تم اس ملک سے میرے بھاگنے میں میری مدد کرو۔ اگر حالات اور بھی ابتر ہوتے گئے پھر تم اپنا فرض پورا کرلینا۔'' اور ایک اور مکالمہ جو راجہ وکرم کا سپہ سالار بولتا ہے کس حد تک ہمارے اپنے مقامی حالات کے لئے برمحل ہے اس کا اندازہ یہ مکالمہ سننے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ سپہ سالار کہتا ہے کہ ''اپنے ملک میں ہم نے بغاوت کا قلع قمع کرلیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کشمیر پر اپنی قوت اور وقت ضائع کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟''

قربانی ٹیگورؔ کے تین ڈراموں قربانی، مالنی اور چنڈالٹی کے کشمیری ترجمہ کی کتابی شکل کا نام

ہے۔ان تین ڈراموں کے کشمیری تراجم نور محمد روشن نے کئے ہیں اور اس کتاب کو سری نگر کے مولانا آزاد روڈ پر واقع زنانہ کالج نے 1961ء میں شائع کیا ہے۔

اسی طرح تین ناٹک یعنی ڈاک گھر، مکتہ دھار اور سرخ گل لالہ بھی کشمیری زبان میں بالترتیب امین کامل، علی محمد لون اور نور محمد روشن نے منتقل کئے ہیں۔ڈاک گھر ڈرامے کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ آتما یعنی روح مکتی یا نجات کے لئے بے چین رہتی ہے۔اسی آتما کے تخیل کا روپ ایک بیمار آمل نے دھارا ہے جو اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔مکتہ دھارا اور سرخ گل لالہ نام کے ڈراموں میں بھی ٹیگور نے وہی فلسفہ زندگی پیش کیا ہے جس نے روحانیت کی بالادستی سے ساری عمر اس کے ادب، مصوری اور سنگیت پر اپنی اثر آفرینی کے نقوش ثبت کئے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کشمیر کے ایک معتبر شاعر مرزا عارفؔ نے دو نظمیں تخلیق کی ہیں جن کے منتخب اشعار اردو تراجم کے ساتھ یہاں پر درج کئے جاتے ہیں:

چھ گیتا کرشنہ سنز گیتانجلی چانۍ
حیاتکہ رسہ برتھ امریت گلی چانۍ
تھوتھ ژٲے ٹھانہ وتھی مس بانہ بری بری
چھ مشتاقو برتھ آسان گلی چانۍ
خیالک فکرہ ہند سودا پیوان سروگ
ہیوان جانباز سرِ دِتھ سر ملی چانۍ
بہر سو چرچہ ساقی باگران مس
اَمی پیٖہ آئے یوت عارف ولی چانۍ

(تمہاری گیتانجلی کرشن کی گیتا جیسی ہے اور تمہارا امرت زندگی کے رس سے بھرا پڑا ہے۔تم نے اپنے خم خانوں کو کھلا چھوڑ دیا اسی لئے مشتاق تمہارے کوچے میں جمع ہو کر آئے ہیں۔خیال و فکر کا سودا اس وقت نہایت سستا معلوم پڑتا ہے جب تمہارے جانباز عاشق اپنا سر دے کر تمہارے راز خریدتے ہیں۔عام چرچا ہے کہ ساقی شراب پلا رہا ہے اور عارف کی دوسری نظم کے چند ابیات یوں ہیں:

کمی سا بور بنگالی ملرین لولہ مس
قولہ کمی سندہ ہولی ہالے عالمس
کمی سندس شارس اندر جادیک اثر
پوشہ برگچ نوزکی سودرک سنیر
زندگی چے کتھ بادہِ کمی سنا پردہ سان
پردہ چے کتھ بادہِ کمی سنا پردہ سان
امی سندس ناگس چھ گرکھ جاری چھُ آب
فیض عامس واتناوان بے حساب

(یہ کس نے بنگالی مئے کے خم کے خم لنڈھائے۔ یہ کس کے قول سے ساری دنیا میں واہ واہ کا شور ہے۔ یہ کس کے اشعار میں جادو کا اثر ہے۔ یہ کس کی شاعری ہے جو برگ گل کی نزاکت اور سمندر کی گہرائی کی حامل ہے۔ اس کے چشموں سے آبِ رواں جاری وساری اور یہ اسی کا فیض ہے جو عام انسان کو مستفید کر رہا ہے۔)

حوالہ جات

(1)......کشمیر ٹائمز جموں۔ 17 رمئی 1992ء ، (2)......ایضاً

(3)......یہاں پر ایسا لگتا ہے کہ آزاد تاریخوں کی صحت کا خیال نہ رکھ سکے ان کے بقول ٹیگور نے ستیارتھی کو 1934ء میں دوبارہ کشمیر روانہ فرمایا لیکن اگلے ہی جملے میں اس تاریخ کو ایک سال پیچھے کی طرف موڑ کر اکتوبر 1933ء کے ابتدائی ہفتے میں لے جاتے ہیں (خیالؔ)

(4)......یہاں پر بھی آزاد چوک گئے ہیں۔ ویوندر ستیارتھی نے مہجور کے سارے کلام کا نہیں بلکہ ایک یا دو گیتوں کا ترجمہ کیا ہے (خیالؔ)

(5)......کشمیری زبان اور شاعری، جلد سوم کلچرل اکادمی سری نگر، طبع ثانی 1984ء ص 287-285

(6)......''وشوا بھارتی'' کوارٹرلی۔ مدیر کے آر کرپلانی۔ شانتی نکیتن بنگال، نومبر 1938ء جنوری 1939ء ص 214

(7)......کشمیری زبان اور شاعری جلد سوم ص 287

(8)......عبدالاحد آزاد نے اگرچہ مہجورؔ کے نام ٹیگور کے دو مراسلوں کا صادقانہ طور پر ذکر کیا ہے اور مہجورؔ کے جوابی کلمات کو بھی اپنی تصنیف میں جگہ دی ہے لیکن ان عبارات کا تاریخی طور پر دستاویزی حیثیت میں کوئی ثبوت کہیں پر دستیاب نہیں ہے (خیالؔ)

............●●●............

فراقؔ اور گنگا جمنی تہذیب

اُردو دنیا میں رگھو پتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کا نام ہندوستان کی تہذیبی میراث اور ثقافتی ورثے کے حوالے سے ایک منفرد حیثیت اور مقام کا حامل ہے۔ اردو میں اگر چہ روایات، تمدّن اور قوم پرستی کے نغمہ خواں سخن وروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے لیکن اس خطے کی قدیم تہذیب اور ہزاروں سال پر پھیلے ہوئے تاریخی سرمائے کی قدر و شناخت یا اُس کی مدح سرائی کے ضمن میں بہت کم ایسے باشعور اور باصلاحیت شاعر نظر آتے ہیں جن کا تقابلی موازنہ فراقؔ کے ساتھ کیا جا سکے، وہ خود کہتے ہیں

''جب میں نے ہوش سنبھالا تو نیا ہندوستان جلوہ گر ہو رہا تھا۔ مجھے اس بات کی تلاش ہوئی کہ ہندوستان کے کلچر کے حقیقی اور قیمتی عناصر کیا ہیں۔ ہماری گھریلو زندگی، ہماری کئی رسمیات اور تہوار، ہمارا سنگیت، ہماری دوسری کلائیں یا فنونِ لطیفہ، دنیا کی ودیعت کی طرف اشارہ کرتے رہے۔ میں نے اپنی شاعری میں اسی پاکیزگی اور ودیعت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ انہیں محسوسات کو اپنے ہندو، مسلمان اور دیگر ہم وطنوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ میری شاعری میں پریم یا محبت اور زندگی کے دوسرے تجربات یہی چاہتے ہیں کہ وہ کرشن لیلا بن جائے۔'' (1)

فراقؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ الٰہ آباد میں گزرا جہاں انہوں نے سرکاری ملازمت کی اور کانگریس کے دفتر میں بھی کام کرتے رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور پھر الٰہ آباد یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔

الٰہ آباد شہر بجائے خود ایک گنگا جمنی ماحول کا گہوارہ رہا ہے جہاں ہندوستان کی تہذیبی

روایات کی نشو و نما کے دوش بدوش برطانوی دور میں انگریزی شاعری کا بھی بول بالا رہا۔ اِس منظرنامہ میں فراقؔ ہندی کے مشہور سوریہ کانت ترپاٹھی نرالاؔ کے ساتھ ساتھ جہاں تاریخ کے تقابلی ادوار سے اثر لیتے رہے وہاں مغرب کی رومانوی شاعری نے بھی اُن کے لب ولہجہ کو اپنی لذّت اور لطافت سے آشنا کرنے میں ایک بھرپور حصہ ادا کیا۔

فراقؔ کو عشقیہ شاعری اور زندگی کے رومان پرور پہلوؤں کا نقیب کہا جاسکتا ہے۔ یہ عناصر اُن کی ساری شاعری پر سب سے زیادہ غالب اور منقش ہیں۔ اس کے علاوہ اگر فراقؔ کو کسی اور تجربے یا جذبے نے متاثر کیا ہے تو وہ اُن کے ملک کی تاریخی قدامت اور ثقافتی سرمایہ داری ہے جس کے وہ قدم قدم پر فخر وانبساط کے ساتھ گیت گاتے ہیں اور ان کی تعریف وتحسین میں اپنے آپ کو سرشار پاتے ہیں۔ اُن ہی کے بقول ''میرے وجدان پر عمر بھر ہندوستان کے قدیم ترین اور پاکیزہ ترین ادب اور دیگر فنون لطیفہ اور نظریۂ زندگی کا گہرے سے گہرا اثر رہا ہے (2) ''......اور سادگی، گمبھیرتا، علامت، تقدّس، فطری حُسن اور ہندوستان کے مزاج کو ظاہر کرنا۔ یہی میری شاعری کے مقاصد ہیں'' (3)

فراقؔ کی شاعری کے آنچل میں جو فضائیں سمیٹی ہیں ان سے ہندوستان کے گوناگوں اور رنگارنگ ثقافتی ادوار اور ماحول کی خوشبوئیں پھوٹ رہی ہیں۔

بعض اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے برعکس ہندو تہذیب فراقؔ کے فکروفن پر حاوی ہے اور وہ دانستہ طور پر اسی کی تشہیر کرتے ہیں۔ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ پرمانند سرؔی واستو کا بھی یہی خیال ہے کہ ''ادھر فراقؔ کی شاعری میں ہندو ذہن کے اثرات کو دیکھنے کا شوق بڑھا ہے، پر اسے اُن کی وسیع النظری، آزاد ترقی پسندی اور سیکولر ہندوستانیت سے جوڑ کر نہیں دیکھیں گے تو مشکل پیدا ہوگی۔'' (4)

فراقؔ نے اپنی شاعری میں ہندو ذہن کے اثرات کا دعویٰ کرنے والے معترضین کو یہ جواب دیا ہے کہ ''جس طرح ہندوستان کی زمین، یہاں کی ندیاں، پہاڑ، موسم، پھل پھول، موسیقی اور یہاں کی دوسری تمام چیزوں پر مسلمانوں اور دوسرے غیر ہندوؤں کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہندوؤں کا'' (5) اور بقول سری واستو ''اس سے زیادہ صفائی کی ضرورت شاید نہیں رہ جاتی۔'' (6)

فراقؔ نے ہند کے جس کلاسیکی ادب اور جن فنونِ لطیفہ کا مطالعہ کیا تھا وہ کم وبیش اسی ہند و نقطہ خیال کی تشریح وتوضیح کرتے ہیں جسے بعد میں انہوں نے علامتوں اور استعاروں کی پیکر تراشی سے ایک واضح اور ہمہ جہت ہندوستانی تہذیب کے قالب میں ڈھال دیا۔

مسلمانوں کی تاریخ یا ہند کی اسلامی معاشرت، ادب، فنون اور تاریخی وراثت کو فراقؔ نے اپنے شوق کا مرکز نہیں بنایا۔ ظاہر ہے کہ ایک حساس شاعر اپنی زندگی کے لئے متعین کردہ فلسفہ اور اس کے اثرات سے ماخوذ تجربات ہی کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں میں اظہار کی صورت بخشے گا لیکن فراقؔ نے اس پابندی سے اپنے دامن کو بار بار چھڑایا ہے۔ فراقؔ اپنی نجی گفتگو میں ہندو مذہب کو ایک طرز حیات (A way of life) کہتے ہیں۔ (7) اور اس سے زیادہ اُسے کوئی ترجیحی مقام دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اس تصور اور خیال کی بنا پر انہوں نے اپنے کلام میں مذہب یا عقائد سے زیادہ سماجی زندگی اور روایتی طرزِ حیات کے رنگا رنگ پہلوؤں کے خط وخال واضح طور پر اُبھارے ہیں اور انہیں لطیف شاعری کا جامہ پہنا کر ان کی تزئین کاری میں کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

فراقؔ ساری عمر یہ خواہش کرتے رہے کہ اردو ادب اور شاعری میں ہندوستانیت بھرپور طریقہ پر سرایت ہو سکے۔ اپنے مجموعہ ''شبنمستان'' میں لکھتے ہیں کہ ''میں چاہتا ہوں کہ اردو ادب اور شاعری میں ہندوستانیت اور بلند ترین ہندوستانیت اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے جیسے بھوبھوتی، کالی داس، بھرتری ہری اور ٹیگور کی شاعری اور پریم چند کے ادب میں ہندوستانیت ہے۔'' (8)

فراقؔ نے جہاں ایک طرف گوتم بدھ کے چکر، کرشن کی بنسی اور مندروں کے گھنٹوں کی آواز کو اپنی شاعری کے تار و پود میں ایک عقیدے کے برعکس ایک شاندار دائمی تجربے کی شکل میں کام میں لایا وہاں انہوں نے ترقی پسندی کی تحریک کو بھی قبول کیا۔ اُردو کی روایتی کلاسیکی شاعری بھی اُن کے حواس پر شدت کے ساتھ سوار رہی۔ یہی وہ اثرات ہیں جو فراقؔ کے کلام کا خاصہ ہیں۔ اس کے علاوہ فراقؔ کے یہاں جنسیات کا تصور ہے وہ اصل میں ہندوستان کے اساطیری ادب کے ساتھ اُن کے والہانہ ذوقِ مطالعہ کی دین ہے۔ قدیم ہندو معاشرہ اور طرزِ حیات میں جنسیات کا ایک اہم کردار رہا ہے اور اس پر مبنی حرارت بخش اور رنگین داستانیں ہندوؤں کی تمام تر مذہبی یا سماجی کتابوں میں ملتی ہیں جس کے اثرات

سے فراقؔ جیسے شاعر کا دور رہنا ممکن نہیں تھا۔ صرف ایک شعر مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

آثرؔ لکھنوی اور کئی دیگر استادوں نے فراقؔ گورکھپوری کی شاعری کا فنی اور تکنیکی پس منظر میں جائزہ لیتے وقت انہیں کم وبیش پختہ مشق شاعروں کے زمرے سے خارج کر کے ہی چھوڑا ہے لیکن جب فراقؔ کی شاعری میں نازک خیالی، اظہار فکر اور تجربہ کے بیان کی کامیابیوں کا لطیف منظر سامنے آجاتا ہے تو اُن کے فن میں اس نوع کی کوتاہیوں کو بہت حد تک ثانوی حیثیت حاصل ہو کے رہ جاتی ہے۔ فراقؔ کے فکر وذہن پر اُردو کی کلاسیکی شاعری کے علاوہ ہندوستان کے اتہاس، سنسکرتی اور یورپی شاعری اور علم تنقید کے جملہ اثرات بیک وقت مرتب ہوتے رہے جس کی بنا پر ان کے کلام میں ایک بوقلمونی پیدا ہوئی ہے جس میں بہر حال رومان اور ہندوستانی تہذیب کے خط وخال کا رنگ سب سے زیادہ جلوہ گر ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں وہ ''زیادہ تر امیرؔ مینائی کا متبع تھا اور چوں کہ عزیزؔ لکھنوی، شادؔ عظیم آبادی، ناصریؔ، مولانا حسرتؔ، اصغرؔ گونڈوی، یگانہؔ چنگیزی اور علامہ اقبالؔ کے کلام کو اصلاح کے خیال کی نظر سے دیکھتا تھا اس لئے ان تاثرات سے بھی اُس کا کلام رنگین ہے۔'' (9)

فراقؔ کی شاعری کو مجموعی طور پر آنند کمار سوامیؔ کے الفاظ میں بیان کردہ اس آفاقی نظریہ کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے کہ:

"Man is not called upon to deny any art of his nature, but to bring higher and lower, essence and nature into harmony"(10)

فراقؔ کی طویل نظم ''ہنڈولہ'' میں شاعر نے دیارِ ہند کے گہوارے میں کالی داس، تان سین، تلسیؔ داس، بھگتؔ کبیر، رضیہ سلطانہ، امیر خسروؔ، میرؔ و غالبؔ، حالیؔ و اقبالؔ اور وارث شاہ اور ٹیگور کو کروٹیں لیتے ہوئے دیکھا اور فرازِ کوہِ ہمالیہ اور رودِ گنگ وجمن کے سائے میں اُسے نسیم صبح تمدّن کی بھیرویں چھڑتی ہوئی نظر آئی۔ پروفیسر راجندر کمار اس نظم کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''اس میں فراقؔ کی یہ خواہش شروع سے آخر تک پوری تڑپ کے ساتھ چھائی ہوئی ہے کہ ہمارا دیس تمام قوی امکانات اور

ترقی کی سرزمین بنا رہا ہے۔ اس نظم میں زمین ہند کا تصور ایک ایسے ہنڈولے کی شکل میں کیا گیا ہے جس میں پورے ہندوستان کی تہذیب کا بچپن جھولا ہے۔ ایسی ہندوستانی تہذیب جس کی تعمیر میں تمام قوموں کی مشترکہ خدمات شامل ہیں۔ ہندوستانیت کی اس خصوصیت کو فراقؔ نے ایک اور طریقے سے اپنی ایک مشہور غزل کے اس شعر میں بیان کیا ہے:

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراقؔ

قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا!!

''دھرتی سنگیت'' نظم میں فراقؔ نے ہندوستان کی سرزمین یعنی دھرتی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ خلا کی رقاصہ ہے۔ شاعر کے خیالوں کی لالی ہے۔ جس کی آنکھوں کی رنگی شعاعوں کی لرزش ہے۔ جس کی گودی میں ہر علم و عمل اور ہر جادوئے فن پلا ہے یہاں بھی فراقؔ نے ہندو دیومالا کی کہانیوں اور افسانوں کا سہارا لے کر ہی اپنے ملک کی عظمتِ رفتہ اور شانِ رفتہ کے قصیدے گائے ہیں۔

''داستانِ آدم'' بھی اسی تہذیب شناسی اور وطن نوازی کا ایک پُر جوش اور حیات بخش فن پارہ ہے۔

اپنے ایک افسانہ نما انشائیہ ''کامیاب زندگی'' میں بھی جب فراقؔ سرلاؔ نام کی ایک دوشیزہ کا حال بیان کرتے ہیں پہلے وہ اس دن کا نقشہ اسی ہندوستانی رنگ سے مزیّن کر کے پیش کرتے ہیں جس دن سرلاؔ اُن کے پاس آجاتی ہے۔ فراقؔ کے الفاظ میں ''جشن آزادی کی ساتویں سالگرہ تھی۔ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے آرام کرسی پر لیٹا ہوا بسنت کی بہار دیکھ رہا تھا۔ سامنے جہاں تک نظر جاتی تھی ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ کھیتوں کے بیچ سرسوں اسی طرح پھولی ہوئی تھی جیسے کسی ندی کی دھارا میں چراغ محبت جلائے گئے ہوں۔ سورج کی روشنی میں روشن سفید بادلوں کا ہجوم نیلے آسمان پر ایسا سہانا لگ رہا تھا جیسے بالک کرشن کے دہن پر ابھی ابھی چرا کر کھایا ہوا دہی۔ ہوا کے چلنے سے گومتی کی دھارا ایسے لہراتی تھی جیسے کسی سمندری حسینہ کی پتلی کمر کسی کے گدگدانے سے بل کھا جائے۔''

''نزدیک ہی ندی کنارے چھند منزل کی طرف سے کوئی دوشیزہ گاتی ہوئی آرہی تھی:

جھلمل بہکت بیار

پون رسی ڈالے رے

سرلا سے ملاقات کے بعد کا حال بیان کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''اس کے بعد میری بیوی اندر چلی گئی۔ میں دالان میں بیٹھا رہا۔ پھر چھتر منزل کی طرف سے گانے کی آواز آئی۔ آواز دوشیزہ کی تھی:

نِرمل کے بلرام
سنے ری میں نے نِرمل کے بلرام
نیر دھن کے دھن رام
سُنے ری میں نے

کتنی رسیلی، کتنی درد بھری آواز تھی جیسے جیسے دوشیزہ دور نکلتی جاتی تھی ویسے ویسے آواز بھی دھیمی ہوتی جاتی تھی۔ آخر میں ایک الاپ سنائی پڑی، پھر کچھ نہیں۔'' (12)

فراقؔ کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور تشخص کی شناخت ہمہ جہت پہلو اپنی رنگارنگ جلوہ سامانیوں کے ساتھ آشکارا ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر صرف چند اشعار ے اس رنگ افشانی کی تصور کشی کی جاتی ہے۔

مدھوبن کے بسنت کا سجیلا ہے وہ روپ
برکھارُت کی طرح رسیلا ہے وہ روپ

زلفِ شبِ گوں کی چمک پیکرِ سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سر گنگ و جمن کیا کہنا

روپ کی چاندنی سوزِ دل سوزِ دل
موجِ گنگ و جمن سازِ جاں سازِ جاں

دیپاولی کی شام گھر پُتے اور سجے
چینی کے کھلونے جگمگاتے لاوے

وہ روپ متی مکھڑے پر ایک نئی دمک
بچوں کے گھروندوں میں جلاتی ہے دیئے

منڈپ کے تلے کھڑی ہے رس کی پُتلی
جیون ساتھی سے پریم کی گانٹھ بندھی
مہکتے شعلوں کے گرد بھاونر کے سمے
مُکھڑے یہ نرم چوٹ سی پڑتی ہوئی

پنگھٹ پہ گگریاں چھلکنے کا یہ رنگ
بائی ہچکولے لے کے بھرتا ہے ترنگ
کاندھوں پہ سروں پر دونوں باہوں میں کلس
دو انکھڑیوں میں سینوں میں بھرپور امنگ

یہ تیرا شعلہ آواز ہے کہ دیپک راگ
قریب و دُور چراغ آج ہوگئے روشن

تناؤ بھرے سینے کا یہ کمر کا کساد
خطوطِ جسم سرنگی کے ہیں کھچے ہوئے تار
فراز سینہ پہ رخشندہ دو مہہ کامل
وہ جسم چاندنی میں چھوٹتا ہو جیسے انار

قد جمیل ہے یا کام دیو کی ہے کمان
نظر کے پھول گھندے تیر کرتے جاتے ہیں وار

یہ چہرہ صبح بنارس یہ زلف شامِ اودھ
کمندِ پیکرِ نازک فضائے خلد شکار

سنسکرت شاعر بھاسؔ کے اس خیال کو کہ ''پچھلے پہر مندروں میں جلتے ہوئے چراغ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے ہوں۔'' فراق نے اس فن کاری کے ساتھ ایک دل نشیں پیرائے میں بیان کیا ہے کہ:

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے ہوں پچھلی رات چراغ

یا

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اُٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

فراؔق گورکھپوری اپنے کئی معاصروں کے مقابلے میں مغربی ادب بالخصوص نشاۃ الثانیہ کی یورپی شاعری کے بھرپور مطالعہ سے سرفراز ہوئے تھے۔ان کے کلام میں یہ مطالعہ ایک ودیعت کی طرح سرایت کر گیا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ فراؔق کے لہجے میں کیٹس، شیلے اور بائرن کے ساتھ ساتھ ٹینی سن اور سون برن کے لہجے کا بھی رس موجود ہے۔ مقامی سطح پر بھی فراؔق نے میر تقی میرؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، غالبؔ اور اقبالؔ سے خوشہ چینی کی تھی لیکن ان تمام تراثرات کے باوجود فراؔق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کی تصویر کشی اور پیکر تراشی کے عکس ان کے موقلم کی فن کاری سے مُزیّن ہو کر قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح نظروں کے سامنے جھلملاتے ہوئے جلوہ گر ہوتے ہیں اور یہی جلوہ فراؔق کی شاعری کا بیش بہا اور لافانی اثاثہ ہے۔

حوالہ جات

(1) نغمہ نما، ستار پبلی کیشنز، نئی دہلی 1991ء۔ صفحہ 7-6

(2) مجلّہ نیا سفر الٰہ آباد۔ جنوری 1998ء۔ صفحہ 295 ، (3) ایضاً۔ صفحہ 308 ،

(4) ایضاً۔ صفحہ 308، (5) ایضاً۔ صفحہ 308 ، (6) ایضاً۔ صفحہ 308،

(7) گل نغمہ۔ ادارہ انیس اردو۔ الٰہ آباد۔ 1997ء۔ صفحہ 15، (8) نیا سفر۔ صفحہ 317 ،

(9) اوراق گل۔ مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی۔ مطبوعات کتاب خانہ رام پور (یوپی)۔ 1944ء، صفحہ 270

(10) شاعر۔ ہم عصر اردو ادب نمبر جلد ا۔ مکتبہ قصر الادب بمبئی۔ 1998ء، صفحہ 196

(11) نیا سفر۔ صفحہ 300 ، (12) یہ صبح۔ مارچ 1998ء، نئی دہلی، صفحہ 50-47

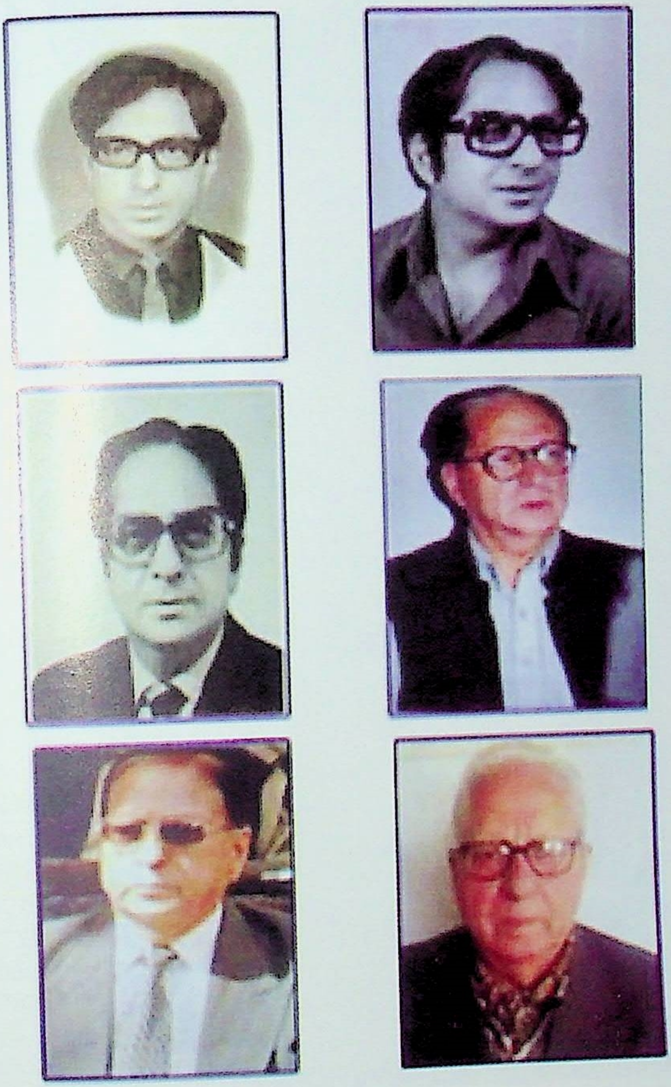
اس شمارے کے قلم کار

۱	محمد یوسف ٹینگ	Hakeem Bagh, Rawalpora,Srinagar-190015(J&K) Mob. 9419761644
۲	پران کشور	A-4/702,Kumar Prerana,Nagras Road Aundh,Pune-411067 Mob.09422088562 Email: prankishore@gmail.com
۳	سیف الدین سوز	Shehjar Humhama,New Airport Road, Srinagar -190014 Mob. 9868181984 Email: siaf@sansad.nic.in
۴	شمس الرحمٰن فاروقی	29C, Hashtings Road, Allahabad, UP India-211001 Mob.094550615881 Email: srfarooqui@gmail.com
۵	فاروق نازکی	81-Shivpora, Batwara Srinagar-190001(J&K) Mob.9419012874 Email: farooqnazki@gmail.com
۶	علی احمد فاطمی	229-A,Lukerganj,Allahabad-211002, U.P. India Mob.09415306239 Email: aliahmad.fatmi@yahoo.com
۷	جتندر اودھم پوری	Udhampur Jammu - 182101 Mob. 9419134424, 0191-257525
۸	نور شاہ	LD Colony,Goripora link Road, Rawalpora, Srinagar-190015(J&K) Mob. 9906771363
۹	ناجی منور	Kapran Shopian, Kashmir-192303(J&K) Mob.788958490 Email: naji.munawar@gmail.com
۱۰	حسن ساہو	Hamdaniya Colony, Bemina Srinagar-190018(J&K) Mob. 9906439491 Email: babhyder@outlook.com
۱۱	شفیع شوق	Chandpora Harwan, Srinagar-190006(J&K) Mob.9596592193 Email: shafishouq@gmail.com
۱۲	قدوس جاوید	27-Green Hills,Near Govt.High School Bathindi, Jammu 182252 Mob.9419010472 Email: jawaidquddus@gmail.com
۱۳	بشر بشیر	Shah Anwar Colony, Hyderpora Bye-Pass Srinagar-190014(J&K) Mob. 7006498722 Email:basharbashir@gmail.com
۱۴	فاروق فیاض	Umer Colony, Khosa Bagh, Bagat-e-Kanipora,Nowgam,Srinagar-190015(J&K) Mob.9419071324 Email: farooqfayaz786@gmail.com
۱۵	مجروح رشید	HOD Deptt. of Kashmiri , University of Kashmir,Hazaratbal,Srinagar-190006(J&K) Mob.9419061043 Email: majroohrashid@gmail.com
۱۶	ایاز رسول نازکی	7/10 Hariparbat Lane Sidra Jammu.180001 Mob.9419155364 Email: ayazrasoolnazki@gmail.com

۱۷	شفق سوپوری	101,Sabzan Gogo,Humhama, New Airport Road,Srinagar(J&K)-190014 Mob.7006828727 Email:drshafaqsopori333@gmail.com
۱۸	ولی محمد اسیر کشتواڑی	Nadeem Residency, House No.3, Lane-8, Firdousabad, Sunjwan Road,Jammu-180011 Mob.9419000471 Email: aseerkishtwari@gmail.com
۱۹	ناصر مرزا	Deptt.of EMMRC, Univesity of Kashmir, Hazaratbal, Srinagar-190006(J&K) Mob.9419073360 Email: enmirza@gmail.com
۲۰	جان محمد آزاد	Upper Soura,Buchpora,Srinagar-190011(J&K) Mob.9622681428
۲۱	عیاش عارف	163-Nursing Garh, Balgarden, Srinagar-190010(J&K) Mob.9419013009 Email:ayasharif@gmail.com
۲۲	شبیر احمد شبیر	Dangiwachi Rafiabad, Baramulla , Kashmir-193301 Mob.9682571449
۲۳	محمد یوسف مشہور	Azad Gali, Bye-Pass Road Kupwara Kashmir-193222 Mob. 9906624123
۲۴	حسن انظر	Sector H,Hamdaniya Colony, Bemina Sgr.(J&K)190018 Mob.9419027593
۲۵	منشور بانہالی	Banihal, Jammu-182146(J&K) Mob.9906395650 Email: manshoorbanihali2@gmail.com
۲۶	شہناز رشید	Noorbagh Sopore District Baramulla-193201(J&K) Mob.9419400872 Email: shahnazrasheed88@gmail.com
۲۷	اشرف آثاری	Sadarbal, Hazaratbal,P.O.Naseembagh,Sgr.190006 Mob.9419017246
۲۸	مشتاق حیدر	P.G.Deptt.of Urdu, University of Kashmir Hazaratbal Srinagar-190006(J&K) Mob.9469423440 Email:mushtaqhaider@gmail.com
۲۹	ولی محمد خوشباش	Doren Chadoura Budgam Kashmir (J&K)-191113 Mob.9906568727 Email:mdkhushbash11@gmail.com
۳۰	محی الدین زور کشمیری	Dar-ul-Adab, Frash Gund Budgam Kashmir-191111 Mob.9419773980 Email:drzoreurdu@gmail.com
۳۱	رشید کانسپوری	Kanispora Baramullah,Kashmir-193101 (J&K) Mob.9596278211
۳۲	مبشر رفاعی	Radio Colony, Wanbal, Rawalpora Srinagar-190005(J&K) Mob. 9419015306 Email:syedmmubashir@gmail.com
۳۳	رفیق احمد بانڈے	Nagin, Tehsil Beerwah, District Budgam Post Office : C.C pora Beerwah-193411(J&K) Mob. 7006687080 Email:rafeeqbanday@gmail.com



آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں



غلام نبی خیاؔل۔ زندگی کے مختلف پڑاوٗ



(دائیں سے) غلام نبی خیالؔ، رفیق رازؔ، پران کشور، رحمان راہیؔ، امین کاملؔ، محمد یوسف ٹینگ

(سری نگر، جون 2003ء)



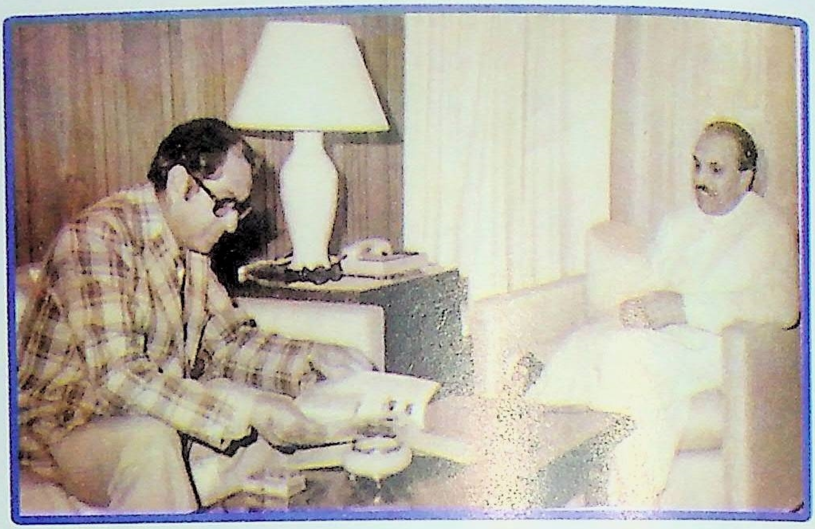
غلام نبی خیالؔ اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ



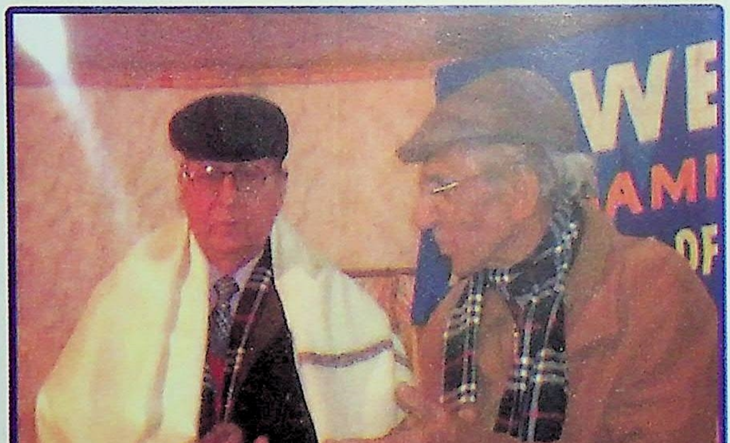
غلام نبی خیالؔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ لیتے ہوئے (فروری 1976ء)



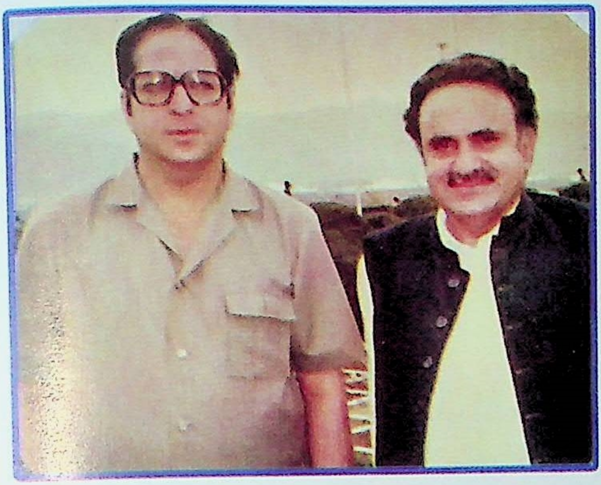
ادبی کانفرنس 1967ء (بائیں سے دائیں) غلام نبی خیالؔ، علی محمد لون، حسرت گڈھا، شاہد بڈگامی، عبدالرشید ارشاد،
تاج بیگم رینزو، ایوب بیتابؔ اور محمد احسن احسن، ارجن دیو مجبورؔ، موتی لال ساقیؔ، مکھن لال صرافؔ، موتی لال کیمو،
ہری کشن کول، مظفر عازم اور سوم ناتھ سادھو



سابق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کا اِنٹرویو لیتے ہوئے۔اسلام آباد(1987ء)



پروفیسر رحمٰن راہیؔ اور غلام نبی خیالؔ



خیاؔل صاحب، کشمیری صحافی عبدالصمد وانی کے ساتھ راولپنڈی میں (1986ء)



لتا منگیشکر اور غلام نبی خیاؔل۔ سری نگر (1979ء)



فیض احمد فیض کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی کے ساتھ علی گڑھ میں (2011ء)



(دائیں سے) مکھن لال محو، غلام نبی خیال، محفوظہ جان، فاروق عبداللہ اور صوفی غلام محمد



غلام نبی خیالؔ رانگر بڈگام میں عبدالاحد آزادؔ کی تربت پر



غلام نبی خیالؔ اور امین کاملؔ



فاضل کاشمیری اور غلام نبی خیالؔ



ڈاکٹر اصغر حسن سامون، غلام نبی خیالؔ، محمد اشرف ٹاک (مدیر اعلیٰ "شیرازہ") اور
سابق ایڈیشنل سیکرٹری کلچرل اکیڈیمی شمیمہ جی



سابق گورنر این این ووہرا غلام نبی خیالؔ کو سٹیٹ ایوارڈ دیتے ہوئے (2013ء)



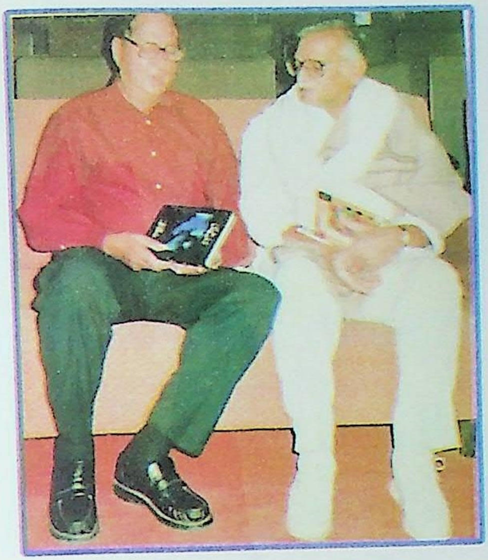
غلام نبی خیالؔ، میرواعظ مولوی محمد فاروق کے ہمراہ (1985ء)



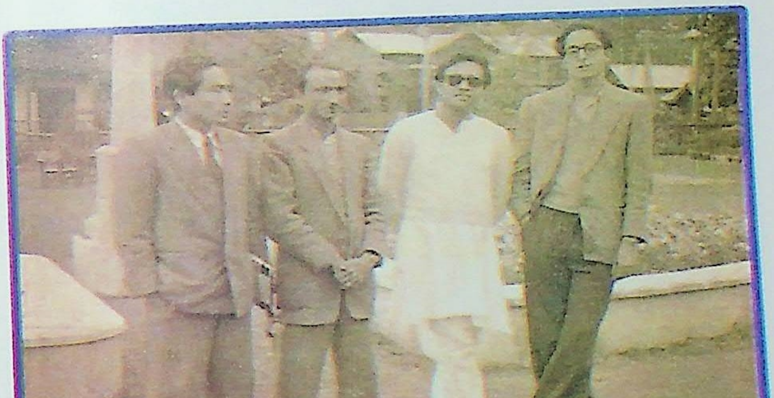
شیخ محمد عبداللہ اور غلام نبی خیالؔ۔ صورہ سری نگر (1964ء)



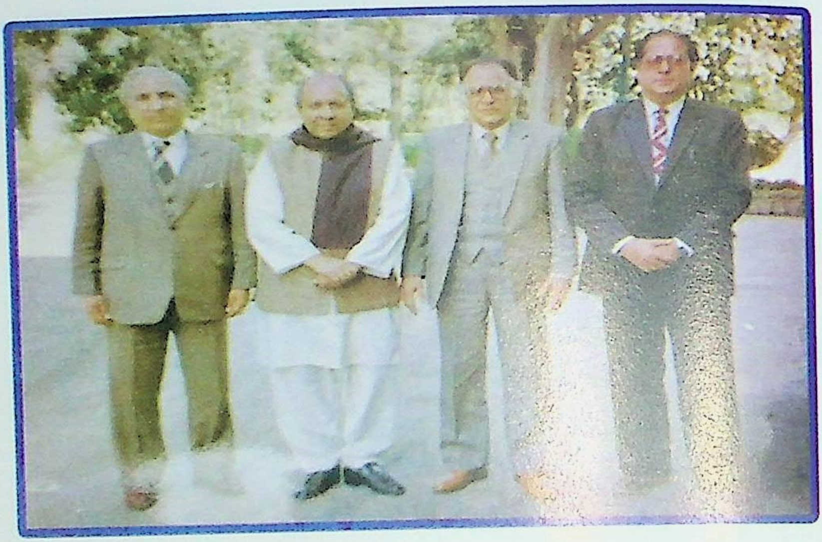
کشمیری یونیورسٹی کے احاطے میں (دائیں سے) مظفر عازم، مرزا غلام محمد عارف بیگ، غلام نبی ناظر، ہری کشن کول،
غلام نبی گوہر، محمد زمان آزردہ، شفیع شوق، سوہن لال کول اور غلام نبی خیالؔ



غلام نبی خیالؔ۔ شاعر اور فلم ساز گلزارؔ کے ساتھ



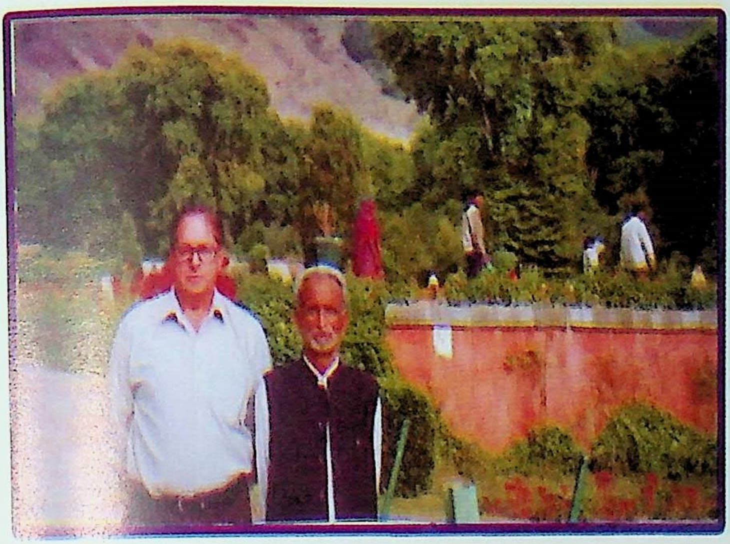
غلام نبی خیالؔ، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، اختر محی الدین اور اکبر لداخی (1957ء)



(دائیں سے) غلام نبی خیالؔ، احمد ندیم قاسمی، قتیلؔ شفائی، کلیم اختر (لاہور۔ جنوری 1990ء)



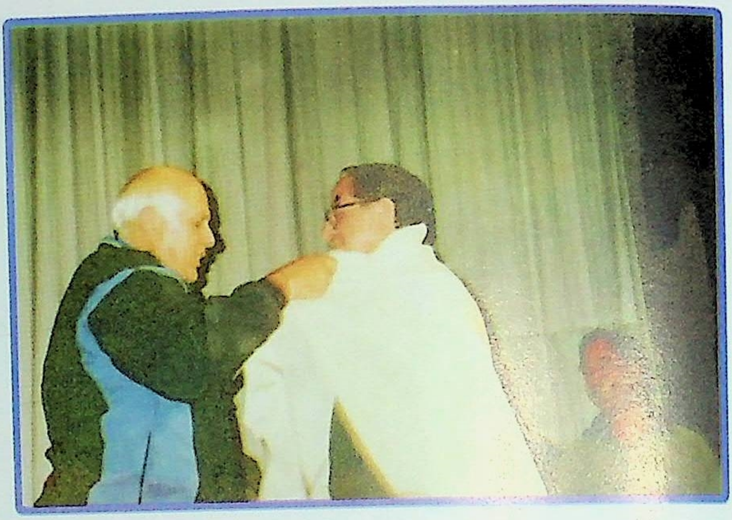
سابق ریاستی وزیر ریگزن جورا، غلام نبی خیالؔ کو اُن کی انگریزی کتاب ''لیوز آف چنار'' پر کلچرل اکادمی کا ایوارڈ دیتے ہوئے۔ تصویر میں سینئر آئی اے آفیسر اَتل ڈُلو اور سابق وزیر ناصر اسلم وانی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔



غلام نبی خیالؔ، نامور کشمیری افسانہ نگار اختر محی الدین کے ساتھ

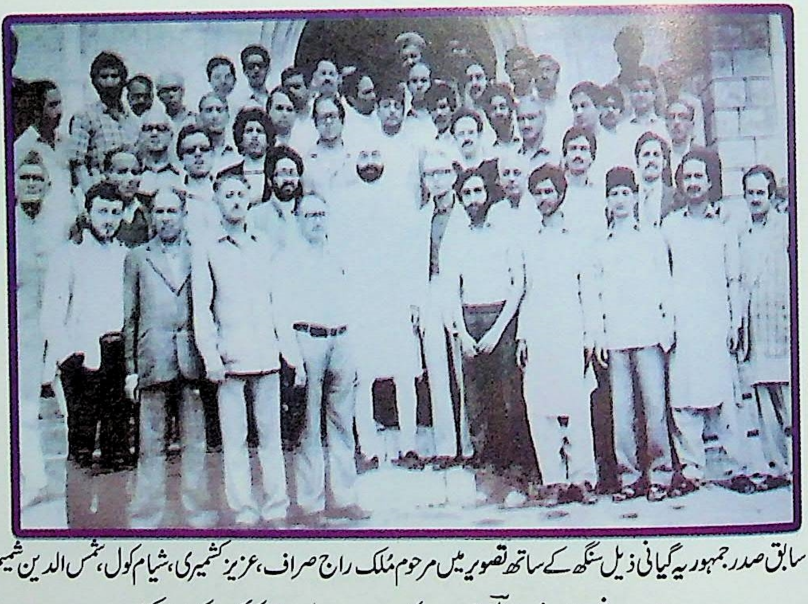


ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اے آر قدوائی، چندی گڈھ میں غلام نبی خیالؔ کو اعزاز دیتے ہوئے
تصویر میں نامور ادیب کشمیری لال ذاکر کو بھی دیکھا جا سکتا ہے



سابق صدر اکادمی ڈاکٹر فاروق عبداللہ، غلام نبی خیالؔ کی خلعت پوشی کرتے ہوئے

ٹیگور ہال سری نگر (1998ء)



سابق صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے ساتھ تصویر میں مرحوم مُلک راج صراف، عزیز کشمیری، شیام کول، شمس الدین شمیم، موہن چراغی، غلام نبی خیالؔ، محمد سعید ملک اور ست پال ساہنی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے

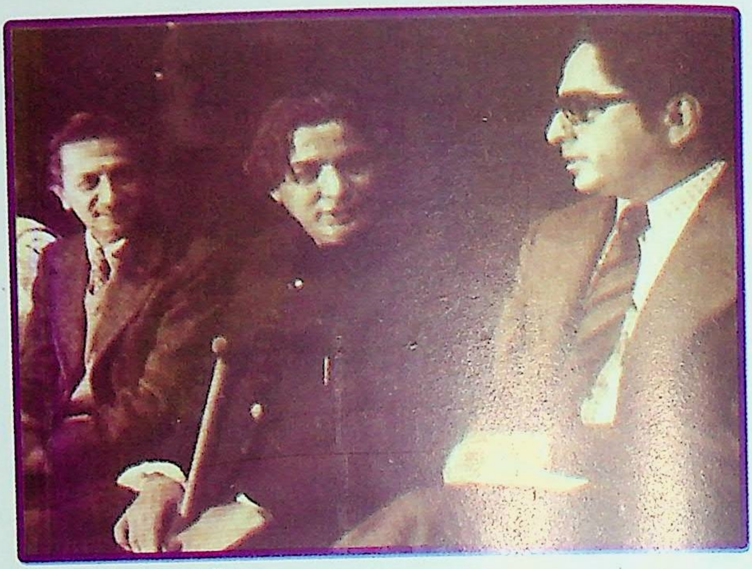
(تصویر: بشکریہ: امداد ساقی)



غلام نبی آتش، غلام نبی خیالؔ اور محمد اشرف ٹاک (مدیر اعلیٰ ''شیرازہ'' اُردو)



غلام نبی خیالؔ کے اعزاز میں ایک تقریب ٹیگور ہال میں
غلام نبی فراقؔ، غلام نبی خیالؔ کی اعزاز پوشی کرتے ہوئے (2004ء)



نئی دہلی میں 1975ء کے ساہتیہ اکادمی انعامات کی تقسیم کی تقریب

غلام نبی خیالؔ، کیفی اعظمی اور بھیشم ساہنی



(9/ اکتوبر 2004ء)

(بائیں سے دائیں) غلام نبی خیال، رمیش مہتہ، سابق سیکرٹری کلچرل اکیڈیمی، ناصر مرزا، مرغوب بانہالی، شاہد بڈگامی

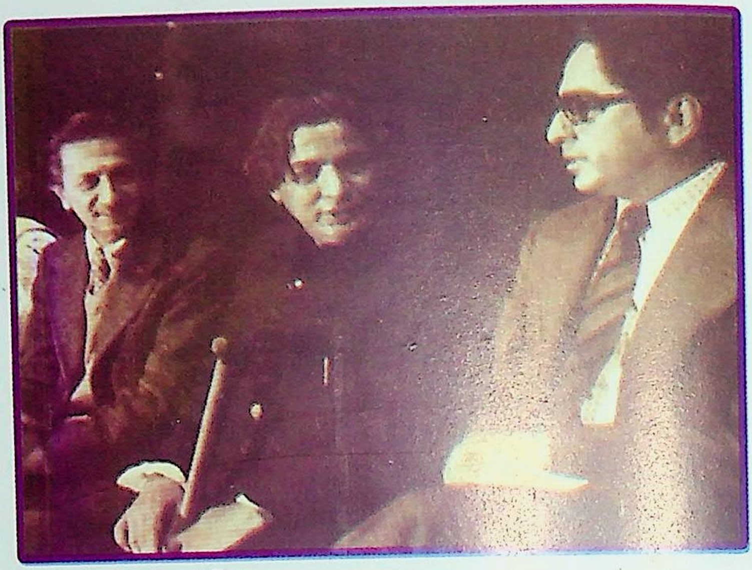
دوسری قطار میں۔ رحمان راہیؔ، عبدالاحد رفیق، غلام نبی گوہر اور نسیم شفائی



غلام نبی آتشؔ، غلام نبی خیالؔ اور محمد اشرف ٹاک (مدیر اعلیٰ ''شیرازہ'' اُردو)



غلام نبی خیالؔ کے اعزاز میں ایک تقریب ٹیگور ہال میں
غلام نبی فراقؔ، غلام نبی خیالؔ کی اعزاز پوشی کرتے ہوئے (2004ء)



نئی دہلی میں 1975ء کے ساہتیہ اکادمی انعامات کی تقسیم کی تقریب

غلام نبی خیالؔ، کیفی اعظمی اور بھیشم ساہنی



(9/اکتوبر 2004ء)

(بائیں سے دائیں) غلام نبی خیال، رمیش مہتہ، سابق سیکرٹری کلچرل اکیڈیمی، ناصر مرزا، مرغوب بانہالی، شاہد بڈگامی

دوسری قطار میں۔ رحمان راہیؔ، عبدالاحد رفیق، غلام نبی گوہر اور نسیم شفائی

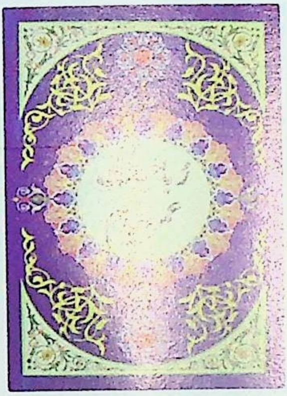


غلام نبی خیالؔ، معروف پنجابی اور کشمیری ادیب سرن سنگھ کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے

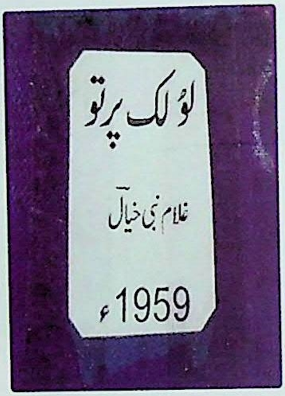


پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ ہے تیرا کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

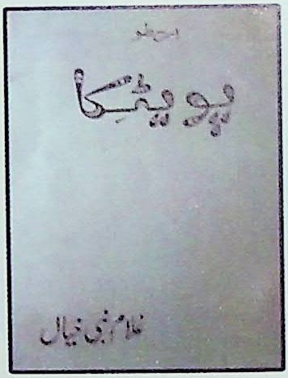
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



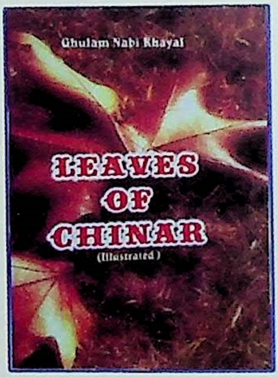
(1961ء)



(1959ء)



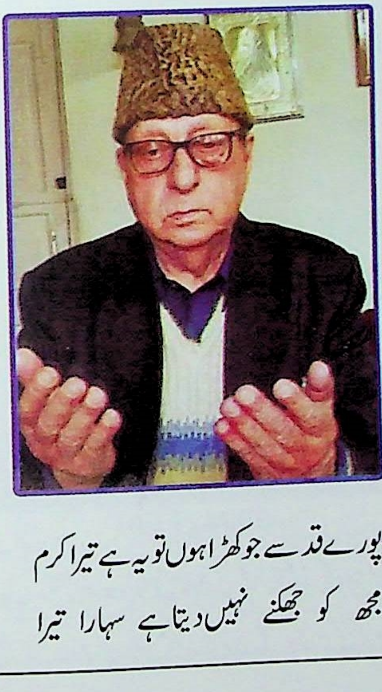
(1962ء)



(2009ء)

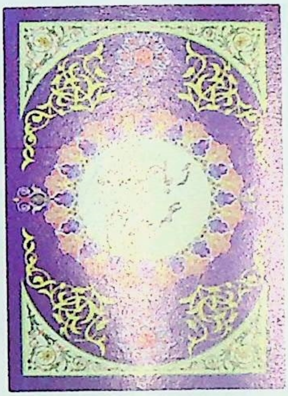


غلام نبی خیال، معروف پنجابی اور کشمیری ادیب سرن سنگھ کے اعزاز میں منعقدہ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے

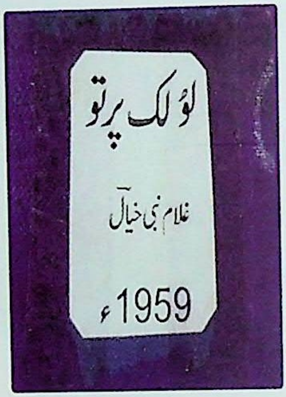


پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ ہے تیرا کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

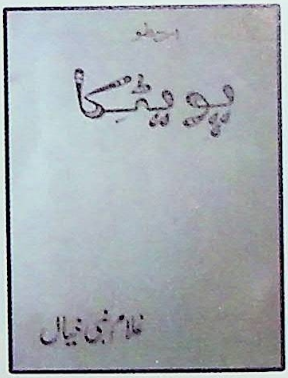
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



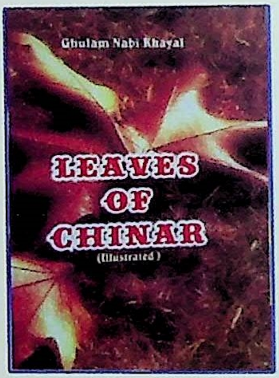
(1961ء)



(1959ء)

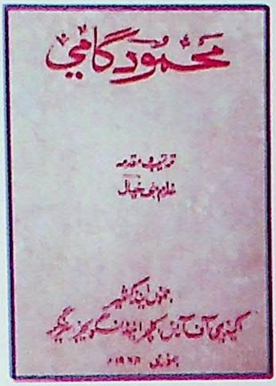


(1962ء)

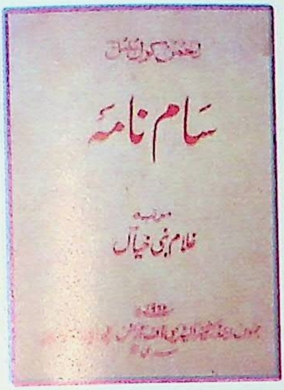


(2009ء)

غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



(1963ء)



(1962ء)

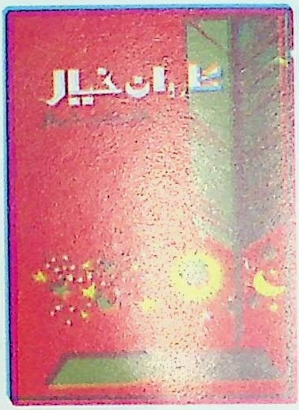


(1974)

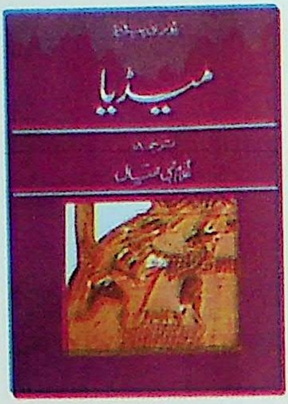


(1973ء)

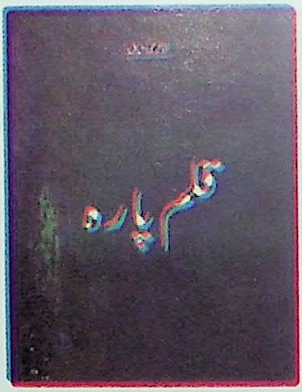
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



(1998ء)



(1998ء)

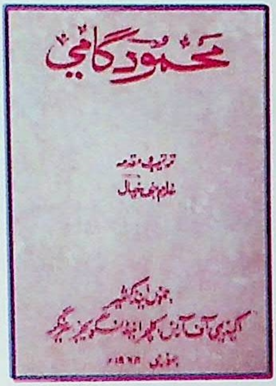


(2003ء)

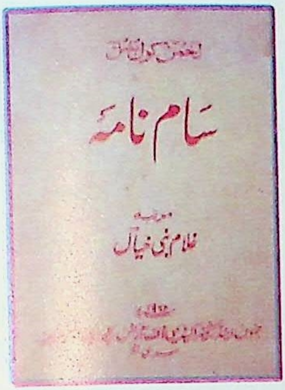


(1999ء)

غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



(1963ء)



(1962ء)



(1974)

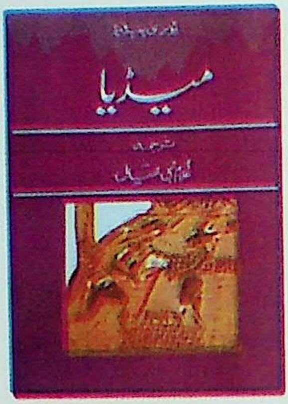


(1973ء)

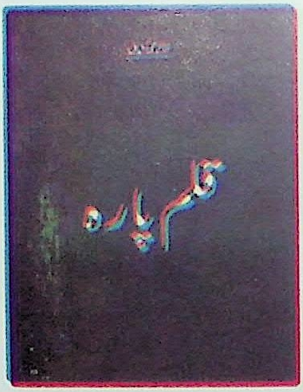
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



(1998ء)



(1998ء)



(2003ء)

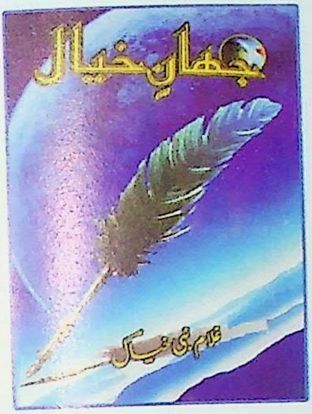


(1999ء)

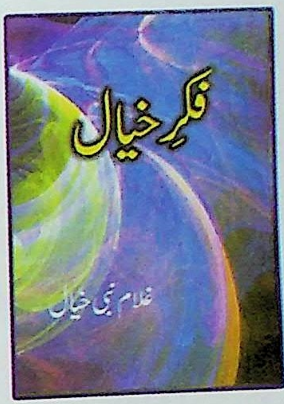
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



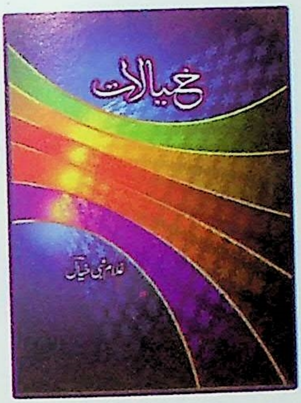
(2004ء)



(2016ء)

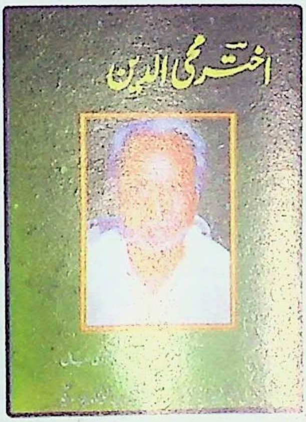


(2007ء)

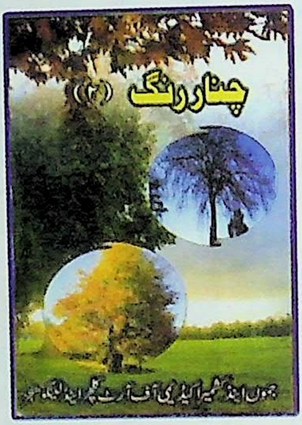


(2004ء)

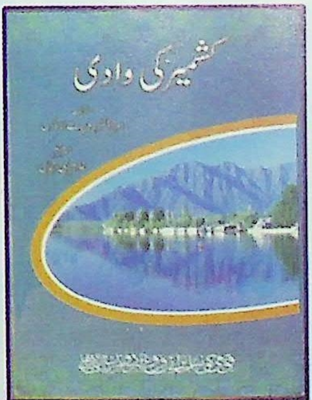
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



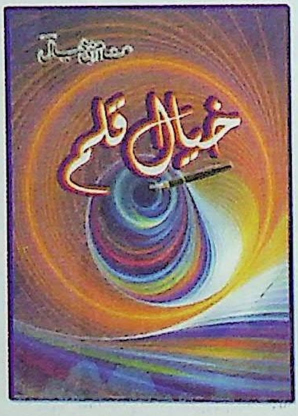
(2012ء)



(2010ء)



(2014ء)



(2014ء)

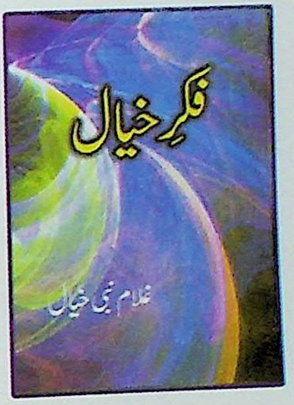
غلام نبی خیالؔ کی تصانیف کے سرورق



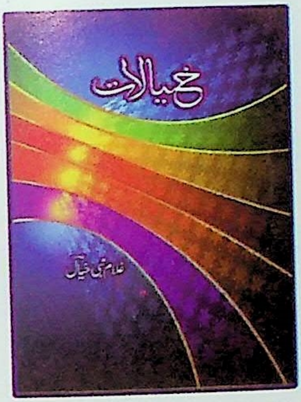
(2004ء)



(2016ء)

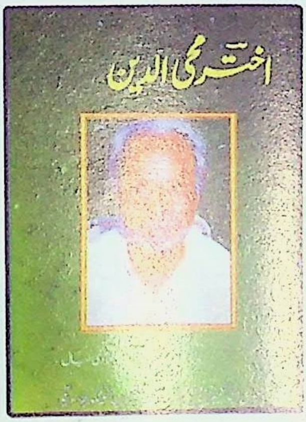


(2007ء)

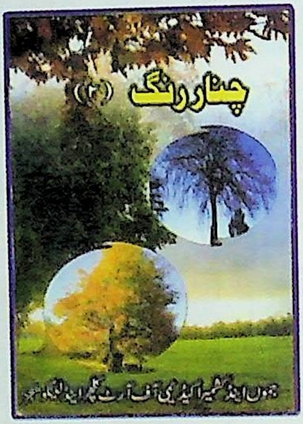


(2004ء)

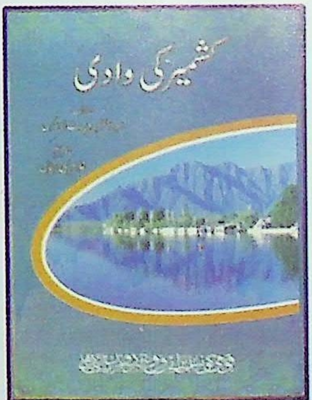
غلام نبی خیال کی تصانیف کے سرورق



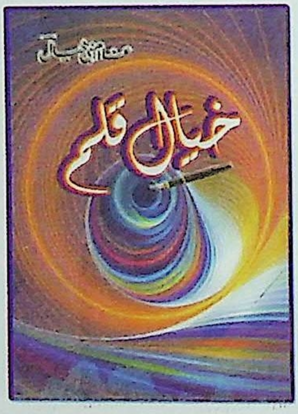
(2012ء)



(2010ء)

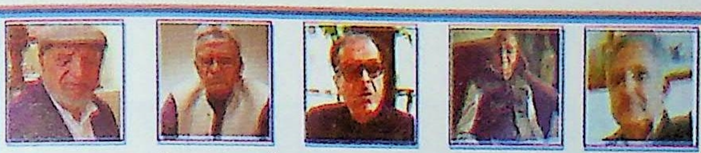


(2014ء)



(2014ء)

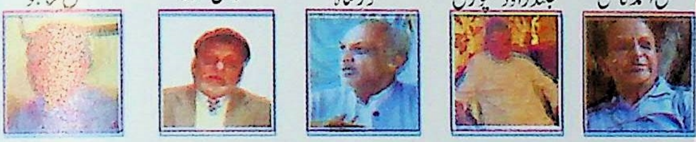
اِس شمارے کے قلم کار



محمد یوسف ٹینگ — پران کشور — سیف الدین سوز — شمس الرحمٰن فاروقی — فاروق نازکی



علی احمد فاطمی — جتندر راودھمپوری — نور شاہ — ناجی منور — حسن ساہو



شفیع شوق — قدوس جاوید — بشر بشیر — فاروق فیاض — مجروح رشید



ایاز رسول نازکی — شفق سوپوری — اسیر کشتواڑی — ناصر مرزا — جان محمد آزاد



عیاش عارف — شبیر احمد شبیر — محمد یوسف مشہور — حسن انظر — منشور بانہالی



شہناز رشید — اشرف آثاری — مشتاق حیدر — ولی محمد خوشاش — محی الدین زور



رشید کانسپوری — محمد اشرف ٹاک — محمد اقبال لون — مبشر رفاعی — رفیق احمد باٹے

اِس شمارے کے قلم کار


محمد یوسف ٹینگ


پران کشور


سیف الدین سوز


شمس الرحمٰن فاروقی


فاروق نازکی


علی احمد فاطمی


جتندر راودھمپوری


نور شاہ


ناجی منور


حسن ساہو


شفیع شوق


قدوس جاوید


بشر بشیر


فاروق فیاض


مجروح رشید


ایاز رسول نازکی


شفق سوپوری


اسیر کشتواڑی


ناصر مرزا


جان محمد آزاد


عیاش عارف


شبیر احمد شبیر


محمد یوسف مشہور


حسن انظر


منشور بانہالی


شہناز رشید


اشرف آثاری


مشتاق حیدر


ولی محمد خوشاش


محی الدین زور


رشید کانسپوری


محمد اشرف ٹاک


محمد اقبال لون


مبشر رفاعی


رفیق احمد بانڈے

ISSN NO: 2277-9833

Urdu SHEERAZA

Ghulam Nabi Khayal Number

Volume: 57 No: 4-6

Chief Editor

M. Ashraf Tak

Published by:
Jammu & Kashmir Academy of Art, Culture and Languages
Srinagar/Jammu

ISSN NO: 2277-9833

Urdu SHEERAZA

Ghulam Nabi Khayal Number

Volume: 57 No: 4-6

Chief Editor

M. Ashraf Tak

Published by:

Jammu & Kashmir Academy of Art, Culture and Languages

Srinagar/Jammu